

(64)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
حَامِدًا وَمُصَنِّفًا

دوسرا حصہ

سرسید کی لائف، انکی تصنیفات اور انکے کاموں کا رولو

سرسید کی ترقی کے اسباب

ہمارے ملک میں ترقی کا لفظ زیادہ تر عہدہ یا منصب کی ترقی پر اطلاق کیا جاتا ہے
مگر اس موقع پر نہ ایسی ترقی سے ہماری غرض متعلق ہے اور نہ نزدیک سرسید نے جو
حافظ سے ترقی کا کوئی ایسا درجہ حاصل کیا ہے جو انکی اعلیٰ لیا فون کے مقابلہ میں کچھ وزن
میرے ایک دوست سے ایک لائق نگاشین نے سرسید کا ذکر کرتے وقت کہا کہ اگر شخص روپ
میں پیدا ہوتا تو کسی بڑی امپائر میں وزیر اعظم کے درجہ تک پہنچتا۔ کرنل گریم نے سرسید کی لائف میں

الطاف حسین حالی

حیات بازید

سردرم

۷۴-۷۵

ایک مثال قابل تقلید سمجھتے ہیں اس لیے انکی ترقی کے اسباب کی تفتیش کرنا غالباً فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔
 سر سید کی لائف مین۔ جیسا کہ انکے ابتدائی حالات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ بہت سی
 ایسی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جن پر انکی ترقیات کی بنیاد قائم کیا جاسکتی ہے۔ قطع نظر ان جسمانی
 اور اخلاقی قابلیتوں کے۔ جنکے بخشنے میں قدرت نے بہت بڑی فیاضی کی تھی اور جنکے بغیر کوئی
 شخص بڑا آدمی نہیں ہو سکتا۔ اتفاقاتِ حسنہ نے بھی انکے ساتھ کچھ کم مساعرت نہیں کی۔ وہ
 ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں قدیم خاندان کی نیکیاں اور نئے خاندان کی اولوالعزمی
 اور ہمت مجتمع تھی۔ انکی ذہنیال سلطنت کے ایک قدیم متوسل گھرانے کی یاد دہ تھی اور انکی
 تخیال ایک ایسے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی جس نے اپنی ذاتی لیاقت حسن تدبیر اور علم و فضل سے
 اپنے اقربان و امثال میں انبیا رحاں کیا تھے۔ ان کے تئیں زمانہ کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ وہ
 خوش قسمتی سے بچپن میں زیادہ تر اپنی تخیال ہی میں رہے اور وہیں تعلیم و تربیت
 نے اپنے نانا کا عہد اپنی آنکھ سے دیکھا اور اپنے لائق ماموون کی صحبت برتی۔ انکی
 سنجیدہ اور دشمندہ بی بی تھیں جنکی تعلیم و تادیب سر سید جیسے جوہر قابل کے لیے اکیسرا حکم ملتی تھی۔
 انھوں نے حسن اتفاق سے ایسی حالت میں نشوونما پائی کہ نہ انکی حد سے زیادہ روک ٹوک ہوئی
 اور نہ انکو بالکل مطلق العنان چھوڑا گیا؛ وہ پڑھتے لکھتے بھی تھے اور ہر قسم کے کھیل بھی کھیلتے تھے مگر
 اپنے رشتہ داروں کے سوا غیر جنس کے لڑکوں سے کبھی نہ ملنے پاتے تھے۔ ان پر تعلیم کا ایسا بوجھ الا گیا تھا
 کہ قوامی جسمانی مضحمل ہو جائیں اور نہ انکی ڈور ایسی ڈھیلی چھوڑی گئی تھی کہ جدمرہ نہ ٹٹھ گیا۔ چلی نکلے۔
 انکے والد ایک آزادوش اور تعلقات دنیوی سے الگ تھلاک رہنے والے آدمی تھے۔ گھر کے

انگو با اعتبار پوئلکلیاقت کے سرسالا جنگ دل سے دوسرے درجہ پر رکھا ہے : مگر اخبار براڈ ایر و
 مطبوعہ ۱۳- فروری ۱۹۶۶ء میں اسپر پر یلارک کیا گیا تھا کہ ”سید احمد خان کو سرسالا جنگ سے دوسرے درجہ
 رکھنے میں ایک ممتاز ہندوستانی جٹلین کی قدر و قابلیت کا غلط اندازہ کیا گیا ہے جسکی تمام زندگی شمالی ہندوستان
 کے واسطے برکت اور رحمت رہی ہے“

سہر حال بیان سرسید کی جس ترقی کے اسباب بیان کرنے مقصود ہیں وہ
 ترقی نہیں بلکہ وہ ترقی ہے جو بعض اوقات کسی شخص کو نہ عمدہ اور منصف کے ہاڑ سے اور نہ مال
 دولت و جاہ سے اعتبار سے بلکہ اعلیٰ اور اشرف خصائل نے مانی کے کماؤ سے نہ ہوتی ہے
 اپنے خانہ ۱۱۰ بلکہ تمام قوم اور ملک میں ممتاز کر دیتی ہے ۔

۱۱۱۔ برکی زندگی کے واقعات جو پہلے حصہ میں بیان ہو چکے ہیں
 پر دیکھا ہے تو جی اُن سے اس قدر ضرورت ثابت ہوگا کہ ایک سلمان جو قومی ترقی
 جسے پاک سرودہ دار اخلاقہ کی پرمردہ سوسائٹی میں ہوش سنبھالا اور

نشوونما پائی۔ اُس نے اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ نہایت جانکاہ محنت ، دلی شوق اور بے نظیر استقل
 گوشت کی خیر اندیشی ، ملک کی خیر خواہی ، قوم کی خدمت اور مذہب کی حمایت میں بسر کر دئی ۔
 ۱۱۲۔ پھر ضروریہ سوال یہ ہے کہ کس چیز نے یہ غیر معمولی تحریک اُس کے دل میں پیدا کی ؟
 ۱۱۳۔ بعد بطوں طویل زمانہ تک ایسے استقلال کے ساتھ اپنے ارادوں پر قائم رہا ؟ اگرچہ اس
 سوال کا جواب میں صرف یہ کلام معجز نظام پیش کرنا کافی ہے کہ ”وَمَنْ مِّنْهُمْ مِّنْ خَلْقٍ لَّهِ يَهْتَفِرُ
 اُس کلام میں جٹلین (۱۱۳) سے آسانی دیتی ہے) لیکن چونکہ سرسید کی بانیوگرفی کو ہم آئندہ نسلوں کے

اور تعصب کے تو بر تو پر دس اُنکی آنکھوں پر پڑ جاتے۔ نئے طریقہ کی تعلیم بھی اُن خلیج تک پہنچانیلی نہ تھی جو سرسید سے ظہور میں آئے۔ یورپ کی اعلیٰ درجہ کی سولیزیشن اور حیرت انگیز ترقیات جو ایک ہندوستان میں طالب علم کے دل پر تعلیم کے ساتھ ساتھ نقش ہوتی جاتی ہیں۔ وہ آخر کار اُسکو اپنے ملک کی ترقی سے مایوس کر رہتی ہیں؛ یہاں تک کہ وہ اُن کوششوں کو جو ہندوستانیوں کی ترقی اور اصلاح کے لیے کی جاتی ہیں محض بے سود اور لا حاصل جاننے لگتا ہے۔ پس کہا جاسکتا ہے کہ سرسید کا پرانی تعلیم میں ادھورا رہنا اور نئی تعلیم سے آشنا نہ ہونا بجز اُن اتفاقات حسنہ کے تھا جنہوں نے قوم کی اصلاح کے عظیم الشان کام پر ہاتھ ڈالنے سے اُنکو جھکے نہیں دیا۔

اگرچہ یہ تمام باتیں جو اوپر بیان کی گئیں بلاشبہ ایسی ہیں جنکو سرسید کی ترقی میں بہت کچھ دخل معلوم ہوتا ہے مگر انہیں سے ایک بات بھی ایسی ہیں جسکو اُنکی ترقی کے لیے اسباب میں شمار کیا جائے؛ کیونکہ یہی باتیں اکثر اوقات ترقی کی سدا رہا دکھی گئی ہیں ۱۰:

۱۔ یہ ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے اور خاص کر ہماری مُردہ قوم میں جس قسم کے خیر و برکت و بزم الشان کام سرسید سے ظہور میں آئے ہیں اور جیسی حیل و تدبیر خد متون میں اُنھوں نے اپنی مددگی کا ایک مُعتمد بہ حصہ نہایت ہتھکڑی کے ساتھ بسر کیا ہے اُنکو محض اتفاقہ امور کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔

بعض اوقات خیال کیا جاتا ہے کہ سرسید کا اپنی بی بی کے انتقال کے بعد دوسری شادی نہ کرنا اور چالیس برس تجربہ اور بے تعلقی کی حالت میں رہنا یہی اُنکے تمام بڑے بڑے کاموں کی بنیاد تھی؛ روزہ دوسرا نکاح کر لیتے تو ہرگز اُنکو ان کاموں کے سر انجام کرنے کا موقع نہ ملتا۔ مگر اس تقدیر پر

انتظام اولاد کی پرورش اور تربیت کا مدار زیادہ تر بلکہ بالکل سرید کی والدہ پر تھا جو باوجود غنطنہ اور حب و داب کے نہایت متحمل و بردبار تھیں۔ پس وہ بے جانشین اور سختی۔ جو اولاد کی تعلیم و تربیت کے لئے مین اکثر والدین سے ظہور میں آتی ہے اور جس سے رفتہ رفتہ اولاد کے دل میں خود اپنی حقارت اور ذلت میٹھ جاتی ہے۔ سرید کی بھی مین گزری۔

جوانی کے آغاز میں سرید کو بچپن کی نسبت کسی قدر زیادہ آزادی حاصل ہوئی وہ اکثر رنگین جلسوں میں شریک ہوتا اور شہر کے نوجوان امیر زادوں سے ملنے جُلنے لگے۔ سوسائٹی کا پرچھاوان اُن پر بھی پڑا اور پڑنا چاہیے تھا۔ مگر ہونا نہ ہونا جو نون کی نغز میں بھی اُنکی اصلاح کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ ایک ٹھوکر کے گرا ایسے چوکنا ہو جاتے ہیں کہ کبھی عمر بھر کھینکھاتے۔ بھائی کے پاس سے اُنکی آفسر کی چپائی کے سینے کے پے ہووے سے دست ہٹا کر ہونا پڑا۔ ناک شکوہ بھرا ہوا تھا وہ آخر کار شتمل ہوئے بغیر نہ رہا۔ وہی سودا جو غفلان تھا اب اس شکل میں ظاہر ہوا تھا جس برس بعد حُب قومی کے لباس میں جلوہ گر ہوا اور میر کا یہ شعر سرید کے حال پر منطبق ہو گیا

”دل عشق کا ہمیشہ حریمِ نبرد تھا اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے در تھا“

جس حد تک سرید کی تعلیم ہوئی اُسکو بھی انکی ترقی کا موبد سمجھا جاسکتا ہے۔ اُنھوں نے جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے قدیم یا جدید کسی طریقہ میں پوری تعلیم نہیں پائی۔ اگر وہ اپنے طریقہ کی تعلیم پوری کر لیتے اور علوم قدیمہ کا رنگ اپنے چڑھ جاتا پھر ممکن نہ تھا کہ کسی دوسرے رنگ کے قبول کرنے کی قابلیت انہیں باقی رہتی۔ وہ تقلید کی بندشوں میں جکڑ بند ہو جاتے

اسی طرح یہ بھی امکان سے خارج ہے کہ یورپ کے رفارمرون اور وطن دوستوں کے حالات کتابوں میں پڑھ کر یا زبانِ سنکر ہندوستان میں بھی ویسی ہی ملک کے جان نثار اور قوم کے مصلح پیدا ہو جائیں۔

اصل یہ ہے کہ ایشیائی طرز حکومت جو ایک طاقت کو اعتدال سے زیادہ بڑھانے والی اور اُسکے سوا تمام طاقتوں کو فنا کرنے والی ہے اور جو ہندوستان میں بھی تمام ایشیائی ملکوں کی طرح ابتدائی آفرینش سے ایک عنوان پر چلی آتی تھی اُسے ایشیائی کسی قوم بلکہ کسی تنفس میں قومیت کی روح باقی نہیں چھوڑی۔ ایک بڑے حکیم کا قول ہے کہ شخصی حکومت میں صرف ایک شخص (یعنی بادشاہ) ملک کا خیر خواہ ہو سکتا ہے اور بس۔ جان سوارٹ مل لکھتے ہیں کہ ”اگر رعیت کو ایسا بنا دو کہ وہ ملک کے لیے کچھ نہ کر سکے تو اُسکو ملک کی کچھ پروا نہ رہی“۔ اگرچہ ہندوستان میں سو برس سے طرز حکومت بدل گئی ہے جس کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ لوگوں میں ملک و قوم کی بھلائی کا خیال اور جوش پیدا ہو، مگر جو سکون اور انجام ہندوستان کی قوموں میں صد ہا پشت سے متواتر چلا آتا ہے اور جو اُنکے آب و گل میں خمیر ہو گیا ہے اُسکو برٹش طرز حکومت جیسی کہ وہ ہندوستان میں ہے ایک صدی میں زائل نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی نظیریں سن سن کر جو اکثر ہندوستانیوں کے دل میں بعض اوقات ملک و قوم کی بھلائی کا جوش دفعۃً اُٹھتا ہے کچھ زیادہ دن نہیں گزرے کہ وہ آگے کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔

البتہ مذہب ایک ایسی چیز ہے جو ہر ملک میں اور خاص کر ایشیائی ملکوں میں مذہبی آدمیوں کو نہایت اعتدال کے ساتھ تمام عمر اپنے ارادوں پر ثابت قدم رکھ سکتا ہے۔ یہ مذہب ہی میں

یہ سوال باقی رہتا ہے کہ وہ کیا چیز تھی جسے ایک پالیس بیالیس برس کے توانا تندرست آدمی استطاعت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان شخص کو نکاح ثانی سے باز رکھا اور تہذیب کی نگاہ اور تلخ زندگی پر قانع کر دیا؟

البتہ ایک اور بات کا غلطہ کے قابل ہے جو سرسید کی لائف پر غور کرتے وقت لوگوں کے ذہن میں ضرور متبادر ہوتی ہوگی: یعنی یہ کہ جب سے انگریزی تعلیم ہندوستان میں پھیلی ہے اور یورپ کے اُن نامور لوگوں کے حالات سے جنہوں نے ملک اور قوم پر اپنی جانیں قربان کی ہیں ہندوستان کے لوگ واقف ہوئے ہیں اسوقت سے ہندوستان میں بھی کم و بیش قومیت اور قومی ہمدردی کا خیال لوگوں کے دل میں پیدا ہوتا جاتا رہا۔ پس یہ بات بالکل قرن قیاس سے دور ہے، بلکہ یہ کچھ ملک یا مذہب کی خدمت میں کیا وہ انھیں یورپ کے رفارمرز و مدبرین کے حالات سن کر ان کی رئیس سے کیا ہو۔ لیکن اول تو جسوقت سرسید کو ملک اور یہ ان خدمت یا مذہب کی حمایت کا خیال پیدا ہوا اُس وقت تک انگریزی تعلیم ہندوستان میں نہایت محدود تھی اور مسلمانوں میں بالکل نہ تھی۔ دوسرے اگر بالفرض یہ بات مان بھی لیجاے تو صرف اسی قدر مافی جاسکتی ہے کہ یورپ کی تاریخ سے اُنکے دل میں بھی حب وطن اور قومیت کا خیال ایسا ہی پیدا ہو گیا ہو جیسا کہ ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں ایک دودھ کا سا اُبال پیدا ہو جاتا ہے مگر اُس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خیال ایسا پاک جائے کہ ایک ہندوستان کا مسلمان قوم کی دھن میں اپنے تئیں فنا کر دے۔ جس طرح حالت موجودہ میں یہ ممکن نہیں کہ یورپ کے مسیحیوں اور مخترعون کے حالات سن سن کر ہندوستان میں بھی ویسے ہی موجود مخترع پیدا ہوئے۔

اور قومی خدمتیں سر انجام کرائی ہیں۔ ہمارے نزدیک جہاں تک کہ انکی لائف شہادت دیتی ہے اور جس قدر کہ انکے حالات۔ افعال۔ اور اقوال سے ظاہر ہوتا ہے انکی تمام ترقیات کا منبع۔ انکے کل مقاصد عالیہ کا محرک ورائے ہر منزل کا رہبر مذہب کے سوا اور کوئی چیز قرار نہیں پاسکتی۔ اسلام کی حقیقت کا یقین اور بانی اسلام کی محبت اور عقیدت گویا سرسید کی گھٹی میں پڑی تھی۔ دار الخلافہ کا اخیر دور تھا اور مسلمانوں کو آخرت کی امیدوں کے سوا جکا اسلام عد کرتا تھا کوئی امید دنیا میں باقی نہ رہی تھی اسلئے وہ مذہب کو زیادہ مضبوط پکڑتے جاتے تھے۔ خصوصاً شریف اور ممتاز خاندانوں میں مذہبی فرائض کی پابندی اور مذہبی باتوں کا چرچا بہت زیادہ تھا۔ شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ۔ جو اُس زمانہ میں دیندار مسلمانوں کا ملجا و ماوئے تھی۔ اُسکے ساتھ سرسید کو ایک خاص تعلق تھا۔ انکے والدین خانقاہ کے مشلح سے کمال ادا و ادب عقیدت رکھتے تھے اور اسلئے سرسید بچپن ہی سے اپنے والد کے ساتھ خانقاہ میں جانے لگے تھے؛ اور ایک مدت دراز تک انھوں نے وہاں کارنگ صحبت اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ انکی والدہ کے سوا انکے تمام انھیال والے جہاں انھوں نے نشوونما پائی شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندان کے معتقد تھے۔ پس سرسید نے آنکھ کھول کر اپنے سارے گھر میں مذہب ہی کا دور دورہ دیکھا تھا؛ گویا مذہب ہی کی آغوش میں انھوں نے نشوونما پائی تھی اور مذہب ہی کی گود میں ہوش سنبھالا تھا۔ علوم جدیدہ جس عمر میں مذہب کے علم چاٹ کر سکتے ہیں اُس عمر میں سرسید پر انکی پرچھائیں تک نہیں پڑی تھی بلکہ زیادہ تر انکی لئے اسوقت کھلنی شروع ہوئی جب مذہب کی جڑ پتال تک پہنچ چکی تھی، اور جب کہ سائنس کو بجلیے انکے لئے مذہب کے ساتھ جنگ کرے اُس سے صلح کرنی ضرور تھی۔

طاقت ہے کہ انسان نہایت سخت ریاضتون میں اپنی زندگی بسر کر دیتا ہے، تمام لذات کو اپنے اوپر حرام کر دیتا ہے، آگ میں تپتا ہے، برف میں گلتا ہے، گھر بار کٹا دیتا ہے اور ہر قابل برداشت تکلیف اٹھاتا ہے۔ مگر مذہب بھی کیسا ہی سچا اور خدا کا بھیجا ہوا ہو طرز حکومت کا تابع ہوتا ہے۔ اسیمن جتنی باتیں طرز حکومت کے مقتضا کے موافق ہوتی ہیں وہ رواج پاتی ہیں اور باقی حصہ ناقابل عمل سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً خود مختار سلطنت جس میں کوئی بات شخصیت سے خالی نہیں ہوتی۔ اُس میں مذہب بھی ذاتی اور شخصی بھلائیوں کے سوا اور کچھ نہیں سکھاتا۔ وہ صرف ایسی نیکیاں سکھاتا ہے جن کا نفع یا تو نیکی کرنے والے کی ذات پر ختم ہو جاتا ہے اور یا صرف خاص خاص شخصوں کو پہنچتا ہے۔ وہ کبھی ایسی نیکیوں کی ترغیب نہیں دیتا جس سے بلا واسطہ تمام ملک یا تمام بنی نوع کو فائدہ پہنچے۔ مذہب کی یہ حالت ایسی پائدار اور مستحکم ہو جاتی ہے کہ خود مختار سلطنت کا دورہ ختم ہو جانے کے بعد بھی صدیوں تک وہ اسی حالت پر قائم رہتا ہے۔ پچھلے جس شاہراہ پر اگلوں کو چلتا دیکھتے ہیں آپ بھی آنکھیں بند کر کے اُسی شاہراہ پر پڑ لیتے ہیں۔ دائیں بائیں آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ مگر بعض اوقات زمانہ کی ضرورتیں خود مذہبی فرقہ میں کوئی ایسا شخص پیدا کر دیتی ہیں جس کو مذہب کی چھان میں کرنی پڑتی ہے اور مذہب کا وہ ترو حصہ جو موجودہ زمانہ کے موافق ہوتا ہے اُس پر عمل کرنا اور اُس کو رواج دینا پڑتا ہے۔ زمانہ کی ضرورتیں اُسکی آنکھیں کھولتی ہیں اور بانی مذہب کی محبت اور عقیدت اُس کو مذہب کی حقیقت کھولنے پر مجبور کرتی ہے اور خود مذہب اُس میں استقلال پیدا کرتا ہے جسکی بدولت وہ قوم کی شاہراہ کے خلاف اپنی کٹھن منزل طے کرتا ہے۔ یہیں سے اُس چیز کا سراغ چلتا ہے جسے سربہ تمام ملکی

مگر مذہب نے اجازت دی اسلئے انگریزی نوکری بے تامل اختیار کر لی۔ مذہب ہی سے یہ سوال کیا کہ غیر قوم اور غیر مذہب گورنمنٹ کی نوکری محض دفع الوقتی و ایام گزاری کے طور پر کرنی چاہیے؟ یا تہ دل سے اُسکے فرائض ادا کرنے چاہئیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ نوکری کا پورا معاوضہ لینا اور اُسکے فرائض تہ دل سے ادا کرنا خدا اور رسول کی مرضی کے خلاف ہے اسلئے نوکری کے فرائض نہایت ایمانداری اور سچائی کے ساتھ سرانجام کیے۔ مذہب ہی سے پوچھا کہ غیر قوم کی حکومت میں رعیت کو اُسکی خیر خواہ اور وفادار رعایا بنکر رہنا ضرور ہے یا نہیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ کوئی گناہ اس سے بڑھ کر نہیں کہ جس گورنمنٹ کے سایہ حمایت میں رعیت کو ہر طرح کا امن اور آزادی حاصل ہوا اُسکی رعیت اپنی گورنمنٹ کی وفادار اور خیر خواہ نہ ہو؛ لہذا اپنی تمام زندگی گورنمنٹ کی وفاداری اور خیر خواہی میں صرف کر دی۔ مذہب ہی سے یہ پوچھا کہ غیر مذہب قوموں کے ساتھ صدق دل سے دوستی، میل جول اور کھانا پینا دین حق کی پاکیزگی اور تقدس کے موافق ہے یا نہیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ موافق ہی ہے، بلکہ نہایت ضرور ہے؛ کیونکہ اسلام نفاق سے بدتر اور رذیل تر کسی خصلت کو نہیں بتاتا اسلئے ہمیشہ انگریزوں اور تمام غیر مذہب قوموں کے ساتھ اُسی صداقت اور خلوص کے ساتھ میل جول رکھا جائے تاکہ مسلمانوں کے ساتھ رکھنا چاہیے۔

واقعہ شہ ۱۸۵۸ء نے جب ہندوستان کے مسلمانوں کو نہایت سخت صدمہ پہنچایا اور اُنکے چہنچے کی بالکل امید نہ رہی اس سے سرسید کے دل پر ایسی افسردگی اور مایوسی چھائی کہ اُن کا ارادہ ہندوستان کے تعلقات قطع کر کے کسی دوسرے ملک میں جا کر رہنے کا ہو گیا۔ اُسوقت بھی اُنھوں نے مذہب ہی سے یہ سوال کیا کہ قوم کی آگ میں کودنا بہتر ہے یا اپنی جان بچا کر اور کسی گوشہ میں بیٹھ کر

چونکہ سرسید کا تمام خاندان دو ایسے خانوادوں سے عقیدت رکھتا تھا جو نہ صرف دینی بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں جامع شریعت و طریقت سمجھے جاتے تھے ایسے اُنکا گھر بہت سی ایسی جاہلانہ رسموں اور سیودہ اوہام اور لغو عقائد سے پاک تھا جنہیں اکثر جاہل مسلمانوں کے خاندان گرفتار ہوتے ہیں۔ چنانچہ سرسید کہتے تھے کہ ”اس زمانہ میں بھی۔ جب کہ میرے مذہبی خیالات متفقانہ اصول پر مبنی ہیں۔ میں اپنی والدہ کے عقائد میں ایک دھبہ بات کے سوا کوئی عقیدہ اپنے اصول کے خلاف نہیں پاتا۔“

یہی عقائد ابتدا سے سرسید کے دل میں ڈالے گئے تھے اور اسلام کی یہی صورت اُنھوں نے آنکھوں سے دیکھی تھی۔ گویا ہوش سنبھالتے ہی اُنھوں نے اپنا قدم تحقیق کی پہلی سیڑھی پر پایا تھا۔ پھر مولانا اسماعیل شہید کی تصنیفات نے اُنکے خیالات کی اور زیادہ اصلاح کی اور اُنکو کسی قدر تقلید کی بندشوں سے آزاد کیا۔ مگر جب تک قدیم سوسائٹی کا رنگ نہ غالب رہا مذہبی خیالات میں کوئی بڑا انقلاب واقع نہیں ہوا۔ وہ انہیں سنت و بدعت تقلید و عدم تقلید کے جھگڑوں میں الجھے رہے اور اسلام کے اشرف و اعلیٰ مقاصد کو صرف انہیں شخصی کاموں میں منحصر جانتے رہے جن کا نفع یا تو خود کامیابی کی ذات کو اور یا خاص خاص شخصوں کو پہنچتا ہے۔ مگر آخر کار زمانہ کی ضرورتوں نے اُنکی آنکھیں کھولیں اور خود اس یقین نے۔ جو اسلام کی حقیقت کی نسبت اُنکی گھٹی میں پڑا تھا۔ اُنکو اسلام کی حقیقت ایرا اس کے اصلی مقاصد تک پہنچا دیا۔ جو باتیں دین حق کی پاکیزگی اور تقدس کے خلاف معلوم ہوئیں اور چھوڑا اور جو اس کے مطابق پائین اُنکو کپڑا اور زید و عمرو کی مخالفت کا خوف یک قلم دل سے اٹھا دیا۔ ہر ایک معاملہ میں خود مذہب کو نہ کہ زید و عمرو کو اپنا رہبر بنایا۔ جو سوال پیش آیا اُسکو بلا واسطہ مذہب ہی سے پوچھا اور جو کچھ دہان سے جواب ملا اُسکو سر پر کھا۔ لوگ انگریزی نوکری پر اعتراض کرتے تھے

حد سے زیادہ گرسے ہوئے ہیں اور گرتے چلے جاتے ہیں اور مسلمانوں کی ذلت بعینہ اسلام کی ذلت ہے۔ اگر چند روز انکا یہی حال ہا تو ہندوستان میں انکا عدم اور وجود برابر ہو جائیگا اور اسلام اس ملک سے رخصت ہو جائیگا۔ اسلئے انھوں نے قوم کو اوانیہا ہی کی طرف متوجہ کیا اور جو ذریعے انکی دنیوی ترقیات کے تھے انکے لیے مہیا کیے۔ سب سے زیادہ انکی ترقی کا مدار انگریزی تعلیم پر سمجھا اسلئے۔ گو ایک زمانہ نے انگریزی تعلیم کی مخالفت اور مزاحمت کی۔ مگر انھوں نے اُسکو قوم میں جاری کر کے چھوڑا۔ مذہبی اوہام اور غلط خیالات جو دنیوی ترقی کے مانع تھے اپنی پورے تحریروں سے انکی غلطی ثابت کی، سوشل و اخلاقی خرابیاں جو قوم میں شایع تھیں جن پر غیر قومیں ہنستی تھیں اور جو دنیوی عزت اور وقار کی منافی تھیں انکی اصلاح میں جہاں تک ممکن تھا کوشش کی، قوم کی طرف سے جو گورنمنٹ کو پوائنٹل بدگمانیاں تھیں انکو رفع کیا، گورنمنٹ کی طرف سے جو قوم کے دل میں مغایرت یا دشت یا جھجک تھی اُسکو دور کیا، انگریز جو اسلام کو ایک حمایت مہیب و خوفناک مذہب خیال کرتے تھے اور اسلئے مسلمانوں کی طرف سے مطمئن نہ تھے۔ انکو اسلام کی اصلی صورت دکھائی اور ثابت کیا کہ اگر دنیا میں کوئی مذہب عیسائیوں کا دوست، عیسائی مذہب کا حامی، بائبل کی تصدیق کرنے والا اور اُسکے اصول سے مطابقت رکھنے والا ہے تو وہ صرف اسلام ہے اور بس، ہندو مسلمانوں میں جہاں تک کہ ممکن تھا اتحاد و اتفاق پیدا کرنے میں کوشش کی کیونکہ دونوں قوموں کی عزت اسی بات پر موقوف تھی اور موقوف ہے کہ آپس میں مل جلکر رہیں، جتنے مدرسے اور انسٹیٹوشن قائم کیے آئیں دونوں قوموں کو شریک کیا اور اُنسے دونوں کے فوائد ملحوظ رکھے، ہمیشہ اپنے پبلک اسکولوں میں دونوں قوموں کو اسی بات کی نصیحت کی کہ ہندوستان کی عزت اتفاق میں ہے، مسلمانوں کے مختلف فرقے

خدا کی یاد کرنی بہتر ہے؟ مذہب نے جواب دیا کہ اسلام کا اصل اصول بلکہ خود اسلام محض قوم کی خیر خواہی اور بہدردی ہے اور بس۔ مذہب نے اُنکو بتایا کہ بانی اسلام جسکی اطاعت اور اتباع تمام امت پر فرض ہے اور جسکی نسبت قرآن ناطق ہے کہ ”لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ“ اُسے دنیا میں آکر کیا کیا؟ اپنی تمام عمر ملک اور قوم کی خیر خواہی میں بسر کی، وہ گمراہ تھے اُنکو ہدایت کی، وہ وحشی تھے اُنکو انسان بنایا، وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے اُنہیں اخوت اور دوستی کی بنیاد ڈالی، وہ آپس کی خانہ جنگیوں میں پھنسے ہوئے تھے اُنہیں ملک گیری اور کشور کشائی کا مادہ پیدا کیا، اُنکا دین اور دنیا دونوں درست کیے، اُنکی خیر خواہی اور اصلاح میں سخت شدا اُدا اور تکلیفیں اپنے نفس پر برداشت کیں، ملک کی محبت کو جزو ایمان قرار دیا اور کہا کہ ”وَحُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْإِيمَانِ“ قوم کی محبت پر تمام امت کو مجبور کیا اور فرمایا کہ ”وَحُبُّ الْعَرَبِ مِنَ الْإِيمَانِ“ قوم کی سواری کو قوم کی خدمت میں منحصر ٹھہرایا اور کہا کہ ”سَيِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ“ اخیر دم تک امت یعنی قوم ہی کا خیال رکھا اور اُمّتی اُمّتی کہتا دنیا سے رخصت ہوا۔

سرسید نے مذہب کی یہ ہدایت سنکر تمام ارادے فسخ کیے اور اس اصول کو مضبوط پکڑ لیا۔ ”ہونے والی دنیاوی تعلقات کو جسکے بغیر قوم کی خیر خواہی اور قوم کو نفع پہنچانا غیر ممکن تھا قطع تعلق سے ہزار جہیم بہتر سمجھا اور اپنی تمام زندگی اور طاقت اور استطاعت اور اپنے تمام قوے کو نفس و اسپین تک قومی خدمت اور قومی خیر خواہی کے لیے وقف کر دیا۔ اُنہوں نے مذہب ہی سے یہ پوچھا کہ قوم کی اصلی اور حقیقی خیر خواہی کس چیز میں ہے؟ مذہب نے جواب دیا کہ مسلمانوں کے اعزاز سے اسلام کو معزز کرنا اور دنیا کے فذیعہ سے دین کو تقویت دینی۔ مذہب ہی نے اُنکے دل میں ڈالا کہ مسلمان نبوی عزت میں

اپنے ذمہ لیا اور اپنی سمجھ اور علم اور عقل کے موافق قرآن کی تفسیر لکھنی شروع کی۔

یہاں تک جو کچھ ہم نے لکھا یہ محض بے سرو یا قیاسات نہیں ہیں بلکہ خود سرسید نے اپنی تحریروں میں جا بجا اس ضمنوں کی طرف اشارہ کیا ہے خصوصاً وہ آرٹیکل جو تہذیب الاخلاق موضحہ کے علم السبع الاول^{۱۳۸۸} ہجری میں ”ایک نادان خدا پرست اور دانا دنیا دار“ کے عنوان سے لکھا ہے اُس سے ہمارے مذکورہ بالا بیانات کی بخوبی تائید ہوتی ہے اُس کے علاوہ ہم ہمیشہ اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے کہ سرسید قومی خدمات اُسی سرگرمی اور ذوق و شوق کے ساتھ انجام دیتے تھے جیسے ایک مریض اور نفس کش زاہد عبادت الہی بجالاتا ہے۔ نہ بیماری اور ضعیفی اُن کے ذوق و شوق کو کم کرتی تھی اور نہ گرمی یا سردی کی شدت یا اور کسی ہرج مرج سے اُن کی ہمت قاصر ہوتی تھی۔ چالیس برس برابر انھوں نے محافیتن جھیلین، اُن کے کفر کے بے شمار فتوے لکھے گئے، اُنکو دہری ملحد کافر اور دجال سب کچھ کہا گیا۔ اُنکو بارہا قتل کی دھمکیاں دی گئیں، صد ہا گناہ خطوں میں مغلط گالیاں لکھ کر بھیجی گئیں، اخباروں اور رسالوں میں جہانتک ہوسکا اُنکی توہین کی گئی؛ مگر وہ اپنی دھن میں اُسی طرح کے رہے اور اپنا کام اُسی ذوق و شوق کے ساتھ کیے گئے۔ بلکہ جب قدر مخالفت بڑھتی گئی اُس قدر کاوش اور سرگرمی زیادہ ہوتی گئی لوگ اُنکو برا بکرا اور گالیاں دیکر اس قدر خوش ہوتے ہوئے کہ کہ وہ برا سنکر اور گالیاں کھا کر خوش ہوتے رہے۔ اُنکی بہن کے انتقال کی خبر اُنکو اس وقت پہنچی جب کہ وہ قومی کانفرنس کی کارروائی میں مصروف تھے۔ جب تک جلسہ اپنے معمولی وقت پر فراغت نہ ہوا وہ بہن کی تجہیز و تکفین میں شریک نہ ہوئے۔ جوان بیٹے کی موت سے اُنکو سخت صدمہ پہنچا؛ پندرہ بیس روز تک قلب کی حرکت نہایت سُست رہی اور یہ صدمہ آخر تک

مذہبی نزاع اور جھگڑوں نے پھوٹ ڈال رکھی ہے اور اس لیے وہ روز بروز ضعیف اور حقیر ہوتے جاتے ہیں۔ جہاں تک ممکن تھا انہیں اتفاق و التیام کی بنیاد ڈالی، مدرستہ العلوم میں مسلمان فرقہ کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا اور ہر فرقہ کے طالب علموں کو ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی ہدایت کی، اپنے سنی دوستوں کو شیعوں کے خلاف کتابیں لکھنے سے روکا اور خود جو ابتدائے عمر میں اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کی تھی اُس سے ہمیشہ کے لیے اجتناب کیا، باوجودیکہ اُنکو اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے مذہب کے متعلق صد ہا باتیں جمہور کے خلاف لکھنی پڑیں مگر بغیر سخت ضرورت کے کبھی کوئی نئی بات زبان سے نہیں نکالی، کبھی جمہور اہل اسلام کے مقابل کوئی جدید فرقہ کھڑا کرنا اور آپ اُس کا سرگروہ بننا نہیں چاہا، کبھی مخالفین کے اعتراضات کا جواب پلٹ کر نہیں دیا، یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ قوم میں اختلاف اور نزاع بڑھنے نہ پائے اور میل کا بیل نہ بن جائے۔

جس وقت سرسید نے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم جاری کرنے کا ارادہ کیا اس وقت مذہب ہی نے اُنکو اس یقین پر قائم رکھا کہ جو صدرِ یورپ میں عیسائی مذہب کو تعلیم سے پہنچا ہے وہ اسلام کو ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ اور جب کہ انگریزی تعلیم انہیں جاری ہو گئی اور اُسکو روز بروز ترقی ہونے لگی اس وقت بھی مذہب ہی نے اُنکو یہ سوچھایا کہ جب تک سائنس و اصولِ سلامہ میں تطبیق نہ کی جائے تب تک اُن کو رے اور سادہ لوح طالب علموں کی طرف سے اطمینان نہیں ہو سکتا جو مذہبی تعلیم سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور اس لیے اُنکے دل میں مذہب کی طرف سے سو ظن پیدا ہوتا بالکل قرین قیاس ہے۔ مذہب ہی نے اُنکو ڈرایا کہ اگر تعلیم سے اسلام کو کچھ صدرِ یورپ پہنچا تو اسکا مظلمہ خاص کر اُس شخص پر ہوگا جس نے قوم میں تعلیم جاری کی۔ چنانچہ اس عظیم الشان کام کو بھی انھوں نے

بغلاف اسکے مدرسہ کی امداد میں وہ اپنی طاقت اور استطاعت سے ہر اتب بڑھ کر خرچ کرتے رہتے تھے۔
 صدر سے پہلے جب کہ وہ بخور میں صدر امین تھے انھوں نے کئی مسجدوں کی تعمیر اور مرمت کرائی، اپنے
 پاس سے بھی روپیہ صرف کیا، اور اپنے دوستوں اور عزیزوں سے بھی لیکر لگایا، مگر صدر کے بعد جب
 سہارنپور کی جامع مسجد کے لیے اُسے چندہ طلب کیا گیا تو انھوں نے چندہ دینے سے صاف انکار کیا
 اور لکھ بھیجا کہ ”میں خدا کے زندہ گھروں کی تعمیر کی فکر میں ہوں اور آپ لوگوں کو اینٹ مٹی کے گھر کی تعمیر کا خیال
 ہے“ ان باتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ سرسید کی کل مذہب کے ہاتھ میں تھی مذہب جہان چاہتا تھا
 اُسے خرچ کر آتا تھا اور جہان چاہتا تھا اُنکا ہاتھ روک دیتا تھا کیونکہ مذہب کے سوا کوئی ایسا زبردست
 حاکم نہیں ہے جو انسان کی طبیعت کے اقتضا پر غالب آجائے اور ایک ہی شخص کو ہمیشہ کے لیے
 ایک جگہ غایت درجہ کا فیاض اور دوسری جگہ حد سے زیادہ مسک ورتنگدل بنادے، جیسا کہ
 بعض صحابہ کا حال تھا کہ کہیں اُنکی داد و دہش کے آگے حاتم کی فیاضی ہیچ معلوم ہوتی تھی اور
 کہیں اُنکی کفایت شعاری اور جُزسی پر حد سے زیادہ تعجب ہوتا تھا۔

سالہ مارچ ۱۸۵۷ء میں جب کہ سر شہر محمد خان بہادر رئیس پالن پور کالج کے ملاحظہ کو علیگڑھ میں آئے اور ٹرسٹیوں کی طرف سے سرسید
 نے اُنکو ایڈریس دیا۔ اُسوقت کالج کی خیر خواہی کے جوش میں سرسید نے ایک ایسا کام کیا جسکو سنکر ہر شخص تعجب کر گیا رئیس
 مدوح، جتنے وقت پچاس روپیہ سرسید پتے سید مسعود کو اور پچاس محمد بشیر کو جو نواب محسن الملک کا عزیز ہے اور پچاس روپے دونوں ملاحوں
 کے ملازموں کو علاوہ پانچ سو روپیہ چندہ کالج کے دیے تھے۔ وہ نوجوان تو خوشی سے کہیا کہ ہم دونوں کے سو روپیہ کالج کی مسجد کی تعمیر میں
 صرف کیے جائیں مگر سرسید نے نوکروں کا روپیہ بھی لینا چاہا نواب محسن الملک نے تو اپنے نوکروں کے انعام کو اُسے لینا ہرگز پسند
 نہ کیا اور پچاس روپے انھیں کو دے دیے مگر سرسید نے حجت شرعی تمام کرنے کو نوکروں سے کہا کہ اگر تمکو ہماری نوکری منظور ہے تو انعام لے لے
 نے لکھ دیا ہے وہ کالج میں دیو در نہ ابھی اپنا حساب کر لو۔ وہ بچا ہے نوکری کیونکر چھوڑ سکتے تھے انھوں نے مجبور پچاس روپے سرسید
 کو دے دیے اور سرسید نے بے تکلف اُسے روپیہ لیکر کالج میں جمع کر لیا ۱۲

خراش نہ ہوا، با اینہم وہ اپنی قومی خدمات میں برابر مصروف رہے اور ایک ات اور ایک دن سے زیادہ جو کہ دلی کی آمد و رفت میں صرف ہوا انھوں نے باوجود ایسے سخت صدمہ کے کوئی قومی کام ملتوی نہ کیا اور ایسے مواقع کو تا بمقدور کبھی پاس نہیں آنے دیا جن سے بیٹے کا داغ تازہ ہو اور قومی خدمات میں حرج واقع ہو۔ دلی میں انھیں خیالات سے وہ جنازہ کے ساتھ نہ گئے اور دفن کرنے میں شریک نہیں ہوئے۔ لوگوں کو سخت تعجب ہوا اور بعضوں نے بڑے بڑے اعتراض کیے اور حق یہ ہے کہ اُنکے اعتراض بالکل بجائے کیونکہ ”من جمل شیئ العداۃ“ الغرض یہ سب باتیں شہادت دیتی ہیں کہ اُنکے تمام کاموں کی محرک کوئی ایسی روحانی امنگ تھی جس پر دنیا کے معمولی ظہان غالب نہیں آسکتے تھے اور جس قدر جسمانی امنگیں کم ہوتی جاتی تھیں وہ امنگ بڑھتی جاتی تھی۔

اس مقام پر یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ سرسید کی فطرت میں جیسا کہ اُنکے حالات اور اُنکے کاموں سے معلوم ہوتا ہے۔ غایت درجہ کی فراخوصلگی اور کشادہ دلی تھی یہاں تک کہ بعض شخصیات غلطی سے اُنکو حد سے زیادہ مسرت اور فضول خرچ خیال کرتے تھے جو لوگ اُنکے حالات سے واقف ہیں اُنکو معلوم ہے کہ جب تک مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کا خیال اُنکے دل میں پیدا نہیں ہوا تھا وہ ہمیشہ اپنی بساط سے بہت بڑھکر غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ سلوک کرتے تھے اگرچہ اُنکی آمدنی میں سے ایک جتنے پس انداز نہ ہوتا تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے اُنکو تعلیم پہنچا (مسلمانوں کا خیال ہوا انھوں نے اس قسم کے شخصی سلوک اور احسان بالکل بند کر دیے جو کچھ اُنکے ضروری اخراجات سے بچاؤ انھوں نے مدرسہ کے سوا اور کبھی نہ صرف نہیں کیا سائل اُنکے دروازہ سے ہمیشہ ناکام پھرتے تھے، تعلیم کے سوا کسی اور فاقہ عام کے چندہ میں بھی وہ شریک نہیں ہوتے تھے

سرسید کی ملکی خدمات اور اُنکے نتائج

اس عنوان کے تحت میں ہم سرسید کی سرکاری، ملکی اور قومی، تینوں قسم کی خدمات کا ذکر کریں گے؛ مگر پیشانی پر ہم نے ان تمام خدمات کو ملکی خدمات کی لفظ سے تعبیر کیا ہے؛ کیونکہ سرسید کو گورنمنٹ کی خیر خواہی اور حسن خدمت کی بدولت ملک اور قوم کی بھلائی کرنے میں بے انتہاء دہنچی ہے؛ اور اس لیے ہم ایسی سرکاری خدمات کو بھی ملکی خدمات میں شمار کرتے ہیں۔ اسی طرح ملک کے کسی فرقہ کو جو زمانہ کے انقلاب سے لپٹ ہو گیا ہو۔ ابھارنا اور اُسکے ہم وطنوں میں اسکا اعزاز اور سرفراز کر کے ان کو شش کرنا، درحقیقت ملک کے ایک ایسے عضوِ مؤثر کی صلاح کرنا ہے جسکے سبب اُسکے تمام صحیح اعضا معرض خطر میں ہوں۔

سب سے پہلے ہم سرسید کی سرکاری خدمات پر۔ جو انکی تمام ترقیات کی پہلی سیر تھی اور اُنکے تمام کارناموں کا ایک زبردست آئینہ ہیں۔ نظر ڈالتے ہیں؛ اور اپنی قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو۔ جو گورنمنٹ سروس کے ذریعہ سے اعزاز حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ نصیحت کرتے ہیں، کہ اُنکو سرسید کی راستبازی، دیانت، وفاداری اور شریفانہ۔ نہ غلامانہ۔ اطاعت۔ جس پر وہ ملازمت کے زمانہ میں اور اُسکے بعد ہمیشہ کاربند رہے۔ سبق لینا چاہیے؛ کیونکہ حسن خدمت کی کوئی مثال اور کوئی نمونہ اُنکو اس سے بہتر دستیاب نہیں ہو سکتا۔

جس زمانہ میں سرسید نے انگریزی نوکری اختیار کی اُسوقت مسلمانوں کو انگریزوں کے اخلاق، عادات، طرز معاشرت اور انگلش گورنمنٹ کی طرز حکومت سے بہت ہی کم واقفیت تھی؛

سرکاری خدمات

سرکاری ملازمت کا انتخاب

گرچہ ایمین شک نہیں کہ سرسید نے جتنے بڑے بڑے کام کیے وہ عقل سلیم اور اے صاحب کی ہمت سے کیے اور ایسے کہا جاسکتا ہے کہ ان کے تمام کارہائے نمایاں ان کی دانشمندی اور اے صاحب کے نتیجے تھے مذہب کے۔ لیکن اول تو جو شخص مذہب و عقل کو لازم و ملزوم جانتا ہو اس کے کسی کام کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عقل کا نتیجہ تھا نہ مذہب کا دوسرے عقل کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ راہ راست بتا دیتی ہے مگر اس راہ پر چلنا اور ثابت قدم رہنا اور نہایت استقلال کے ساتھ اس کی تمام منزلیں طے کرنا جب تک کہ مذہب کا سہارا نہ ہو غیر ممکن ہے۔

اس بحث کو جو سمجھنے اس قدر طول دیا ہے اس سے شاید لوگوں کو یہ خیال ہو کہ ہم سرسید کے مخالفین کو ان کے مسلمان یا پابند مذہب ہونے کا یقین دلانا چاہتے ہیں مگر فی الواقع ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کیونکہ جس مذہب کو سرسید مذہب سمجھتے تھے اور جس اسلام کو وہ اسلام جانتے تھے مخالفین کے نزدیک نہ وہ مذہب تھا اور نہ وہ اسلام اسلام۔ بلکہ ہمارا مقصد اس طولانی بحث سے صرف اس بات کا ظاہر کرنا ہے کہ ایشیائی ممالک میں جہان وطنیت اور قومیت کا خیال بالکل نہیں ہے جو شخص مذہب کا پابند نہ وہ ہرگز ملک یا قوم کی بھلائی کا کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ پس ہماری قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جو قومی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک وہ اسلام پر ثابت قدم نہ رہیں ممکن نہیں کہ قوم کی بھلائی کا کوئی بڑا کام کر سکیں۔ یورپ اور امریکا بن اب تک جس قدر ترقیات اور اصلاحات ظہور میں آئی ہیں ان کے بانی مبنی تقریباً تمام وہی لوگ بنائے جو مذہب کے سخت پابند تھے؛ لوٹھر، کالون، بیکن، ملٹن، نیوٹن، گلیس، بنجمن فرینکلن، جارج سیٹھن، واشنگٹن، ہمپڈن، میٹنی وغیرہ وغیرہ سب مذہب کے نہایت پابند تھے۔

اسکے بعد انھوں نے اپنے تمام زمانہ ملازمت میں اس قاعدہ کو ہمیشہ نصب العین رکھا کہ جو کام سرکار کی طرف سے اُنکو تفویض ہوا اس کے متعلق کافی واقفیت ہم پہنچائی اور اُس کے فرائض بڑے پیکار و دیون کی طرح سر انجام کیے۔ یہاں تک کہ سروس کا زمانہ ختم ہونے کے بعد بھی جتنے کام گورنمنٹ نے اُن سے لینے چاہے اُنکو کمال جانفشانی اور محنت سے اور نہایت بصیرت اور اطلاع کے ساتھ انجام یا۔ لیجس لیٹو کو نسل کی ممبری انھوں نے ایسی لیاقت کے ساتھ کی کہ اُن سے پہلے کسی ہندوستانی ممبر نے نہیں کی تھی۔ اُن سے پہلے ظاہر کسی نیٹو ممبر نے کوئی مسودہ قانون پیش نہیں کیا تھا۔ انھوں نے تین مفید قانون بنائے جنہیں سے صرف دو پیش ہوئے اور دو نو پاس ہو گئے۔ کونسل کے اکثر مباحثوں میں باوجود انگریزی نہ جاننے کے نہایت سنجیدہ اور لیگال سپیچین کین اور محض اپنی اعلیٰ لیاقت کے سبب و سیراؤن کے عہد میں دوبار منتخب ہوئے اُنکی ایک سیج کی نسبت جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے خود لارڈ لٹن نے اپنی زبان سے کہا کہ میں نے ایسی قابلانہا سیج کبھی نہیں سنی۔ اسی طرح ایجوکیشنل کمیشن میں جیسی مبسوط اور مفصل شہادت انھوں نے دی اور جو روشنی تعلیمی معاملات پر اُنکی شہادت نے ڈالی اُس سے زیادہ کسی کی شہادت میں نہیں سنی گئی۔ غرض کہ انھوں نے سرکاری کام کو کبھی بیگاریوں کی طرح نہیں کیا بلکہ ہر ایک خدمت کے فرائض نہایت ہی اور جانفشانی سے ادا کیے۔ اسی سبب اُنکے افسر ہمیشہ اُنکے مداح اور شکر گزار رہے۔

جہاں تک ہم کو معلوم ہے انھوں نے کبھی اپنی ترقی یا کسی خدمت کے صلہ کی صراحت یا کثایت اپنا افسرین سے درخواست نہیں کی؛ بلکہ ہمیشہ اپنی کارگزاری اور حسن خدمت سے اُنکے دل میں جگہ کی اور خود اپنے کاموں کو اپنا سفارشی بنایا۔ ستم میں جب کہ سرسید کو بقیہ مقام علی گڑھ

اور ولی اور اُس کے نواح کے مسلمان عموماً انگریزی نوکری اور انگریزی تعلیم سے متنفر تھے۔ خطبہ جو خاندان قلعہ دہلی سے کچھ تعلق رکھتے تھے انکو انگریزی نوکری کا کبھی خواب بھی نظر نہ آتا ہوگا۔ چنانچہ سرسید نے جب سرکاری ملازمت کی خواہش ظاہر کی تو اُن کے تمام عزیز اور رشتہ دار اس ارادہ سے مانع آئے مگر چونکہ اُن کے نانا دبیر الدولہ نے بعض سرکاری خدمات انجام دی تھیں اور اُن کے خالو خلیل اللہ خان اس وقت ایک ممتاز انگریزی خدمت پر مامور تھے اس لیے انھوں نے قلعہ دہلی کے تبرک پر قناعت نہ کی بلکہ انگریزی نوکری اختیار کر لی۔

سرسید نے ابتدائے ملازمت ہی میں یہ نکتہ بخوبی ذہن نشین کر لیا تھا کہ کسی کام کے ملنے سے پہلے اُس کام کی لیاقت اور اُس کے فرائض کی اطلاع حاصل کرنی ضرور ہے۔ چنانچہ ۱۸۳۷ء میں جب مسٹر رابرٹ ہملٹن نے اُنکو عدالت کشن کا سرشستہ دار مقرر کرنا چاہا تو انھوں نے اُس کے قبول کرنے سے انکار کیا اور صاف کہہ دیا کہ جس کام کی میں اپنے میں لیاقت نہیں پاتا اُس کو کیونکر قبول اور اُس کے فرائض ادا کر سکتا ہوں؟ جب وہ آگرہ کی کشنری میں نائب منشی کے عہدہ پر مقرر ہو گئے تو انھوں نے بہت جلد قوانین مالی سے واقفیت حاصل کر لی اور ترتیب دفتر کا ایک دستور العمل بنایا جس کے مطابق تمام دفتر کشنری آگرہ کا مرتب کیا گیا۔ پھر عدالت منصفی کے احکامات قوانین کا ایک خلاصہ تیار کیا جسکو صدر کشن آگرہ نے گورنمنٹ میں پیش کر کے اُن کے لیے عہدہ منصفی کی سفارش کی۔

اسے چونکہ سرشستہ دار عدالت کشن کے قبول کرنے سے سرسید اس خوف سے انکار کیا تھا کہ مبادا اُس کے فرائض ادا نہ ہو سکیں اس لیے مسٹر رابرٹ ہملٹن نے جو سفارش کی چٹھی مسٹر لنڈزی کے نام لکھ کر سرسید کو آگرہ بھیجا تھا اُس میں اُنکو عالی خاندان اور ہوشیار پور نیلے علاقہ ڈیرہ بکھی لکھا تھا۔ اس چٹھی کو کوئی گریم سرسید کی لائف میں قتل کر کے لکھتے ہیں کہ سرسید میں اب کوئی علامت ڈیرہ بکھی ہونے کی نہیں ہے اسے بعد وہ عارف جنگ کے معنی ماسرور ہار لکھ کر کہتے ہیں کہ ہر کے موت پر سید احمد نے اس خطاب کا کافی ثبوت دیا ہے ۱۱

کام میں
لاشون

سالانہ رپورٹ میں انکی نسبت لکھا تھا کہ ”شہر اور ضلع بنارس کو سید احمد خان ایک ایسا شخص ملے جیسو نہایت
اعتماد رکھتے ہیں اور جسکو فریب یا دھوکا نہیں دے سکتے۔“

غدر سے پہلے جو اکثر یوروپین افسران نے سرسید کی نسبت اپنی چٹھیا میں رائے ظاہر کی ہے
اس میں زیادہ تر انکے علو خاندان لیاقت اور دیانت داری کا ذکر کیا ہے کیونکہ اس سے زیادہ
وہ ہندوستانیوں کے کیر کڑے اسی وقت بخوبی واقف ہو سکتے ہیں جب کوئی امتحان کا موقع
پیش آئے۔ یہاں ہم صرف ٹامس مٹکاف صاحب ریزیڈنٹ و کمشنر دہلی کی چٹھی مورخہ ۱۲ جولائی
۱۸۵۳ء کا ترجمہ نقل کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ”سید احمد خان معزز خاندان کے ممبر ہیں اور زبان بیلر لہو
خواجہ فرید خان مرحوم کے۔ جو شاہنشاہ اکبر شاہ مرحوم کے وزیر اعظم تھے۔ نواسے ہیں۔ اور میں اپنے ذاتی تجربہ سے اس
بات کی شہادت دیتا ہوں کہ ایمان داری اور لیاقت میں بہت اعلیٰ درجہ کا کیر کڑ رکھتے ہیں۔“

اس باب میں سرسید کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ انکی سروس ختم ہونے پر باوجودیکہ گورنمنٹ بہت خوشی
سے انکو کچا کھانے کی مہلت دینی چاہتی تھی مگر انھوں نے زیادہ مہلت یعنی مناسبت سمجھی کیونکہ درسیۃ العلوم
قائم ہوئے تا جسکے لیے چندہ جمع کرنے کی از بس ضرورت تھی اور وہ عام طور پر چندہ وصول کرنا ملاوٹ
کی حالت میں خلاف احتیاط سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب تک انھوں نے پنشن نہیں لی بنارس میں اپنے
دوستوں کے سوا کسی سے چندہ طلب نہیں کیا۔

اگرچہ سرسید نے اُس دربار کے سایہ میں پرورش پائی تھی جو ایک قدیم ڈسپانٹک گورنمنٹ کی
یاد تھا۔ جہاں آزادی کے پر جلتے تھے اور خوشامد کا بازار گرم تھا۔ نیز اُس وقت شمالی ہندوستان
میں انگریزی عملداری کا ابتدائی زمانہ تھا اور اسلیئے برٹش گورنمنٹ میں بھی اُس وقت تک ایشیائی

کے سی اس آئی کا خطاب دیا گیا اُس وقت صاحب کلکٹر علی گڑھ سرکینڈی نے سرسید کی تعریف میں جو لمبی تقریر کی تھی اُس میں یہ بھی کہا تھا کہ ”یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے واسطے کبھی کچھ نہیں چاہا بلکہ ہر چیز اپنے ملک کے واسطے چاہی“ پروفیسر آرمیلڈ ایم اے جو دس برس علی گڑھ کالج میں سرسید کے پاس رہے انھوں نے لاہور کے ماتمی جلسہ میں جو سرسید کی وفات پر ایچ دی تھی اُس میں یہ بھی کہا تھا کہ ”گورنمنٹ کی طرف سے جو اعزاز یا خطاب انکو ملا وہ ہمیشہ بے طلب ملا اور میں آج تک کسی ایسے شخص سے نہیں ملا جو اُن سے زیادہ شرفانہ زندگی بسر کرنے والا اور اُن سے زیادہ بے لاگ اور بے غرض ہو“

دیانت داری کی صفت اُنکی تمام پہلک سروس میں ایسی نمایاں رہی ہے جیسے آفتاب میں روشنی۔ صہیب رومی کی نسبت آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ ”نَعْمَ الْعَبْدُ صَہِیْبٌ كَوْكَبٌ يَخْفَعُ اللّٰهُ كَوْنَهُ“ (یعنی صہیب اسانیک بندہ ہے کہ اگر وہ خدا سے نہ ڈرتا تو بھی اُسکی نافرمانی نہ کرتا) یہی حال سرسید کے تدین کا تھا۔ وہ نہ کسی حاکم کے خوف سے اور نہ شرعی امتناع کی وجہ سے بلکہ محض اپنی طبیعت کے اقتضائے کوئی کام دیانت داری کے خلاف نہیں کر سکتے تھے۔ غدر سے پہلے اُنکا تدین بہت خوفناک صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔ اہل مقدمہ کو یہ جرات تو نہ ہوتی تھی کہ اُنکے سامنے کچھ نہ رانہ پیش کریں، یا ایسا پیغام بھیجیں البتہ کبھی کبھی ناواقف لوگ دوران مقدمہ میں اُنکے مکان پر صرف ملنے کے بہانے یا کوئی سوغات لیکر چلے جاتے تھے۔ سوغات کا قبول کرنا تو درکنار۔ ہنسنے سناہے کہ وہ سوغات لانے والے سے استقدر بدگمان ہو جاتے تھے کہ اُسکا اثر مقدمہ کے فیصلہ تک پہنچتا تھا۔ آخر اہل مقدمہ اُٹھنے سے خائفانہ میں اُن سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ جھوٹے مقدمے بنانے والے اور جھوٹی گواہیاں دینے والے اُنکے نام سے کانپتے تھے۔ نہ اُن سے اپنوں کو رعایت کی توقع تھی اور نہ غیروں کو۔ صاحب جج بنارس نے

اور برخلاف عام اشخاص کے اُنکے ساتھ خاص طور کا برتاؤ دیتے ہیں۔ جب صاحب بیج نے اس وقت
عذر سنا پھر کبھی انہیں ایسا بے جا دباؤ نہیں ڈالا۔

سنہ ۱۸۵۰ء میں جب کہ وہ پہلی بار مسٹر کرک کی جگہ صدر امین مقرر ہو کر رہتک گئے ہیں اس وقت
رہتک میں عجب کھل ملی پڑی ہوئی تھی۔ مسٹر گتھی قائم مقام مجسٹریٹ نے بے شمار مقدمے بلا حلالی
اور رشوت ستانی کے مسٹر کرک پر دائر کر رکھے تھے، مخبری کا بازار گرم تھا، جیل گتھی صاحب کے ہاں
کرک کے برخلاف مخبری کرتے تھے اُنسے سب لوگ دبتے تھے۔ خان بہادر غلام نبی خان مرحوم جو اس وقت
جہان نائب سرشید دار کلکٹری تھے اُنکا بیان ہے کہ ”سید صاحب نے وہاں جا کر کئی کام صاحب مجسٹریٹ
کی مرضی کے بالکل برخلاف کیے اور کبھی اُنکا دباؤ نہیں مانتا۔ ایک شخص بابر خان نامے قصبہ رہتک کا نہر دار۔ جسکو رقم
بھی جانتا ہے۔ گتھی صاحب کا بڑا مقرب تھا جس نے کرک کے برخلاف کو بہت مدد دی تھی۔ اُسے کسی دیوانی کے مقدمے
میں سید صاحب کے اجلاس میں جھوٹی گواہی دی۔ اُنھوں نے فوراً اُسکو ماخوذ کیا۔ ہر چند گتھی صاحب نے اُسکی رہائی
کے لیے سفارش کی مگر سید صاحب نے سفارش نہیں مانی اور اُسکو دورہ سپرد کر دیا جہاں سے اُسکو تین برس کی قید حکم ہوا۔“
پھر وہ پہلے کیٹی کے ایک مقدمے میں گتھی صاحب ایک ٹھیکہ دار کی جائداد بعلت مطالبہ کیٹی نیلام کرنی
چاہتے تھے اور تمام ہیران کیٹی سولے سید صاحب کے اُنسے متفق ہو گئے تھے۔ سر سید اس وقت کے بالائے کے مطابق
یہ سولے کی کیٹی بدولت حاصل کرنے ڈگری دیوانی کے اپنے اختیار سے ٹھیکہ دار کی جائداد کے نیلام کرنے کی مجاز نہیں تھا۔
جب سب نے اس ریلے سے اختلاف کیا تو اُنھوں نے اپنی ریلے آل نظر کر کے کیٹی میں پھیری۔ آخر گتھی صاحب
کو بعد اگراہ اُنھیں کی ریلے کے موافق عمل کرنا پڑا۔“

فشی صاحب ہی کا یہ بھی بیان ہے کہ ”جب سے گتھی صاحب نے مسٹر کرک کو تنگ دی تھی صدر امین کی

طرح حکومت کی تمام حاصبتین موجود تھیں : اہلکار خوشامد کو اہلکاری کا زیور سمجھتے تھے اور اسوجہ
 یوروپین حکام اور افسر ہندوستان میں اگر خوشامد پسند بن جاتے تھے ۔ باوجود اسکے سرسید کا
 برتاؤ اپنے افسرین کے ساتھ ابتدا سے اخیر تک نہایت آزادانہ رہا ۔ وہ اپنے افسرین کا ادب اور
 تعظیم اور کارسرخار میں انکی اطاعت جیسی کہ چاہیے ہمیشہ کرتے تھے مگر انکا بے جا دباؤ کبھی نہیں مانا
 اور بے موقع کبھی انکی ہان میں ہان نہیں ملائی ۔ غدر سے بہت پہلے ۔ جب کوئی مین جان پاٹن
 گبنس کشن جج اور سرسید منصف تھے ۔ قسمت دہلی کے دو جاگیردار بھائیوں میں ۔ جنہیں سے
 ایک سرسید کا گہرا دوست تھا ۔ جاگیر کی بابت سخت نزاع تھا اور انکا جھگڑا گورنمنٹ میں پیش تھا ۔
 دوسرے بھائی نے صاحب جج سے شکایت کی کہ میرے بھائی کو سید احمد خان بھگاتا اور ہر قسم کی مدد
 دیتا ہے ۔ اُسکو آپ سمجھا دیں کہ جب تک ہمارا جھگڑا عدالت سے طے نہ ہو جائے وہ میرے
 بھائی سے ملنا چھوڑ دے ۔ جان پاٹن گبنس کے طنطنے اور رعب و داب کی تمام قسمت میں
 دھاک تھی اور انکے کسی ماتحت کی یہ مجال نہ تھی کہ انکا کہنا نہ مانے ۔ انھوں نے بدے دوز سرسید
 کو بلا کر سمجھایا کہ جب تک یہ نزاع رفع نہ ہو تم اپنے دوست سے ملنا چھوڑ دو ۔ سرسید نے صاف
 کہہ دیا کہ میں بے شک آپکا ماتحت ہوں سرکاری معاملات میں جو کچھ آپ ہدایت کریں ۔ انکی
 بسر و چشم تعمیل کروں گا مگر میرے ذاتی تعلقات میں آپ کو دخل دینا نہیں چاہیے ۔ اگر آہن
 کہ تم چند روز کو اپنی مان یا بہن سے ملنا چھوڑ دو تو میں کیونکر آپ کے حکم کی تعمیل کر سکا ہوں
 اگرچہ انگریزوں میں ہندوستان کی آب و ہوا تحمل اور خوشامد پسندی پیدا کر دیتی ہے مگر یہ لمہ
 آزادی انکی گھٹی میں پڑی ہوئی ہوتی ہے وہ ایسے آزاد شخصوں کی آخر کار قدر کرنے لگتے ہیں

لکھا تھا۔ ٹرکی اور مسلمانوں کے تعلقات کی نسبت کہتے ہیں کہ ”اس ضمن میں سرسید کوئی مذہب اور مشتبہ آزار نہیں نکالی۔ اُس نے بھی اور مسلمانوں کی طرح سلطانِ ٹرکی کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی اور اُس کے منزل پر افسوس کیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ مصالحتِ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا جاتا ہے اور اُس کو یہ خوف تھا کہ عبادِ مسلمان بھی پوٹنگل بے وقعتی کی اس حالت تک پہنچ جائیں جو یورپ میں یہودیوں کی حالت ہے۔ اسی لیے ٹرکی کے ہر ایک صدر پر وہ ویسے ہی سچے دل سے رنج و الم کرتا تھا جیسا کہ ہر مسلمان کرتا ہے۔ لیکن اس ہمدردی کی بدولت جو اُس کو اپنے معزز ہم مذہبوں کے ساتھ تھی۔ وہ قیصرِ ہند کی وفاداری اور حسامندگی سب کو پیش نہیں کیا۔ اُس کے سوا سرسید نے اپنی تمام ملازمت کا زمانہ جس بے تعصبی اور کشادہ دلی سے بسر کیا وہ فی الحقیقت ہمارے ملک میں ایک ایسی مثال ہے جو نایاب نہیں تو کیا بضرور ہے۔ انھوں نے عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر ہر قوم اور ہر مذہب کے آدمی کو ہمیشہ ایک نگاہ سے دیکھا؛ اور کبھی ایک جج ہونے کی حیثیت سے اپنی قوم اور اپنے مذہب کے آدمی کو دوسری قوم اور دوسرے مذہب کے آدمی پر ترجیح نہیں دی۔ بلکہ ایسی ترجیح دینے کو ایک نہایت کمیتہ خصلت اور سنگ انسانیت تصور کیا۔ انکی بے عصبی کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ غدر کے موقع پر جیسا کہ پہلے حصہ میں مفصل بیان ہو چکا ہے۔ باوجودیکہ ضلع بجنور کے ہندو مسلمانوں میں کمالِ عداوت تھی۔ وہاں کے تمام ہندو تعلقہ داروں و دوسرے کمال خوشی اور آرزو کے ساتھ یہ درخواست کی کہ جب تک ضلع میں امن نہ ہو سید ا۔ غان اور ڈپٹی رحمت خان کو ضلع سپر دیکھا جائے، اور انھیں کو ضلع کا حاکم بنایا جائے۔ تاہم سرکشی بجنور میں سرسید نے جہاں ہندو چودھریوں کا حال لکھا ہے اُس سے انکی غایتِ درجہ کی بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے۔ باوجودیکہ ہندو چودھریوں اور ان کے ساتھیوں کی طرف مسلمانوں پر

کچھ وقت لوگوں کی نظر میں نہیں رہی تھی۔ خصوصاً ملازمانِ کچھری ضلع اُسکو لاشیٰ مضر سمجھنے لگے تھے۔ اتفاق یہ کہ ایک شخص۔ جسکا باپ صاحب ضلع کے ٹکڑے میں سرشتہ دار تھا۔ صدر امینی میں بزمہ مہران نوکر تھا؛ اور اس گھنڈ پر کہ میرا باپ صاحب مجسٹریٹ کی ناک کا بال ہے۔ اپنا کام نہایت بے پروائی سے کرتا تھا۔ سرسید نے اُسکو بخل غفلت و بے پروائی کے معطل کر دیا۔ ہر چیز ضلع والوں نے سفارش کے لیے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر انھوں نے کچھ التفات نہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ دیوانی کی تعطیل میں دلی چلے گئے؛ مگر تعطیل سے واپس آکر کسی کے کہنے سے نہیں بلکہ اُسکے باپ کے بڑے چاہے کا خیال کر کے اُسکو پھر بحال کر دیا۔

یہ واقعات اُس زمانہ کے ہیں جب کہ سرسید یورپ میں حکام کی نظر میں ایک ہندوستانی عہدہ دار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے؛ اور جو وقعت اور اعتبار انکو ایامِ قدر کی خدمات کے بعد انگلش حکام اور خود انگلش گورنمنٹ میں حاصل ہوا اُسکا عشرِ عشر بھی اسوقت حاصل نہ تھا۔ مگر اُس حالت میں بھی انھوں نے اپنی آن کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا؛ اور اپنے فرائض منصبی نہایت آزادی اور دلیری سے ادا کرتے رہے۔ منشی غلام نبی خان مرحوم کہتے تھے کہ ”موسیٰ صاحب جو مسٹر کرک کے مقدمات کی تحقیقات کے لیے اڈنٹل کسٹر ہو کر رہتے گئے تھے جب سرسید ان سے ملے تو وہ انکی ملاقات سے نہایت خوش ہوئے؛ اور انکی غیبت میں لوگوں سے کہا کہ بھنے ہندوستانی افسر میں ایسا صاف اور آزاد طبع نہ کوئی افسر نہیں دیکھا۔ اسی وجہ سے سرسید کا منی صاحب استقدر ربط بڑھ گیا تھا کہ آٹا لٹھنا دید کا انگریزی ترجمہ۔ جو مسٹر بارٹس جنٹ مجسٹریٹ دہلی نے ناتمام چھوڑ دیا تھا۔ اُسکے پورا کرنے کا وعدہ انھوں نے سرسید سے کیا۔ چنانچہ جب صاحب موصوف مراد آباد میں حج ہو کر گئے تو بہت سا ترجمہ انھوں نے کرایا۔“

تھیوڈور مارسلین اُس آرٹیکل میں۔ جو انھوں نے سرسید کی وفات کے بعد اُنکے پوٹریل ورکس پر

تھیں کہ بے ایک سکارپٹ کے واسطے "سید احمد خان سکارپٹ" کے نام سے مفرد کی تھی جو اب تک جاری ہے۔

استقامت قحط مراد آباد کا محض حال ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں اسی کے ضمن میں وہ واقعہ چورچوئیچکیشن میں اس صاحب نے مجھے خود بیان کیا تھا اور جس سے انکو سرسید کی بے تعصبی کا یقین ہوا تھا ملاحظہ کے قابل ہے کہ رسالہ "لائل محمداوت انڈیا" کو دیکھ کر انھوں نے سرسید کو ایک سخت متعصب مسلمان خیال کیا تھا مگر مراد آباد کے محتاج خانہ میں ہر مذہب اور ہر ملت کے آدمی نے کنگلون کی خدمت گزاری میں انکو دیوانہ وار سرگرم دیکھ کر وہ حیران اور انکی بے تعصبی کے دل سے قائل ہو گئے۔

غدر کے زمانہ میں جس خلوص اور سچائی کے ساتھ گورنمنٹ کی وفاداری خیر خواہی اور یورپین مردوں عورتوں اور بچوں کی جان کی حفاظت افسے بن آئی اسکو ہم مفصل پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں یہاں صرف سر جان اسٹریچی کے چند الفاظ نقل کیے جاتے ہیں جو انھوں نے ۱۸۵۷ء میں ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت محمدن کلج کیٹی کے ایڈریس کے جواب میں سرسید کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہے تھے انھوں نے کہا کہ "کسی شخص نے اس سے زیادہ شریفانہ طور پر دلی اور وفاداری کا ثبوت برٹش گورنمنٹ کے ساتھ نہیں دیا جیسا کہ شہہ میں انھوں نے (یعنی سید احمد خان نے) دیا۔" کوئی لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کر سکتا جس کی جہن شادی کا کافی طور پر اظہار ہو "اسی اسپیچ میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ "شمال مغربی ضلع میں افسے زیادہ کوئی روشن ضمیر جج نہیں ہوا" اور مسٹر شکسپیر نے اپنی رپورٹ میں اقرار کیا تھا کہ "اگر صدر امین (یعنی سید احمد خان) زیچ میں لاٹھ نہ ہوتا تو جاری پابن

سخت ظلم اور زیادتیان ہوئی تھیں۔ اس پر بھی چونکہ وہ فی الواقع بغاوت کے الزام سے پاک تھے اس لیے انکو اس الزام سے بالکل بری کیا ہے۔ اس واقعہ کے بیان کرنے میں مذہبی یا قومی تعصبات کو جو اس وقت تمام ملک میں وبا کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ مطلق کام نہیں فرمایا۔

جب سرسید ملازمت سے کنارہ کش ہو کر بنارس سے روانہ ہونے کو تھے تو وہاں کے ہندو اور مسلمان رؤسائے بشمول پوروہین حکام کے انکو ایک داعی ایڈریس دیا تھا۔ جس میں انکی سرکاری ملک، اور قومی خدمات کے علاوہ خاص کر انکے بے لاگ نصاوت اور بے تعصبانہ فیصلوں کی نہایت تعریف تھی۔ سرسید نے اس کے جواب میں کہا کہ وہ اگر میں نے قانون کی تعمیل نصاوت کے ساتھ بلا لحاظ کسی کے رتبہ اور قوم اور رنگ یا مذہب کی تو اس کے لحاظ سے میں کسی شکریہ کا مستحق نہیں ہوں۔ مجھکو تمام عمر اس بات کی فکر رہی ہے کہ جو بڑا فرض مجھکو تفویض ہوا ہے اسکو ایمانداری کے ساتھ انجام دوں۔ میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو ہمیشہ خوب سمجھتا رہا ہوں؛ اور دنیا کی دولت اور عزت پر سچ بات کو اور خدا تعالیٰ کی خوشنودی کو انسان کی قدردانی اور تعریف پر ہمیشہ ترجیح دیتا رہا ہوں۔ میں ہمیشہ اپنے تئیں خدا تعالیٰ کا جواب دہ سمجھا ہے؛ نہ کہ انسان کا۔ گو میں نے اپنی رائے میں غلطی کی ہو۔ مگر ہمیشہ اپنے ایمان کی ہدایت پر عمل کیا ہے۔ باوجود اس کے مجھکو وہ بات کے دیکھنے سے کچھ کم خوشی حاصل نہیں ہوئی کہ جو کوششیں میں نے سب لوگوں کے حق میں انصاف کرنا شروع کیں انکی قدر شناسی میرے ہر وطنوں نے کی ہے۔“

انہیں دونوں میں جبکہ سرسید بنارس کی رخصت ہونے والے تھے شہر کے ہندو اور مسلمان شرفائے انکی یادگار قائم کرنے کے لیے ایک کمیٹی منعقد کی تھی جسکے پریسیدنٹ راجہ شیمبھو نرائن سنگھ بہادر تھے۔ اس کمیٹی میں راجہ صاحب موصوف نے سرسید کی یادگار کے طور پر بنارس میں کلچر میں طبیعیات کی

اور نیز انکی اس روشن 'مذہب اور بی غرضانہ محنت کی نسبت بھی جو انھوں نے اپنی پرائیوٹ لائف میں اپنے
ہموطنوں کے فائدہ کے واسطے کی ہے۔"

پچھتی

اس موقع پر ہائی کورٹ نے چاہا تھا کہ سرسید کی خدمات کی نسبت ایک خاص شکریہ گورنمنٹ گزٹ
میں مشترک کرایا جائے۔ مگر چونکہ یہ ایک غیر معمولی طریقہ تھا اسلئے عمل میں نہیں آنے پایا۔ لیکن
پایونیر نے غالباً رجسٹرار ہائی کورٹ کے اشارہ سے اس شکریہ کے الفاظ چھاپ کر مشترک کر دیے تھے
کتاب "پلرزاؤن دی انڈین اسپائر" جس میں سرسید کو ارکان سلطنت ہندوستان میں
ایک کن شمار کیا گیا ہے۔ انکی ممبری کونسل کے زمانہ کی طرف اشارہ کر کے یہ لکھا ہے کہ "ان طریقوں میں
جو لارڈ لٹن نے ہندوستانیوں کو حوت اور ذمہ داری کے منصب پر ترقی دینے کے لیے اختیار کیے تھے کوئی طریقہ ایسا
استحقاق کے اس قدر ہر دل عزیز نہیں ہوا جیسا کہ شایستہ مسلمانوں کے اس واجب التعظیم لیڈر (یعنی سید احمد خان)
کا جس لیڈر کونسل میں مقرر کرنا ہوا ہے۔ اس اعزاز کو ہندو اور مسلمانوں نے مساوی طور پر سید احمد خان کی
دیانت داری، بے غرضانہ اور شریفانہ برتاؤ اور انکی قابلیتوں کا صلہ تسلیم کیا ہے۔"

پچھتی

مسٹر ایچ جی کین ممبر پارلیمنٹ نے اخبار "ہوم ورڈ میل" میں سرسید کی نسبت اپنی یہ ای
ظاہر کرنی کہ "سید احمد خان۔ جس میں نے ہندوستان میں۔ جب کہ وہ ہمیں لیڈر کونسل کا ممبر تھا۔ واقفیت حاصل
کی تھی۔ ایک اسرار تمام شخص ہے جسکو ہندوستان کا ایک انگلش منتظم اپنے ساتھ رکھنے کی خاص شکر اور خطرہ کے
وقت خواہش کر گیا۔ وہ ایک خاندانی، تعلیم یافتہ، لائق، وفادار اور پوری اچھل مستقل طبیعت کا
آدمی ہے۔ وہ تاج برطانیہ کا ایک خیر خواہ اور دوست سمجھا جاتا ہے؛ مگر بایں ہندو انگریزی گورنمنٹ کے نقصوں
سے بھی بخوبی واقف ہے۔"

نواب محمد خان کی شکار ہو جاتیں۔“ اسی رپورٹ میں انھوں نے سر سید کی دانشمندی، بے مثال مائنداری اور سرگرمی پر شہادت دی تھی۔

بنارس کے سول ججسٹریل ایڈمنسٹریٹیشن رپورٹ میں صاحب جج بندرچ آئی کی نسبت لکھا تھا کہ ”شہر اور ضلع بنارس کو سید احمد خان ایک ایسا شخص ملا ہے جس پر وہ نہایت اعتماد رکھتے ہیں اور جب کو فریب یاد ہو گا نہیں دے سکتے۔ وہ اپنے فرائض کے ادا کرنے میں نہایت باقاعدہ اور ان کی طرف متوجہ رہنے والا ہے اور اس کے فیصلے نہایت احتیاط اور غور سے کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ مقدمہ کے ہر ایک پہلو اور ہر ایک جانب پر اس طرح غور کرتا ہے کہ عدالت اپیل کے فیصلہ کے واسطے کچھ باقی نہیں رہتا۔ اُن کے اس بہت بڑے تجربے سے جو ہر قسم کے جوڈیشل امور میں اُن کو حاصل ہے۔ میں نے خود بہت فائدہ اٹھایا ہے۔“

ہائی کورٹ کے ججوں نے سر سید کی درخواست نمٹیشن گورنمنٹ میں بھیجے وقت حسب ذیل رپورٹ کی تھی ”سید احمد خان کے اوصاف اور قابلیت بحیثیت ایک پبلک سروسٹ کے ہزاروں پر بخوبی روشن ہیں۔ مگر یہ عدالت بوجہ بالادست عدالت ہونے کے۔ جس کے سید احمد خان ماتحت ہے ہیں۔ اُن کی ذہانت، محنت، قابلیت اور ہوشیاری کی بلند اور بے دریغ شہرت کو۔ جو انھوں نے اپنے طویل و طویل زمانہ ملازمت میں تمام جماعتوں کے درمیان حاصل کی ہے بطور شہادت کے درج کر دینا چاہتی ہے؛ اور نیز اُس نقصان پر افسوس ظاہر کرنا چاہتی ہے جو پبلک سروس کو۔ جو انھوں نے اس قدر عزت اور شرافت کے ساتھ انجام دی ہے۔ اُن کی کندہ کشی سے پہنچا۔“

نواب لفٹنٹ گورنر کی طرف سے جو اس رپورٹ کا جواب موصول ہوا وہ یہ ”سید احمد خان کا استعفا منظور کرنے میں ہزاروں لفٹنٹ گورنر نے محکومیت کی ہے کہ اُن کی جانب سے میں اُن کی ہائی ایجنسین سید احمد خان کی اُس قابلیت اور ہوشیاری کی نسبت ظاہر کر دوں جو پبلک سروس میں اُن کے امتیاز کا باعث بنی ہے؛

سید احمد علی شاہ

اسی آب کی نسبت ۱۸۸۶ء میں سرکلنڈ کا لون لٹنٹ گورنر نے ریشیان محمد علی کی ایڈریس کے جواب میں یہ الفاظ کہے تھے کہ ”جو واقعات سب سے پہلے مجھ کو۔ اُس وقت پیش آئے جب کہ میں اول مرتبہ ہندوستان میں آیا تھا۔ مجھ کو اُنکے ایک یہ بات تھی کہ میرے دوست سرسید احمد خان نے ایک ایسے معاملہ میں مجھے اعانت کی خواہش کی جو اُس وقت اُنھوں نے شروع کیا تھا، اور جسکی طرف اُنکی دلی توجہ مائل تھی۔ اُنھوں نے مجھے یہ فرمائش کی تھی کہ میں اُنکو ہندوستانی زبان سے انگریزی زبان میں اُس سال کا ترجمہ کرنے میں مدد دوں جو اُنھوں نے اُن افسوسناک واقعات کے اسباب کی نسبت تحریر کیا تھا جو شہر میں ظہور میں آئے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ میں سے اکثر صاحبوں نے اُس رسالہ کو دیکھا ہوگا۔ اُنھوں نے مجھے اس امداد کی درخواست کر کے مجھ پر ایک ایسا احسان کیا جو ہندوستان میں میرے دُورِ ملازمت کے خاتمہ تک قائم رہیگا۔ کیونکہ اُنھوں نے اُس سال میں خاصکر بعض ایسے خیالات پر زور دیا تھا جنکی پوری قوت کو میں اُسکے بعد اپنے تحریر کی رو سے بخوبی سمجھ سکتا ہوں۔ سرسید احمد نے اُس میں اشارہ کیا تھا کہ جو بات انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کے خیالات اور حقائق کو بخوبی سمجھیں۔ اُنھوں نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ زیادہ تر اُن واقعات کی بنیاد جن پر وہ بحث کر رہے تھے۔ بجائے ناراضی کے غلط فہمی تھی۔ پس اگر انگریز اور ہندوستانی ایک دوسرے کے خیالات کے سمجھنے میں ثابت قدمی کے ساتھ کوشش کریں گے تو اُنکے باہمی تعلقات بہت زیادہ مربوط و محکم ہونگے۔ اُسکے اُنھوں نے کہا کہ ”انھیں خیالات سے ہمارے ہندوستان کے استقامی مسائل حل ہونگے اور انھیں خیالات کی دوسری صورت علی گڑھ کا لچ ہے“

سید احمد علی شاہ

مسٹر تھیوڈور مارلین نے جو سرسید کی وفات کے بعد اُنکے پولیکل ورکس پر ایک رٹکل لکھا تھا اسی میں وہ اسی رسالہ اسباب بغاوت کی نسبت لکھتے ہیں کہ ”انگریزوں میں بہت سے اس بات کے

مسٹر تھیوڈور بیک نے جو ۲۹- مارچ ۱۸۵۹ء کو سرسید کی وفات پر ایسیج دی تھی اُس میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ”دس برس کا عرصہ ہوا کہ سرسید کا لون نے۔ جب کہ وہ اعلیٰ گزرتے مجھے کہا تھا کہ وہ کسی زندہ شخص نے۔ عام اس سے کہ وہ انگریز ہو یا ہندوستانی۔ برٹش گورنمنٹ کے استحکام سلطنت ہندوستان کے بارہ میں اس قدر کوشش نہیں کی ہے جس قدر کہ سرسید نے کی ہے۔“

رسالہ اسباب بغاوت جس کا لکھنا ایک حیثیت سے ملک و قوم کی بے نظیر خدمت اور دوری حیثیت سے تاج برطانیہ کی حقیقی خیر خواہی کا کام تھا۔ سرسید کی اُن جلیل القدر خدمات میں سے ہر جنسے وہ ارکان سلطنت میں شمار کیے جانے کے مستحق ہوئے ہیں۔ وہ اپنے ایک خط میں جو ولایت سے مولوی سید مہدی علی خان کو بھیجا ہے لکھتے ہیں کہ ”میں ناظر یا وفس میں صاحب سکرٹری وزیر ہند کے پاس گیا تھا۔ انھوں نے مجھ کو کونسل کے کاغذات میں میری کتاب اسباب بغاوت مع تمام کمال انگریزی ترجمہ کے دکھائی۔ اُسے دیکھ کر میرا بہت دل خوش ہوا۔ چونکہ رائیمن اُسکی بدولت قرار پائیں اُنکے بیان بے فائدہ ہے۔ اہل ہند ناقدردان دوست کش اور اپنے خیر خواہ کے دشمن ہیں۔ مگر میں خوش ہوں کہ میرے ہوطنوں کی بھلائی ہوئی۔“

اسی حال کو انھوں نے زبانی مجھے اس طرح بیان کیا کہ ”ولایت میں۔ سرخان کے۔ میں نے سکرٹری وزیر ہند سے پراوٹ ملاقات ہوئی تو اُنکی میز پر ایک دفتر کاغذات کا موجود تھا، انھوں نے ہنس کر کہا کہ وہ جانے ہو یہ کیا چیز ہے؟ یہ تھا رسالہ اسباب بغاوت اصل اور اُسکا انگریزی ترجمہ ہے اور اُسکے ساتھ وہ تمام مباحثہ نہیں جو آپس پرارلنٹ میں ہوئے مگر چونکہ وہ تمام مباحثے کا نقیذ نسل تھے اسلئے وہ نہ بھیجے اور نہ اُنکا ولایت کے کسی اخبار میں تذکرہ ہوا۔“

اور پھر لوگوں کی رائیں
رسالہ اسباب بغاوت

سید احمد خان کی کتاب

اور ہندوستانی اور یورپین جو ملازم سرکار نہ تھے وہ دوسرے اور پریزیڈنسیوں کی لیجسلیٹو کونسلوں میں شریک کیے گئے۔
 اخبار سینٹ جیمس بجٹ نے اسی کتاب پر یہ ریا رک کیا تھا کہ ”سید احمد خان کی مستحکم وفاداری
 جو اس یقین پر مبنی ہے کہ انگریزی حکومت اُس کے ملک کے واسطے سراسر مفید ہے۔ وہ اُس کے اُن خیالات اور رایوں کو نہایت
 سنگین کر دیتی ہے جو اُسے بڑے جوش و رفاحت کے ساتھ کتاب اسباب بغاوت میں بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب
 انگریزوں کے واسطے اب تک نہایت نفع بخش و فائدہ مند ہے۔ خود سید احمد خان دو دفعہ الیسرائی کی کونسل میں لاٹھن
 اولاردرپن کے عہد میں ممبر رہا ہے؛ اور اُسکی وہ خواہش جو ہندوستانیوں کے کونسل میں شریک ہونے کی تھی پوری
 ہوئی ہے۔ لیکن ابھی اُسکی اس شکایت میں زور ہے کہ حاکم اور محکوم دونوں طرف فساد اور غلط فہمی ہونیکے سبب ہمنوں
 ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اور یہ اکثر صورتوں میں عدم ہمدردی یا بالاتر قوم کی طرف سے عمدہ اخلاق ظاہر ہونے
 کے سبب ہوتا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک خیالی شکایت ہے؛ لیکن اگر ہم یہ خیال کریں کہ ہم علی لوگ ہیں؛
 ایسے ہمو خیالی شکایتوں پر توجہ نہ کرنی چاہیے؛ تو بے شک ہم اُس غلطی میں گھر جائیں گے جسکی سید احمد خان شکایت
 کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک سید احمد خان کی شکایتوں کا اثر بہت جلد اور بہت وسعت کے ساتھ پھیلا ہے بہ نسبت اُن
 شکایتوں کے جو لالی موہن گھوس اور اُس کے اسکول کے نوجوان آدمی نہایت فصاحت کے ساتھ کرتے ہیں۔“
 کرنل گریم۔ جنھوں نے سر سید کی لائف لکھی ہے۔ وہ اس کتاب کی نسبت لکھتے ہیں کہ
 ”اگرچہ ہم میں سے بعض لوگ سید احمد کی اسباب بغاوت سے متفق نہ ہوں مگر یہ رسالہ جسکو ہماری خیر خواہ اور وفادار
 مسلمان شرفا میں سب لائق ترین شخص نے لکھا ہے۔ فی نفسہ بدرجہ غایت مفید ہے؛ کہ اُس سے ہندوستانی طرز خیالات
 کے اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔“

کرنل گریم کی کتاب

رسالہ اسباب بغاوت کے بعض نتائج

اگرچہ کرنل موصوف کے بیان کے موافق ممکن ہے کہ کچھ انگریز ایسے ہوں جو اس سالہ کے مضامین

میرے خواہشمند تھے کہ فتح کے بعد (ہندوستانیوں سے) دل کھول کر انتقام لین اور اُنکے غصہ کی آگ مسلمانوں کے
برطان خاص کر بڑھاپی ہوئی تھی جنکی نسبت بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ وہ غدر کے محرک ہوئے ہیں + + +
اُس وحشیانہ حالت میں جبکہ شدید تر خیالات کے پھیلنے کا احتمال تھا ایک ایسی حق بات کا۔ جو عام پسند نہ تھی۔
مونہ سے نکالنا کوئی آسان بات نہ تھی + + + ششہ میں یہ دلیری کے الفاظ تھے : باوجود اسکے سرسید کے دلائل کے عام
نیشے کی سچائی اُسی وقت سے تسلیم کر لی گئی ہے اور جو لوگ سرسید کے اُس برتاؤ پر۔ جو اُسے نیشنل کانگریس کے ساتھ کیا۔
الزام لگاتے ہیں اُنکے لیے اس بات پر غور نامفید ہوگا کہ اُسے اتنی مدت پہلے جتنی کہ ششہ سے اب تک گزری ہے۔ گورنٹ پر
زور ڈالا تھا کہ لیجس لیٹو کو نسل میں دیسیوں کے داخل کرنے کی نہایت ضرورت ہے ۔

انگلستان کے مشہور اخبار ہوم نیو نے اس کتاب کی نسبت لکھا تھا کہ ”سید احمد خان
نے جو غدر کے اسباب تحریر کیے تھے اُنہیں سے بعضی نہایت قیمتی اور عملدرآمد کے قابل تجویزین پیش کی تھیں جو
حکام ہندوستان نے کسی اور ذریعہ سے جا مل نہیں کیں ۔ اُسے نہایت دلیری کے ساتھ اپنی رائے اس
مضمون پر ظاہر کی ۔ یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ حکمران گروہ میں اُسکی رائے نے نہایت اثر پیدا کیا۔
وہ اُن اسباب کے بیان کرنے سے خائف نہیں ہوا جنکی طرف غدر کو بخوبی منسوب کیا جاسکتا ہے : اور جنکی
صحت تجربہ سے پورے طور پر ثابت ہو چکی ہے “

یومنگھم ڈیلی گزٹ نے سرسید کی اسی کتاب کا کسی قدر خلاصہ لکھ کر یہ تحریر کیا تھا کہ
”ان شکایتوں کو اس طرح رفع کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی حکومت ایٹھ انڈیا کمپنی سے لیکر تاج برطانیہ سے متعلق کہیں :“

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رسالہ اسباب بغاوت کے دیکھنے کے بعد تبدیلی عمل میں آئی ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تبدیلی اعلان
کیا گیا تھا سرسید کی کتاب چھپنے سے پہلے شائع ہو چکا تھا پس اس سے یہ مراد ہے کہ جس بات کی آرزو سرسید نے اس کتاب میں ظاہر کی تھی
وہ اُنکی کتاب کے پیش چرنے سے پہلے ہی پوری کر دی گئی ۱۱

یومنگھم ڈیلی گزٹ

یومنگھم ڈیلی گزٹ کی رائے

ہم دل سے اپنے تئیں اس قدر مبارکباد دے سکیں جس قدر کہ سرسید احمد خان کی لافنت پردہ و ہندوستان سے انہوں تک سرکار
انگریزی کے راج کا پکا دوست رہا اور جو خدمتیں اُس نے کیں اُنکی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا۔

یہاں تک ہم نے سرسید کی سرکاری خدمات، اور جو وقت اور اعتبار انہوں نے اُن خدمات
کی بدولت ایک ایسی قوم کی حکومت میں حاصل کیا۔ جسکی نظریں ہندوستانیوں کا چھنا شاید محال ہے
کچھ ہی کم ہوگا، اُسکو بطور۔ مشتے نمونہ از خروارے۔ بیان کر دیا ہے۔ اب ہم اُنکی ملکی اور قومی خدمات
پر نظر ڈالتے ہیں جنکی نظیر کم سے کم ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے دستیاب ہوگی۔

اگرچہ پہلے حصہ میں سرسید کے ہر قسم کے واقعات زندگی کے ضمن میں اُنکی ملکی و قومی خدمات کا
ذکر اپنی اپنی جگہ تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے؛ مگر ہم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اُنکو ایک
سلسلہ میں نہایت اختصار کے ساتھ منظم کر کے ناظرین کو خاص طور پر اُنکی طرف متوجہ کیا جائے؛
اور اُنکے تعلق جو امور پہلے حصہ میں بیان نہیں ہو سکے، یا جو نتائج اُن خدمات پر مترتب ہوئے؛
انکو بھی اس سلسلہ میں شامل کر دیا جائے۔

مگر اس کتاب میں ایک ایسے شخص کی خدمات کا ذکر کر رہے ہیں جسکے
اختیار میں
اور حکومت
کے دل سے
ہم کو سرسید کی لافنت میں۔ بہ نسبت اسکے کہ اُسکی کوششوں سے ملک و قوم کو کیا فائدے
پہنچے۔ نہ تو ہر یہ دیکھنا چاہیے کہ اُس نے اُنکے فائدے کے واسطے کیا کیا کوششیں کیں۔ اسی لیے

بالکل تسلیم کرتے ہوں یا اس کے بعض مضامین سے اختلاف رکھتے ہوں؛ لیکن اس میں شک نہیں کہ گورنمنٹ نے جیسا کہ مذکور بالا انگریزی اخباروں میں تصریح کی گئی ہے۔ سرسید کی بہت سی تجویزوں کے موافق عمل درآمد اور اکثر شکایتوں کا تدارک کیا۔ مثلاً سب سے بڑی چیز۔ جسکو سرسید نے کتابت کو میں بغاوت کا اصلی سبب قرار دیا تھا۔ وہ ہندوستانیوں کا قانونی کونسل میں شریک نہ ہونا تھا۔ جس کے سبب سے گورنمنٹ کے خیالات رعایا پر اور رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر ہونے پاتے تھے۔ گورنمنٹ نے فوراً اس شکایت کا تدارک کیا؛ یعنی ۱۸۶۰ء میں یہ رسالہ گورنمنٹ میں پیش ہوا اور ۱۸۶۱ء میں ہندوستانی رئیس لیجس لیٹو کونسل کی ممبری پر نامزد کیے گئے چنانچہ جنوری ۱۸۶۲ء کے اجلاس کونسل میں ہم پہلی ہی بار ہمارا راجہ نرندر سنگھ رئیس بیٹیا لہ، راجہ دیو نرائن سنگھ رئیس بنارس، اور راجہ ڈنکر او دیوان ریاست گوالیار کو شریک پاتے ہیں۔ اگرچہ اس وقت ہندوستانیوں کا کونسل میں شریک ہونا محض برائے نام تھا؛ مگر سرسید نے درحقیقت یہ بیج بویا تھا اس پودے کا جواب کسی قدر بار آور ہونے لگا ہے؛ اور انکا یہ احسان تمام ملک پر ہمیشہ ہوگا۔ یا مثلاً کتابت مذکور میں یہ بھی شکایت کی گئی تھی کہ ہندوستانیوں کو بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدوں پر مقرر نہیں کیا جاتا۔ اس شکایت کا دفعیہ بھی گورنمنٹ نے بہت جلد کیا۔ کتابت مذکور کے پیش ہونے سے ایک برس بعد ۱۸۶۲ء میں پہلی ہی بار پنڈت شیمبونا تھہ ہائی کورٹ کلکتہ کے جج مقرر ہوئے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اکثر اعلیٰ عہدے جو پہلے کبھی ہندوستانیوں کو نصیب نہیں ہوئے تھے ملنے لگے۔

لندن کے نامور اخبار پال مال گزٹ میں سرسید کی وفات پر انکی پوشاک خدمات کی بہت یہ ریمارک کیا تھا کہ ”سرکار انگریزی اور باشندگان ہند کے تعلقات کی کمافی میں کوئی باب ایسا نہیں ہے۔“

بادشاہ کی ایک دُھندلی تصویر کا اُجالنا مقصود تھا۔ اُنہی فوجی عادات محنت کرائی۔ لیکن یہ سب کام ایسے تھے کہ اگر سرسید کی کوششیں انہیں کاموں پر ختم ہو جائیں تو شاید انکو ایک محبت وطن کی خدمات کا درجہ نہ دیا جاتا؛ مگر جب اُنکی آئندہ مسلسل خدمات پر جبکا سلسلہ اُنکے اخیر دم تک برابر جاری رہا۔ نظر کی جاتی ہے تو لامحالہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اُنکے یہ معمولی کام اُسی طلائی زنجیر کی ابتدائی کر دیاں تھیں جو زمانہ مستقبل میں اُنکی ملکی اور قومی خدمات سے ترتیب پانے والی تھی۔

پہلے حصہ میں جو سرسید کے ہر قسم کے کام تاریخیوار بیان کیے گئے ہیں اُنپر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص میں جس درجہ کی عملی قوت پیدا کی گئی تھی وہ اُن کاموں پر بس کر نیوالی نہ تھی جو وہ ابتدائے حال میں وقتاً فوقتاً سرانجام کرتے رہے۔ باوجودیکہ عدالت کا کام۔ جو اُنکو سپرد تھا اور جسکو وہ کمال تندرہی اور نہایت غور و فکر سے انجام دیتے تھے۔ فی نفسہ ایک تھکا دینے والا کام تھا با اینہم وہ بعینہ ایک مستحق کی طرح۔ جسکی پیاس چلو دو چلو پانی سے نہیں بجھتی اور وہ کنوین یا دریا کی طرف دے رہے۔ ہمیشہ کسی بڑے کام کی تلاش میں رہتے تھے۔ غرض سے پہلے۔ جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا۔ مون نے مختلف قسم کے بہت سے کام سرانجام کیے مگر اُنکی پیاس کسی طرح نہ بجھی آخر وہ وقت پہنچا۔ اُنکی طبیعت کے اُعلیٰ جو بہر ظاہر ہونے والے تھے۔ سہ کے ہنگامہ نے۔ جیسا کہ سرسید اسی کا قول ہے۔ اُنکے دل پر وہ کام کیا جو لو تھر کے دل پر بجلی کے گرنے نے کیا تھا۔ جس طرح سورج کی گرمی سے لاکھ خاص حصہ اپنے چیز طبعی سے بلند ہو جاتا ہے اسی طرح غلہ کی آغ نے سرسید کو اپنے طبقہ الا ترکر دیا۔ دلی مراد آباد اور کجنور کے مسلمان خاندانوں کی تباہی اور براہوی حکمران

نہیں

میں

سے سرسید کی کامیاب اور بارور کوششوں کے ساتھ ان کا سن کا بھی ذکر کیا ہے جسے کوئی معتد بہ
نتیجہ پیدا نہیں ہوا، یا جو سبب نامساعدت وقت کے ادھونے سے ہٹ گئے؛ تاکہ لوگوں کو اچھی طرح
معلوم ہو جائے کہ اس شخص کی ساری عمر کس دھن اور کس دھڑکن میں گزری ہے۔

ہمدردی کا اصل مادہ ظاہر انسان اور تمام حیوانات میں یکساں پیدا کیا گیا ہو۔
فرق صرف اس قدر ہے کہ دیگر حیوانات کی ہمدردی۔ اُس حد سے جو انکی فطرت میں رکھی گئی ہے
کبھی آگے نہیں بڑھ سکتی؛ برخلاف انسان کے کہ کبھی اُسکی ہمدردی ایک چھوٹے سے حلقہ میں
محدود رہتی ہے اور کبھی بیرونی اسباب سے وہ نہایت وسیع ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمیشہ اُسکا تعلق
اول گھر کی چار دیواری سے شروع ہوتا ہے؛ پھر جب قدر انسان میں بیرونی اسباب متاثر ہونے
کی قابلیت زیادہ ہوتی ہے اسی قدر وہ تعلق بڑھتا جاتا ہے۔ سرسید کے واقعات زندگی سے
بہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ انہیں ہمدردی کا مادہ اور بیرونی اسباب سے متغیر ہونے کی قابلیت
معمولی آدمیوں سے ہر اتب بڑھ کر پیدا کی گئی تھی۔ محبت جو کہ ہمدردی کا رازان ہے اُنکی
طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ محبت کی پہلی سیڑھی ہے؛

سُوائسکی شہادت میں اس کتاب میں جا بجا ملینگی۔ خاندان کے بعد
سودائی کے ساتھ جو دلبستگی اُنکو تھی اور جو آخر کو حسرت کے ساتھ بدل
بھی اس کتاب میں متعدد مقامات پر ملیگا۔ اسی وطن کی محبت کا اقتضا
اُنکو اُس اُجرے و پارسے کے پُرانے کھنڈروں اور قدیم یادگاروں کی تحقیقات بن بے انتہا
مشقتیں اٹھانے پر مجبور کیا اور آئین اکبری کی تصحیح میں۔ جس سے دلی کے مل ترین

ہمدردی

خاندان کا

دن کی محبت

آخر کار انکو وہ ارادہ فسخ کرنا اور قوم کی آگ میں کودنا پڑا۔ اُس وقت جو کیفیت اُنکے دل پر طاری تھی اُسکا کسی قدر اندازہ اُس اُردو مناجات کے پُرورد الفاظ سے ہو سکتا ہے جو ملکہ معظمہ کا اشتہار معافی شائع ہونے کے وقت اُنھوں نے بعد اداسے دو گانہ شکر الہی کے پندرہ ہزار مسلمانوں کے مجمع میں بہت عام مراد آباد پڑھی تھی اور جسکو ہم پہلے حصہ میں بحشیہ نقل کر چکے ہیں۔

الغرض اس مہم کے سر کرنے کے لیے جب کبھی جو تدبیر اُنکے خیال میں گزری اُس کو اُنھوں نے کیے بغیر نہیں چھوڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں اُنکو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جب تک ہندوستان میں مغربی طریقہ تعلیم عام نہ ہوگا اُس وقت تک رعایا اور گورنمنٹ میں جو منافرت چلی آتی ہے وہ رفع نہ ہوگی۔ چنانچہ مراد آباد میں آتے ہی اُنھوں نے اول ایب اسکول جسکو تعلیم کے میدان میں اُنکا پہلا قدم سمجھنا چاہیے قائم کیا۔ پھر انھیں وہ دن میں جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے ایک راسے۔ جبین ورنیکلر اسکول غت اعتراض کیے تھے اور گورنمنٹ کو نہایت شد و مد کے ساتھ مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان کے ساتھ فی الواقع بھلائی کرنی چاہتی ہے تو اُنکو انگریزی زبان میں سیکھے۔ اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھاپ کر شایع کی۔ پھر سالہ اسباب غارت کے ذریعہ سے گورنمنٹ ہند اور پارلیمنٹ کو اُن تمام شکایتوں سے جو ازرا غلط فہمی یا واجبی طور پر گورنمنٹ کی طرف سے ہندوستانیوں کے دلوں میں شکار تھیں اور اُن کے ظاہر ہونے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ نہایت دلیری

مراد آباد

مراد آباد

مراد آباد

جس جوش کے ساتھ ہمدردی کی ہر آنکھ دل میں اٹھی وہ فی الواقع حیرت انگیز تھی۔ اُس وقت انکا حال
 بعینہ اُس شخص کا سا تھا جسکے گھر میں آگ لگ کر گھر کا ایک حصہ جل گیا ہو اور باقی حصوں کو بچانے
 کے لیے دیوانہ وار ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنا پھرتا ہو۔ انھوں نے خیال کیا کہ جو مسلمان غدر کی روڈن
 میں آچکے اور جو خاندان بگڑ چکے اُنکو مدد پہنچانی تو اب امکان سے خارج ہے مگر جو باقی ہیں اور
 جو ہندوستان کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ہیں اُنکو کس طرح غدر کے آئندہ خوفناک نتیجوں سے
 بچایا جائے؟ گورنمنٹ تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے بدگمان ہو گئی ہے، مسلمان گورنمنٹ کے
 شدید انتقام اور سخت سزاؤں سے۔ جو غدر کے بعد ظور میں آئیں۔ اُسکی مہربانی اور شفقت سے
 بالکل مایوس ہو گئے ہیں، جن غلط فہمیوں کے ہندوستانی شکار ہوئے ہیں اُنکی سوتیلے بدستور
 جاری ہیں، جس جہالت اور تعصب نے یہاں تک نوبت پہنچائی وہ اسی طرح ہندوستانیوں اور
 خاص کر مسلمانوں کے سر پر سوار ہے، حکمران قوم مسلمانوں کو دشمنی کی نگاہ سے دیکھتی ہو، انگریزی
 اخباروں میں برابر مسلمانوں کے برخلاف آرٹیکل لکھے جاتے ہیں جنسے انگریزوں کا دل روز بروز
 مسلمانوں سے زیادہ پھٹتا جاتا ہے، کچھ بیان اور دفتر مسلمانوں سے خالی ہوتے ہیں، توہین،
 فوج میں اُنکی بھرتی موقوف ہو گئی ہے، وہ درباروں میں کم بلائے جاتے ہیں، تمام
 آثار اس بات پر گواہی دیتے ہیں کہ اب مسلمانوں کا ہندوستان میں عزت اور اس کے
 ساتھ رہنا غیر ممکن ہے۔

ان تمام باتوں پر نظر کر کے اول اول تو سرسید کا جی چھوٹ گیا تھا، انکا
 ہندوستان سے کسی دوسرے اسلامی ملک میں جا کر بود و باش کرنے کا پختہ
 تھا، مگر

بجائے

مراد آباد ہی میں سرسید کو یہ خیال ہوا کہ جو غلط فہمیان عیسائی ملکوں میں اسلام پر مبنی
 اسلام کی نسبت ابتدائے شیوع اسلام سے آج تک چلی آتی ہیں اور جو تیرہ سو برس تک کہتے چکے
 تمام دنیا کے عیسائیوں کی طرح انگریزوں کے نزدیک بھی مثل علوم متعارفہ کے مسلم الثبوت ٹھہری
 ہیں جب تک وہ دفع نہ ہوں گی (اور انکار دفع ہونا کچھ ہنس کی کھیل نہیں ہے) اس وقت تک مسلمان
 ہمیشہ انگریزوں کی نظروں میں کھٹکتے رہیں گے اور جو تدبیر مسلمانوں کی صفائی کے لیے کی جائیگی وہ
 اس دو کی طرح جو بغیر ازالہ سبب کے کسی مرض کے علاج میں استعمال کی جائے بے سود ثابت ہوگی۔
 اگرچہ یہ بہت بڑا کام تھا جس کا بوجھ سید احمد خان جیسی حیثیت کے آدمی سے اٹھانا ممکن معلوم ہوتا تھا
 لیکن وہ جو مشہور ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہوتا ہے جو میں سرسید کو یہ خیال پیدا ہوا معاصر کار
 انکی مدتوں کی چڑھی ہوئی تنخواہ جو قدر کے زمانہ میں بند رہی تھی اور لٹے ہوئے اسباب کا معاوضہ
 ان کو مل گیا۔ انھوں نے فوراً جیسا کہ پہلے حصہ میں بفضل مذکور ہے اس عظیم الشان کام کی بنیاد مراد آباد
 ہی میں ڈال دی اور بائبل کی تفسیر لکھنی اور ساتھ کے ساتھ چھپوانی شروع کر دی۔ جس بنیاد پر
 اور جس سے سرسید نے اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور جو اثر اس کے شائع ہونے سے عیسائیوں
 کے دل پر اس کا فائدہ ہوگا ہم پہلے حصہ میں کر چکے ہیں اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کام
 خاص کر ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں کس قدر مفید اور نفع بخشہ تھا۔ لیکن کچھ تو ایسے مسلمان
 ہیں جنکی کچھ قدر نہ ہوئی اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ سرسید کی توجہ اس سے مفید تر اور اعلیٰ تر کاموں
 کی طرف مٹ گئی اس تفسیر کی صورت و جلد میں چھپ کر رہ گئیں۔

بجائے

پورے پچھراٹھوں نے دوسری طرح سے ہندوستانیوں اور انگریزوں میں صلہ

اور صفائی کے ساتھ ظاہر کیا ۔

اسی بہرہ روی کے جوش میں جو اس وقت اُنکے دل میں موج زن تھا اُنھوں نے صاحب کلکٹر مراد آباد سے خود درخواست کر کے قحط کا انتظام اپنے ذمہ لیا اور جہانگیرنگی دسترس تھی ہندو مسلمانوں کے یتیم بچوں کو مشنریوں کے چنگل سے بچانے میں کوشش کی ۔ پھر اسی زمانہ میں جب کہ مسلمانوں کے برخلاف انگریزی اخباروں میں زیادہ بوجھار ہونے لگی تو اُنھوں نے ایک سہ ماہی رسالہ موسوم بہ لائل محمد نزاوت انڈیا اُردو اور انگریزی میں ۔ جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے ۔ نکالنا شروع کیا ۔ اسی زمانہ میں اُنھوں نے سنا کہ ایک مسلمان کچ اس جرم میں کہ اُسے انگریزوں کو لفظ نصارے سے تعبیر کیا تھا سخت سزا دی گئی ہے ۔ یہ سنتے ہی اُنھوں نے ایک رسالہ اس لفظ کی تحقیق پر لکھ کر اُردو اور انگریزی میں شائع کیا جس میں نہایت خوبی سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ مسلمان انگریزوں کو ازراہ تحقیر کے نصارے نہیں کہتے بلکہ قرآن کی رو سے اُنکے ہاں کوئی لقب انگریزوں کے لیے اس سے زیادہ معزز نہیں ہے ۔

انتظام قحط
بچوں کی حفاظت

رسالہ لائل
محمد نزاوت

شرح لفظ نصارہ

۱۔ اسی رسالہ میں جہاں اُنھوں نے ہندوستانیوں کے کونسل میں شریک ہونے کی شکایت کی ہے وہاں اس اعتراض پر کہ ہندوستانی جو جاہل اور بے تربیت تھے کونسل میں کیونکر شریک کیے جاسکتے تھے ۔ اسی طرح دیا ہے کہ کونسل میں رہایا کے ہر حصے کا بیان کیا ہے اُسکو ملاحظہ کرنا چاہیے ۔ پھر جو خط کہ سر سید نے ولایت سے سید محمد علی خان کو لکھے ہیں اُن سے کہ وہ ولایت ہی میں طریقہ انتظام سلطنت ہندوستان پر ایک مبسوط کتاب لکھنی چاہتے تھے ۔ مگر حیات اقم نے بذریعہ محمد یحییٰ کے اُن سے اس کتاب کا محل دریافت کیا تو اُنھوں نے ایک لمبی تحریر بھیجی تھی جس کا ماحصل یہ تھا کہ اس کتاب کے لکھنے کے وقت یہ ارادہ تھا کہ انڈیا کونسل میں جرن سے بھی ہر ایک پوائنٹ پر اس باب میں گفتگو کی جائے مگر کونسل مذکور کے تمام ممبر انگریزی میں گفتگو کرتے تھے اور میں اُردو میں ؛ خود بری بات سمجھتے تھے اور نہ میں اُنکی ۔ اس لیے کافی محنت سے ان کو کوئی سامان پیش کیا ۔ پھر ایک مرتبہ گفتگو کرنے کے لیے کراچی کی گاڑی پر چڑھا پڑا تھا ۔ اب گفتگو ہو گاڑی کو باہر کھڑا کرنا پڑا تھا اور ان اعتراضات کا جواب نہ مل سکا تھا اسی لیے جو چند یادداشتیں اور مسودے لکھے تھے وہ سب معدوم ہو گئے ۔

ب۔

نکاح و بقیہ

اور اس کے بعد

پھر اسی سوسائٹی کی قیادت پر جو کہ اُسے ایڈریس مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۲۶ء میں حضور سرولیم میور
 گورنر بمقام علیگریڈس کی تھی ہزار نے وعدہ کیا کہ جو کتابیں ویسی زبان میں تصنیف
 و تالیف یا ترجمہ کی جائیں گی انہیں گورنمنٹ ضرور امداد دیگی۔ چنانچہ ۲۶- اگست ۱۹۲۶ء کو یہی
 ایڈریس کے پیش ہونے سے ساڑھے تین مہینے بعد گورنمنٹ شمال مغرب نے وہ انعامی اشتہار
 جاری کیا جس کا ہندوستان پر ہمیشہ احسان رہیگا اور جسے تیس برس کے عرصہ میں ملک اس سر
 سے اُس سرے تک ویسی زبانوں کی تصنیفات سے مالا مال کر دیا۔ اگرچہ انعام سے کچھ زیادہ آدمی
 مستفید نہیں ہوئے اور اشتہار کی میعاد چند سال بعد گزر گئی لیکن اس اشتہار کا اثر اُس تمام گروہ میں
 جو ویسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی کم و بیش لیاقت رکھتا تھا مگر اُس لیاقت کو کام میں لانا
 نہیں جانتا تھا۔ برقی قوت کی طرح دوڑ گیا۔ انہوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدہ پہنچایا
 اور وہ خود بھی حق تصنیف کے فائدہ اٹھانا سیکھ گئے۔ خصوصاً اردو لٹریچر صرف اسی تحریک کی
 بدولت کہ اشتہار مذکور نے ملک میں عموماً پیدا کر دی تھی تھوڑے عرصہ میں قلع سے بہت زیادہ ترقی کر گیا۔
 اسی ایڈریس میں جو کہ سرولیم میور کی حضور میں پیش کیا گیا تھا یہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ بھلاؤں
 کتابوں کے۔ جو اردو زبان میں سوسائٹی تیار کر رہی ہے۔ دو کتابیں سیاح احمد خان لائف آن نیری
 سکریٹری۔ کر رہے ہیں ایک اردو لٹریچر کی تاریخ یا فہرست جس میں تمام کتابوں کا۔ جو اب تک
 آج تک چھپی ہیں۔ نام، اُس کے مصنف کا حال، تصنیف کا زمانہ، طرز بیان اور مختلف مقامات
 سے اُسکی عبارت کے چند نمونے اور بعض مضامین کا خلاصہ ہوگا۔ دوسری اردو لٹریچر کی فہرست
 معلوم ہوتا ہے کہ پہلی کتاب کی شروع کرنے کی نوبت نہیں پہنچی لیکن اردو لٹریچر جو سربراہ نے

اور اس مسافرت کے دور کرنے کی۔ جو شہسکی بغاوت نے حاکم و محکوم میں پیدا کر دی تھی۔ بنیاد دلی۔ اس سے ہماری مراد سائنٹفک سوسائٹی کا قائم کرنا ہے جو اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ لٹریچر دلی علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کر مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اس وطن میں پیدا کیا جائے علمی مضامین پر سوسائٹی میں لکھ دیے جائیں رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر اور گورنمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعہ سے ظاہر کیے جائیں جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہو کر ہندو مسلمان اور انگریز تینوں قوموں کے ممبران میں شامل کیے جائیں اور سطح قومی مغایرت اور مذہبی تعصبات اور جو جھپک ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ہے اُسکو آہستہ آہستہ کم کیا جائے۔

قطع نظر ان اہم مقاصد کے جن کے لیے یہ سوسائٹی قائم ہوئی تھی اُس اور بہت سے ضمنی فائدے نہ صرف شمالی ہندوستان بلکہ ملک کے اکثر حصوں کو پہنچے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں جہاں تک حکومت کا معاملہ ہے کوئی قومی انسٹیٹیوشن یا قومی مجلس جو ذکر کے قابل ہو اس سوسائٹی سے پہلے قائم نہیں ہوئی تھی۔ پھر ۳۵ برس کے عرصہ میں جس قدر سوسائٹیاں، انجمنیں اور سبھاؤں نے میں پھیلیں وہ سب اسکے بعد اور اسی کی ریس سے قائم ہوئیں اور اسی سوسائٹی کے اخبار، تمام علمی اخباروں کا رنگ بالکل بدل دیا۔ انہیں بجائے اسکے کہ کچھ سچی اور اکثر بے سرو پا بعید از قیاس خبریں درج ہوتی تھیں۔ پولٹکل سوشل اور علمی و اخلاقی مضامین بھی خبروں کے ساتھ چھپنے لگے اور سچا اسکے۔ کہ وہ محض دیسیوں کے دل بہلانے کے ہزار تھے۔ انکو یہ دن نصیب ہوا کہ گورنمنٹ نے انکی آواز پر کان لگانے لگی۔

ہندوستانی علم و فن کا

انجمنوں کا

انجمنوں کی اصلاح

عقل کے دشمن سائنسک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کرینگے اور کوئی درجہ سی کوشش کا واسطے شکست کر دینے
سوسائٹی کے باقی نہ دھیکے پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اُسکے سنبھالنے
اور ممبروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمائیں۔“

سوسائٹی قائم کرنے کے بعد جب تک کہ سر سید اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچے جو کام ملک اور
قوم کی بھلائی کا اُنکو معلوم ہوا اُسی ذوق و شوق اور سرگرمی کے ساتھ جو اُنکی جبلت میں داخل تھا اُنکو
سراجام کیا۔ ۳۳ء میں اُنھوں نے غازیپور میں محض قومی چندہ سے بڑی دھوم دھام کے ساتھ
ایک مدرسہ قائم کیا جسکی اُنھان مدرسۃ العلوم کی ابتدا سے کچھ ہی کم سمجھنی چاہیے اور جواب تک
و کٹوریا اسکول کے نام سے غازیپور میں جاری ہے۔ پھر ۳۶ء میں اُنھوں نے علی گڑھ اگر
برٹش انڈین ایسوسی ایشن۔ جسے اب نیشنل کانگریس کی صورت میں جون لیا ہے۔
قائم کی جسکا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق کی خواہش اور اپنے در و دل و اپنی شکایتوں
کے اظہار کے لیے براہِ رست پارلیمنٹ اور گورنمنٹ ہند سے تعلق پیدا کریں۔ اگرچہ جس مقصد کے
لیے یہ ایسوسی ایشن قائم ہوئی تھی وہ اس سبب کہ ملک میں اُسکے چلانے کی قابلیت نہ تھی، اور
سر سید جو اُسکے بانی مبنی تھے۔ وہ ایک انار و صد بیار کے مصداق تھے۔ چل نہوا، گراؤ کے ذریعہ
اکثر مفید، مین کی گئیں اور انہیں سے اکثر مین کامیابی ہوئی، جیسے مسافر ان ریل کی تکلیفات
کی شکایت، کتابوں کے حصول میں تخفیف کی درخواست، ورنیکلونیورسٹی قائم کرنیکی سلسلہ جیسا
وغیرہ۔ پھر ۳۸ء میں بمقام بنارس اُنکو یہ خیال ہوا کہ ہومیو پیتھک سے زیادہ کوئی طریقہ علاج
کا ملک کے لیے مفید نہیں ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے جہانگیر کی قدرت میں تھا۔ اُس کی حمایت

جس کا کام اور

اُس کی شکایت

جس کا کام اور

کسی شرف کی تھی اُس کا نمونہ سوسائٹی کے اخبار میں چھپا ہوا اور اُس پر بعض روپین فاضلوں کے عہدہ
ریا کرکس موجود ہیں۔ اگرچہ سرسید نے ان دونوں کاموں میں سے کوئی کام پورا نہیں کیا لیکن اس
اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ملک اور قوم کی تمام مقدم ضرورتیں جن میں سے بعضی باتیں بھی لوگوں
کو محسوس نہیں ہوئیں اس شخص نے اب سے تیس بلکہ چالیس برس پہلے بخوبی محسوس کر لی تھیں۔
یہاں تک کہ جب کوئی اُن ضرورتوں کا پورا کرنے والا نظر نہ آتا تھا تو باوجود یک سر نہ ہزار سودا ہونے
کے خود ہی اُس کام کے سرانجام کرنے کو کھڑا ہو جاتا تھا۔

مگر درحقیقت یہ سب سوسائٹی کے ضمنی نتائج تھے اور جس بڑے مقصد کے لیے وہ قائم
کی گئی تھی اُس کا گھرا بھی بہت دور تھا اور محض سوسائٹی اُس درد کی دوا نہیں دے سکتی تھی بلکہ سرسید
سوسائٹی کے ترقی دینے میں کوئی دقیقہ کو شش و تدبیر کا فرو گذاشت نہیں کیا یہاں تک کہ سالانہ چندہ
اور قیمت اخبار کی تعداد دس ہزار آٹھ سو پچاس روپیہ سالانہ تک پہنچ گئی؛ ضلع کے رئیسوں کو اُسکی امداد
پر آمادہ کیا، گورنمنٹ کو اُسکی طرف توجہ دلائی، خود اپنی بساط سے بڑھکر اُسکو مالی مدد پہنچا، اُسکی
عالیشان عمارت اپنے اہتمام اور نگرانی میں بنوائی، اُسکی مستقل آمدنی کے لیے عہدہ تدبیر میں
کیں، لائق لائق آدمی ترجمہ کے کام کے لیے مقرر کیے، قریب چالیس چھوٹی بڑی علمی اور تاریخی کتابیں
انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں، غازیپور علیگڑھ بنارس جہان کہیں ہے دسائٹی
کے اخبار کو اپنے عہدہ مضامین سے برابر مدد پہنچاتے رہے یہاں تک کہ ہندوستان چھوڑنے کے بعد بھی
سوسائٹی کی دھن برابری رہی۔ چنانچہ ولایت جاتے ہوئے جو خط لکھا کہ انھوں نے مولوی سید محمد علی
کو عدن سے بھیجا تھا اُس میں لکھتے ہیں کہ ”مملوک علاوہ مفارقت احباب کے یوں بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ

میں کو کس
سوسائٹی کی ترقی

بلا واسطہ اطلاع حاصل کرے اور بدگمانی اور خوف رسائی اور اطمینان کے ساتھ بدل جائے۔ اس وقت اس سال پر بیت لے دے ہوئی اور سرسید کو اس کے لئے پرجہیسی کہ امید تھی سب کچھ کما گیا مگر آخر کار اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کے ایک جم غفیر نے جنگی انگریزوں تک رسائی اور ان کے ساتھ بد معاشرت تھا یہ آن بالکل توڑ ڈالی۔

اس رسالہ کے علاوہ سرسید نے اور طرح طرح سے انگریزوں اور مسلمانوں میں دوست پیدا کرنے کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کی جھپک نکالنے کے لیے انھوں نے اولاً خود انگریزوں کے ساتھ معاشرت اور مواعلت اختیار کر کے قوم کے واسطے ایک مثال قائم کی اور رفتہ رفتہ اپنے دوستوں کی سوسائٹی میں اس طریقہ کو وسعت دیکر اس کا اثر در در تک پھیلا دیا۔ تہذیب الاخلاق اور انسٹیٹیوٹ گورنمنٹ میں انھوں نے بہت سے آرٹیکل اسی مضمون پر لکھے۔ انگریزوں کو انھوں نے سب سے پہلے نہایت شد و کد سے رسالہ اسباب بغاوت میں متنبہ کیا تھا کہ انکو ہندوستانیوں کے ساتھ دوستی اور صداقت کا براور کھنا ضرور ہے۔ اسکے بعد ہمیشہ اپنی تحریروں اور پبلیک بیچوں میں اس بات کی تمنا ظاہر کرتے رہے کہ ہمارے اور انگریزوں کے سوشل تعلقات برا اور انا اور دوستانہ ہونے چاہئیں نہ حاکم محکومانہ۔ اس سوشل پریم سرسید کی ایک مختصر پیسیج جو انھوں نے علی گڑھ میں ایک ڈیز پر پریسٹنٹ ممبر پارلیمنٹ کا جامہ پروپوز کرتے وقت سکرٹری کی تھی اور جس میں یہی تمنا خاص مسلمانوں کی طرف سے ایک لطیف پیرایہ میں ظاہر کی گئی تھی۔ مجنسہ نقل کرتے ہیں سرسید نے کہا "ہم کو نہایت خوش ہے کہ

کہ مسٹر بلنٹ نے ہمارے ملک کو دیکھا۔ ہماری قوم کے مختلف گروہوں سے ملے۔ ہم کو امید ہے کہ انھوں نے ہر گز قوم کو تاج برطانیہ کا لائل اور کون و کٹور یا پھر اس کوٹ لایا دلی خیر خواہ پایا ہوگا۔ اگر ہماری کسی آندہ دوست

اور ترقی و اشاعت میں کوشش کی؛ اسکی تائید کے لیے ایک کمیٹی قائم کی۔ جسکے وہ سرکاری تھے۔ ایک ہومیو پیٹھک دسپنل کھولا، اس طریقہ علاج کی پستری اور اسکے اصول پر لکھ دیے اور ایک رسالہ لکھ کر شائع کیا۔ پھر شہ میں سرسید ہی کی سلسلہ جنبانی سے تمام ضلع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں مقرر کی گئیں جنہیں ہر ضلع کے زمینداروں کو تعلیم کے انتظام، نگرانی اور اخراجات پر بحث اور گفتگو کرنے کا اختیار دیا گیا۔ پھر بنارس ہی میں انھوں نے اردو زبان اور فارسی خط کی حمایت میں۔ جو بظاہر خاص مسلمانوں کی طرف داری کا، مگر درحقیقت تمام شمالی ہندوستان کی بھلائی کا کام تھا بے انتہا کوشش کی؛ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہندوستان کے دفاتر سرکاری میں اردو زبان اور فارسی خط بدستور بحال و برقرار رکھا گیا۔ اور ہزار ہا ہندو مسلمان۔ جو بذریعہ اردو تحریر اور فارسی خط کے سرکاری نوکری کرتے تھے یا نوکری کے امیدوار تھے اور جنکو بڑھے طوطے کی طرح اب بھاشا زبان اور ناگری حروف کا سیکھنا اور امتحان دینا ایسا ہی مشکل تھا جیسا پھر کاہل تھا۔ اس ناگہانی طوفان کے ریلے سے بچ گئے اور اردو زبان جسے کئی صدیوں کی ترقی کے بعد ایک مستقل زبان کا درجہ حاصل کیا تھا اور جو ہندوستان کے ہر صوبہ اور ہر ٹکڑے میں برابر بولی اور سمجھی جاتی تھی وہ اس صدمہ سے جو کورٹ کی زبان اور خط کے بدلنے سے اُسکو پہنچنے والا تھا محفوظ رہی۔ اسکے سوا بنارس ہی میں انھوں نے احکام طعام اہل کتاب پر ایک غریب لکھا کہ مسلمان جب کاندھیا نگریزوں کے ساتھ کھانا کھانے سے مانع نہیں ہے، بلکہ محض اہم و رواج کی قید نے انکو آج تک نگریزوں سے دور رکھا ہے۔ انکی یہ جھپک دور کاوٹ جاتی رہے، انکو حکمران قوم کے ساتھ زیادہ میل جول کا موقع ملے، ہر ایک قوم دوسری قوم کی خیرات

تعلیمی کمیٹیاں

اردو زبان کی ترقی

مسلمانوں اور نگریزوں میں میل جول کا رواج

انگلش فیشن ہمارے مفروضہ ملک میں کی، مگر کل ایک دوست کے نہ بطور ایک دشمن کے، ہماری خواہش
ہندوستان میں انگلش حکومت صرف ایک مادہ درآمد تک ہی نہیں بلکہ اثر مل ہونی چاہیے، ہماری یہ خواہش
انگلش قوم کے لیے نہیں ہے بلکہ اپنے ملک کے لیے، ہماری یہ آرزو انگریزوں کی بھلائی یا انکی خوشامدی و جیسے
میں ہے بلکہ اپنے ملک کی بھلائی و بہتری کے لیے ہے، پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم میں اور ان میں سمپتھی نہ ہو،
سمپتھی سے میری مراد بالکل سمپتھی نہیں ہے، بالکل سمپتھی تانبے کے برتن پر چاندے کے طع سے زیادہ کچھ وقعت
نہیں رکھتی، اسکا اثر دونو (فریق) کے دلوں میں کچھ نہیں ہوتا، ایک فریق جانتا ہے کہ وہ تانبے کا برتن ہے
دوسرا فریق سمجھتا ہے کہ وہ جھوٹے طع کی قلعی ہے، سمپتھی سے میری مراد برادرانہ دوستانہ سمپتھی ہے۔

سر سید کہتے تھے کہ ”یہ اسپیش جہاں اخبار میں سر ایفروڈ لائل لفتنٹ گورنر کی نظر سے گزری اور اُسکے
بعد میں اُنسے ملا تو اُنھوں نے فرمایا کہ تم نے یہ عجیب طرح کی اسپیش دی تھی، میں نے کہا شاید عجیب ہو مگر غلط نہیں تھی“
غالباً ہر آنر کے اسپیش مذکور کے اس فقرہ پر تعجب ہوا ہو گا کہ ”انگلش حکومت کے قائم ہونے میں ہم اور وہ
مثل قینچی کے دو پلڑوں کے شریک تھے“ شاید عام لوگ سر سید کی اس تلخ سے آگاہ نہ ہوں؛ اس لیے
اُسکا جو مطلب ہم سمجھے ہیں اُسکو مختصر طور پر بیان کرتے ہیں، غالباً سر سید نے اس فقرہ میں
ہندوستان کے اُن تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جنسے ثابت ہوتا ہے کہ ممالک ہندوستان
کی ابتدائی انگریزی فتوحات اور سرکار کیسی کے رعب داب اور انکی پالیسی کو مسلمان امیرون اور
ملانوں کی تائید اور آشتی سے بہت مدد ملی ہے، جیسے پلاسی کی لڑائی میں میر جعفر کا مقابلہ
سراج الدولہ کے لارڈ کلایو کا ساتھ دینا، شاہ عالم کا مرہٹوں کے مقابلہ کے وقت اپنے
تین لارڈ لیک کی حفاظت میں سپرد کر دینا، اور نظام حیدر آباد کا لارڈ ولزلی کی صلاح ماننا

”میں نے تودہ صرف انگریزوں کی طرف سے کسی کی خواہش ہوگی۔ جسکی نسبت بلاشبہ میں کہوں گا کہ ہماری خواہش پورے طور پر پوری نہیں ہوئی۔“

”مسلمانوں کی یہ خواہش کہ مسلمانوں میں اور انگلش نیشن میں سمیٹھی قائم ہو۔ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ کبھی کوئی ایسا زمانہ نہیں گزرا کہ ہم مسلمانوں میں اور انگلش نیشن میں کوئی معرکہ ایسا گذرا ہو کہ ہم میں ہونا نہیں کوئی بناے محضت قائم ہوئی ہو؛ اُنکو ہم سے بدلا لینے کی رغبت ہو، اور ہمارے عروج اقبال سے شک و حسد ہو۔ کروسیڈ کے زمانہ میں۔ جو ایک ماہ ہر قسم کی عداوتوں کے برائیکٹھ ہونے کا تھا۔ انگلش کو بہت ہی کم اُن معرکوں سے تعلق تھا“

”یہ بات سچ ہے کہ ہم نے ہندوستان میں کئی صدیوں تک شاہنشاہی کی، یہ بھی سچ ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کی شان و شوکت کو بھول نہیں سکتے، لیکن اگر یہ خیال کسی شخص کے دل میں ہو کہ ہم مسلمانوں کو انگلش نیشن کے ساتھ۔ اس وجہ سے کہ اُنھوں نے ہماری جگہ ہندوستان کی حکومت حاصل کی۔ کچھ حسد و رشک ہے تو وہ خیال محض غلط ہوگا۔ وہ زمانہ۔ جس میں انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی۔ ایسا زمانہ تھا کہ بچاری اندیا بیوہ ہو چکی تھی۔ اُسکو ایک شوہر کی ضرورت تھی۔ اُس نے خود انگلش نیشن کو اپنا شوہر بنا لیا پسند کیا تھا تاکہ گاہ پل کے عہد نامہ کے مطابق وہ دونو ملکر ایک بن سکیں۔ مگر اس وقت اس پر کچھ کمنا ضرور نہیں ہے کہ انگلش نیشن نے اس پاک وعدہ کو کمان تک لے لیا۔“

”ہندوستان میں ہمنے اپنے ملک کی بھلائی کے واسطے انگلش حکومت قائم کی۔ ہندوستان میں حکومت قائم ہونے میں ہم اور وہ مثل قینچی کے دو پلڑوں کے شریک تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اُن دونوں میں کس نے زیادہ کام کیا ہے۔ پس ہم مسلمانوں کی نسبت ایسا خیال کرنا۔ کہ ہم انگلش حکومت کو ایک ناگوار سچی دیکھتے ہیں۔ محض ایک غلط خیال ہوگا“

ساوات کے باب میں بھی دیکھا۔ سرسید کو نہایت تعجب ہوا کہ اس کے ساتھ نہایت خدمت ہوئی کہ جو کچھ
 گون کو نہیں دلا گیا تھا وہ غلط ہو گیا۔ یہ اسی وقت دربار کے میدان میں پہنچے اور قصداً اوپر کی
 میں ایک کرسی پر جا بیٹھے۔ بابو نے آکر انکو بھی ٹوکا یہ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور سرسید
 حسن حسن سکریٹری گورنمنٹ سے جو وہاں کے ٹکٹ بانٹ رہے تھے سارا حال بیان کیا۔
 انھوں نے بھی اس امر کو ناپسند کیا اور سرسید سے کہا کہ آپ اسکا ذکر سٹریٹس سے کریں اتنے ہی میں
 سٹریٹس ہارن حل صدر بورڈ کے حاکم اعلیٰ وہیں چلے آئے۔ جب انکو یہ قصہ معلوم ہوا تو وہ سرسید پر
 نہایت افروختہ ہوئے اور کہا کہ تم لوگوں نے قدر میں کوئی برائی تھی جو ہمارے ساتھ نہیں کی؟ اب تم
 یہ چاہتے ہو کہ ہمارے اور ہماری عورتوں کے ساتھ ہلو بہ ہلو بار میں بیٹھو۔ سرسید نے کہا اسی سبب
 تو یہ ساری خرابیاں پیدا ہوئیں کہ آپ لوگ ہندوستانیوں کو ذلیل سمجھتے رہے۔ اگر انکو اس طرح ذلیل
 سمجھا جاتا تو کیوں یہاں تک نوبت پہنچی۔ تھارن حل صاحب اور زیادہ دیر ہم ہوئے۔ آخر
 سٹریٹس حسن نے سرسید کو سمجھایا کہ اس گفتگو سے کچھ فائدہ نہیں۔ سرسید وہاں سے اپنے ڈیرے
 میں چلے آئے اور دربار میں شریک نہیں ہوئے۔ لیکن یہ خبر نواب لفٹنٹ گورنر کو پہنچی تو انھوں نے
 بھی دربار میں آکر اس بات اور انتظام کو ناپسند کیا اور یہ حکم دیا کہ اس وقت زیادہ تبدیلی تو نہیں ہو سکتی لیکن
 اس کے حکام کو چاہیے کہ اپنے اپنے ضلع اور قسمت کے ہندوستانی رئیسوں اور افسروں
 کے ساتھ نیچے کی لین میں بیٹھیں۔ دربار کے جو جو روپین افسر سرسید سے ملتا تھا اس واقعہ کو
 پوچھتا تھا اور جب وہ بیان کرتے تھے تو بگڑتا تھا۔ لاجپات انھوں نے وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب
 نہ سمجھا اور رات کو وہاں سے سوار ہو کر علیگڑھ چلے آئے۔ مگر چند روز بعد لوکل گورنمنٹ سکریٹری کی

اور تمام فرانسیسیوں کی فوج کو اپنی قلمرو سے یکپلم موقوف کرنا وغیرہ وغیرہ۔

ایک اور موقع پر اسی سودا کے جوش میں کہ ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کا بڑا اچھا نہیں ہے سرسید ایک ایسی جرات کر بیٹھے جسکی بدولت آخر کار انکو گورنمنٹ سے معافی مانگنی پڑی۔
 فوری شدہ میں۔ جب کہ ڈرمینڈ صاحب ضلع شمال مغرب میں لفٹنٹ گورنر تھے۔ اگر وہ میں ایک بہت بڑی نالیش ہوئی تھی اور سرسید بھی منتظم کمیٹی کے ایک ممبر تھے۔ اس کمیٹی میں انکے سوا اور بھی چند خیر خواہ ہندوستانی انگریزوں کے ساتھ شامل تھے اور تمام ممبروں کو یکساں اختیارات دیے گئے تھے۔ کسی طرح کا تفاوت انگریزوں اور ہندوستانی ممبروں میں نہ تھا۔ نالیش کی اخیر تاریخ دربار کے لیے مقرر تھی اور دربار کا انتظام مسٹر لکک کلکٹر ضلع اگرہ کے سپرد تھا۔ صاحب موصوف نے نالیش گاہ کے قریب ایک میدان میں درباریوں کے لیے گریسین سطح بچھوائیں کہ جو مقام کسی قدر بلند تھا کرسیوں کی ایک لین تو اس مقام پر لگائی اور اس پر ایک شامیانہ بھی جس سے دھوپ کی روک ہو کھجوا دیا۔ اور دوسری لین اسی کے متوازی مگر اس سے ذرا نیچی جگہ پر لگوائی جس پر شامیانہ وغیرہ کچھ نہ تھا۔ سرسید نے اکثر ہندوستانی درباریوں کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ اس موقع پر گورنمنٹ کو یہ منظور ہے کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں کچھ تمیز نہ رکھی جائے اور سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائے۔ درباریوں میں سے ایک معزز ہندوستانی شاید دربار سے ایک دن پہلے پھرتے دربار کے میدان کی طرف جانکے اور اتفاق سے اوپر کی لین میں ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ ایک بابو نے آکر انکو وہاں سے اٹھا دیا اور کہا کہ آپ کے واسطے نیچے کی لین لگائی گئی ہے۔ وہ وہاں سے سیدھے سرسید کے پاس آئے اور حال بیان کیا اور یہ کہا کہ آپ کا خیال انگریزوں اور ہندوستانیوں کی

نالیش گاہ کے دربار میں
 صاحب موصوف نے نالیش گاہ

مصلحتی لکھنؤ بھی جیمن اہل منشا اپنی اس جہارت کا بیان کیا تھا۔ اس جیمنی کے آنے کے
پہلے سٹرپالک انکی طرف سے بالکل صاف ہو گئے تھے۔

الغرض سرسید کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ہندوستانیوں کے ساتھ کوئی برتاؤ انگریزوں
طرف سے ایسا نہ ہو جو ہندوستانیوں کی ذلت کا باعث ہو۔ خصوصاً مسلمانوں کی جانب سے۔
انگریزوں کی بدگمانی رفع کرنے میں انھوں نے کوئی دقیقہ کوشش و تدبیر کا فرو گذاشت نہیں کیا۔
سٹیوٹ گزٹ کی سالانہ جلدوں میں شاید ہی کوئی جلد ایسی نکلے جس میں ان کے متعدد آرٹیکل
اس مضمون پر لکھے ہوئے موجود نہ ہوں۔ خصوصاً ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا دیو۔ جو ان کے سترہ
بقام بنارس لکھا تھا اور جس کا مفصل ذکر پہلے حصہ میں ہو چکا ہے۔ سرسید کی ان جلیل القدر
خدمات میں سے ہے جس کے شکر سے ہندوستان کے تمام مسلمان عموماً اور وہابی مسلمان خصوصاً بھی
حمدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ چونکہ اس دیویو میں سرسید نے اپنے وہابی ہونے کا اقرار کیا تھا۔
سیلے انگریزوں کی بدگمانی وہابیوں کی نسبت بالکل جاتی رہی تھی، منشی غلام نبی خان مرحوم
کہتے تھے کہ دو غالباً سترہ میں جب منسٹر گریفن ڈپٹی کمشنر لاہور نے منشی قادر بخش خان تحصیلدار جو نیاں کو
سٹرپالک کی رپورٹ پر مجرم و باعیت دیر مواخذہ کر کے صاحب فنانشل کمشنر کے پاس بھیجا اور
ان ڈیو میں کوئی دوسرے وقت کمشنر تھے۔ یہ معلوم ہوا کہ قادر بخش خان کا وہی مذہب ہے جو سید احمد خان کا ہے
انھوں نے فنانشل کمشنر سے سفارش کر کے انکی تبدیلی قصور میں کرادی۔ اسکے بعد جیمنی تبدیلی قصور
رہنے لگی تو سٹرپالک ان اسسٹنٹ کمشنر قصور نے انکو جو سٹرپالک بعض صفائی کے دیا تھا اس میں بڑا ثبوت انکی
صفائی کا لکھا تھا کہ یہ شخص وہی مذہب کھتا ہے جو سید احمد خان صدر الصدور ضلع شمال مغرب کا مذہب اور سیلے

مفت احمد رضا کے فتاویٰ

سید کے نام پر بھی جبین اُسے اس بات کا جواب طلب کیا گیا تھا کہ تم بدامین کیوں نہیں
 شریک تھے؟ اور بلا اجازت کس لیے علیگڑھ چلے گئے؟ سرسید نے اگر وہ بلا اجازت چلے آئے
 کا سبب لکھ بھیجا اور دربار میں شریک نہ ہونے کی معافی چاہی۔ اس کے بعد پھر وہاں سے کچھ باز پرس
 نہیں ہوئی۔ مگر اس نمائش سے پہلے جو لارڈ لارنس مرحوم وائسرائے و گورنر جنرل نے اگر وہاں
 دربار کیا تھا وہاں سرسید کو ایک طلائی تمغہ دیے جانے کا حکم دیا تھا اور وہ تمغاب تیار ہوا تھا
 چونکہ سرسید نمائش کے دربار میں شریک نہیں ہوئے تھے اس لیے نواب لفٹنٹ گورنر نے وہ تمغہ
 صاحب کشتہ قسمت میرٹھ کو دیدیا تاکہ وہ میرٹھ جاتے ہوئے علیگڑھ میں سرسید کو اپنے ہاتھ سے
 تمغہ پہنائے جائیں صاحب کشتہ علیگڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو سرسید صاحب کشتہ وہاں
 موجود تھے اُنکو ایک طرف لجا کر سبب اس بخش کے جو تارن ہل صاحب اُنھوں نے سخت
 گفتگو کی تھی یہ کہا کہ اگرچہ میں اپنے ہاتھ سے تمغہ پہنانا پسند نہیں کرتا لیکن گورنمنٹ کے حکم
 مجبور ہوں۔ یہ کہہ کر سرسید کو تمغہ پہنانا چاہا سرسید نے یہ کہہ کر کہ میں بھی گورنمنٹ کے حکم سے مجبور ہوں اُنکے
 آکے سر جھکا دیا اور تمغہ پہن کر چلے آئے۔ ہمنے معتبر ذریعہ سے سنا ہے کہ اُنھیں دنوں میں گورنمنٹ کا
 ارادہ سب ججوں کی تنخواہ میں معقول اضافہ کرنے کا تھا مگر سرسید کی اس کار ^{یہ اضافہ}
 مدت تک ظہور میں نہیں آیا اور سرسید کے ساتھ اور لوگ بھی۔ جو اُنکے ہم عہدہ تھے۔ ^{معلوم ہے}
 نواب محسن الملک کا بیان ہے کہ اس واقعہ کے بہت دن بعد مسٹر پالک سے جب کہ وہ کشتہ ایک
 دن سرسید کا ذکر آیا اُنھوں نے نہایت چین بہ چین ہنر کر کہا کہ وہ بڑا مفسد اور باغی ہے اور اگر وہ
 کی نمائندگاہ کا وہ تمام قصہ بیان کیا۔ میں نے یہ حال سید صاحب کو لکھ بھیجا اُنھوں نے مسٹر پالک کو

اور جو اس کتاب کے لکھتے وقت مخدومی مولوی سید زین العابدین خان نے راقم کو عنایت فرمائی تھی۔ لایا جاتا ہے کہ ایک شخص قوم کے سوزمین انگاروں پر لوٹ رہا ہے۔ کبھی یورپ کی ترقی کے مقابلہ میں مسلمانوں کی پستی و تنزل کا اندازہ کر کے نہایت مایوسی کے الفاظ لکھتا ہے، کبھی کسی انگریزی اخبار میں قومی مضمون مسلمانوں کے برخلاف دیکھ کر تیج و تاب کھاتا ہے۔ کبھی یہ صلاح دیتا ہے کہ ہندوستان میں کوئی انجمن مسلمانوں کی طرز معاشرت کی اصلاح کے لیے جلد قائم کرنی چاہیے، کبھی اسی غرض سے کوئی قومی اخبار یا میگزین ہندوستان میں جاری کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے، کبھی انگریزی میں ایسی کتابیں لکھوانے پر کمر باندھتا ہے جن میں یورپ کے مورخوں کے اُن سبب اعتراضات کا جواب دیا جائے۔ جو انھوں نے مسلمان بادشاہوں یا خلیفوں پر وارد کیے ہیں اور جن کا اثر ہندوستان کے مسلمانوں کی پورے شکل حالت پر بہت بُرا پڑتا ہے۔ اور اس کام کے لیے ہندوستان سے چندہ طلب کرتا ہے، کبھی اسی کتابیں لکھوانے کا ارادہ کرتا ہے جن سے مسلمانوں کو اپنی گذشتہ عظمت کا خیال پیدا ہو اور اُن کو سلف کی ترقی اور اپنے تنزل کا اندازہ کرنے سے غیرت آئے، کبھی کسی ہندوستان کے مسلمان کے اعزاز کی خبر سن کر نہایت خوشی ظاہر کرتا ہے اور کبھی کسی ایسے قانون کے نافذ ہونے پر جس سے ہندوستان کے حقوق کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے افسوس کرتا ہے۔ یہاں ہم چند فقرے مذکور بالا خطوں میں مناظرین کی اطلاع کے لیے بطور نمونہ کے نقل کرتے ہیں۔

ایک خط میں اُس عربی مدرسہ کا۔ جو دلی میں منشی اموجان مرحوم کے مکان میں قائم کیا گیا تھا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں ”جان من و جناب من! ایسے مدرسوں سے کچھ فائدہ نہیں ہے، افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی اٹھا ٹکانے والا نہیں۔ ہاں افسوس! امرت خور کے ہیں

اسکی نسبت بدخواہی سرکار کا اشتباہ محض لغو ہے۔

ولایت کا سفر جو سرسید نے ۱۸۶۹ء میں کیا اگرچہ ظاہر اس غرض سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کو تعلیم کے لیے انگلستان لے جا کر اُس کے اُمام و آسائش و تعلیم و تربیت کا انتظام اپنی آنکھوں کے سامنے کریں اور اُسکی طرف سے ہر طرح کا اطمینان حاصل کر کے واپس چلے آئیں؛ مگر حقیقت میں اور جن منصوبوں میں انھوں نے شرہ مینے لندن میں بس کر کے اُسے صاف پایا جاتا ہے کہ بیٹے کی تعلیم کا صرف ایک بہانہ تھا ورنہ اصل منشا اس مفرد و درود کا قوم کی غیر خواہی اور اسلام کی حمایت کے جوش کے سوا کچھ نہ تھا۔ اُسوقت اسلام اور مسلمانوں کی لگن میں سرسید کا حال بعینہ اس شعر کا مصداق تھا

”تَرَكَتُ لِلنَّاسِ دُنْيَاهُمْ وَدِينَهُمْ شَغَلَ الْحَيَاتُ يَا دِينِي وَدُنْيَايَ“

مذہب اسلام کی خدمت جو کچھ کہ وہاں اُنسے بن آئی اُسکا ذکر ہم اگلے عنوان میں کر کے بیان صرف یہ دکھانا منظور ہے کہ اس سفر کے آغاز سے لیکر انجام تک برابر اُنکو مسلمانوں کی نوکسدر لگی رہی ہے۔ اُنکے سفر نامہ سے جسکا نمونہ پہلے حصہ میں دکھایا جا چکا ہے اور اُنکے اُتر نکالوں سے جو وقتا فوقتاً وہ سوسائٹی کے اخبار میں چھپنے کے لیے ولایت سے ہندوستان میں بھیجتے رہے ہر شخص باسلوئے مذہب ہے کہ ہندوستان سے جاتے وقت جو حالت کہ وہ مسلمانوں کی دیکھ گئے تھے اُس سے اُنکے دل پر چپ بے چینی اور قلق کا عالم تھا؛ خصوصاً اُنکے دل کی کیفیت اور تلامذہ اُن پر اثرات خطوں کے دیکھنے سے بالکل آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے جو انھوں نے اپنے ہمدرد اور ولی دوست سید مہدی علی خان کو ولایت بھیجے ہیں

”شاعر نے جو یہی طرف خطاب کر کے کتاب حاصل یہ ہے کہ لوگوں کو اُنکی دنیا کا دین مبارک ہو میرا دین بھی تو یہی ہے اور دنیا بھی تو یہی“

دکھت بنی خاندان کی غیر خواہی کا نتیجہ

دوسری کے اثرات

دوسری کے اثرات خطوط

”دو بڑے واقعے دنیا میں ہوئے ہیں جن سے مسلمانوں کو نہایت بڑا تعلق ہے؛ ایک واقعہ فتح اندلس کا ہے۔
 حسین سات سو برس تک مسلمانوں کی عیسائیوں پر حکومت رہی اور جو انصاف اور تعلیم و تربیت مسلمانوں نے اُس قوم کی
 کی نہایت ہی عجیب و رقابلی فخر ہے۔ دوسرا واقعہ کروسیڈ کا ہے یعنی آٹھ لڑائیاں جو مسلمانوں اور عیسائی قوموں کے
 بیت المقدس پر ہوئیں۔ میں نے اُن عالم صاحب (یعنی جان ڈیون پورٹ) سے کہا ہے کہ ان دونوں واقعوں کی
 دو خفشار تاریخین وہ لکھیں اور ان کی رائے میں جو سچ اور انصاف ہو اور جبکہ قصور ان کی منصفانہ رائے میں ہو سب لکھیں۔
 اور چونکہ وہ نہایت منصف اور بہت بڑا عالم ہے اور جرمن لیٹن فریج گریک زبان جانتا ہے اور سب مصنفوں کی
 کتابیں پڑھ کر رائے قائم کرتا ہے صرف انگریزی کتابوں پر اس کو بھروسہ نہیں ہے اسلئے امید ہے کہ جیسی باتیں
 اُس نے یہ کتاب (یعنی اپالوجی) لکھی ہے ویسی ہی وہ بھی لکھیں گے۔ ان دونوں کتابوں کے چھپنے اور تیار ہونے میں
 آٹھ سو روپیہ تخمیناً صرف ہوگا، فی کتاب چار سو روپیہ۔ بس میں چاہتا ہوں کہ آپ وہاں کے احباب آٹھ سو
 پندرہ کروڑ روپے پاس بھیج دیں۔ چندہ کرنے میں شہرت نہیں چاہیے؛ بلکہ احباب غلصت سے چندہ ہو۔ مثلاً
 آپ میر ظہور حسین، زمین العابدین، مرزا رحمت اللہ، اور اور احباب سے ملاقات کریں اور زبانی بات چیت
 کریں اور جو جس کی توفیق ہو اُس سے لیکر جمع کریں“

مولوی سید ممدی علی خان کے لیے ہندوستان میں صاحب کشتی زحمت کے لیے گورنمنٹ
 میں رپورٹ کی ہے اس کی مبارک باد کے بعد سر سید انکو لکھتے ہیں ”بھائی ممدی! تم پابو نیلہ اخبار
 الہ آباد کے ایک آرٹکل کا ترجمہ سنو وہ لکھا ہے کہ ”آج کل ہندوستان میں خاندان مسلمانوں کے روز بروز گھٹتے
 جاتے ہیں۔ چنانچہ صوف بنگالہ میں تمام سلطنت کے ملازمین میں چند مسلمان ہیں؛ وہ بھی منہ پھینک رہے ہیں؛ چنانچہ
 لینے؛ اور ان کی جگہ یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونیکا؛ اور آئندہ بجز چیرسی اور دوسری کے کوئی مسلمان معزز ہوگا“

ہاں افسوس ہاتھ پڑنے والے کا ہاتھ جھٹکتے ہیں اور مگر کے ہونے میں ہاتھ دیتے ہیں۔
 سے بھائی جی کچھ نگرہ اور عین جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت ہی
 کم فاصلہ باقی ہے۔ اگر تم بیان آئے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے؟ اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے؟ اور علم کیونکر
 آتا ہے؟ اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں ایمان سے واپس آنکر سب کچھ کرونگا اور
 کرونگا؛ مگر تیرے کافر، مردود، گردن مڑی ہوئی مرغی کھانے والے، کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سنیں گے۔
 ایک اور خط میں سطح لکھتے ہیں ”جس کتاب کے چھاپہ ہونے کا اشتہار میں نے بھیجا تھا وہ تمام ہوئی۔
 ہفتہ یا دو ہفتہ کے بعد اسکے نسخے آپ کے پاس بھیجوں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ مصنف نے کیسا انصاف اور کیسا سچ اختیار کیا ہے۔
 گو بعض خیالات اسکے ہمارے خیالات کے مطابق نہ ہوں۔ وہ مسلمان نہیں ہے انگریز ہے۔ جب آپ اس کی کتاب
 دیکھیں گے تو جانیں گے کہ وہ انگریز ہزاروں مسلمانوں سے بہتر ہے۔“

”اب ایک در بات ضروری ہے جو لکھا ہوں۔ انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کا
 تاریخین نہایت نا انصافی اور تعصب لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں ہے جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو۔ ہماری
 قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انہیں تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں۔ جس بڑا نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات کہ
 ازراہ نا انصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے اسکو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں۔ اسلئے ایسی قسم کی انگریزی
 کتابوں کا پیدا ہونا جنہیں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو نہایت مفید بلکہ نہایت ضروری ہے۔“

اس کتاب کا ذکر ہے جو جان ڈیون پورٹ نے اسلام کی حمایت میں لکھی تھی اور جسکو لندن میں کوئی پبلشر نہیں چھاپتا تھا مگر سر سید نے
 وہاں پہنچ کر اور اپنے روپیہ سے اسکو چھپوا کر ہندوستان میں بھیجا اور یہاں دو شخصوں نے اسکے الگ الگ ترجمے کیے۔ اگرچہ
 ڈیون پورٹ کی انگلستان میں کچھ وقعت نہ تھی اور اسکی کتاب میں اور مشفقوں کے اقوال نقل کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا مگر چونکہ
 سر سید نے اس سے پہلے کسی یورپین مصنف کی ایسی تقریر جو میں اسلام کی اس قدر حمایت کی تھی نہیں دیکھی تھی اسلئے انکو اسے شائع کرنے کا خیال آیا۔

ہندوستان میں
تعلیم کی ترقی

ہندوستان میں
تعلیم کی ترقی

ہندوستان میں
تعلیم کی ترقی

ہندوستان میں
تعلیم کی ترقی

الفرض سرسید کے تمام منصوبے جو وہ ابتدائے مسلمانوں کی بھلائی کے لیے بار بار پیش کرتے تھے
اس لیے پراکٹم ہو گئے کہ ہندوستان میں چلکر قوم کی تعلیم کے لیے ایک محسن کا بیج یا محسن یونیورسٹی
میں کھائے۔ انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سوشل اور پولیٹیکل حالت درست کرنے کے لیے ایسٹیشن
میں کرنی یا کاغذ کی ناو سے اس دریا کو طے کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ بلکہ جب تک کہ زمین مگر زری تعلیم
بھیلائی جائیگی انکی بھلائی کی تمام تدبیریں ایسی ہی فضول اور بیکار ثابت ہونگی جیسے کسی کھیت
میں تخم یوزی سے پہلے آب پاشی کرنا۔ انھوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اپنی تمام زندگی اس کام پر وقف
کر دیجیے۔ چنانچہ اس مقصد کے متعلق تمام ابتدائی مدائح جو ولایت میں طے ہونے ممکن تھے انھوں نے
وہیں طے کر لیے۔ ایک ہیفٹ جیسین ہندوستان کے موجودہ نظام تعلیم پر اعتراض اور بجائے اسکے
جو طریقہ تعلیم انکے نزدیک ہندوستان کی حالت کے مناسب تھا اسکو بیان کیا تھا۔ لندن میں شائع
تاکہ جنگی رے اسکے خلاف ہو وہ اخباروں کے ذریعہ سے ظاہر کریں۔ تیر کیمبرج یونیورسٹی
کو خود جا کر نہایت توجہ سے دیکھا اور اسکے تمام جزئی و کلی حالات پر غور کی۔ پھر مسلمانوں اور
تیز گورنمنٹ کی اطلاع کے لیے اردو اور انگریزی میں اشتہار چھپوا کر سید محمد علی خان کے پاس
شاحت میں سے ہندوستان میں بھیجے اور ہندوستان میں اگر نہایت باقاعدہ اور نمونہ
پتہ سے اس منصوبہ کے پورا کرنے پر کمربند ہی جو انکی سالہا سال کی غور و فکر کا آخری نتیجہ تھا۔ اور تو
میں خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم کی۔ جسکی کوششوں سے آخر کار مدرسہ العلوم قائم ہو گیا۔
اور اُدھر قوم کو جگانے اور تعلیم کی طرف مائل کرنے کے لیے ہرچہ تہذیب الاخلاق نکالا۔ سرسید ان دنوں
کاموں کا مفصل حال ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں بیان یہ کہ صرف یہ دکھانا ہے کہ تہذیب الاخلاق

نہیں ہوگا۔ دیکھو جو مین کہتا تھا اور جب کاغذ لکھتا تھا اب سب لوگ ذہنی کہتے ہیں۔ یہ آرٹکل بہت بڑا ہے
 کہیں سے دستیاب ہو تو منگا کر بالکل سنو۔ بہر حال جو عزت تکو خدا سے وہ تمام قوم کی عزت ہے۔ اور مجھ کو دوسری
 خوشی ہے ایک قومی دوسری خاص محبت و محبوبیت کی۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ با اقبال رکھے۔“

مولوی امداد اعلیٰ جو سرسید کے سخت مخالف تھے انکو ہندوستان میں سٹار آف انڈیا
 کا خطاب ملنا تجویز ہوا ہے یہ خبر سکر سرسید مولوی محمد علی خان کو لکھتے ہیں ”بلا تضرع میں آپ سے
 عرض کرتا ہوں کہ مولوی امداد اعلیٰ صاحب کی نسبت سٹار آف انڈیا تجویز ہونے سے بے انتہا خوشی ہوئی۔ عین آرزو
 مسلمانوں کی ترقی اور عزت کی ہے۔ چشم مارو شن و دل ماشاد۔ اُنکلیہ فرمانا کہ۔ سید احمد نے انگریزوں کا جھوٹا کھاکر
 سٹار آف انڈیا لیا اور انھوں نے موچھون پر ناؤ دیکر۔ (نہیں نہیں بھول گیا اُنکے موچھین نہیں ہیں) ڈاڑھی پر
 ہاتھ پھیر کر۔ میرے سر اور آنکھوں پر۔ خدا کرے ایک نکو اور ہزار اور مسلمانوں کو یہ دن نصیب ہو۔“

اول کئی خطوں میں مولوی محمد علی خان کو اس بات کی تاکید لکھی ہے کہ میرے وارے۔
 آنے سے پہلے ایک ایسوسی ایشن مسلمانوں کی طرز معاشرت کی اصلاح کے لیے قائم کرو اور ایک اخبار اسی
 مقصد کے لیے ایسوسی ایشن کی طرف سے ایسا اور ایسا نکالو؛ اور چنان کرو اور چنین کرو۔ پھر
 جب اس سے بھی کچھ کامیابی ہوتی نہیں دیکھی تو ممانعت کر دی۔ بعد ممانعت کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ
 ”اگر تخصیص مسلمانوں کی تربیت کے لیے جدا گانہ مدرسہ مقرر ہو جائے تو ایک امت ہمارے لیے ہے۔ کوئی رکن نہیں جاتی کہ ایسے مدرسہ تفرقہ بائین اور
 تجویزین میان نہیں ہوتیں۔ مگر بغیر اس لاکھ روپیہ نقد کے ممکن نہیں ہے۔“ اسی طرح سرسید کے تمام خطوں میں۔ جو دلالت سے
 انھوں نے سید محمد علی خان کو لکھے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کا دکھارونے کے سوا کوئی مضمون نظر نہیں آتا۔

سید مولوی امداد اعلیٰ تہذیب سنت کے خیال سے موچھین نہیں رکھتے تھے۔ اسکی طرف اشارہ ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گروہ ایسا بھی تھا جسکی افشرہ اور بائوس طبعیتیں
 انکافرون تنزل کے سبب ڈوبتی ہوئی ناؤ کی طرح کوئی ایسا سہارا ڈھونڈ نہ رہی تھیں
 جسے انکی ڈھارس بندھی اور کوئی امید کی صورت نظر آئی۔ تہذیب الاخلاق نے اس
 کے دل پر فی الواقع وہ کام کیا جو مرہم زخم پر یا ٹھنڈا پانی پیاسے پر کرتا ہے۔ اس گروہ نے
 وہ اپنے تئیں ناچیز اور ایک نہایت کس پیرس حالت میں سمجھ رہا تھا اور دیوی ترقی
 دروازے اپنے چاروں طرف مسدود پاتا تھا۔ دیکھا کہ ایک ناصح شفیق کمال دلسوزی
 انکو نیند سے جگاتا ہے، انکی غفلت پر ملامت کرتا ہے، انکے اسلاف کے کارنامے سنا کر
 غیرت دلاتا ہے اور انکو ترقی کرنے کا گرتیتا ہے۔ یہ گروہ انکی آواز پر اس طرح دوڑا جیسے کسی
 ساری فوج کا کوئی سرور ہر اپید ہو جائے اور وہ انکے اشارہ پر ادھر ادھر سے سمٹ کر اس کے گرد
 بائے، غرض کہ موافق اور مخالف دونوں فریق ہمہ تن انکی طرف متوجہ ہو گئے دوسرا سیلے
 انکی آواز غور سے سنیں اور پہلا سیلے انکی آواز کسی کو سننے ندین۔ تعجب یہ ہے کہ جس قسم انکی
 محنت سے قوم کو فائدہ پہنچا اسی کے قریب قریب انکی مخالفت نے لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔
 یہاں تہذیب الاخلاق مدرسہ محمد العلوم کی طرف لوگوں کو بلاتا تھا اور جب قدر وہ انگریزی
 کی ضرورتیں انکے ذہن نشین کرتا تھا اسی قدر مدارس اسلامیہ قائم کرنے کا جوش مسلمانوں
 بڑھتا جاتا تھا۔ چنانچہ اسی کی تحریک سے بے شمار اسلامی مدرسے ہندوستان میں قائم
 ہوئے اور برابر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تہذیب الاخلاق کو جاری ہوئے شاید تین برس گزرے تھے
 مولوی سخاوت علی صاحب نے انہی میں ایک اسلامی مدرسہ قائم کیا۔ مدرسہ قائم کرنے کے بعد

مسلمانوں پر کیا اثر کیا اور مدرستہ العلوم سے اُنکو بتایا کیا فائدہ پہنچا اور آئندہ کن فائدوں کے پہنچنے کی توقع ہے۔

ہندوستان میں دہلی اخباروں اور میگزینوں کی حالت کچھ تو اس وجہ سے کہ اُنہیں کوئی ایسا کرشمہ نہیں ہوتا جو سبک میں کچھ جنبش پیدا کرے اور زیادہ تر ہندوستانیوں کی مردہ دلی کے سبب۔ جیسی کہ اب تک رہی ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ یورپ میں ہی اخبار اور میگزین قوموں کے دلوں کے مالک ہیں اور اُنکے جذبات اور خیالات پر حکومت کرتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک میں۔ سوال اسکے کہ لوگ اُنکو ایک دل کا بہلاوا جانتے ہیں۔ وہ کسی مرض کی دو انہیں سمجھ جاتے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ تہذیب الاخلاق سے۔ جو ایک سب سے زیادہ افسردہ اور دل مردہ قوم کے بیدار کرنے کے لیے نکالا گیا تھا۔ کیا امید ہو سکتی تھی؟ باوجود اسکے نتیجے اُس سے پیدا ہوئے وہ نہایت تعجب انگیز ہیں۔

تہذیب الاخلاق کے نتائج

بات یہ ہے کہ جسوقت یہ پرچہ جاری ہوا اسوقت مسلمانوں پر سبب اُس انقلاب کے۔ جس نے غدر کے بعد اُنکی حالت دگرگون کر دی تھی۔ دو مختلف حالتیں طاری تھیں۔ ایک طرف مذہبی تعصبات اور مذہبی جوش و خروش۔ جو بار بار اور تنہا کے زمانہ کے ہتھیار ہیں۔ دوسری طرف یہ تھے اور تہذیب الاخلاق کا جزو اعظم وہ مضامین تھے جنکو مذہبی تعصبات کے سہارے ہی نسبت تھی جو آگ کو بارود کے ساتھ ہوتی ہے۔ پس جیسی کہ امید تھی تہذیب الاخلاق سے متعصب لوگوں کے گروہ میں تلاطم پیدا کر دیا اور مذہبی مناظرہ کے ہتھیار جو مدت دراز سے کام میں نہ آنے کے سبب زنگ خوردہ پڑے تھے اُنکو کام میں لانے کا موقع ملا۔

مرکز مناسب نہیں ہے لیکن چند سال سے ایسے آثار نظر آتے ہیں کہ نامہ جو سب بڑا کارآمد ہے
 کی اصلاح کیے بغیر نہ رہیگا۔ چنانچہ ندوۃ العلماء جسکا پانچواں اجلاس سال گذشتہ میں ہوجا کر
 غرض سے قائم ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے قدیم سلسلہ درس کی زمانہ حال کی ضروریات کے
 حق اصلاح کرے۔ اور اگر ذرا غور کر کے دیکھا جائے تو خود ندوۃ العلماء کا جو فاسی نتیجہ کی ایک شاخ
 کے لیے تہذیب الاخلاق جاری کیا گیا تھا۔ وہی کانپور۔ جو تہذیب الاخلاق اور سید کی مخالفت
 سب سے بڑا مرکز تھا اور جہاں سے تہذیب الاخلاق کے برخلاف نور الانوار نور الافاق اور امداد الافاق
 اور کیا اور کیا مدت دراز تک شائع ہوتے رہے۔ وہیں سے علما کی یہ جماعت اس غرض اٹھی ہے
 کہ مسلمانوں کی قدیم طرز تعلیم زمانہ حال کی طرز تعلیم کے سانچے میں ڈھالیا جائے اور اسی لیے اگر علما
 اس سے بدگمان ہو گئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مجلس سید احمد خان کے اشارہ سے قائم ہوئی ہے
 ایسا تو نہیں سمجھتے لیکن اتنا ضرور کہتے ہیں کہ ”هذا ايضا من بوکات اللہ و امکہ“ بے شک
 مسلمانوں کی اصلاح کا خیال اُنکے دل میں سید کی چیخ پکار نے پیدا کیا ہے اور اگر وہ اپنے ارادوں پر
 ثابت قدم رہے اور قوم سے خوف زدہ نہ ہوئے تو رفتہ رفتہ ضرور وہ اپنے موجودہ خیالات
 کے برعکس اور جن باتوں کی حقیقت قوم کو ضرورت ہے اُنکی طرف متوجہ ہونگے۔
 نواب محسن الملک نے ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس میں گفتگو کرتے وقت ندوۃ العلماء
 کی رویداد سے اُسکے بعض ممبروں کی تقریر کا خلاصہ نقل کیا تھا جو تہذیب الاخلاق جدید کی پہلی
 جلد میں چھپ گیا ہے اُسکے دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو کچھ سید نے تہذیب الاخلاق
 کی ابتدائی جلدوں میں علوم جدیدہ کی ضرورت کے متعلق لکھا تھا، یا قرآن کی سائنس کی تفسیر

انھوں نے جیسا کہ تہذیب خلاق سلسلہ جیلد مین منقول ہے ایک موقع پر کہا کہ ”اگرچہ پہلے بھی ہمارے
اپنی قوم کی بھلائی کی فکر تھی مگر کوئی تقاضا کرنا والا اور بار بار جگانا والا نہ تھا۔ اب تہذیب الاخلاق نے ہمارے
چوکنٹا اور آگاہ کیا جس کے سبب اس قصبہ میں بھی ایک مدرسہ قائم ہو گیا۔ خلاص پرچہ تہذیب الاخلاق کو ہمارے لیے ہمیشہ
مبارک رکھے۔“ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ”ہمارے مدرسہ انہیٹہ اور ہمارے ضلع کے کل مدارس دیوبند، سہارنپور
اور گنگوہ کو بڑی تسلی ہے کہ یہ سب مدرسے اس مدرسۃ العلوم مسلمانان سے جس کے قائم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ مستفیض
ہونگے؛ گویا علی گڑھ ہمارے مدرسوں کے طلباء کا قصداً میر ہے۔ اگر حقیقت ہم اپنی ترقی کرینگے تو وہ قصداً ہمارے
لیے ہے۔ پس کس قدر ہمارے اسکے بانیوں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔“

اس قول کے نقل کر کے بعد سر سید تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں کہ ”سب سے اخیر مدرسہ جو ہماری
تحریروں کے اثر سے قائم ہوا وہ مدرسہ ایما نیہ لکھنؤ ہے۔ جس میں مشہور دیگر علوم معینہ کے مذہب شیعہ اثنا عشریہ کی بھی
تعلیم ہوتی ہے اور اس سے خیال ہوتا ہے کہ ہماری کوششوں نے شیعہ اور سنی دونوں کے دل کو جکا دیا ہے۔“

جس مضمون میں یہ حال لکھا ہے وہ ۱۸۶۴ء کا لکھا ہوا ہے جسکو اب چوبیس برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔
اس عرصہ میں آدھے شمار مدارس اسلامیہ زیادہ تر اسی خیال سے قائم ہوئے ہیں کہ انگریزی تعلیم جسکی
بنیاد مسلمانوں میں تہذیب الاخلاق نے ڈالی ہے اس کے اثر سے مسلمانوں کو بچایا جائے۔ یہ خیال فی نفسہ
صحیح ہو یا غلط مگر اس میں شک نہیں کہ تہذیب الاخلاق ہی نے مسلمانوں میں یہ جوش پیدا کیا ہے
اور اس طرح سر سید کی چیخ پکار نے اپنے مخالفوں میں بھی وہ اسپرٹ پیدا کر دی ہے جسے قومی ترقی کا دار و مدار
اگرچہ تمام مدارس اسلامیہ جو ہندوستان میں اب تک قائم ہوئے ہیں ان میں کوئی تبدیلی
زمانہ کے تقاضا کے موافق ظہور میں نہیں آئی اور وہ قدیم ڈگر اب تک نہیں چھوڑی گئی جو اس زمانہ کے

ترقی کی سדרاتھیں اُنکے دور کرنے پر علی الاعلان مگر نہ باندھتا تو ظاہر ہے کہ اُسکی مخالفت بالکل نہوتی اور اسلئے جو عمدہ نتیجے اُسکی مخالفت سے پیدا ہوئے وہ ظور میں نہ آتے۔ نیز جسقدر اُسکی مخالفت کم ہوتی اُسقدر اُسکے مددگاروں کا جوش کم ہوتا اور اسلئے وہ مخالف اور موافق دونوں کے حق میں کوئی مقدمہ نتیجہ پیدا نہ کر سکتا۔ یہی سبب تھا کہ جون جون اُسکی مخالفت زیادہ ہوتی گئی اُسی قدر لوگ اُسکی طرف زیادہ متوجہ ہوتے گئے اور اُسی قدر اُسکا منتر زیادہ کارگر ہوتا گیا۔

مسلمانوں کا اصول کی ترقیات

اُسے۔ جب کہ مسلمان اپنے اسلاف کے حال سے بے خبر تھے۔ نہایت مؤثر طریقوں کے ساتھ اُنکو اُنکے بزرگوں کی علمی اور عقلی فتوحات سے آگاہ کیا تاکہ انہیں وہ حمیت پیدا ہو جو اولاد کے دل میں اپنے آبا و اجداد کی بڑائی سننے سے پیدا ہونی چاہیے اور وہ اپنے موجودہ تنزل کا مقابلہ زمانہ سلف کی ترقیات کے ساتھ کر کے خود ترقی کی طرف مائل ہوں۔ اگرچہ تہذیب الاخلاق کو اس مقصد میں پوری مدد دیتی ہے کہ اُسے مسلمانوں میں فخر و مہابات کا جوش توقع سے زیادہ پیدا کر دیا لیکن اُن خیرِ مولانے کے سبب جو گرمی ہوئی قوموں کو مدت تک اُکسنے نہیں دیتے۔ ابھی تک انہیں وہ حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ سلف کے کارنامے سنکر ایک غیور قوم میں خود بخود پیدا ہو جاتا ہے اور اُنکو پستی تنزل کے ننگ و عار سے نکلنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ تاہم جسقدر بیس بائیس برس کے عرصہ میں کم و بیش ترقی کا خیال ہندوستان کے مسلمانوں میں پیدا ہوا ہے اُسکو اسی تہذیب الاخلاق کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ نہ مسلمانوں نے زمانہ کی مخالفت پر جس شد و مد کے ساتھ کمر باندھ ہی تھی وہ اُسوقت تک کہ زمانہ اُنکو پیس نہ ڈالے۔ ہرگز کھلنے والی نہ تھی۔ تہذیب الاخلاق جس کو ٹھے پر چڑھنے کی تاکید کرتا تھا صرف اُسکے بتانے ہی پر اکتفا نہیں کرتا تھا بلکہ اُسکا دینہ بھی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ایک

علم جدید کے مطابق کی تھی اور جیسپر انکی تکفیر کجاتی تھی۔ ہمارے علمی رایوں پر اسے کس قدر اثر کیا ہے اور انکے خیالات کو کمان سے کمان تک پہنچا دیا ہے اب وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا قدیم علم کلام جو اس زمانہ کے فلاسفہ کے مقابلہ کے لیے مدون ہوا تھا اس زمانہ میں اسکا مدارس اسلامیہ میں پڑھانا بے فائدہ ہے؛ اب فلاسفہ زمانہ حال کے مقابلہ کی ضرورت ہے اور اسلئے انگریزی زبان کا سیکھنا اور علوم جدیدہ سے واقف ہونا ضرور ہے۔ پہلے جو ہمارے علماء علوم جدیدہ کے پڑھنے سے اس لیے منع کرتے تھے کہ اُن سے اصول اسلام میں شبہات پیدا ہونگے اور احاد اور دہریت پھیلے گی۔ اب برخلاف اُسکے وہ بھی وہی کہنے لگے ہیں جو بیس برس سے برابر سرسید کہتے چلے آتے تھے۔ چنانچہ ایک عالم نے ندوۃ العلماء میں یہ کہا کہ ”مذہب اسلام ایسا ریتے کا گھرنین جیسپر نے فلسفہ کا ریتا کچھ اثر کرے اور نہ کبھی پچھلی صدیوں میں کچھ اثر کیا ہے۔ فلسفہ بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہیگا پر آسمانی مذہب کبھی نہ بدلیگا۔ سلام کا کوئی دنیاوی فلسفہ نہیں نہ کوئی ہیأت و ریاضی ہے وہ تو صرف انسان کی اخلاقی و روحانی تعلیم کرنوالا۔“

پھر کہا کہ ”اسلام نے تاریخ کا بھی بطور مورخانہ ذمہ نہیں لیا ہے بلکہ انھیں واقعات کا ذکر کیا ہے جو انسان کے لیے عبرت و خبرت پیدا کریں۔ اگر بطلیموس کی ہیأت ثابت ہو جائے تو کیا، اور فیثاغورس کی قائم ہو جائے تو کیا، جزو لای تجزی باطل ہو تو کیا، اور ثابت ہو تو کیا، ٹلا کا بطلان ہو تو کیا اور اثبات ہو تو کیا، ہمارے بزرگوں نے یونانی فلسفہ کے حملے روکنے کے لیے ایسے ایسے مسائل علم کلام میں داخل کیے تھے جنکو آج کل محض جودت طبع کے لیے ہم لوگ پڑھتے ہیں؛ ندوہ ہمارا مذہب تھا نہ کتاب و سنت اور مشکوٰۃ نبوت کا فرمودہ تھا۔ سب کچھ بگڑ جائے تو ہماری بلا سے“

اگر مذہب لا اخلاق لوگوں کی مخالفت کے خوف سے صلح کل کا طریقہ اختیار کرتا اور جوہر کا دین مسلمانوں کی

کی طرح بے حس و حرکت کر دیا تھا اس سے اُنکو مطلع کیا اور صرف مطلع ہی نہیں کیا بلکہ لاکھوں کے
 خیالات بدل دیے اور تدبیر و کوشش کی طرف اُنکا رخ پھیر دیا۔ اسی پرچہ نے اُنکو اپنے دست
 و پاؤں پر پھر دسا کرنا اور گورنمنٹ کا سہارا چھوڑنا سکھایا اور سلف ہلپ کا اصول جسکے بغیر کوئی
 قوم ترقی نہیں کر سکتی اُنکے ذہن نشین کیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ قومی کاموں میں ایک پیہ
 صرف کرنا نہیں جانتے تھے وہ سیکڑوں اور ہزاروں صرف کرتے لگے۔ کوئی شخص انکار نہیں کہہ سکتا
 کاموں میں چندہ دینا کم سے کم ہندوستان کے مسلمانوں کو صرف تہذیب الاخلاق نے
 یا دوسرے لفظوں میں سید احمد خان کی تحریروں اور ایسی چون نے سکھایا ہے اور اس بات کا
 بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمان جو روپیہ دور روپیہ نہیں سے زیادہ اولاد کی تعلیم میں خرچ کرنا
 نہیں جانتے تھے وہ اسی شخص کی جج پگوار سے اب پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ روپیہ عینا بیدار
 پن کی تعلیم میں خرچ کرتے ہیں اور ولایت کی تعلیم کے لیے ایک ایک لڑکے پر مین مین
 تیس تیس ہزار صرف کر دیتے ہیں۔ سر سید کے مخالف جو ہمیشہ مستثنیٰ نتیجوں کو اعتراض کا
 ذریعہ گردانتے ہیں اس مقام پر ضرور مسلمان لڑکوں کی وہ مثالیں پیش کریں گے جنکو ولایت جانے
 سے بچے فائدہ کے مضامین پہنچا ہے۔ مگر ایسے مستثنیات تو خدا کے کام بھی خالی نہیں پائے جاتے۔
 باران کہ در لطافت طبعش خلاف نیست در بلغ لالہ روید و در شوق بلوغ خم
 ہلکوا اس باب میں اُن شاد و نادر مثالوں پر نظر کرنی نہیں چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے
 کہ سر سید نے مسلمان کے خیالات میں کس قدر تبدیلی پیدا کر دی ہے کہ جو روپیہ وہ پہلے اولاد کی
 بیاہ شادیوں کی بیہودہ رسموں میں خرچ کرنے کے عادی تھے یا جس روپیہ جاہل و رنالا قی طلاق کے لیے

ہاتھ سے لوگوں کو ترقی کی طرف بلاتا تھا اور دوسرے ہاتھ سے مدرستہ العلوم کی تصویر اُنکے سامنے پیش کرتا تھا۔ اسی لیے اُسکی کوششیں بالکل آکارت نہیں گئیں۔

تہذیب الاخلاق ہی نے لوگوں میں یہ خیال پیدا کیا کہ یورپ کے مصنفوں نے جو غلطیاں اسلام کی حقیقت ظاہر کرنے یا اسلام کی تائید لکھنے میں کی ہیں اُن غلطیوں کو رفع کیا جائے اور اُنکا منشا ظاہر کیا جائے۔ اگرچہ سرسید اپنی متعدد تصنیفات میں جیسا کہ اس کتاب میں جابجا ظاہر کیا گیا ہے۔

اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکے تھے اور آئندہ مصنفوں کے لیے یہ رستہ صاف کر چکے تھے مگر اُنکی تحریرات عام طور پر شائع نہیں ہوئی تھیں۔ تہذیب الاخلاق ہی کی تحریک سے لائق مسلمان

اس کام پر کھڑے ہوئے بہت سے مضامین تہذیب الاخلاق میں اسی موضوع پر لکھے گئے اور اُنکے سوا عمدہ عمدہ متعدد کتابیں انگریزی اور اردو میں علیحدہ شائع کی گئیں۔ اس تحریک کا سب سے عمدہ نتیجہ

مسلمانوں کے حق میں یہ ہوا کہ بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان - جن سے ہم خود واقف ہیں یا جن کا حال ذریعوں سے معلوم ہوا ہے - اُن اعتراضوں کو دیکھ کر جو انگریزی کتابوں میں اسلام اور مسلمانوں پر

دارو کیے گئے ہیں اسلام سے برگشتہ ہو چکے تھے؛ کوئی عیسائی ہونے کا ارادہ رکھتا تھا اور کوئی سرے سے مذہب ہی کو لغو سمجھنے لگا تھا؛ مگر تہذیب الاخلاق کے مضامین دیکھ کر جو بہت سی بات

اسلام کی طرف سے اُنکے ذہن میں خطرات کرتے تھے وہ یقیناً زائل ہو گئے اور اُنکے دل کا وہ خندہ بالکل جاتا رہا۔ اب وہ اسلام پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور اپنے اُن پرانے خیالات سے ناامید ہیں۔

تہذیب الاخلاق نے تعصبات کو بہت کم کر دیا، تقلید کی بندشیں ڈھیلی کر دیں، توکل، قناعت اور تقدیر کے جو غلط معنی لوگ سمجھے ہوئے تھے اور جس غلطی نے اُنکو نکلا اور کابل و جہاد

مسلمانوں میں عیسائی مورخوں کے افادات کو صحیح کرنے کا خیال پیدا ہوا

تہذیب تقلید و توکل قناعت اور تقدیر کی مرہمت کا حکم ہوتا

برابر نکلتا رہا۔ لٹریچر خوبی کے لحاظ سے جبکہ رعمہ مضامین ان سات برس کے پرچون میں شائع ہو چکے ہیں
 نہیں ہوئے اور جو تعلق کہہ رہے اور پر بیان کیے ہیں وہ زیادہ تر انہیں سات برس کے پرچوں کے علاوہ دیکھتے ہیں۔
 اس پرچہ کو جاری ہوئے صرف تین برس کا عرصہ گزرا تھا کہ سرمدی ایک نگرین دوست جیسا کہ جلد ۴
 نمبر میں مذکور ہے اُنکو لکھا تھا کہ ”تہذیب لاطلاق نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو زبان میں بھی ہر قسم کے مضامین اور
 خیالات عمدگی اور سادگی سے ادا ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ثابت کیا کہ مذہب سلام ایسا سنگ تار کیلئے نہیں ہے جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا ہے“
 یہ کہنا کچھ مبالغہ میں داخل نہیں ہے کہ سوشل خلاقی اور مذہبی مضامین جس سادگی اور لطافت
 اور شائستگی کے ساتھ اس پرچہ میں لکھے گئے ویسے کبھی کسی اردو زبان کے پرچہ میں نہیں لکھے گئے۔
 اسی پرچہ نے مسلمانوں کے مذہبی لٹریچر میں جو صدیوں سے بند پانی کی طرح بھروسہ و حرکت چلا آتا تھا
 دفعہ توجہ پیدا کر دیا۔ تہذیب لاطلاق سے پہلے ہندوستان میں جو کچھ مذہب کے متعلق لکھا گیا تھا اُس میں سرمدی
 سوا بہت ہی کم لوگوں کی تحریروں میں آزادی کا عنصر پایا جاتا تھا، تعصب اور تقلید نے ارجنیلٹی
 کی سونہیں بالکل بند کر دی تھیں، علمائے سلف کے اقوال و راویوں کو نقل کر دینا ہی تصنیف و تالیف
 کی معراج تھی، غیر مقلد جو بہت آزادی کا دم بھرتے تھے اُنکی جولانگاہ بھی صرف چند مسائل فقہیہ متعلق
 بہ عبادات تھے اور بس، پادریوں کے مقابلہ میں اسلام کی حمایت کرنے کا طریقہ اسکے سوا اور کچھ نہ تھا کہ جو
 اعتراضات و مذہب اسلام پر قرآن اور حدیث کے حوالوں سے کرتے اُسی قسم کے اعتراضات عیسائی مذہب پر
 توریت و انجیل کے حوالوں سے کیے جاتے تھے، یورپین سویلریشن اور یورپین سائنس کے حوالے جو اسلام پر ہو رہے تھے
 اول تو اُنسے مسلمان عالم محض بے خبر تھے اور اگر اُنکو خبر بھی ہوتی تو تقلید کی بدولت انہیں یہ قابلیت باقی نہ رہی تھی کہ
 ان نئے علموں کو دفع کرنے کے لیے نئے ہتھیار ایجاد کریں، مناظرہ کا طریقہ اس قدر نامذہب و زخراب ہو گیا تھا

تہذیب لاطلاق میں آزادی کا پیدا ہونا

۷۱

تہذیب لاطلاق کے طریقہ کی اصلاح

میں نے حرمِ کرائی عیاشی اور بہنیں یا گاہلی اور سستی کا سامان میا کر جاتے تھے اب ہر وہ پائیگی
میاقت اور اصلی عزت اور رقت اور بڑھانے میں صرف کرنا سیکھ گئے ہیں ۔

تہذیبِ الاخلاق ہی نے اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کو مدتِ ہزاروں کے بعد قومیت
کے معنی یاد دلانے ہیں ۔ قومیت جو درحقیقت ایک لفظِ اسلامی اخوت کا مرادف ہے اس کے مفہوم سے
ہندوستان کے مسلمانوں کو بالکل ذہول ہو گیا تھا ، انہیں بھی مثل ہندوؤں کے ذاتوں کی

تفریق پیدا ہو گئی تھی اور ایک ذات کو دوسری ذات کے ساتھ قومی حیثیت سے کچھ تعلق نہ سمجھا ۔
پٹھانوں کو یہ استحقاق نہ تھا کہ وہ مغلوں کی فتوحات پر فخر کر سکیں اور سادات اس بات کا حق
نہیں رکھتے تھے کہ بنی امیہ یا بنی عباس کے کارناموں پر نازان ہوں ۔ اس کے مذہبی فرقوں کے سوا
اختلاف نے انہیں ایک دوسری طرح کا تفرقہ ڈال دیا تھا جس کے سبب سے وہ رابطہ جو تمام اہل قبلہ
میں بسبب اتحادِ اسلامی کے متحقق ہونا چاہیے باقی نہ رہا تھا ۔ تہذیبِ الاخلاق نے ان کو تو

کے دور کرنے کی بنیاد ڈالی اور ہندوستان کے لاکھوں مسلمانوں میں کم سے کم یہ خیال ضرور پیدا کر دیا
کہ ذاتوں کے تفرقہ یا مذہبی طریقوں کے اختلاف سے قومی اتحاد میں کچھ فرق نہیں آتا اور ہمارے
نزدیک یہ کتنا کچھ غلط نہیں ہے کہ قوم و قومیت ، قومی ہمدردی اور قومی عزت کے الفاظ جن کو وسیع
معنوں میں کہ اب ہندوستان میں عام طور پر بولے جاتے ہیں یہ درحقیقت سرسید ہی کی تحریروں نے
جو اول سوسائٹی اخبار میں اور اس کے بعد تہذیبِ الاخلاق میں شائع ہوئے لوگوں کو بولنے سکھائے ہیں ۔

اردو لٹریچر کو بھی اس پرچہ کچھ کم فائدہ نہیں پہنچا ۔ یہ پرچہ جیسا کہ پیچھے حصہ میں دیکھا گیا ہے
برس کے عرصہ میں تین دفعہ مختلف قوتوں میں جاری ہوا مگر سب سے زیادہ عرصہ تک صرف پہلی دفعہ یعنی سات برس

سکھیا کا خیال پیدا ہونا

اردو لٹریچر میں

پیدا ہو گیا اور انھوں نے قومی جذبہ سے متعدد کالج کھول دیے۔ پھر خود مدرستہ العلوم میں کوئی قاعدہ ایسا نہیں رکھا گیا جسکی رو سے وہ مسلمانوں کے لیے مخصوص سمجھا جائے اُس میں ابتداء سے آج تک ہندو مسلمان عیسائی بنگالی پارسی سب قوموں کے طالب علم برابر پڑھتے ہیں۔ چنانچہ شہداء سے ابتک ہندو طالب علم محمدن کالج اور اسکی وکلاس سے مختلف امتحانوں میں کامیاب ہوئے ہیں انکی تعداد یہ ہے۔

گرچیٹ انڈرگریجویٹ انٹرمیڈیٹس ال ال بی وکالت ہائی کورٹ وکالت ضلع میٹران اور متعدد ہندو گرچیٹ اسی کالج کے سرسٹری یا مڈلیسن میں ولایت جا کر کامیاب ہو چکے ہیں۔ پس یہ کہنا کچھ بناوٹ میں داخل نہیں ہے کہ محمدن کالج نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ تمام ہندوستان کی بھلائی کے لیے قائم کیا گیا ہے اور اُس سے غیر فوونکو بھی برابر فائدہ پہنچتا رہا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ سرسید کا بڑا مقصد اس کالج کے قائم کرنے سے یہی تھا کہ کسی طرح مسلمانوں کی حالت درست ہو۔

مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے مواقع

مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ قطع نظر ان سخت مخالفتوں کے۔ جو مدرستہ العلوم قائم کرتے وقت پیش آئیں اور جنکا حال ہم آئندہ عنوان میں لکھینگے۔ مسلمان پہلے ہی انگریزی تعلیم سے متنفر تھے۔ ابتداء سے ہندو اور مسلمانوں کے خیالات میں جو تفاوت انگریزی تعلیم کے متعلق تھا اُسکا اندازہ اُس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۲۳ء میں جبکہ گورنمنٹ نے کلکتہ میں ہندوؤں کے لیے ایک سنسکرت کالج قائم کیا تو ہندوؤں نے ایک عرضداشت اس مضمون کی گزرائی کہ ہم کو اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ گورنمنٹ ہمارے لیے سنسکرت کی تعلیم کا سامان مہیا کرے بلکہ اُسکو چاہیے کہ جانتا کہ ہندو انگریزی تعلیم کی اہمیت میں کوشش کرے۔ برخلاف اسکے ۱۸۳۵ء میں۔ جب کہ واقعہ مذکور پر گیارہ برس گزر چکے تھے اور ہندوؤں کا

کہ کتابوں کے نام نہ 'جوت'، 'آرہ'، 'ورو'، 'بقاب' اور کتاب رکھے جاتے تھے؛ تہذیبِ لاطین جہانگیر
کہ اُس پر سب کا تہذیب کی جڑ کاٹی، تقلید کی بندشیں توڑیں، مذہبی تحریروں میں آزادی کی روح پھونکی،
مذہبی حمایت کا فرسودہ طریقہ جو اس زمانہ میں کچھ بکا آمد نہ تھا اسکی جگہ دوسرا طریقہ جو زمانہ کے مناسب حال تھا
جاری کیا، مناظرہ کے ناپسندیدہ طریقہ کی اصلاح کی اور اپنے طرزِ بیان سے اُس طریقہ کی ایک مثال قائم
کی جسکی قرآن نے ہدایت کی تھی کہ "وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ"۔

اُردو شاعری میں دو سو برس سے ایک ہی قسم کے خیالات برابر دہرائے جا رہے تھے اُسے بھی زیادہ
اسی پرچہ کی تحریک سے کروٹ بدلی نئے نئے میدانوں میں شعر اقدم رکھنے لگے، مبالغہ اور جھوٹ کی جگہ حقائق
وواقعات کے خاکے کھینچنے لگے اور شاعری بجائے اسکے کہ محض ایک لگی کی چیز سمجھی جاتی تھی ایک کام کی چیز بننے لگی
سب عمدہ نتیجہ جو اس پرچہ کے اجرا سے مرتب ہوا اور جسکے لیے حقیقت یہ پرچہ جاری کیا گیا تھا وہ
یہ تھا کہ مسلمان جو قدیم سے انگریزی تعلیم کی سخت مخالفت کرتے چلے آتے تھے آہستہ آہستہ انکی رجحان

نکلنی شروع ہوئی یہاں تک کہ لاکھوں مسلمان ہندوستان میں اب ایسے موجود ہیں جو انگریزی تعلیم کو اپنی
اولاد کے حق میں نہایت ضروری جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بغیر اسکے ملک میں عزت اہننا ناممکن ہے۔
سب بڑی ملکی اور قومی خدمت جو سرسید بن آئی اور جسکا احسان بظاہر صرف مسلمانوں کی قوم پر

مگر حقیقت ہندوستان کی تمام اقوام پر ہے۔ وہ مدرستہ العلوم کا قائم کرنا ہے۔ ہندوستان کی ایک ایسی
قوم کا جسکی تعداد قریب چھ کروڑ کے ہے۔ تعلیم سے محروم رہنا تمام ملک کے لیے جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں
ایسا ہی مضر تھا جیسا ایک ٹھنڈی ٹیس کا ماؤف ہونا انسان کے تمام اعضاء پر مضر ہے۔
اسکے سوا صرف مدرستہ العلوم کی ریس شمالی ہندوستان کے ہندوؤں میں قومی تعلیم کا جوش بکڑا دیا

اُردو شاعری میں انقلاب

اُردو شاعری میں انقلاب

اُردو شاعری میں انقلاب

بالکل نہیں ہے اور دنیا میں عربی کے سوا کوئی علمی زبان نہیں ہے۔

اسکے سوا اور بہت سے موانع تھے جنکی تفصیل کی یہاں کنجائش نہیں۔ اس سے

بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جسوقت سرسید نے محمدن کلچ قائم کرنے کا ارادہ کیا اُس وقت مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کیا حالت ہوگی؟ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء یعنی اُسوقت سے۔ جبکہ حکومت مدراس اور بمبئی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ ۱۸۵۷ء یعنی اُسوقت تک۔

کہ علیگڑھ میں ابتدائی اسکول کھولا گیا۔ تمام ہندوستان میں مسلمان گریجوٹس کی تعداد صرف بیس تک پہنچی تھی جنہیں ۱۷ بی اے اور ۳ ایم اے تھے حالانکہ اُس وقت تک ہندو گریجوٹس کی تعداد ۸۴۶ تک پہنچ گئی تھی جنہیں ۱۵ بی اے اور ۱۳۱ ایم اے تھے۔

نیز جو نفرت یا نامناسبیت اور اجنبیت مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے چلی آتی تھی اُس سے اس

کا اندازہ بھی اچھی طرح ہو سکتا ہے کہ اگر بالفرض اُنکو تعلیم کا خیال پیدا بھی ہو جاتا تو بھی انہیں انگریزی تعلیم کے ساتھ دلچسپی اور مناسبت پیدا کرنے کے لیے کس قدر عرصہ درکار تھا؟ اور وہ

کتنی مدت میں اس قابل ہو سکتے تھے کہ اپنی ہموطن قوموں کے ساتھ جو چالیس برس پہلے سے انگریزی تعلیم پر دلدادہ اور اُسکے حاصل کرنے میں سرگرم تھیں تعلیمی دوزمین شریک ہوں۔

ان تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد جو نتائج نہایت قلیل عرصہ میں علی گڑھ محمدن کلچ

سے ظور میں آئے اُنکو نہایت غنیمت سمجھنا چاہیے۔ علیگڑھ محمدن اسکول ۱۸۵۷ء میں اور

محمدن کلچ ۱۸۵۷ء میں کھولا گیا تھا اور کلچ کے نتائج ۱۸۸۰ء سے نکلنے شروع ہوئے اُسوقت

۱۸۹۹ء تک۔ کہ جسکو ۱۹ برس سے زیادہ مدت نہیں گزری۔ اُسے صرف اپنے مسلمان طلبہ میں سے

۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۸ء تک مسلمانوں کی تعلیم کی یہ حالت تھی

۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۸ء تک مسلمانوں کو اسے تعلیم

شوق دیوانہ کی تھا۔ کلکتہ کے مسلمانوں نے جسوقت یہ سنا کہ گورنمنٹ تلم ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتی ہے تو انھوں نے ایک عرضی تیار کی جس پر ٹھہرے مسلمان ریسون اور عالموں کے دستخط تھے اور جبکہ اصل یہ تھا کہ گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر اسقدر توجہ کرنا صاف دلالت کرتا ہے کہ اسکا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔ قطع نظر مذہبی خیالات کے مسلمان زیادہ تر اسوجہ سے بھی انگریزی تعلیم کے مخالف تھے کہ ابتداً اشاعت اسلام سے وہ جس ملک میں گئے اور جہاں جا کر رہے مستثنیٰ ہوتوں کے سوا کبھی انکو غیر ملک اور غیر قوم کی زبان سیکھنے کی طرف توجہ نہیں ہوئی وہ جہاں جاتے تھے اپنی زبان اور اپنا علم ادب اپنے ساتھ لے جاتے تھے جس طرح اسپین میں جا کر انھوں نے اسپینش زبان یا ایران میں ژند زبان نہیں سیکھی اسی طرح ہندوستان میں آکر اس ملک کی زبانوں کے سیکھنے کی طرف توجہ نہیں کی اور اسیلے غیر زبانوں کے سیکھنے کی فی الواقع انہیں قابلیت نہ رہی تھی۔ برخلاف اسکے ہندوؤں نے مسلمانوں کے عہد میں غیر زبان سیکھنے کا ملک اپنے میں بخوبی پیدا کر لیا تھا۔ جو قومیں ملازمت پیشہ تھیں وہ اپنی اولاد کو کم سے کم فارسی زبان سیکھا۔ نہایت ضروری جانتی تھیں اور اکثر شوقین لوگ فارسی کی تکیل کے لیے عربی بھی سیکھتے تھے۔ پس مسلمانوں کو جسقدر کہ مذہبی خیالات انگریزی تعلیم سے مانع تھے اس سے زیادہ انکی طبعی نامناسبیت جو تیرہ سو برس سے انہیں متواتر چلی آتی تھی ایک اجنبی زبان کے سیکھنے کی سوجاؤندی تھی۔ ماس انگریزی میں انگریزی زبان کے سوا اور بھی بعض سبکٹ ایسے تھے جن سے ہندوستان کے مسلمانوں کو کچھ مناسبیت نہ رہی تھی۔ جغرافیہ جیسے انکے اسلاف اگلے زمانہ میں بے انتہا ترقی کی تھیں اب اسکو محض لغو جاننے لگے تھے۔ تاریخ کا حال بھی ماسکی قریب قریب تھا۔ ریاضی سے فی الواقع مسلمانو کو کچھ لگاؤ باقی نہ رہا تھا۔ مسلمانوں کے ذہن میں عموماً یہ بات تہ نشین تھی اور اب تک ہے کہ انگریزی زبان میں منطق اور حکمت و فلسفہ

مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کے لیے ہندوستان میں کھول دیے جس کا ایک صریح نتیجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء سے لیکر اس وقت تک کہ محمدن کالج کے طالب علم یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانوں میں شریک ہونے لگے اور اسکی شہرت سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا ولولہ پیدا ہوا۔ یعنی ۱۸۸۱ء تک جو کہ چوبیس برس کا زمانہ ہوتا ہے تمام ہندوستان میں مسلمان گریجویٹس کی تعداد صرف ۴۳۴ تک پہنچی تھی مگر ۱۸۸۲ء سے ۱۸۹۳ء تک یعنی صرف بارہ سال میں تمام ہندوستان کے مسلمان گریجویٹس کی تعداد ۴۳۳ سے بڑھ کر ۳۹۹ تک پہنچ گئی اور ۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۶ء تک یعنی تین سال میں صرف آلہ آباد یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی سے ۱۸۵ مسلمان بی اے اور ام اے کے امتحانوں میں کامیاب ہوئے اور اگر بد قسمتی سے وہ مشکلات جو گزشتہ دس برس طالب علموں کو پیش آرہی ہیں اور جنہوں نے خاص کر مسلمانوں کی چلتی گاڑی میں روڑا اٹھا دیا ہے ان میں

نواور بھی زیادہ عمدہ اور بہتر نتیجے ظور میں آتے ۔

تعلیم کی ابتدا کی مشکلات

اسکے سوا جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ قومی تعلیم کی چال ابتدا میں نہایت سست اور دھیمی ہوتی ہے ۔ کم عمر لڑکے جنسی قومی تعلیم کی بنیاد قائم ہوتی ہے ۔ باوجودیکہ انکو حد سے زیادہ ترغیب اور اشتعال کی ضرورت ہوتی ہے ۔ وہ اپنے دائیں بائیں کوئی سامان ایسا نہیں دیکھتے جس سے انکو تعلیم میں کچھ مدد مل سکے ، یا اسکی طرف کافی توجہ ہو ۔ نہ قومی سوسائٹی میں ان باتوں کا چرچا ہوتا ہے جسے تعلیم کا شوق اور اسکے ساتھ لگاؤ پیدا ہو ، اور نہ خاندان کے چھوٹے بڑوں میں کوئی ایسا نظر آتا ہے جس سے مدرسہ کی پڑھائی میں کسی قسم کی اعانت کی توقع ہو ۔ برخلاف اسکے جب قوم میں تعلیم کی سیلاب برپا ہو

۱۲۶ گریجویٹ اور ۱۷۱ انڈر گریجویٹ پیدا کیے ہیں۔

مطالب علم کہ محمدن کالج کی لاکھاس میں لکھ سکتے ہیں وہ ۱۹۰ء سے قانونی امتحانوں میں شریک ہونے لگے ہیں اسوقت سے اب تک صرف مسلمانوں میں سے ۱۲ ال ال بی کے امتحان میں اور ۵ وکالت کے امتحان میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

اور اگر اس سخت گیری پر جو آٹھ سات برس سے قانونی امتحانوں میں ہونے لگی ہے۔ نظر کی جائے تو اس قلیل عرصہ میں مذکورہ بالا نتائج خاصہ مسلمانوں کے حق میں بہت غنیمت ہیں۔ مگر محمدن کالج کے فوائد کو صرف ان نتائج ہی میں منحصر نہ سمجھنا چاہیے جو خاصہ اسکے طالب علموں نے یونیورسٹی کے مذکورہ بالا امتحانوں میں حاصل کیے ہیں بلکہ اسکا اثر ہندوستان کے تمام حصوں اور تمام صوبوں تک پہنچا ہے اور اسکا کسی قدر اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انٹنٹ گورنر بنگال نے ۱۹۰۶ء کے آغاز میں ایک موقع پر مسلمانان بنگالہ کی تعلیم کے متعلق یہ کہا تھا کہ ۱۹۰۶ء میں

میں نے بنگال کو چھوڑا تھا تو صوبہ مذکور کے تمام مدرسوں اور کالجوں میں ایک لاکھ پچاسی ہزار مسلمان طالب علم تھے اور اپنے واپس آنے پر شجاکو معلوم ہوا ہے کہ اس تعداد کی نو بہت قریب چار لاکھ تو بے ہزار کے پہنچ گئی ہے۔ چونکہ ۱۹۰۱ء سے زیادہ تر محمدن کالج کا پیر چاہندوستان میں ہوا ہے اور صوبہ بنگال میں ظاہر کوئی زبردست تحریک مسلمانوں کی تعلیم کے لیے نہیں ہوئی ایسے سوا اسکے کہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت اور محمدن کالج کی شہرت سے یہ نتیجہ پیدا ہوا ہے اور کوئی بات خیال میں نہیں آتی۔

نیز اسی کالج کی ریس اور اسی کے بانی کی چیخ پکار سے متعدد کالج اور بے شمار اسکول خاص

طالب علم تعلیم کے لیے ولایت نہ جاتے ہوں۔ ایک متدبرہ تعداد ولایت کے تعلیم یافتہ بیٹروں اور سول سروس دھیرہ کی جگہ پہلے بنگالیوں اور پارسیوں کے سوا کسی قوم میں وجود نہ تھا۔ اکثر قوموں میں پیدا ہو گئی ہے جو روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور جیسا کہ نواب محسن الملک نے اپنے لاہور کے لکچر میں بیان کیا ہے اس وقت صرف محمدن کالج کے ۳۱ طالب علم بیرٹھراٹ لاہور اور ۴ ولایت میں ڈاکٹری کی تعلیم پا رہے ہیں۔

اس حالت کا مقابلہ جب شمالی ہندوستان کی اُس حالت سے کیا جاتا ہے۔ جبکہ سرسید نے پہلے ہی بار ولایت جانے کا ارادہ کیا تھا اور جب کہ ہمارے ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں ہی خیالات کے سبب یورپ جانے کو عیسائی ہو جانے سے کم نہیں سمجھتے تھے اور غیر ملکوں کے سفر کے بالکل عادی نہ تھے۔ تو دونوں حالتوں میں زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اور اس میں شک کرنے کی ظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جس طرح مسلمانوں میں ولایت کی تعلیم کا خیال صرف سرسید کی تحریک سے پیدا ہوا اسی طرح شمالی ہندوستان کے ہندوؤں میں خیال اسی شخص کی بدولت پھیلا ہوا۔ باوجودیکہ ہندو مت کے انگریزی تعلیم میں مصروف تھے مگر وہ ایسے چپ چاپ یہ رستہ طے کر رہے تھے جیسے تناخو آدمی ایک کونے میں بیٹھ کر اینالپٹ پھر لیتا ہے اور پڑوسیوں کو خبر نہیں ہونے دیتا؛ یہاں تک کہ پچاس برس گزر گئے اور مسلمانوں میں کسی قسم کی جنبش پیدا نہیں ہوئی۔ مگر سرسیدی کی چیخ پکار صرف مسلمانوں ہی کو جگایا نہ تھی بلکہ اُس نے شمالی ہندوستان کے دونوں صوبوں میں اس سرے سے اُس سرے تک تعلیم کا غل ڈال دیا۔ اگرچہ ہندوستان کی تعلیم پر ہندو پہلے ہی سے متوجہ تھے اور سرسیدی کی تحریک نے سوا اسکے کہ اُن کی ترقی کی رفتار کسی قدر تیز کر دی

تو انکو بھی کچھ دیکھ کر کے درود دیوار سے ہی آواز میں سنائی دیتی ہیں۔ اسلئے امید ہے کہ اگر مسلمانوں میں تعلیم کا شوق اسی نسبت سے آئندہ بھی بڑھتا رہا جیسا کہ گذشتہ ۲۳ برس میں بڑھتا رہا ہے تو انکی ترقی کی رفتار روز بروز زیادہ تیز ہوتی جائیگی۔

ولایت کی تعلیم کا خیال شمالی ہندوستان کے ہندو مسلمانوں میں درحقیقت اسوقت سے پیدا ہوا ہے جبکہ سرسید اپنے بیٹوں کو ساتھ لیکر انگلستان گئے ہیں۔ اُس سے پہلے ہندوستان کا کوئی مسلمان اور شمالی ہند سے کوئی ہندو یا مسلمان ولایت میں تعلیم کے لیے نہیں گیا تھا۔ اگرچہ سرسید کو اس سفر کی جرأت زیادہ تر اُس اسکا لرشپ کے سہارے سے ہوئی تھی جو سید محمود کی تعلیم کے لیے گورنمنٹ نے عنایت کیا تھا لیکن چونکہ وہ خود بھی مع اپنے بڑے بیٹے کے، مہینے ولایت میں ٹھہرے تھے اور سید محمود کی تعلیم ختم ہونے تک ایک خدمتگار برابر پانچ برس اُنکے ساتھ رہا تھا اور بعض ایسے اخراجات بھی جو اوروں کو اٹھانے نہیں پڑتے تھے سرسید کو برداشت کرنے پڑے تھے۔ اسلئے علاوہ دس ہزار روپیہ کے جو گورنمنٹ نے عطا کیا تھا پچاس ہزار روپیہ اُنکو اپنی جائیداد اور کٹاؤں سے سچکڑہ رخصت کے زمانہ کی تنخواہ کٹوا کر گویا اپنے پاس سے خرچ کرنا پڑا۔ اگرچہ سرسید کو اُس سے بہت بڑی زیریں ملی ہوئی مگر ہندوستان کے لیے آئندہ ولایت جانے کی راہ کھل گئی۔ سرسید نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ بیٹے کو ولایت میں تعلیم دلا کر ملک کے لیے ایک مثال قائم کر دی بلکہ جیسا پہلے حصہ میں مذکور ہو چکا ہے انھوں نے متعدد تدبیریں ہندوستانیوں کے اور خاص کر مسلمانوں کے ولایت بھیجنے کے لیے کیں جنکا نتیجہ آج ہر شخص اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ کلکتہ، بمبئی اور مدراس کے علاوہ شمالی ہندوستان میں کوئی سال ایسا نہیں جاتا جس میں کچھ ہندو یا مسلمان

ولایت کی تعلیم
کا خیال شمالی
ہندوستان میں
پیدا ہوا

انگریزی تعلیم سے جس قدر حصہ کہ انھوں نے اس عرصہ میں لیا ہے وہ حصہ نہ لیتے تو آج سرکاری مفترا اور محکمے اُن سے گویا بالکل خالی پاتے اور ہندوستانی ریاستوں میں بھی وہ شاید خال خال ہی نظر آتے۔
 دومہ داری کے عہد پہلے ہندوستانیوں کو اودنے درجہ کی تعلیم یا سہی سفارش وغیرہ کے ذریعہ سے ملاتے تھے۔ اب سوا اسکے کہ گورنمنٹ اپنے خاص اختیارات سے کسی مستثنیٰ آدمی کو دیدے۔
 گورنمنٹس کے سوا کسی کو نہیں مل سکتے۔ کو پٹیشن کے قاعدہ نے انہیں کٹھنڈ کلاس کے سوا۔ ہر درجہ کے آدمیوں کو عمدہ خدمات سے گویا بالکل محروم کر دیا ہے۔ اور جس قدر ملازمت کے امیدواروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اُسی قدر ملازمت کی شرطیں روز بروز زیادہ سخت ہوتی جاتی ہیں۔ سیکڑوں مڈل پاس اور انٹرمیڈیٹ پاس آٹھ آٹھ دس دس روپیہ ماہوار کی نوکری ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور مشکل سے فیصدی دس کامیاب ہوتے ہیں۔

۱۸۸۰ء میں جبکہ محمدن کالج کی عمر دو تین برس سے زیادہ کی نہ تھی سرید نے جو متعدد مضامین پنجاب یونیورسٹی اور مشرقی تعلیم کے خلاف لکھے تھے انہیں ایک جگہ لکھتے ہیں ”جب صدر عدالت دیوانی ہائیکورٹ نہیں ہوئی تھی مشرقی علوم اور مشرقی زبان کے نہایت ذی علم دلائق شخص وکالت کرتے تھے اور ایسے کامیاب تھے کہ نہ انپر شک کرتا تھا دفعہ ۱۸۸۰ء میں صدر عدالت دیوانی ہائی کورٹ ہو گئی اور یورپین زبان نے اپنا راج کیا۔ وہ بار آورد خت علوم مشرقی اور مشرقی زبان کے جنگی پھنڈ آسمان تک پہنچی تھی اس طرح گما کر زمین پر گر پڑے جیسے کوئی نیا نازک پودا پالے کے صدر سے مجلس جائے۔ اب ہائی کورٹ میں جا کر علمائے علوم مشرقی کا حال دیکھو کہ انپر مکھیان بھنگتی ہیں۔ نہ وہ اپنی ذات کا کچھ فائدہ کر سکتے ہیں نہ ملک کا نہ قوم کا۔ تمام عہدوں میں مشرقی علوم و مشرقی زبان خارج ہو گئی ہے۔ دیوانی عہدوں میں جنگی بنیاد وکالت کے امتحان پر قائم ہوتی ہے مشرقی علوم

کوئی بڑا خیال انشا پر نہیں کیا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ولایت کی تعلیم کا خیال ان میں صرف مسلمانوں کی رہیں اور سرسید کے شور و غل سے پیدا ہوا۔ مذہبی مذکورین ملک کے ہندوؤں میں اور ہندوؤں سے بہت زیادہ تھیں؛ چنانچہ بعض شریف ہندو اسی جرم میں کٹاؤں نے ولایت میں جا کر تعلیم پائی برادری سے خارج کر دیے گئے۔ لیکن چونکہ تعلیم نے انکو فکری آگس کو دیا تھا اور زمانہ کا ساتھ دینے کے مضرتناج سے وہ خوب واقف تھے۔ ایسے اٹھوں وہ تمام قیدی جو ترقی کے مانع تھیں توڑ ڈالیں اور مسلمانوں کو ولایت کی تعلیم میں بھی اپنے سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔

سربداری یا غیر سربداری ملازمت میں جس قدر ترقی مسلمانوں نے محمدن کلج کی تعلیم کے ذریعہ سے بواسطہ یا بلا واسطہ کی ہے اسکا اندازہ اس طرح پر کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ اس کلج کے قائم ہونے سے پہلے مسلمان ملازمین کی تعداد کیا تھی اور اسکے قائم ہونے کے بعد کتنا تک پہنچ گئی۔ یا یہ کہ ہندوستان کی دیگر قوموں کے ساتھ صیغہ ملازمت میں انکو پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے؛ بلکہ چارے نزدیک اسکا اندازہ اس طرح ہونا چاہیے کہ اگر محمدن کلج قائم نہ ہوتا اور سرسید کی تحریک سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو تعلیم کا خیال پیدا نہ ہو جاتا تو آج کے مسلمان سربداری محکوم یا ہندوستانی ریاستوں میں ملازم پائے جاتے؟

سربداری ملازمت کی جو شرطیں گزشتہ بیس سال میں وقتاً فوقتاً قرار پاتی ہی ہیں اور انہیں کے قریب قریب ہندوستانی ریاستوں میں بھی قیدین ملتی چلی جاتی ہیں انہر کا ط کرنے سے اس بات میں کچھ شبہ باقی نہیں رہتا کہ اگر اب تک مسلمان اسی خواب غفلت میں رہتے اور

و مشرقی زبان کی قدر پرش نہیں رہی ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ ہائی کورٹ کی وکالت کے امیدواروں کی فہرست میں ایک بھی مسلمان نہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ ایک لائق تحصیلدار عالم علوم مشرقی کو امیدواران ڈپٹی کمشنری کی فہرست میں اس لیے جگہ نہیں مل سکی کہ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا۔“

سرسید کا یہ مضمون ۱۸۸۷ء کا لکھا ہوا ہے جسکو سترہ برس کا زمانہ گزر چکا ہے اور جس کے بعد سرکاری عہدوں کی شرطیں آج تک برابر سخت ہوتی چلی آئی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس عرصہ میں جو تھوڑی بہت ترقی مسلمانوں نے انگریزی تعلیم میں کی ہے اگر اس کا اب تک کچھ ظہور نہ ہوتا تو سرکاری معزز عہدوں پر شاذ و نادر ہی کسی مسلمان کی صورت نظر آتی اور پانچویں نے جو ۱۸۸۷ء میں صوبہ بنگال کی نسبت لکھا تھا کہ ”تمام بنگالہ میں چند مسلمان عہدہ دار ہیں جو جلدیشن لینکے اور انکی جگہ یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونیکا اور آئندہ بجز چراسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدہ پر نہیں دکھائی دیگا“ بعینہ وہی حال صوبہ پنجاب اور اضلاع شمال مغرب و اوڑھ کا ہو جاتا ہے سرکاری عہدوں پر کسی مسلمان کی شکل دکھائی نہ دیتی پس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں جس قدر تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان سرکاری عہدوں پر نظر آتے ہیں۔ عام اس کے کہ وہ محمدن کالج کے تعلیم یافتہ ہوں یا کسی اور کالج کے۔ یہ سب اُسی شو و غل کا نتیجہ ہے جو سرسید نے ولایت سے آکر محمدن کالج قائم کرنے اور مسلمانوں کو اُسکی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے تمام ملک میں ڈال دیا۔

اگرچہ اس صاف اور صریح نتیجہ پر خیال کر نیے بعد اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ خاص کر محمدن کالج کے جن مسلمان طالب علمین نے گورنمنٹ سروس یا ہندوستانی ریاستوں کی ملازمت میں

گورنمنٹ میں محمدن کالج کے طالب علمین کی تعداد

محقق اور موجد و مخترع پیدا ہونے لگیں جیسے انگلستان فرانس اور جرمنی میں پیدا ہوتی ہیں مگر یہ سب ناشدنی باتیں ہیں جنکو ہندوستان کی آب و ہوا اس آتی معلوم نہیں ہوتی۔

لیکن اگر تعلیمی نتائج سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو محمدن کالج میں ضرور ایسی خصوصیتیں موجود ہیں جنکے لحاظ سے اُسکو ہندوستان کے دیگر کالجوں کی نسبت زیادہ مفید کہا جاسکتا ہے۔ از انجملہ ایک نہایت صاف اور صریح خصوصیت کالج مذکور کی یہ ہے کہ اُس میں ہر سال جس قدر روپیہ اسکالرشپوں میں خرچ کیا جاتا ہے ظاہر ہندوستان کے کسی گورنمنٹ کالج یا پرائیویٹ کالج میں صرف نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ مسلمانوں کی مالی حالت کے لحاظ سے یہاں سب جگہ سے زیادہ اس بات میں کوشش کی جاتی ہے کہ جہان تک ممکن ہو غریب طالب علموں کو جو شوقین اور ہونہار معلوم ہوتے ہوں اسکالرشپوں کے ذریعہ سے تعلیم میں مدد دی جائے اور تا بمقدور غریب اور آسودہ حال طلبہ تقریباً یکساں حالت میں طالب علمی کا زمانہ بسر کریں۔ چنانچہ سن ۱۹۱۷ء سے لیکر سن ۱۹۹۶ء تک یعنی چھ سال میں کچھ کم ستائیس ہزار روپیہ اس کالج کے طلبہ کو اسکالرشپوں اور وظیفوں میں دیا گیا ہے۔ اگر ذمہ دار مسلمانوں کو منتظران کالج کی نسبت ایک سوان حصہ بھی قوم میں تعلیم پھیلانے کا خیال ہو تو مذکورہ رقم سے دس حصہ زیادہ روپیہ اس مد میں صرف ہو سکتا ہے

لیکن بڑی خصوصیت اس کالج کی سامان تربیت ہے جسکو بانی کالج نے ہمیشہ تعلیم سے زیادہ اہم اور ضروری سمجھا ہی اور جسکے بغیر فی الواقع تعلیم کا عدم اور وجود برابر ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسکا ہماری درس گاہوں میں کبھی خیال نہیں کیا گیا اور اسی لیے ہم لوگ تربیت کے مفہوم سے جیسی کہ چاہیے واقفیت نہیں رکھتے۔ اگرچہ کالج کے بانیوں نے تربیت کے متعلق بہت کچھ تحریر و

بہت قیمت سمجھنا چاہیے لیکن ان نتائج سے محمدن کالج کی کوئی ایسی خصوصیت ظاہر نہیں ہوتی جسکی
 دوسرے اسکول ہندوستان کے اور کالجوں پر ترجیح دیا سکے یا اسکول مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید
 سمجھا جائے۔ سوائے کہ اس کالج میں ہندوستان کے اور کالجوں کی نسبت مسلمان طلبہ کی تعداد
 کسی قدر زیادہ پائی جاتی ہے کوئی تفاوت تعلیم اور نتائج تعلیم کے لحاظ سے محسوس نہیں ہوتا۔
 نہ بیان کے طالب علموں نے آج تک فضیلت اور علمی لیاقت میں اور کالجوں کے طلبہ پر کوئی صریح
 فوقیت دکھائی ہے اور نہ یہ ثابت کیا ہے کہ یونیورسٹی کے نتائج امتحان میں اس کالج کے تعلیم یافتہ
 بہ نسبت دیگر کالجوں کے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں پس تاوقتیکہ کوئی وجہ امتیاز کی نہ بتائی جائے
 یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر اور اس سے مفید تر کوئی سٹیٹوشن نہیں ہے
 بات یہ ہے کہ نفس تعلیم کے لحاظ سے ہمارے ملک کے کالجوں کو جب تک کہ انکی بااثر ہندوستان
 کی موجودہ یونیورسٹیوں کے ہاتھ میں ہو ایک دوسرے پر ترجیح دینی ناممکن ہے ایک سانچے سے
 ایک ہی سے پرستے ڈھنگ سے نکلتے ہیں اور جس قسم کا بیج بویا جاتا ہے ویسی ہی جنس پیدا ہوتی ہے
 درپس آنہ طوطی صفتم داشتہ اند
 پنچہ ہستاد ازل گفت ہمان مہی گویم
 بارہا خود مدبران سلطنت نے ایجوکیشنل درباروں میں کہا ہے کہ سرکاری کالج اور یونیورسٹیاں
 کامل تعلیم دینے سے قاصر ہیں۔ پس جو تعلیم کا اصلی مقصد ہونا چاہیے اسکول سرورست ہندوستان کے
 کسی کالج میں ڈھونڈنا حاصل ہے ہاں اگر ہندوستانیوں میں اتنی ہمت اور اُس کے ساتھ
 قدرت بھی ہو کہ وہ بھی یورپ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طرح اپنے پرائیویٹ کالجوں میں
 فیاوسٹم جاری کریں یا اپنی یونیورسٹی الگ قائم کریں تو ممکن ہے کہ اس ملک میں بھی ویسی ہی

منسوب کیجاتی ہیں؛ جیسے مذہبی تعصبات، باہمی نزاع، رشک و حسد، غیبت، بدگمانی، کاہلی، تن آسانی، تضييع اوقات، ادائی فرائض میں سستی کرنا، غصہ، بے اعتدالی، نافرمانی وغیرہ اور کچھ شک نہیں کہ انہیں سے اکثر خصلتیں مسلمانوں میں بہ نسبت دیگر اقوام کے زیادہ دیکھی جاتی ہیں۔ یہی باتیں جب چھوٹے بڑوں میں دیکھتے ہیں تو انکی طبیعتوں میں آہستہ آہستہ سرایت کرتی جاتی ہیں اور آخر کار انکی طبیعت ثنائی بنجاتی ہیں۔

انہیں خرابیوں کے تدارک کے لیے محمدن کالج میں بورڈنگ سسٹم قائم کیا گیا ہو۔ مگر پہلے اس سے کہ ہم اس سسٹم کے فوائد اور یہ کہ اسکو طلبہ کی تربیت میں کیا دخل ہو بیان کریں۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح تعلیم کے نتیجے اعداد کے ذریعہ سے دکھائے جاسکتے ہیں اس طرح تربیت کے نتائج نہیں دکھائے جاسکتے۔ نیز تعلیم کا اثر دفعۃً اور نمایان ہوتا ہے اور تربیت کا اثر نامعلوم اور بتدریج ہوتا ہے۔ جس طرح دھوپ اور ہوا اور پانی کی تاثیر سے پودے جواہستہ آہستہ نشوونما پاتے ہیں اُنکا نمو کرنا مالی کے سوا ہر شخص کو فوراً محسوس نہیں ہوتا اسی طرح تربیت کے نتائج بدیہی طور پر ایک مدت کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ چونکہ کالج اور بورڈنگ ہوس کو قائم ہوئے کچھ بہت عرصہ نہیں گزرا ایسے ایمان ہکوز زیادہ تر یہ دکھانا مقصود ہے کہ محمدن کالج میں مسلمان طلبہ کی تربیت کا کیا سامان مہیا کیا گیا ہے؟ وہ کہاں تک انکی حالت کے مناسب ہے؟ اور اُس سے آئندہ کن نتائج کی توقع ہو سکتی ہے؟ نہ یہ کہ اس طریقہ تربیت سے اب تک کیا نتیجے مترتب ہو چکے ہیں؟

تربیت کا خیال

سب سے زیادہ ضرورت مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں میں اتفاق و یکجہتی و قومی ہمدردی پیدا کرنے کی ہے جسکے نہونے سے تمام قوم روز بروز مضحل اور تباہ و برباد ہوتی جاتی ہے۔

اور قریر بن میں بیان کیا ہے باوجود اسکے اکثر لوگ تربیت کے مضموم سے اب تک ناواقف ہیں اور اسی واسطے محمد کالج کے کھیلون پر اور طالب علموں کے لباس وغیرہ پر اعتراض کرتے ہیں۔ اسی خیال سے ہم چاہتے ہیں کہ اس مطلب کو زیادہ وضاحت سے بیان کریں۔ کیونکہ سرسید کی لائف میں اس سے زیادہ کوئی مہتمم بالشان واقعہ نہیں ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی درسگاہ میں تربیت کی بنیاد ڈالی ہے۔

ہمارے ہاں تربیتِ اولاد کا آلہ زیادہ تر تعلیم و تلقین، نصیحت و پسند، زجر و توبیخ، یا زد و کوب کو سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ تمام وسائل جب تک کہ لڑکے ایک معتد بہ زمانہ تک عمدہ سوسائٹی میں نہ رہیں اکثر صورتوں میں محض فضول اور بیکار ثابت ہو سکتے ہیں۔ مذکورہ بالا وسائل سے اول تو اکثر صورتوں میں مضرت تلخ پیدا ہوتے ہیں اور اگر کوئی عمدہ اثر دلون پر ہوتا بھی ہو تو وہ نقشِ ۴ کی طرح جلد زائل ہو جاتا ہے۔ لیکن سوسائٹی کے اثر سے عمدہ اخلاق رفتہ رفتہ طبیعت ثانی بن جاتے ہیں اسی سوسائٹی کے اثر سے اہل یورپ کے اخلاق اصولاً ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اسی سوسائٹی کے میسر ہونے سے ہم لوگوں کے اخلاق و عادات میں باہم زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے لڑکے جب کسی درسگاہ میں آتے ہیں تو بجائے اسکے کہ انکو کچھ سکھایا اور یاد کرایا جائے زیادہ تر اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ اپنے گھروں سے سیکھا آئے ہیں اُسکو بالکل اُنکے دلون سے بھلا دیا جائے۔ قطع نظر اُن عام خرابیوں کے جو ہندوستانیوں کے اخلاق اور معاشرت میں عموماً پائی جاتی ہیں ہم خاص کر اُن چند خصلتوں کا ذکر کرتے ہیں جو بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ

اُن کتاب کے کیرٹون کے جو اپنے تمام قوای دماغی کتاب کی نذر کر دیتے ہیں اور زندہ دلی و شگفتگی اور تمام اُمنگین اور چاؤ بلکہ بعض صورتوں میں اپنی زندگی تک تعلیم پر قربان کر دیتے ہیں۔ جب کالج کو چھوڑتے ہیں تو لکھنے پڑھنے کے سوا وہ دنیا کے تمام کاموں کے لائق ثابت ہوں۔

وہ ہندوستان کی عام حالت کے برخلاف۔ جہاں ایک شخص کا سپاہی اور عالم ہونا گویا اجتماعِ ضدین سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم یافتہ بھی ہوں اور سپاہی بھی۔ وہ اُن فرسودہ دماغوں کی طرح۔ جنہیں اکثر مطالعہ سے محال و برداشت کی طاقت نہیں رہتی۔ چڑچڑے، نازک مزاج، اور بد دماغ نہ بن جائیں۔ اگر اُنکو یورپ میں افسروں کی ماتحتی میں رہنے کا اتفاق ہو تو محنت اور جفاکشی کے موقعوں پر اُنکا ساتھ دینے سے عاجز اور اُنکی نظر میں ذلیل نہ ہوں۔ وہ ملکی اور فوجی دونوں قسم کی خدمات کے لیے انتخاب ہو سکیں۔ اگر اُنکو نوکری میسر نہ آئے تو اپنے دست و بازو پر بھروسہ کر کے ہر کام پر مہم کرنے کی جرأت کر سکیں۔ اُنہیں ایسی مستعدی پیدا ہو جائے کہ بیکاری اور آرام طلبی۔ جو مسلمانوں کی قومی خصلت بن گئی ہے اور جس کے سبب سے عرب میں ”ہندی بھال“ ایک مثال ہو گئی ہے اُنکو وبال معلوم ہونے لگے۔ وہ غیر ملکوں کے سفر سے نہ ہچکچائیں۔ وہ سختیوں کے جھیلنے کے عادی ہو جائیں۔ انہیں اغراض کے لیے محمدن کالج میں ریاضت جسمانی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ محض تعلیم سے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اُس میں دلیری اور مستعدی کا عنصر پیدا نہ ہو۔ لارڈ ڈفرن اپنے عہد حکومت میں جب محمدن کالج کے ملاحظہ کو آئے اور ایڈریس میں کرکٹ وغیرہ کا ذکر سنا تو اُسکا جواب دیتے وقت اُنہوں نے طالب علموں سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ ”ہماری قوم نے

یہ امید رکھتی۔ کہ وعظ و نصیحت سے . باخباروں اور سالون میں اتفاق کے فوائد پر بڑے بڑے
 آرٹیکل لکھنے سے ، یا اس مضمون پر زور دار اور مؤثر نظمیں شائع کرنے سے مسلمانوں میں اتفاق پیدا
 ہو جائیگا۔ ایسی ہی بات ہے جیسے حُب کے عمل سے دشمنوں میں دوستی پیدا کرنی . انہیں اتفاق
 پیدا ہونے کی صورت یہی ایک صورت ہے کہ انکی نسلیں اتفاق کے سایہ میں نشوونما پائیں اور ایک
 مدت تک ایسی سوسائٹی میں زندگی بسر کریں جہاں مختلف خاندانوں ، مختلف صوبوں اور مختلف
 مذہبوں کے لڑکے ایک ہال میں کھانا کھائیں ، ایک مسجد میں نماز پڑھیں ، ایک فیلڈ میں مزارعہ
 کھیل کھیلین ، ایک میدان میں گھوڑے دوڑائیں ، ایک کلب میں ڈبیٹ کریں ، ایک کالج
 میں پڑھیں اور ایک حاطہ میں دن رات سکے بھائیوں کی طرح شہر و شکر ہو کر رہیں اور سطح
 اتفاق کی حلاوت مان کے دودھ کی طرح انکی رگ و پے میں سرایت کر جائے .

ریاضت جسمانی۔ جسکا سامان محمدن کالج میں ہندوستان کے تمام کالجوں سے زیادہ مہیا
 کیا گیا ہے اور جسمین بیان کے طالب علموں نے تمام ملک میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ اکثر لوگ اعتراض
 کرتے ہیں کہ اس سے طالب علموں کی طبیعت تعلیم سے اُچاٹ ہو جاتی ہے اور کالج میں رہنے سے جواہل
 بمقصود ہے وہ حاصل نہیں ہوتا . مگر جس قوم کی تقلید سے ہم اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم دلواتے ہیں
 انکے ہاں ریاضت جسمانی تعلیم کا جزو غیر منفک سمجھی جاتی ہے . لیکن صرف انکی تقلید ہی سے ریاضت
 جسمانی کو محمدن کالج میں ضروری نہیں ٹھہرایا گیا بلکہ اسلئے اسکا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے کہ جو طالب علم
 بیان سے نکلیں وہ قوم میں مستعدی اور جفاکشی کی مثال ہوں اور سستی اور کاہلی جو مسلمانوں کی
 ایک قومی خصلت سمجھی جانے لگی ہے بجائے اسکے وہ انہیں چستی و چالاکی کی بنیاد دالیں . وہ بہر حال

یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ کرکٹ فٹ بال ورجنٹاٹک وغیرہ کے شوقین تعلیم میں کوشش نہیں کرتے یا لکھنے پڑھنے سے انکا دل اُچاٹ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ جس کالج ٹیم نے پچھلے دنوں میں بمبئی اور پارسسی ٹیم اور پٹیاہ ٹیم پر دو نمایاں فتخیں حاصل کی تھیں انہیں کسی گریجویٹ تھے اور باقی جتنے کالج کلاسوں میں پڑھتے تھے وہ سب تعلیم کے لحاظ سے بھی اپنی جماعتوں میں اچھے سمجھے جاتے تھے۔ ایک اور فائدہ بورڈنگ سسٹم سے طالب علموں کے لیے یہ سمجھا گیا ہے کہ بورڈنگ ہوس میں رہنے سے انکو ضبط اوقات کی عادت پڑتی ہے۔ ہندوستان میں سب زیادہ مسلمانوں کی اولاد ترویج اوقات کرنیوالی مشہور ہے؛ حالانکہ جس قوم کی گورنمنٹ سے ہمارے نوجوان نوکریوں کی خواستگار ہیں اُسکا ایک ایک فرد وقت کو اپنی دولت بلکہ اپنا دین و ایمان سمجھتا ہے۔ اور فی الحقیقت جو لوگ وقت کی کچھ قدر نہیں کرتے نہ وہ دین کے فرائض ادا کر سکتے ہیں نہ دنیا کے۔

وقت کی پابندی بھی وعظ و نصیحت سے یا کتابوں میں اُسکی خوبیاں پڑھنے سے یا کسی نفع کی امید یا نقصان کے خوف سے نہیں ہوتی؛ بلکہ ایک مدت تک اُسکی مشق کرنے سے ہوتی ہے۔ محمدن کالج کے بورڈنگ ہوس میں جو صغیر سن اڑکے ایک الگ وارڈ میں رہتے ہیں اُنکی ابتدا ایسی ڈالی گئی ہے جس سے امید ہوتی ہے کہ وہ کالج سے نکل کر ہمیشہ اوقات کے پابند رہیں گے۔

صبح کے پانچ بجے سے رات کے نو بجے تک وہ مختلف فرائض میں جکڑے رہتے ہیں۔ نماز پڑھنا، قرآن پڑھنا، ہوا خوری کرنا، یا گیند بلا اٹھیلنا، مارٹنگ سکول، نائٹ اسکول اور بڑے اسکول میں پڑھنا، کھانا کھانا، مطالعہ دیکھنا اور سونا یا سو کر اٹھنا، غرض ہر ایک کام کے لیے خاص اوقات مقرر ہیں جنہیں بیماری کے سوا کبھی فرق نہیں آنے پاتا۔ ظاہر ہے

پہلی فتح کرکٹ کے میدان میں حاصل کی تھی، ایک حکیم کا قول ہے کہ ”قومی قوت صحت پر منحصر ہے“ اور چونکہ صحت بغیر ریاضت جسمانی کے قائم نہیں رہ سکتی اسلئے یہ کہنا چاہیے کہ قومی قوت ریاضت جسمانی پر منحصر ہے۔

خصوصاً جس قوم کو خدا نے ہم پر حکمران کیا ہے اور جنگی پسند اور انتخاب کے ساتھ ہماری تمام امیدیں وابستہ ہیں اُنکے برابر کوئی قوم رومی زمین پر ریاضت جسمانی کی فریفتہ نہیں۔ اُنکو شیر خوارگی کے زمانہ سے ریاضت کے قابل بنایا جاتا ہے۔ اور جب تک مرض الموت میں مبتلا نہیں ہوتے کبھی ریاضت ترک نہیں کرتے، علاوہ معمولی کھیلوں اور ریاضتوں کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں کوس گھوڑے یا بالیسل پر پیادہ پاسفر کرتے ہیں، کشتیان کھتے ہیں، گاڑیاں ہانکتے ہیں، برف پر دوڑتے ہیں، پہاڑوں پر چڑھتے ہیں، کانوں میں اُترتے ہیں، لکڑیاں چیرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مصر کا ایک لائق مسلمان اپنے سفر نامہ یورپ میں لکھتا ہے کہ ”مخاطرو ممالک میں گھس جانا، اخیر دم تک اپنے ارادہ پر ثابت قدم رہنا اور جب قدر زیادہ مشکلات پیش آئیں اسی قدر زیادہ تہ اور استقلال سے اُنکا مقابلہ کرنا دنیا کی کسی قوم میں ایسا نہیں پایا جاتا جیسا انگریزوں کی قوم میں پایا جاتا ہے“ ایسی قوم کی نظر میں کیا ہمارے نوجوان جب تک کہ اُنھیں کی برابر بلکہ اُنسے زیادہ جفاکش، محنتی، دلیر اور مستعد نہ ہوں محض کتاب کا کیرا بننے سے کچھ اعتبار یا وقعت حاصل کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ جو لوگ گورنمنٹ سے یہ چاہتے ہیں۔ کہ ہلکو والنٹیر بنایا جائے اور ہکو فوج میں معزز عہدہ دیے جائیں۔ جب تک کہ وہ بھی مثلاً انگریزوں کے اپنے تیمن ایجوکیٹڈ سپاہی نہ بنائیں ہرگز ایسی خواہش کرنے کا اتھاق نہیں رکھتے اور اسی لیے محمدن کالج کے بانیوں نے ریاضت جسمانی کو تعلیم کا جزو غیر منفک قرار دیا ہے۔

تو کس قدر باقاعدگی اور اطاعت انکی طبیعت میں پیدا ہو جائیگی؟ اور کس قدر وہ دنیا میں ہر جگہ ہر دل عزیز ہو کر رہنا سیکھ جائینگے؟

ایسی اطاعت جو قواعد و اصول پر مبنی ہو اسکی عادت اولاد کو ابتداء سے عمر میں ڈلوانی ایسی ہی ضروری ہے جیسے ایل بچھڑے کو سدھا کر اور باگون پر صاف کر کے سواری کے قابل بنانا۔ جس طرح اونکے اور سرکش گھوڑے کا کوئی خریدار نہیں ہوتا اسی طرح نافرمان آدمی کہیں عزیز نہیں سمجھا جاتا۔ اکثر انگریز افسروں نے لوگوں سے یہ شکایت کی ہے کہ مسلمان ایسے فرمان بردار نہیں ہوتے جیسے ہندو؛ اور اسی لیے یورپین افسرانکی نسبت ہندوؤں کو زیادہ پسند کرتے ہیں اگر فی الواقع یہ شکایت صحیح ہے تو مسلمانوں کی اولاد جنکا مدار معاش اب تک صرف نوکری پر رہا ہے انکو سب سے زیادہ اطاعت اور فرمانبرداری سکھانے کی ضرورت ہے۔ یہ سمجھنا کہ آزادی اور اطاعت میں منافات ہے صحیح نہیں ہے۔ انگریزوں کی قوم دنیا میں سب سے زیادہ آزاد خیال اور آزاد طبع سمجھی جاتی ہے؛ حالانکہ اُنسے بڑھکر کوئی اپنے افسر کا حکم ماننے والا اور قانون پر چلنے والا اور قواعد کی پابندی کرنے والا نہیں ہوتا۔ پس محمدن کالج کے بورڈنگ ہوس میں رہنے سے مسلمانوں کی اولاد ایک ایسی خصلت سیکھتی ہے جسکو انکی تمام آئندہ کامیابیاں منحصر ہیں۔

تو کیا اس کا خیال

اسکے سوا مسلمانوں میں قومیت کا خیال پیدا کرنے کے لیے ایک اور چیز کی ضرورت ہو جسکو آج تک ہندوستان کے عام مسلمانوں نے قابل تفات نہیں سمجھا؛ حالانکہ وہ ایک نہایت متم بالشان مسئلہ ہے لباس جسکی نسبت ہمارے بزرگوں کا یہ قول تھا کہ ”النَّاسُ بِاللِّبَاسِ“ اور جس کا ایک قوم کی دوسری قوم سے تمیز کجاتی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس میں کوئی اختیار باقی

کہ آٹھ دس برس تک جب انکی زندگی اس پابندی اوقات کے ساتھ گزرے گی تو امید نہیں کہ وہ عمر بھر اس عادت کو ترک کر سکیں اگرچہ بڑی عمر کے لڑکوں کے لیے بھی فرائض اور اوقات مقرر ہیں مگر جو عادت بچپن میں ڈالی جاتی ہے وہ طبیعت ثانی ہو جاتی ہے، بخلاف بڑی عمر کے لڑکوں کے کہ اول تو انکو بچپن کی برابر کالج میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوتا، دوسرے جو عادتیں وہ باہر سے سیکھ کر آتے ہیں انکا زائل ہونا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے محمدن کالج میں بچپن سے رہنا نسبت بڑی عمر کے لڑکوں کے زیادہ مفید ہے۔

شریانیہ اور باقاعدہ اطاعت و فرمانبرداری جو ہر قوم کا اور خاص کر محکوم قوم کا زیور ہے انکی عادت ڈالنے اور مشق کرائیے جو ذریعے اس بورڈنگ ہوس میں موجود ہیں ظاہر ہندوستان کے کسی انسٹیٹیوشن میں موجود نہیں ہیں۔ علاوہ کالج اور ہائی اسکول اور مائٹنگ اسکول اور نائٹ اسکول کے جہاں طالب علموں کو برابر پروفیسروں اور ماسٹروں کی آرڈر میں رہنا ضروری ہے وہ ہر وقت اپنے تئیں کسی نہ کسی ہڈیا افسر کے زیر حکم پاتے ہیں۔ جب تک وہ بورڈنگ ہوس میں ہیں پرائکٹر کے محکوم ہیں، جب تک ڈائینگ ہال میں رہتے ہیں ایک یورپین پروفیسر انکا نگران رہتا ہے، اسی طرح فیلڈ میں پرووڈنٹ یا کیپٹن، یونین کلب میں پریسڈنٹ یا اسکا قائم مقام، جمناسٹک اور قواعد کے وقت ڈرل ماسٹر، گھوڑے کی سواری کے وقت رائڈنگ ماسٹر بیماری کی حالت میں ڈاکٹر، اور مسجد میں ایک دیندار عالم انکی روک ٹوک کے لیے مقرر ہیں جبکہ حکم ماننا انکو ضرور ہے۔

ظاہر ہے کہ جب برابر آٹھ سات برس طالب علموں کی زندگی ان ضوابط کے ساتھ بسر ہوگی

ہونیکے ہر موسم اور ہر حالت کے مناسب اور قواعد حفظ صحت کے بھی موافق ہے۔ اور جب وہ کالج چھوڑ کر وہی لباس اپنے وطن میں جا کر پہنتے ہیں تو اکثر قوم کے نوجوان اُنکی دیکھا دیکھی وہی لباس اختیار کر لیتے ہیں اور سطح محمدن کالج ہندوستان کے مسلمانوں میں آہستہ آہستہ ایک قومی لباس کو رواج دے رہا ہے۔

اگرچہ بعض تنگدل انگریز جو ہندوستانیوں کو ہمیشہ سبت اور ذلیل حالت میں دیکھنا پسند کرتے ہیں وہ اس لباس سے ناراض ہوتے ہیں لیکن چونکہ گورنمنٹ نے ہر قسم کا لباس پہننے کی آزادی دی ہے اور انگریزوں میں بھی زیادہ تر وہی فیاض اور آزاد طبع لوگ ہیں جنکا ایسے تعصبانہ خیالات نہیں ہیں اسلئے محمدن کالج کے طالب علم نہایت آزادی سے ٹرکش لباس پہنتے ہیں اور کسی کی بیجا ناخوشی یا ناگواری کا خیال نہیں کرتے۔

کالج کی سرسائیاں

نیز بورڈروں نے کالج کے احاطہ میں متعدد سوسائٹیاں قائم کر رکھی ہیں۔ ازاں جملہ ایک کالج یونین کلب اور دوسری اسکول یونین کلب ہے۔ کالج اور اسکول کے طلبہ ہفتہ میں ایک روز مختلف مضامین پر اپنے اپنے صدر انجمن کے روبرو انگریزی یا اردو میں معارضہ بحث کرتے ہیں انگریزوں کی بات داب مناظرہ اور تہذیب کے خلاف زبان پر نہیں لاسکتے۔ جو لڑکے ڈبیٹ یا اسپیکنگ میں عمدہ لیاقت ظاہر کرتے ہیں انکو انعام دیے جاتے ہیں۔ اس سے علاوہ اسپیکنگ اور استدلال کا ملکہ پیدا ہونیکے۔ بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں جو مجاہدہ کا ناپسندیدہ طریقہ عموماً جاری ہے اُسکی اصلاح کی انہیں بنیاد پڑتی ہے اور طالب علموں کو مختلف سوالات پر بحث کرنیکے لیے مختلف کتابیں دیکھنے اور ہر ایک سوال پر اپنے قائم کرنا موقع ملتا ہے۔

نہیں رکھا۔ انگرکھا، پاجامہ، ٹوپی، عامہ، پگڑی یا جوتا غرض کہ کوئی چیز مسلمانوں کے لباس میں ایسی نہیں ہے جس پر قومی خصوصیت کا اطلاق ہو سکے۔ ہندو مسلمانوں میں پہلے صرف اٹے اور سیدھے پردے کی تمیز تھی مگر جب سے چکن کارواج ہوا ہے یہ تمیز بھی باقی نہیں رہی۔ قطع نظر ان ملکوں کے۔ جہاں ہر قوم ایک خاص لباس کھتی ہے۔ خود ہندوستان میں اکثر معزز قومیں ہیں جو صرف اپنے قومی لباس سے پہچانی جاتی ہیں، جیسے پارسی، مرہٹے، بنگالی، راجپوت وغیرہ۔ مگر مسلمانوں کے لباس میں کوئی قومی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ لباس کا متحد ہونا قومی یکانیت کے بڑھانے اور مغایرت کے دور کرنے میں ویسا ہی دخل رکھتا ہے جیسا زبان، فسل اور مذہب کا متحد ہونا۔ اسکے سوا جس قوم کے لباس میں کوئی قومی خصوصیت نہیں ہوتی انکی مجلسیں، انکے میلے اور انکی عتیمیں دوسری قوموں کی نظر میں ایک گویا ہر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

اسی سبب سے سر سید کو ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی اور قوموں کی طرح اپنے لباس میں کوئی خصوصیت اور ماہرہ الاتیاز پیدا کریں، اور چونکہ بقول انکے آج ہندوستان میں کوئی مسلمان اتھارٹی ایسی موجود نہیں ہے۔ جو ایک نیشنل لباس اختراع کرے اور اسکے رواج دینے پر زور دے۔ اسلئے انھوں نے مسلمانوں کی ایک معزز ترین قوم یعنی ترکوں کا لباس اول خود اختیار کر کے قوم میں ایک مثال قائم کی اور پھر محمدن کالج کے بورڈروں کے لیے اس قاعدہ کے موافق جیسرا قسطنطنیہ کی درگاہوں میں عملدرآمد ہے یونی فارم کا قاعدہ جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر بعض عناصر کے سبب وہ قاعدہ جاری نہیں ہو سکا۔ لیکن محمدن کالج کے طالب علم جو بورڈنگ ہوس میں آکر رہتے ہیں بغیر کسی جبر کے اپنے ہتھیاروں کو دیکھ کر خود بخود ترکش لباس اختیار کر لیتے ہیں جو علاوہ خوش قطع اور خوش

ہندوستانی ٹیمون مین۔ جیسا کہ کالج کی سالانہ رپورٹوں سے ظاہر ہے۔ توقع سے بہت زیادہ شہرت حاصل کی ہے۔

تربیتی تعلیم

مذہبی تعلیم و تربیت بھی اس کالج کی خصوصیات میں سے ہے۔ اگرچہ اسپین شک نہیں کہ یہ شاخ جیسی کہ ایک محمدن کالج میں ہونی چاہیے ابھی تک اس درجہ پر نہیں پہنچی لیکن اس کا الزام سرمد یا کالج کے اور منتظموں پر عائد نہیں ہوتا۔ اول تو وہ مذہبی کمیٹیاں جو شیعہ اور سنی دونوں کی مذہبی تعلیم کی نگرانی اور انتظام کے لیے جدا جدا مقرر تھیں اور جن سے سرمد نے کوئی بدگمانی کے خیال سے خود علیحدگی اختیار کی تھی انھوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ دوسرے دینی تعلیم کے کورس جو یونیورسٹی وقتاً فوقتاً مقرر کرتی ہے وہ اس قدر مشکل و رطوبیل الذیل ہوتے ہیں کہ اُنکے پورا کرنے میں طلبہ کو دوسری طرف متوجہ ہونے کا بہت ہی کم موقع ملتا ہے؛ یہاں تک کہ رائی پور مذہبی تعلیم کا زیادہ بوجھ ڈالا جائے تو وہ حال سے خالی نہیں؛ یا تو وہ کالج چھوڑ دیں گے یا یونیورسٹی کے امتحانوں میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ بالآخر جب قدر مسلمانوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا اہتمام اس کالج میں کیا جاتا ہے اور جسکی تفصیل اسکی سالانہ رپورٹوں میں ہمیشہ چھپی ہے۔ ہندوستان کے کسی کالج میں اس کا وجود نہیں ہے۔

یہ سچ ہے کہ انگلستان کے جن کالجوں کی تشکیل سے اس کالج میں تربیت کا مذکورہ بالا سامان مہیا کیا گیا ہے اُنکے مقابلہ میں اس کالج کو مشہور کل سے ایک خاک یا ایک دھوا نمونہ اُن کالجوں کا کہا جاسکتا ہے؛ لیکن اسکے ساتھ ہی جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ انگلستان کے مذکورہ بالا کالج کتنی کتنی مدت میں موجودہ حالت تک پہنچے ہیں تو جس حد تک علی گڑھ محمدن کالج میں بائیس

طالب علموں ہی نے ایک دوکان ڈیوٹی شاپ کے نام سے بورڈنگ ہوس میں کھول رکھی ہے جو مختلف طریقوں سے روپیہ جمع کر کے کالج اور طلبہ کی مدد کرتی ہے اس سے اُنکے دل میں کالج کے ساتھ ہمدردی اور اُسکی امداد کے لیے عملی کام کرنے کی خود بخود ترغیب ہوتی ہے ۔

ایک اور سوسائٹی برادر ہڈ کے نام سے قائم کی گئی ہے جس میں اُن تمام طالب علموں نے جو تعلیم ختم کرنے کے بعد کمین نوکر ہو گئے ہیں اپنی آمدنی میں سے فیصدی ایک روپیہ ماہوار چندہ محض کالج کی امداد کے لیے دینے کا وعدہ کیا ہے ۔

اسکے سوا دو اور سوسائٹیاں ہیں ایک انجمن اخوان الصفا جس میں اُسکے ممبر آزادی کے ساتھ مختلف عنوانوں پر مضامین لکھ کر پیش کرتے ہیں ۔ دوسری بجنۃ الادب جو عربی زبان میں تقریر یا تحریر کی مشق کر نیکے لیے قائم کی گئی ہے ۔

ایک اور سوسائٹی حال ہی میں سائنس پر لکچر دینے اور اُسکے تجربے دکھانے کے لیے طالب علموں نے قائم کی ہے جس کا مقصد ہندوستانیوں میں علمی مذاق پیدا کرنا ہے ۔ یہ سوسائٹی اگر ابھی ابتدائی حالت میں ہے مگر چونکہ وہ زمانہ کے مقتضا کے موافق ہے اس لیے اُسکے ترقی کرنے کی بہت کچھ امید کی جاتی ہے ۔

ان سب سوسائٹیوں کے علاوہ ریاضت جسمانی کے لیے کرکٹ اور فٹ بال ورجمناٹک کلب اور گھوڑے کی سواری کے لیے رائڈنگ سکول ہے ۔ اگرچہ رائڈنگ سکول نے مسلمانوں کی کم ہمتی یا بے مقدوری کے سبب ابھی تک کچھ زیادہ ترقی نہیں کی مگر جو کلب ریاضت جسمانی کے لیے قائم ہیں ان میں توقع سے بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے جسکی وجہ سے کالج ٹیم نے تمام ہندوستان کی پورویں اور

جیسا انگریز پروفیسروں کا پرسکتا ہے۔ ڈیوٹی کا خیال، وقت کی قدر، قواعد حفظ صحت کی پابندی، سلف بلب، مستعدی اور ریاضت جسمانی کی عادت؛ یہ تمام خصلتیں یورپ میں بھی نگلش قوم کی خصوصیات میں شمار ہوتی ہیں۔ خصوصاً انگلستان کی مشہور یونیورسٹیوں کے گریجویٹ شریفانہ اخلاق کے لحاظ سے تمام قوم میں ممتاز گئے جاتے ہیں۔ اسکے سوا کالج کا نظم و نسق اور افسرانہ رعب و داب جیسا کہ ایک انگریز معلم کالج یا اسکول میں قائم رکھ سکتا ہے ہندوستانی معلموں سے اُسکی ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی۔ اسی لیے کالج کے قواعد میں یہ اصول قرار دیا گیا ہے کہ کم سے کم ایک پرنسپل اور دو پروفیسر کالج میں اور ایک ہڈ ماسٹر اسکول میں ہمیشہ یوروپین ہونا چاہیے اور جہاں تک کالج کی آمدنی میں گنجائش ہو اس تعداد میں اور اضافہ کیا جائے اور جب کسی یوروپین پروفیسر کی ضرورت ہو تو انگلستان کی کسی مشہور یونیورسٹی کا گریجویٹ جسکی علمی اور اخلاقی فضیلت پر اُسکے استادوں نے شہادت دی ہو ایک ہزار روپیہ سفر خرچ دیکر بلایا جائے۔ چنانچہ اب تک چار چار پانچ پانچ یوروپین افسر کالج اور اسکول میں برابر مقرر رہے ہیں اور اگر کالج فنڈ میں گنجائش ہو تو ممکن ہو کہ عند الضرورہ اُنکی تعداد اس سے زیادہ بڑھ جائے۔

اگرچہ بظاہر جو ہمیش قرار تنخواہ میں یوروپین عہدہ داروں کو دی جاتی ہیں وہ کالج کی مالی حیثیت سے بہت زیادہ معلوم ہوتی ہیں لیکن حق یہ ہے کہ یوروپین اسٹاف نے عام طور پر اُس ضرورت کو بخوبی ثابت کر دیا ہے جسکی بنا پر سرسید نے اُنکو کالج کا جزو اعظم قرار دیا ہے۔ وہ باوجود قومی، مذہبی اور ملکی مغایرت کے محمدن کالج کو گویا اپنا قومی انسٹیٹیوشن سمجھتے ہیں، وہ اپنے طلبہ کے ساتھ مشفقانہ اور برادرانہ برتاؤ رکھتے ہیں، اُنکے کھیلوں میں، اُنکی دعوتوں اور پارٹیوں میں، اُنکی

برس کے عرصہ میں پہنچ گیا ہے اس سے کچھ کم تعجب نہیں ہوتا۔ انگلستان کے بڑے بڑے نامور کالج اور یونیورسٹیاں جو آج تمام یورپ میں مشہور و معروف ہیں کئی کئی سو برس تک نہایت گمنامی اور پستی کی حالت میں رہی ہیں اور حسبِ طرح بتدریج قوم میں تعلیم بڑھتی گئی اُسی طرح آہستہ آہستہ اُنکی حالت ترقی کرتی گئی۔ پس ہم کو اس کالج کی موجودہ حالت پر نظر کرنی نہیں چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ جن اصول پر وہ قائم کیا گیا ہے اگر انہیں اصول کے موافق وہ ترقی کرتا چلا گیا تو پچاس ساٹھ ہی برس میں وہ کس درجہ پر پہنچ جائیگا۔

بے شک کالج کے اندرونی انتظامات میں بہت سی باتیں قابلِ اعتراض موجود ہیں جسکو سر سید کی خود رائی اور ضد اور ہٹ کا نتیجہ کہا جاتا تھا اور کچھ شبہ نہیں کہ لوگوں کا یہ کہنا بالکل غلط نہ تھا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ صدیوں کے کام مہینوں اور دنوں میں پورے نہیں ہو سکتے اور ایک شخص کی طاقت سے باہر ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک قومی انسٹیٹیوشن کو اُس حد تک پہنچا جائے جسکے بعد کسی اصلاح یا ترقی کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اور ایک رفارمر جس نے اگلے وقتوں کے بہت سے خیالات اور بہت سی رایوں کی اصلاح کی ہو اُسکا یہ کام نہیں ہے کہ وہ ساتھ کے ساتھ اپنے خیالات اور اپنی رایوں کی بھی اصلاح کرتا جائے۔

ایک اور خصوصیت اس کالج کی یورپین اسٹاف ہے جسکو بانی کالج نے متعدد وجوہ سے نہایت اہم اور ضروری سمجھا ہے۔ اُنکی رائے تھی کہ اول تو ہندوستانی تعلیم یافتہ علمی لیاقت اور طرزِ تعلیم کے لحاظ سے بھی یورپین پروفیسروں کی برابری نہیں کر سکتے اور اگر بالفرض ایسے لائق ہندوستانی پروفیسر میسر بھی آجائیں تو اُنکا اثر طلبہ کی تربیت پر جو اس کالج کا اصلی مقصود ہے ویسا ہرگز نہیں پڑ سکتا

اس قدر افسوس ہوا تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً کالج کلاسوں کے طالب علم جو انکا کچھ سنتے تھے انکو مسٹر آرنلڈ کی اور مسٹر آرنلڈ کو انکی جدائی کا جس قدر رنج اور قلق ہوا تھا اسکی مثال ملنی مشکل ہے اسے پہلے جب مسٹر والس پروفیسر اور مسٹر ہورسٹ ہڈ ماسٹر نے کالج سے قطع تعلق کیا تھا اسوقت بھی تمام کالج کو اسی کے قریب قریب رنج ہوا تھا جیسا کہ اس سال مسٹر آرنلڈ کے جانے سے ہوا اور اسی طرح مسٹر ڈنٹن مرحوم ہڈ ماسٹر کے قبل زوق مر جانے پر کالج کے تمام متعلقین نے مثل اپنے عزیزوں کے رنج و ماتم کیا ہے۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کالج کو ہمیشہ ایسے ہی دلسوز اور مسلمانوں کے ہمدرد پروفیسر ملتے رہینگے جنکا ذکر اوپر ہوا یا جیسے کہ اب کالج میں موجود ہیں لیکن بہر حال یورپین اسٹاف کا اس کالج میں ہونا خاص کر مسلمانوں کی حالت کحاط سے نہایت ضروری ہے۔

غدر شہ عے۔ بلکہ اسوقت سے جبکہ ہندوستان کی سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر انگلش قوم کے ہاتھ میں گئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا حال بعینہ ایک نوجوان بیو کا سا رہا ہے کہ کیسی ہی عقیقہ اور پاک امن ہو مگر بدگمانیوں سے کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ پس ہندوستان کے مسلمانوں کو جس طرح اپنے مذہب کی رو سے اس بات کی ضرورت ہے کہ سچے دل سے انگلش گورنمنٹ کے وفادار رہیں اسی طرح ملکی مصلحت سے یہ بھی ضرور ہے کہ حکمران قوم کو کبھی اپنی طرف سے بدگمان ہونے کا موقع نہ دیں۔ آج کل انگریزی تعلیم سے انگریزوں میں تقریباً ویسی ہی بدگمانی پائی جاتی ہے جیسی کسی زمانہ میں جہالت اور تعصب سے پائی جاتی تھی۔ پس ایک ایسا انسٹیٹیوشن جہاں چار چار سو مسلمان طالب علم ایک وقت میں انگریزی تعلیم پاتے ہوں اور کئی کئی برس تک دن رات وہیں زندگی بسر کرتے ہوں۔ جب تک کہ اس میں متعدد یورپین افسرانے نگران اور

مجلسوں میں، اور انکے مباحثوں میں خود بھی شریک ہوتے ہیں اور اسٹیشن کے پورے بین افسروں اور انکی لیڈیوں کو شریک کرتے ہیں، اور اس طرح انکا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ گورنمنٹ اور انگریزوں کی نظر میں انکا اعتبار زیادہ ہو۔ انکو گورنمنٹ کا ادب اور انگریزوں کی محبت سکھاتے ہیں۔ خود انکا برتاؤ جو ہندوستانی طالب علموں کے ساتھ ہے انگلش نیشن کی محبت اور وقعت انکے دل میں پیدا کرتا ہے۔ وہ طرح طرح سے انکو غیرت دلاتے ہیں اور انکی غفلت کے نتائج سے انکو خبردار کرتے ہیں۔ وہ اپنی عمدہ خصلتوں، شایستہ عادتوں، فرائض کی پابندی، صفائی، ضبط و اتقا اور دیگر خوبیوں سے طالب علموں کے کیرئیر پر نہایت قوی اور پائیدار اثر پیدا کر رہے ہیں جو کسی اور طریقہ سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ غریب طالب علموں کی طرح طرح سے امداد اور تقویت کرتے ہیں، بیارون کی خبر لیتے ہیں، کالج کے چندوں میں شریک ہوتے ہیں، اسکی ترقی کی تدبیریں سوچتے ہیں، اسکی محبت طالب علموں کے دل میں پیدا کرتے ہیں اور اس میں وہ تمام انتظامات اور تربیت کے طریقے جو انگلستان کے کالجوں میں جاری ہیں آہستہ آہستہ جاری کرتے جاتے ہیں۔ وہ باوجود مذہبی اختلاف کے مسلمان لڑکوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا خیال خود مسلمانوں سے زیادہ رکھتے ہیں۔ مسجد کی غیر حاضری پر انکو سزا میں دیتے ہیں، مذہبی تعلیم اور قرآن خوانی کی انکو تاکید کرتے ہیں، مولود کی مجلسوں اور انکے دیگر مذہبی اجتماعوں میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک بڑا بدیہی ثبوت اس بات کا کہ وہ محمد کالج میں کس وقعت اور محبت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ ہے کہ مسٹر آرنلڈ پر وفسر آف فلازفی جو کالج کی بد قسمتی سے بیان کا تعلق ترک کر کے لاہور کالج میں چلے گئے ہیں۔ انکی روانگی کے زمانہ میں ہر شخص کو جو کالج سے تعلق رکھتا تھا

سید کی ملی شاہ اور انگلستان

سید کی ملی شاہ اور انگلستان

جو رائیمن اور خیالات محمدن کالج یا اسکے طلبہ اور اسکے بانی کی نسبت مدبران سلطنت نے وقتاً فوقتاً اپنی تحریروں یا تقریروں میں ظاہر کیے ہیں انہیں سے کچھ کچھ فقرے انتخاب کر کے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

سنتھامین سر جان سٹرن ہچی نے اس ایڈریس کے جواب میں جو ہندوستان سے جاتے وقت انکو کالج میں دیا گیا تھا کہا کہ ”سب بڑا اور اخیر کام جس میں انہوں نے (یعنی سید احمد خان نے) اپنی زندگی اور اپنے تمام وسائل کو صرف کیا ہے یعنی اپنے ہوطنوں کی تعلیم اور انکی حالت کو ترقی دینے اور مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان زیادہ تر اتھا اور سہر دی پیدا کر لے کا وہ کام ہے جسکے بعض نتیجوں کو ہم شاید دیکھ رہے ہیں۔ مجھکو کچھ شبہ نہیں کہ یہ نتیجے زمانہ آئندہ میں اور بھی زیادہ عجیب و غریب ہونگے۔ لیکن اب بھی میں اس کالج کی ترقی کو شمالی ہندوستان کی مٹھی تواریخ کے نہایت عظیم اور دلچسپ واقعات میں سے تصور کرتا ہوں“

پھر صاحب ممدوح نے اپنی کتاب ”انڈیا“ میں اول ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ کا یہ فقرہ جو محمدن کالج کے متعلق ہے نقل کیا ہے کہ ”بعض اعتبارات سے یہ کالج ہندوستان میں سب سے ٹیٹیشنوں سے اعلیٰ درجہ کا انسٹیٹوشن ہے جو تعلیمی اور ملکی دونوں حیثیتوں سے بڑی عظمت اور وقعت کا وہ مدہ کرتا ہے۔ انگریزی حکومت کے آغاز سے لیکر اب تک مسلمانوں کی ذاتی کوشش کا یہ پہلا اظہار ہے۔ علی گڑھ کی جماعت نے ایک مثال پیدا کی ہے جسکی اگر اچھی طرح سے پیروی کی جائے تو قومی تعلیم کا مسئلہ حل کر دیگی۔ اُن لوگوں کی جنہوں نے ایسی دلسوزی سے محنت کی ہے اور اُس رقعہ کی جو سرکار کو تعلیم اور ترقی کے کام میں ملا ہے جہاں تک قدر و منزلت کی جائے نامناسب نہوگی“ اسکے بعد وہ اپنی کتاب ”انڈیا“ میں اہل انگلستان سے محمدن کالج کی سفارش کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ”انہیں (یعنی اہل انگلستان کو) اپنی مدد سید احمد خان کے کالج کے واسطے بھیجی جا رہی ہے۔ انکو اس زیادہ طاقت بخش موقع نیکی کرنا نہیں ملے گا“

ان کے خیالات کی اصلاح کریندے موجود نہوں ہرگز حکمران قوم کے اطمینان کے لائق نہیں ہو سکتا۔
 انہیں خیالات سے سرسید نے کم سے کم چار یورپین افسروں کا ہمیشہ کالج اور اسکول میں
 رہنا کالج کے قواعد میں داخل کر دیا ہے اور اس تدبیر سے کالج کو بہت فائدہ پہنچا ہے اور اس سے
 بہت زیادہ فائدے پہنچنے کی آئندہ توقع ہے۔ زیادہ تر اسی خصوصیت کی وجہ سے گورنمنٹ ہندو ہزار
 چھ سو روپیہ سالانہ کی امداد اس کالج میں دیتی ہے اور اسی سبب سے تمام انگریز افسرین افسر و حکام عموماً
 اس کالج کی نسبت عمدہ خیال رکھتے ہیں۔ دور دور سے نابالغ سردار زادوں اور رئیس زادوں کو تعلیم
 کے لیے یہاں بھیجتے ہیں، ہر صوبہ میں بیان کے طالب علموں کو خوشی سے نوکریاں دیتے ہیں۔ بعض
 اوقات پرنسپل سے خود درخواست کر کے یہاں کے طلبہ کو نوکری کے لیے بلاتے ہیں، بڑے بڑے جلیل القدر
 انگریز کالج کو آکر دیکھتے ہیں، چارولیسری اور چھ سات لفٹ گورنرا تک یہاں آچکے ہیں، لارڈ ناتھ
 بروک نے دس ہزار روپیہ اسکا لرشپوں کے لیے اس کالج کو عنایت کیا ہے اور ان کے سوا کئی ویسٹروں
 لفٹ گورنروں نے اس میں چند ہائے دیے ہیں خصوصاً سیر کی وفات کے بعد جو خاص توجہ اور مہربانی سیر
 خصوصاً لارڈ لنگن اور ایریل سٹراٹھم اور خاصکر سنوٹنی مکڈنل نے کالج کی نسبت ظاہر فرمائی ہے
 اس کی شکرگزاری سے ہندوستان کے تمام مسلمان عموماً اور منتظمان کالج خصوصاً کسی طرح سبکدوش
 نہیں ہو سکتے اور کچھ شک نہیں کہ یہ تمام امتیازات زیادہ تر یورپین اسٹاف اور خاصکر مسٹر
 تھیوڈور بک پرنسپل کالج کی بدولت اس انسٹیٹیوشن کو حاصل ہوئے ہیں۔ انہیں جو ہات سے
 سرسید کالج کی باگ کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں جانی نہیں چاہتے تھے جس سے یورپین اسٹاف کے
 ساتھ ویسا ہی برتاؤ رکھنے کی۔ جیسا کہ وہ خود ان کے ساتھ رکھتے تھے۔ توقع نہو۔

حزب کا نام

سراکلنڈ کالون نے محمل کالج کے طالب علموں کی نسبت کہا کہ ”جو شخص ان دنوں
سے واقف ہے جو اس کالج سے پاس ہو کر نکلے ہیں وہ غالباً اس امر میں مجھے اتفاق کریں گے کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کی
علامتیں ایسی ہی صاف صاف ظاہر کرتے ہیں جیسی کہ انگلستان میں ہمارے پبلک اسکولوں اور ہماری یونیورسٹی
کے گریجویٹ ظاہر کرتے ہیں۔ علی گڑھ کالج کا طالب علم فیاضانہ خیالات اور ترقی یافتہ تعلیم و تربیت اور آزادانہ
نصرت رکھنے والا شخص خیال کیا جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر وہ ہندوستانیوں کے اُس فرقہ کا ایک نمونہ ہو گیا ہے جو
انگریزوں کی خواہش کی بخوبی داوری کے واسطے کوشش کرتا ہے اور اُس کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ ہم بھی اُنکی خواہشوں
کی اسی طرح داد دیں۔“

تدریس میں ترقی

مسٹر کین۔ جو پارلیمنٹ کے ایک نامور اور بنی نوع کے خیر خواہ ممبر ہیں اور جو پچھلے برسوں
میں شراب اور مسکرات کے استعمال کے خلاف ہندوستان میں لکھ دینے اور اعلیٰ حالات تحقیق کرنے
پہ اتھے۔ انھوں نے سفر ہندوستان کے متعلق ایک کتاب موسوم بہ پیکر سٹ انڈیا لکھی ہے
جس کے ایک باب میں علی گڑھ کالج کی نسبت نہایت عمدہ اور مفصل خیالات ظاہر کیے ہیں۔ انہیں سے
ہم چند فقروں کا خلاصہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ”محمد اننگلو اور نیٹل کالج دوسرے
کالجوں سے اس بات میں امتیاز رکھتا ہے کہ وہ ایک خالص تعلیمی جوش کی نسبت زیادہ تر ایک پولٹل جوش پھیلانے والا ہو۔
اسی فیلنگ کا۔ یعنی اس بات کا کہ قوی بہودی اسی اصول پر منحصر ہے جبکا وہ پابند ہے۔ یہ نتیجہ ہے کہ اُسکی بڑی امداد
کی گئی ہے۔ نہ صرف مسلمانوں کا ترقی یافتہ گروہ بلکہ گورنمنٹ انگریزی بھی نہایت توجہ اور شوق سے اُسکی جانب نظر
رکھتی ہے۔“ دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں کہ ”گورنمنٹ کالجوں سے یہ کالج دو خاص باتوں میں مختلف ہے۔ اول تو
انہیں مسلمان طالب علموں کی مذہبی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ اذان کی آواز سن کر طالب علم اس

جاکر پڑھو

ڈاکٹر ہنٹ نے ۱۸۸۲ء میں جبکہ وہ ایجوکیشن کمیشن کے پریذیڈنٹ تھے اضلاع شمال مغرب کے دورہ کے وقت صرف محکمہ کالج کی عظمت و شان کے لحاظ سے کمیشن کا پہلا اجلاس علی گڑھ میں کیا اور اپنی اخیر اسپیکر جوائنٹ کمیشن کے باب میں تھی وہ کالج کے بڑے ہال میں آکر کی اور کالج کی نسبت کہا ”وہ صاحبو یہ کالج جس میں ہم جمع ہوئے ہیں۔ چونکہ یہ ایک نہایت عظیم اور شریف کوشش کا نتیجہ ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے کی گئی ہے۔ اس لیے کمیشن کا پہلا اجلاس جو اضلاع شمال مغرب میں ہونا چاہیے تھا علی گڑھ میں تجویز ہوا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہماری موجودگی اور اس مقام پر آنا اس سلف ہلپ کی عظیم الشان مثال کی خوبی کا ایک ثبوت خیال کیا جائیگا۔ اگر ایسی ہی چند مثالیں سلف ہلپ کی اور ہوں تو ہندوستان میں ایجوکیشن کمیشن کی ضرورت نہ رہے گی“ پھر کہا کہ ”یہ ایک نہایت شریف کام ہے جو کسی فانی انسان کے ہاتھوں سے دنیا کے پروردگار پر ہوا ہو اور یہ میرے پاس موجود ہے وہ بہادر اور فیاض دل شخص جسے بیس برس کی پُرصورت و پر استقلال کوششوں سے اس کام کو انجام دیا ہے“ پھر کہا کہ ”پہلے دس برسوں میں میرے دوست سید کوثر الیوسیون۔ موندہ دیکھنا پڑا اور اس کے اختیار کیے ہوئے کام میں بہت کم ترقی ہوئی۔ اُس کو اپنے بعض خیالات چھوڑ کر نئی تجویزیں اختیار کرنی پڑیں اور لوگوں کی مخالفت اور ناراضی اور اپنے پرانے دوستوں کی سرد مہری اور جاہل دشمنوں کی پر ضرر شورش نہایت تحمل سے برداشت کرنی پڑی مگر اس نے ایک لمحہ کے واسطے ہمت نہ ہاری۔ رفتہ رفتہ مگر مضبوطی سے اُس کے مقصد ترقی پائی۔ لوگوں نے اُس پر اعتماد کیا کیونکہ وہ اپنے کام پر اعتماد رکھتا تھا“

سر ایف۔ ڈکلیں نے اس کالج کی نسبت کہا کہ ”اس نظیر کے قائم کرنے سے کالج کے بانیوں نے گورنمنٹ اور رعایا اور علی العموم ہندوستان کی تعلیم کے حق میں ایک عمدہ خدمت کی ہے؛ کیونکہ وہ ہلکے ایک ایسے مسئلہ کے حل کرنے میں مدد دے رہے ہیں جو اب تک شاید ہی دنیا کے کسی حصہ میں خاطر خواہ طور پر حل ہوا ہو“

تاریخ لاہور

علی گڑھ میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان جو صفائی قلمی رد و بدلے میں جول دیکھا جاتا ہے ویسا شاؤنادر ہی ہندوستان میں دیکھا جاتا ہے۔ اسٹیشن کے انگریز جنٹلمین اور لیڈیان کالج کے طالب علموں کی بیچ پر دعوت کرتے ہیں اور کالج کے ہال میں ان کے ساتھ دعوتوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اس طرح برصغیر کی فیلنگ کی ایک ایسی بنیاد قائم کی گئی ہے کہ اگر اسکو ترقی ہو جائے تو وہ ہندوستان کے باشندوں اور انگریزی حکومت دونوں کے حق میں بے شمار فائدوں کا باعث ہوگی۔ ایسے موقعوں پر معزز بزرگ سید نے اکثر اوقات پر جوش سرگرمی کے ساتھ اپنی یہ ملی آرزو ظاہر کی ہے کہ انگریز اور مسلمان سچے دوست ہو جائیں اور ایک دوسرے کے اتفاق سے کام کیا کریں اور انہیں موقعوں پر اسے کالج کے اس نشان کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں ہلال پر ایک صلیب لگی ہوئی ہے۔

سرحد کی ملکی خدات

سراینٹونی مکڈانل نے جو ۱۸۹۶ء میں ٹرسٹیان کالج کی ایڈریس کا جواب دیا تھا اس میں انھوں نے کالج کا ذکر کرتے وقت فرمایا ”ایک بڑے شاعر کا قول ہے کہ صلح کی فتوحات لڑائی کی فتوحات کی نسبت کچھ کم نہیں ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں ہمارے عہد کی مصاحت آئین فتوحات میں اس کالج کا قائم ہونا یقیناً ایک فتح ہے جس سے سب کے دلوں کو خوشی حاصل ہوتی ہے اور کسی کے دل کو تکلیف یا رنج نہیں پہنچتا۔ یہ ایک ایسی فتح ہے جسکی رونق ہر روزمانہ کی وجہ سے کم نہیں ہو سکتی“ پھر فرمایا کہ ”میں اس اسٹیشن کو نہایت غرت کے لائق سمجھتا ہوں؛ جس طرح ہر کہ میں کسی شخص کو پسند کرتا ہوں اسی طرح ہر میں اس اسٹیشن کو پسند کرتا ہوں جو آپ اپنے اوپر بھروسہ رکھتا ہو اور فخریہ طور پر آزاد ہو اور اسی کے ساتھ گورنمنٹ کی فیاضانہ مہربانی کی واجبی طور پر قدر کرتا ہو“ پھر اسپیچ کے خاتمہ پر یہ الفاظ کہے ”اس بات کی امید کرنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ یہ کالج ترقی پا کر آئندہ مسلمانوں کی بڑی درگاہ ہو جائیگا اور یہ مقام مشرق کا قرطبہ ہو جائیگا“

لارڈ ایلگن نے نومبر ۱۸۹۶ء میں جبکہ سرحد پر سرکاری فوج آفریدیوں سے لڑ رہی تھی

و سبھی طالب علم کی تمام اطاعت سے اپنے آبا و اجداد کے عقیدہ کے موافق عبادت کریں گے۔ ایسے مسجد میں جمع ہو جاتے ہیں۔ نماز کے علاوہ قرآن اور دینیات اور اخلاق کی کتابوں کا پڑھنا کالج کے سلسلہ خواندگی کا ایک حصہ ہے۔ اس سے امید کی جاتی ہے کہ جو طالب علم اس کالج سے نکلے گا وہ قدیم خیالات پر نئے علوم کا پیوند لگا دینگے اور اسکے ذریعہ سے پرانے خیالات کے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں گے کہ وہ زمانہ کے ساتھ ساتھ چلیں اور جو طریقہ قوم کو اسکی ذلیل حالت سے نجات دینے کا موجود ہے اسکو اختیار کریں۔ دوسرا اصول۔ جس میں یہ کالج سرکاری مدارس سے ممتاز ہے۔ یہ ہے کہ انہیں نجلی سرکاری مدارس کے صرف عقلی تعلیم ہی پر توجہ نہیں کی جاتی۔ بلکہ وہ انگلستان کی یونیورسٹیوں کے نمونہ پر قائم کیا گیا ہو۔ سب طالب علم ایک احاطہ میں رہتے ہیں، ایک جگہ کھانا کھاتے ہیں اور ایک صحت بخش کالج لائف خطاً اٹھاتے ہیں کسی نمک میں ایک ایسے انسٹیٹیوشن کا پانا مشکل ہے جو اس کالج کی نسبت زیادہ تر زیر دست جوش باہمی اتحاد کا پیدا کرتا ہو۔ قوم کی امیدیں اس انسٹیٹیوشن کی کامیابی کے ساتھ وابستہ ہیں اور یہ ایک بڑی کوشش ہے جو ترقی اور اصلاح کے باب میں ایک ایسی قوم نے کی ہے جس میں تقدیر پر بھروسہ کر نیکی عقیدہ نے تمام مہتممین اور آزاد پست کر دیے ہیں۔ پھر کریٹ کلب کے متعلق لکھتے ہیں کہ ”کالج کی ایک ٹیم تمام پرائڈ ٹیمیں ہندوستانی ٹیموں سے گوی سبقت لجاتی ہے اور اسٹیشن کی نہایت عمدہ ایونون کا مقابلہ کرتی ہے“ پھر یونین کلب وغیرہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ ”ڈبلینگ سوسائٹی۔ جو کیمبرج یونین کلب کے نمونہ پر قائم کی گئی ہے۔ اگر کون کو جلسہ عام میں گفتگو کرنے اور انگریزی طریقہ پر کاروبار انجام دینے کا سبق دیتی ہے۔ کالج کی دعوتوں اور جلسوں، مذہبی تہواروں، شاعرانہ صحبتوں، کرکٹ، فٹ بال اور اور جسمانی ورزشوں کے باعث نوجوان مسلمانوں کو اپنی زندگی مختلف طریقوں میں دل بہلانے کے لیے مدد ملتی ہے اور انکی مختلف لیاقتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ معلمین اور طالب علموں میں کسی قسم کا تفرقہ جو قومی اختلاف سے پیدا ہوتا ہو مطلق نہیں ہے۔“

اگرچہ اس عظیم الشان کام کی ابتدائی مشکلات اُس مرحوم کی جانشانی اور استقلال سے تقریباً بالکل حل ہو گئی ہیں، مذہبی مخالفتوں اور بدگمانیوں کا طوفان فرو ہو گیا ہے، کالج کی سالانہ آمدنی اور خرچ کی نوبت پون لاکھ کے قریب پہنچ گئی ہے، عمارتیں جس اعلیٰ اور وسیع پیمانے پر بنانی منظور تھیں گوارا بھی انکی تکمیل نہیں ہوئی مگر قوم کی تھوڑی سی توجہ سے پوری ہو سکتی ہیں، یورپین اور نیٹو اسٹاف توقع سے زیادہ عمدہ اور قابل اطمینان ہم پہنچ گیا ہے، یونیورسٹی کے نتائج امتحان کالج اور اسکول کی وقعت اور اعتبار لوگوں کی نظر میں روز بروز زیادہ کرنے جاتے ہیں، بورڈنگ ہوس ایک بے نظیر نمونہ پر جیسا کہ کبھی ہندوستان میں نہیں دیکھا گیا تھا طلبہ کی تربیت کے لیے قائم ہو گیا ہے، مذہبی تعلیم و تربیت کا سامان بھی جہانک کہ منتظران کالج کی قدرت میں تھا مہیا کیا گیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گورنمنٹ نے اسکی طرف خاص توجہ مبذول فرمائی ہے، مگر درحقیقت اُس کا تھا منہ، اسکی اصلاح کرنا اور اُسکو ترقی دینا قوم کا اور صرف قوم ہی کا کام ہے۔ اگرچہ سرسید کی زندگی میں تو لوگ قوم کی طرف سے بالکل مایوس تھے اور سمجھتے تھے کہ انکی آنکھیں بند ہوتے ہی کالج کی حالت دیگر گون ہو جائیگی مگر خدا کا شکر ہے کہ سرسید کے بعد مسلمانوں نے بالکل خلاف توقع اور خلاف امید کالج کی طرف وہ توجہ ظاہر کی ہے کہ بقول ایک ظریف کے اگر سرسید کو یہ خبر ہوتی کہ میرے بعد لوگ ایسی سرگرمی ظاہر کریں گے تو وہ بن آئی مہر جاتے۔

سرسید نے ترقی تعلیم کی غرض سے صرف محمدن کالج قائم کرنے اور اُس میں تعلیم و تربیت کا سامان مہیا کرنے ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ یونیورسٹی کے طریقہ تعلیم کی اصلاح اور ہائی ایجوکیشن کی

اور ہندوستان کے مسلمانوں کی نسبت اینگلو انڈین اخبارات حکمران گروہ میں بدگمانی پھیلا رہے تھے۔
 محمدن کلج میں آنے کی خود خواہش ظاہر کی اور جوائڈر لیس ٹرسٹیان کلج کی طرف اُٹلی
 خدمت میں پیش کی گئی اُسکے جواب میں انھوں نے اُسوقت جبکہ کلج کے تمام طالب علم اُنکے سامنے
 حاضر تھے یہ فرمایا کہ ”صاحب کوئی وقت ایسا نہیں ہے جب کہ اس قسم کا ایک مجمع سیری طبیعت کو استفادہ خوش معلوم
 ہو سکے جیسا کہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ پچھلے چند مہینوں میں اور اسوقت گورنمنٹ ہند بالکل اپنی خواہش کے برخلاف
 اُن قوموں کے ساتھ جو تمہارے ہم مذہب ہیں۔ علانیہ لڑنے پر مجبور ہوئی ہے اور ایسے شخصوں کی کچھ کمی نہیں ہے
 جنھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت اور اُسکی مسلمان رعایا کے درمیان مخالفت روز بروز
 رُو بہ ترقی ہے +++ صاحبانِ قابلِ فسوس ہنگاموں میں ہمنے پھر اُس بات کو دیکھا ہے جو ہم اکثر اُدقاسابق
 میں دیکھ چکے ہیں؛ یعنی حضورِ ملکہ معظمہ کی نسبت مسلمان رعایا کی خیر خواہی اور بہادری کو؛ اور میں اس جگہ پر
 ایک زیادہ تر پر امن موقع پر اس بات کو تسلیم کرنے اور معلوم ہونے سے خوش ہوں کہ اس کلج کے اندر پر امن تصور
 میں خیر خواہی اور وفاداری کا وہی جوش ترقی پر ہے جیسا کہ میدانِ جنگ میں ظاہر کیا گیا ہے۔“
 یہ اور اسی قسم کے اُور بہت سے عمدہ خیالاتِ مدبرانِ سلطنتِ انگلشیہ اس کلج کی موجودہ حالت
 دیکھ کر دقتاً و قفا ظاہر کرتے رہے ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ ایک تعلیمی اسیٹوشن کی عمدگی پر
 لوگوں کی شہادت سے بہتر کسی کی شہادت نہیں ہو سکتی۔
 یہ ہے سید احمد خان کی زندگی کا وہ کارنامہ جسکی اگرچہ مسلمانوں نے عام طور پر اب تک کچھ قدر
 نہیں کی لیکن یورپ کے نامور اخبارات آئمز آف لندن نے گزشتہ اپریل میں اسی کارنامہ
 سرسید کی نسبت لکھا تھا کہ ”اس شخص کو ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں تعلیم کا پروفٹ کما جائے تو بجا ہے“

اُن سے یہ احتمال قوی ہو گیا کہ اگر پنجاب یونیورسٹی کالج کو یونیورسٹی کے اختیارات مل گئے تو پنجاب میں ایجوکیشن کا نام و نشان باقی نہ رہیگا۔ چنانچہ ہذا کسلنس کے جواب میں یہ الفاظ موجود تھے کہ ”ترقی و اشاعت زبانہای مشرقی و علوم مشرقی نہایت ہی کار احسن ہے +++ اور جہاں تک ہندی و فارسی و لغت و فصاحت معاملات ہندوستان میں ہے میں اُن خیالات سے اتفاق رکھتا ہوں جو میرے نزدیک آپ لوگ رکھتے ہیں کہ اس ملک میں صرف زبانہای دیسی کے توسل سے علوم و فنون کی ترقی و اشاعت بہترین سولیت سے ہو سکتی ہے“ اور جس ایڈریس کے جواب میں ہذا کسلنس نے یہ ارشاد فرمایا تھا اُس میں صاف لکھا تھا کہ ”سارے تین لاکھ روپیہ جو سرمایہ یونیورسٹی کالج ہے والیان ریاست ہماچل و ساہیوال نے دراصل زبانہای دیسی کی تکمیل سے تعلیم کو رواج دینے کی غرض سے عطا کیا تھا۔ سنٹ کو اس بارہ میں کچھ بھی شک نہیں کہ علم کو زبانہاں دیسی کے توسل سے ترقی دینا تعلیم کی ضروریات کو ملک کے حسب حال بنانے کا بہترین طریقہ ہے اور سنٹ اور بورڈ ہند کا بھی یہی مقصد ہے“

جب یہ ایڈریس اور اُس کا جواب شائع ہوا اور سرسید کی نظر سے گزرا تو اُنکی آنکھوں میں اندھیرا آگیا اور جیسا کہ اُنکی طرز تحریر سے پایا جاتا ہے عنانِ صبر اُنکے ہاتھ سے جاتی رہی۔ اُنھوں نے حد سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ پے درپے تین آرٹیکل پنجاب یونیورسٹی کے خلاف لکھ کر شائع کیے جن کا تمام پنجاب میں غل پڑ گیا۔ تعلیم یافتہ گروہ نے جنہیں زیادہ ترہمت و ایجوکیٹڈ شامل تھے تینوں آرٹیکل کو ایک جگہ جمع کر کے چھپوا دیا اور تمام پنجاب میں اُن کو عام طور پر شائع کر دیا جس سے پنجاب یونیورسٹی کے اکثر حامیوں کی رائیں بدل گئیں اور ڈاکٹر لائٹمن جو مشرقی علوم اور دیسی زبانوں کے نہایت سرگرم حامی تھے اور پنجاب یونیورسٹی کو گویا دیرینہ منظر

ضرورت پر وہ اخیر دم تک اپنی تحریروں اور ایجوکیشن میں برابر زور دیتے رہے۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم کو وہ ہمیشہ ہندوستانیوں کے حق میں غیر مفید خیال کرتے تھے اور جب ملک میں یہ خیال پھیل گیا تھا کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن موقوف کرنا چاہتی ہے، انکو سخت افسوس ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے جو ممبر کر تعلیم کے وسائل مہیا کیے گئے ہیں، کہیں یہ تمام کوششیں باطل نہ ہو جائیں اور سرمنڈاتے ہی اگلے نہ پڑ جائیں۔ اس لیے وہ ہمیشہ یونیورسٹیوں کے نظام پر نکتہ چینی کرتے تھے اور جب کبھی انکو گورنمنٹ کے تیسرے ہائی ایجوکیشن کے برخلاف معلوم ہو، انھوں نے فوراً اسکی حمایت پر قلم اٹھایا اور نہایت دلیری اور بے باکی سے اس پالیسی کی تغلیط کی۔ ۱۸۹۲ء میں انھوں نے ایجوکیشن کمیشن میں شہادت دیتے وقت یونیورسٹی کے قواعد پر خوب لکھ کر اعتراض کیے اسکے سوا ہمیشہ بذریعہ تحریر اور تقریر کے یونیورسٹی کے نقص اور مستقم ظاہر کرتے رہے۔

ہائی ایجوکیشن کے متعلق انھوں نے کمیشن کو آگاہ کیا کہ لوگوں میں عموماً یہ خیال پھیل گیا ہے کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن بند کرنا چاہتی ہے پس اگر گورنمنٹ کوئی کلج توڑ لگی۔ خواہ اسکے توڑنے کی کیسی ہی معقول وجوہات ہوں۔ لوگ یہ سمجھنے لگے کہ سرکار ہمو اعلیٰ درجہ کی تعلیم سے محروم رکھنا چاہتی ہے۔

اس سے پہلے ۱۸۸۱ء میں جس شد و مد کے ساتھ انھوں نے اسی بنا پر پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت کی تھی وہ اکثر لوگوں کو یاد ہوگی۔ اس مخالفت کی بنیاد یہ تھی کہ اول لارڈ لٹن نے پنجاب کے بعض مقامات میں جو اسپیشل کمین اُنسے مشرقی علوم کی ترغیب و تحریص کی ہو آتی تھی۔ اسکے بعد جوائڈرین اہل پنجاب نے لاڈلرین کی حضور میں گزارنے اور جو جواب حضور مدوح نے انپر

ہائی ایجوکیشن کی حمایت

پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت

اصلاً سے اہل ہند کو یورپ کے علم و حکمت کی تعلیم دینا۔ بیان کیے ہیں۔ پھر انھوں نے دینیات کو مستثنیٰ کرنے کے بعد مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر کی جسکو پنجاب یونیورسٹی از سر نو زندہ کرنا چاہتی تھی خوب قلعی کھولی ہے۔ اسکے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”ہم صاف صاف کہنا چاہتے ہیں کہ ہندو مشرقی علوم کی ترقی کے پندرے میں پھنسا ہوا ہندوستانیوں کے ساتھ نیلی کرنا نہیں ہے بلکہ دھوکے میں ڈالنا ہے۔ ہم لارڈ مکالے کو دعا دیتے ہیں کہ خدا اسکو بہشت نصیب کرے نہ اسے اس دھوکے کی ٹیٹی کو اٹھا دیا تھا؛ کیا وہ ٹیٹی ہماری آنکھوں کے سامنے پھر لگائی جاتی ہے؟ ایڈریس کے ساتھ (جو لارڈ رپن کو دیا گیا تھا) بڑے بڑے ہندوستانی سرکاروں کا ہونا اور بہت بڑی فیاضی سے بڑے بڑے چندون کا دیدینا مثل اُسی فیاضی کے ہے جو ہمیشہ وہ اصلی مقصدنا واقعہ رکھ کر دیگر اسباب سے کیا کرتے ہیں۔ اُنکی شان و شوکت ایسے امر کی۔ جوئی الحقیقتہ کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ وقعت نہیں بڑھا سکتی۔ چندنا قبت اندیش ہندوستانی شاید ان باتوں سے خوش ہوتے ہوں گے اور گورنمنٹ کا جان سے ہونگے؛ مگر دورانِ اندیش آدمی ان تمام باتوں سے نہایت رنجیدہ ہوتے ہیں اور نہایت افسوس مایوسی سے گورنمنٹ کی اور اُن یوروپین اعلیٰ درجہ کے حکام کی کارروائی کو۔ جو اس میں شریک ہیں۔ دیکھتے ہیں۔“

”ہم نہایت سچائی سے اور گورنمنٹ کی دلی خیر خواہی سے بتانا چاہتے ہیں کہ سمجھدار اور دورانِ اندیش ہندوستانی ان تمام کارروائیوں سے گورنمنٹ کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں؟ نہایت بد خیال لنگے دل میں پیدا ہوتا ہے چند سال گزرے (یعنی یونیورسٹیاں قائم ہونے سے پہلے جبکہ مشرقی علوم کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا) کہ اُنکو یقین کامل تھا کہ گورنمنٹ کو درحقیقت ہندو واقعی تعلیم دینا منظور نہیں ہے اور وہ ہندو اسی قدر تعلیم دینا چاہتی ہے جس قدر کی اُسکو ضرورت ہے۔ وہ ہندو ایسا مرکز بنانا چاہتی ہے کہ اسباب لا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دے۔ اسکو انتظام ملک و انتظام دفتر کے یہ چند ایسی پتلیاں درکار ہیں جو انگریزی لکھ سکتی ہیں

یا اورینٹل ریویو میں بنانا چاہتے تھے، انھوں نے سرسید کے آرٹیکلوں کا انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں جواب لکھ کر شہر کیا مگر اس عربی مثل کے موافق کہ ”قَدْ سَبَقَ الشَّيْفُ الْعَذْلَ“ سرسید کی تحریریں اپنا کام کر چکی تھیں اور اسلئے اب انکا جواب لکھنا اور انکی تردید چھاپنی بے سود تھی۔ اگرچہ یہ تینوں آرٹیکل بہت لمبے ہیں اور بیان انکے نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن چونکہ یہ بھی سرسید کی ملکی خدمات میں سے ایک خدمت ہے اور اسکی وقعت کا اندازہ بغیر اسکے نہیں ہو سکتا کہ ان تحریروں میں سے کچھ فقرے بطور نمونہ کے ناظرین کو دکھائے جائیں اسلئے ہم تینوں آرٹیکلوں میں سے بعض بعض مقامات اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

پہلے آرٹیکل کو جسکا عنوان ”مشرقی علوم و فنون“ ہے وہ اس طرح شروع کرتے ہیں ”ہم کو نہایت ہوشیاری سے دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے۔ کہ ہمارے اور ہمارے ملک کی بیہودی اور ترقی کے لیے جو ایسا نیکو صرف و ہوا کا ہو۔ ہم کو اسوقت پچھلے زمانہ کے قصے اور کہانیوں کو یاد دلانا اور کہنا۔ کہ ایشیائے سلطنت کے زمانہ میں علوم و فنون کیا تھے اور انکے وقت میں انکو کیسی ترقی اور کیسی سرسبزی تھی۔ جس سے فائدہ ہو۔ ہم کو اپنے زمانہ کے حالات پر جو گورنمنٹ انگلشیہ کی حکومت کا زمانہ ہے۔ غور کرنا اور اسکو ہندوستان ہی کی حدود میں محدود رکھنا ہمارے لیے زیادہ مفید اور زیادہ تر بہار آمد ہے۔“

اسکے بعد انھوں نے وہ مختلف طریقے جو ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق ابتداء سے عملداری سے اختیار کرتی رہی (یعنی اول ہندوستانیوں کی تعلیم کے فرض سے غافل رہنا۔ پھر انھیں علوم مشرقی کے رواج دینے میں کوشش کرنا اور آخر کار لارڈ مکالے کے

۱۔ یعنی تلمذِ اہلِ مکی اب ملامت بے فائدہ ہے۔

دھین اور اس میں کوشش کریں کہ گورنمنٹ ایسی
ہو اور جن کے تمام کام و حقیقت دیگر اسباب پر

ہماری زبان ہے انھوں نے اول اُن
ن ترجمہ کر کے شائع کرنے میں پیش
ٹی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لیے قائم کرنا
میں ترجمہ ہونا اور پھر اسی مقصد کے
جگہ ناکامی کے سوا کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوا
جب غیر قوم یعنی مسلمانوں نے ہندوستان کو
میں شریک ہوئے جنھوں نے اُن کے علوم، اُنکی
ادب و شاختیاری، ہندوستان میں اس خیال کا
ت و دولت و شہرت و حکومت حاصل کرینگے
نہ اپنی ویسی زبان اور ویسی علوم میں ترقی
پگے۔

جب کسی قوم میں حکومت مذہب تو اسکی
اہل کرنے سے اپنے فخر مندوں کے ساتھ
حاصل کرے جنہیں اُن فخر مندوں نے

مگر سمجھ نہ سکتی ہوں : جیسے کہ مینچسٹر میں سوت کا تنے کے لیے پلیٹوں کی ضرورت ہے ۔ جو کچھ کہ وہ (یعنی گورنمنٹ) ہندوستان میں تعلیم کی نسبت کرتی تھی کوئی اسکا شکر گزار نہ تھا اسلئے کہ اسکو خود غرضی پر محمول کیا جاتا تھا نہ رعایا پروری پر ۔

”دیکھ بہت عرصہ نہیں گذرا (یعنی جب کہ ہندوستان میں کلکتہ بمبئی اور مدراس یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں) کہ ہندوستانیوں میں سے یہ بد خیال دور ہوا تھا اور ہندوستانی یہ یقین کرتے تھے کہ گورنمنٹ نے اپنی پالیسی بدل دی ہے اور حقیقت اسکو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دینا اور ہندوستانیوں کو انھیں کے فائدہ کے لیے تعلیم دینا مقصود ہے ۔ مگر ہندوستانی خوب سمجھتے ہیں کہ تھوڑے دنوں سے بعض مدبران سلطنت کی پالیسی پھر بدلی ہے اور ہندوستانیوں کو اب اعلیٰ درجہ کی حقیقی تعلیم دینا وہ مناسب نہیں سمجھتی ۔ انکو (یعنی ہندوستانیوں کو) اب تک یقین نہیں ہے کہ یہ پالیسی حقیقت مستحکم ہو گئی ہے اور اس پر عمل کرنا فی الواقع قرار پا چکا ہے ۔ مگر ایسے واقعات جو پیش آتے جاتے ہیں ۔ جیسے کہ حضور علی لارڈ لٹن کے وقت میں ^{۱۸۵۸ء} سیرو کے قواعد قرار پائے ، اور جیسے کہ جناب مدوح نے بعض اسپچوں میں علوم مشرقی کی ترقی کی ترغیب دی ، یا جیسے کہ یہ حال میں واقعہ پنجاب یونیورسٹی کالج کو کامل یونیورسٹی بنانے کی درخواست کے وقت پیش آیا ۔ دورانہ دش ہندوستانیوں کو نہایت تردد میں ڈالتا ہے اور وہ خوف زدہ ہو کر خیال کرتے ہیں کہ شاید وہ پالیسی مستحکم ہو گئی ہے اور وہی دھوکے کی ٹٹی پھر ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑی کیجاتی ہے جسکو ہمارے محسن مرحوم لارڈ مکالے نے اپنی نہایت سچی تحریروں اور زبردست باتھون سے اٹھایا تھا ۔ ہننے کوئی مجلس لائق ہندوستانیوں کی ایسی نہیں پائی جس میں ان خیالات کی روز بروز ترقی نہ ہوتی ہو ۔ ہمارا دلی مقصد ہے کہ ہم اعلیٰ حال ان ہندوستانیوں کی فیلنگ کا

سطح چوند انگریزوں سے جس کے قواعد میں امیدواروں کے لیے کسی یونیورسٹی کی ڈگری کی شرط نہیں تھی اسلئے یہ خیال پیدا ہوا کہ گورنمنٹ ملکی پالیسی کو موافقت کرنا چاہتی ہے ۱۲

جنکی قیادت و حقیقت قدر و غور کے لائق ہے گورنمنٹ سے مخفی نہ رکھیں اور اس میں کوشش کریں کہ گورنمنٹ ایسی جماعت کی باتوں سے۔ جنکے ظاہری بدن زرد و جاہر سے جگمگاتے ہیں اور جنکے کام و حقیقت دیگر اسباب پر مبنی ہیں نہ واقعی واقعات پر۔ دھوکے میں نہ آوے۔“

دوسرے آرگنل مین۔ جس کا عنوان ”ورنیکلر یعنی ہماری زبان“ ہے انھوں نے اول اُن مشکلات کو بیان کیا ہے جو مغربی علوم کو دیسی زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کرنے میں پیش آتی ہیں اور الیسٹ انڈیا کمپنی کا کلکتہ میں ایک سوسائٹی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لیے قائم کرنا، پھر دہلی کالج میں بہت سی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہونا، اور پھر اسی مقصد کے لیے سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کا قائم ہونا اور تینوں جگہ ناکامی کے سوا کوئی نتیجہ حاصل نہ ہونا نہایت عمدگی سے ظاہر کیا ہے۔ اسکے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”جب غیر قوم یعنی مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کیا تو یہاں کے باشندوں میں سے وہی لوگ برسرِ عرصہ اور حکومت میں شریک ہوئے جنھوں نے اُنکے علوم، اُنکی زبان، اُن کیسے خیالات، اُنکا سامن، اُنکا سالب، اُنکی سی روش اختیار کی۔ ہندوستان میں اس خیال کا پیدا کرنا۔ کہ ہم مشرقی علوم، دیسی زبان اور دیسی علوم کو ترقی دیکر عزت و دولت و حشمت حاصل کریں گے۔ بیسندہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی امریکا کے اصل باشندوں کو خیال دلاوے کہ تم اپنی دیسی زبان اور دیسی علوم میں ترقی کر کے اپنی حکمران قوم میں عزت و دولت و حشمت و حکومت حاصل کرو گے۔“

تومی ترقی اور حکومت دونوں مان جائی بسین ہیں؛ پس جب کسی قوم میں حکومت مذہب تو اُسکی ترقی صرف اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی فتنہ قوم کے علوم و زبان حاصل کرنے سے اپنے فتنہ دون کے ساتھ ملکی حکومت میں حصہ لے، علوم کی اُن شاخوں میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل کرے جنہیں اُن فتنہ دون نے

مگر سمجھ نہ سکتی ہوں جیسے کہ مینچسٹر میں
(گورنمنٹ) ہندوستان میں تعلیم کی نسبت
محول کیا جاتا تھا نہ رعایا پروری پر

”کچھ بہت عرصہ نہیں گذرا (یعنی)

قائم ہو گئیں) کہ ہندوستانیوں میں سے

نے اپنی پالیسی بدل دی ہے اور حقیقتاً

کے لیے تعلیم دینا مقصود ہے۔ مگر ہندو

پالیسی پھر بدلی ہے اور ہندوستانیوں کا

ہندوستانیوں کو) اب تک یقین نہیں ہے

پاچکا ہے۔ مگر ایسے واقعات جو پیش آئے

کے قواعد قرار پائے، اور جیسے کہ جناب مدد

یہ حال میں واقعہ پنجاب یونیورسٹی کالج کو کا

ہندوستانیوں کو نہایت تردد میں ڈالتا

اور وہی دھوکے کی ٹٹی پھر ہماری آنکھوں

اپنی نہایت سچی تحریروں اور زبردست

پانی جیہن ان خیالات کی روز بروز ترقی

سچہ نہ انہیں سول سروس کے قواعد میں امیدوار

مافیہ راج لکیش کو موقوف کرنا چاہتی ہے ۱۲

کے لیے تعلیم

(۱۲)

چند ان قابلیت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے۔ جانے دو؛ مگر ہائی کورٹ کی ججی حاصل کرنے سے ہماری امیدیں ابھی منقطع نہیں ہوئی ہیں، ہندوستانیوں کا کونسل قانونی میں داخل ہونا ابھی تک بند نہیں ہوا ہے؛ ہکو بھنا چاہئے کہ ان حقوق کے واجبی طور سے حاصل کرنے کے لیے ہکو کیا کرنا ہے؟ کیا مشرقی مَردہ علوم کو زندہ کرنیوالی یونیورسٹی؟ کیا ہماری پرانی شایستگی کو پھر ہمارے لیے ہتیا کرنے والی تجویز؟ معمولی عہدے بھی۔ جیسے وکالت و منصفی و سب ججی ہے۔ بغیر انگریزی زبان کی کافی لیاقت کے ہکو میسر نہیں آسکتے؛ پھر کیا مَردہ علوم مشرقی کے زندہ ہونے اور ہماری مشرقی زبانوں کی ترقی سے ہکو کچھ نتیجہ مل سکتا ہے؟ یونیورسٹی کالج لاہور۔ جو پوری یونیورسٹی ہونے والا ہے۔ بھڑا سکے۔ کہ ہکو سیدھی راہ چلنے سے روکے، ہکو ہمارے حقوق سے محروم رکھے اور ہکو اس لائق ہونے دے کہ ہم اپنے حقوق کا دعوے کر سکیں۔ ہمارے حق میں اور کیا کر سکتا ہے؟

ہکو ایسا لائق ہونا چاہیے کہ ہم دور و دراز اور مختلف ملکوں کے سفر کرنے کے قابل ہوں، ہم بساطی سی دوکانداری سے نکلیں، ہم اپنی اور اپنے ملک کی تجارت کو ترقی دین، ہمدی تجارت کی محسن اینڈ ہندو کمپنی کے نام سے کوٹھیاں لندن میں، ایڈنبرا میں، ڈبلن میں، بروزلزمین، سینٹ پیٹریسبرگ میں، برلن میں، دُائنامین، قسطنطنیہ میں، پلین میں، واشنگٹن میں اور دنیا کے تمام حصوں میں قائم ہوں اور ہم بحری و بری سفر سی طرح خوشی سے کریں جیسے کہ اور قومیں کرتی ہیں جس سے ہکو عزت، دولت، شہمت اور حکومت میں شرکت حاصل ہو۔ پھر کیا ہمارے مَردہ مشرقی علوم کا زندہ ہونا اور مشرقی زبانوں کا ترقی دینا اور ہماری پرانی شایستگی کو پھر قائم کرنا ہکو اس قابل بناویگا؟ ہرگز نہیں۔ پس ہکو علوم مشرقی کے زندہ کرنے اور مشرقی زبانوں کے ترقی دینے کے جال میں پھنسانا صاف ایسی تدبیریں کرنا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہکو ہماری ترقیات حاصل کرنے سے روکا جائے۔ جو لوگ دو ماہ اندیش ہیں وہ کبھی ایسی پالیسی کو پسند نہ کریں گے

کامیت حاصل کی ہے، سوشل خدمات اور علمی و ملکی خیالات اُس قسم کے پیدا کرے جو فاتح و مفتوح میں کسی درجہ تک مناسبت پیدا کریں۔ جب تک فاتح و مفتوح میں اس قسم کی مناسبت پیدا نہ ہو اس وقت تک باہمی دوستی کا برتاؤ محالات سے ہے۔ اسی مناسبت کے نہونے سے آج تک ہندوستان میں فاتح و مفتوح کے باہم دوستانہ برتاؤ نہیں ہے۔ خوشامد کی باتیں جو کوئی چاہے سو کہ لے اور پورے لٹکل طریقہ میں جو کچھ بیان کرنا ہو کیا جائے مگر ہندوستانیوں کا حال اپنی فتح مند قوم کے ساتھ غلامی کی حالت سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ہم اسکا الزام اپنی فتح مند قوم کے ذمہ نہیں دھرتے بلکہ خود اپنی قوم کے ذمہ ڈالتے ہیں کہ اسنے خود اپنے تئیں اس لائق نہیں بنایا کہ ہماری فتح مند قوم سے دوستانہ برتاؤ کر سکے۔ پھر علوم مشرقی کی ترقی اور چھوٹی موٹی ترجمہ کی ہوئی کتابیں ہلکوکیا نتیجہ دینگے؟ اور ہلکوکوسی عزت و دولت و حکومت بخشینگے؟ یونیورسٹی کا لچ لاہور نے اب تک ہلکوکس نتیجہ پر پہنچایا ہے جو آئندہ پوری یونیورسٹی ہو کر اور مقررہ علوم مشرقی کو زندہ کر کے اور ہماری پرانی ستائشی کو پھر پیدا کر کے ہلکوپہنچا دیگا۔ کچھ شبہ نہیں کہ یونیورسٹی کا لچ اب بھی ہماری ترقیوں کا سدراہ رہا ہے۔ جب وہ یونیورسٹی ہو جائیگا اور ضرور ہو جائیگا تو ملک کے لیے، قوم کے لیے، ملکی اور قومی ترقی کے لیے آفت عظیم ہوگا۔ ہم پراحسان رہنکر ہلکودھوکے میں ڈالا جاتا ہے کہ ہم تمہارے مشرقی علوم و تمہاری مشرقی زبان کو ترقی دیتے ہیں؛ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیوں اور کس مطلب سے؟ اسکا جواب کسی پیرایہ میں اور کیسی ہی میٹھے لفظوں میں دیا جائے اسکا نتیجہ یہی ہے کہ غلامی کی حالت میں رکھنے کے لیے۔

”گورنمنٹ نے ہمارے لیے سول سروس میں داخل ہونے کا راستہ۔ گواسمین کیسی ہی مشکلات پر گئی ہوں۔ اچھی تک کھلا رکھا ہے، بیرٹری کی سند، ڈاکٹری کا ڈپلوما اور انجینیری کا سٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے کوئی امر ہلکومزاحم نہیں ہے؛ ہندوستان میں انڈین سول سروس کے عہدے کو۔ حسین ہماری بدبختی سے ابھی تک

جسٹسین کیسے اخلاق، بیان تک کہ ہمارے تغیر لباس سے بھی وہ ایسے ناراض ہوتے ہیں اور چشم خشم آلود سے ہٹکے دیکھتے ہیں جیسے کوئی نہایت نیک دل بڑے مجرم کو دیکھتا ہو۔ مگر ہٹکواپنی اور اپنی قوم کی بھلائی پر نظر رکھنی چاہیے اور جو تکالیف اور مشکلات ہٹکوپیش آئین نہایت تحمل اور پختہ مزاجی سے برداشت کرنی چاہئیں۔ مگر ہم اس ت کو مخفی رکھنا نہیں چاہتے کہ گریٹ رفاہی (یعنی زمانہ) ان باتوں کو ضرور ہونے دیکھا اور کوئی مزاحمت اور کوئی ناخوشی و خفگی اُسکو روک نہیں سکیگی۔ لیکن بے شک یہ تنگدلی کے خیالات ناراضی کو ترقی دینے والے اور فلاح و مفتوح میں ہمدردی و محبت کو توڑنے والے ہیں۔“

یہ دو آرٹیکل جنسے مفہوم ہوتا تھا کہ سرسید نے خاص کر پنجاب یونیورسٹی پر حملہ کیا ہے جب پنجاب یونیورسٹی کے حامیوں کو شاق گذرے اور اُنکے برخلاف پنجاب سے بعض مضامین شائع ہوئے تو سرسید نے ایک تیسرا آرٹیکل۔ جسکا عنوان ”ہماری زبان اور ہماری اعلیٰ درجہ کی تعلیم“ تھا اور لکھا ہے صرف یہ جتنا مقصود تھا کہ درحقیقت ہمارا روی سخن پنجاب یونیورسٹی کی طرف نہیں بلکہ گورنمنٹ کی پالیسی کی طرف تھا جس سے خوف تھا کہ رفتہ رفتہ تمام ہندوستان کی یونیورسٹیاں یہی اصول نہ اختیار کر لیں۔ اس آرٹیکل کو اُنھوں نے اس طرح شروع کیا ہے ”ہمارے دو آرٹیکلون نے ہمارے پنجاب کے دوستوں کو گھبرا دیا ہے بلکہ کسی قدر رنجیدہ کر دیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اُن آرٹیکلون سے ہٹکوا بالخصوص یونیورسٹی پر حملہ کرنا مقصود ہے اور اپنے حسن ظن سے اسکی بنیاد حسد پر قائم کی ہے، ہٹکوا غصہ سے ہے اگر یہ کینہ خصلت ہم میں ہے۔“

پنجاب یونیورسٹی کالج کے اصول سے بلاشبہ ہم مختلف رائے ہیں۔ اگر وہ یونیورسٹی ہو جائے تو ملک کو اور ایسے وسیع ملک کو جنہیں میں آؤر یونیورسٹیاں موجود ہیں کوئی معتد بہ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اگر وہ صحیح اصول پر قائم ہوتی ہے اور اُس سے ملک کو برخلاف ہماری رائے کے فائدہ پہنچنے والا ہے تو چشم مارڈشن۔

اور اسی بن ہندوستان کی فلاح نہ تصور کریں گے ؛ بلکہ اپنے حق میں ہندوستان کے حق میں اور گورنمنٹ کے حق میں شدید مضر سمجھیں گے “

اسکے بعد اُن اسباب کی طرف جن سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن موقوف کرنا چاہتی ہے۔ اشارہ کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ” ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یونیورسٹی کی تعلیم نے بعض تعلیم یافتہ لوگوں کو زیادہ دلیر کر دیا ہے اور انھوں نے نہایت سخت اور بعض اوقات نہایت بجا اور نا واجب اور نامنصفانہ نکتہ چینی گورنمنٹ پر کی ہے ؛ مگر ہم دل سے یقین رکھتے ہیں اور گورنمنٹ کو بھی یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہی تعلیم یافتہ نکتہ چین جس قدر گورنمنٹ انگریزی کے قدردان ہیں شاید کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ پس نکتہ چینی کے اندیشہ سے ہماری تعلیم کو برباد کرنا ہمارے حق میں کچھ انصاف نہیں ہے ۔ ہلکو بالغ العلوم اور مالک العلوم کے خطاب دینا اور پھر نابالغ کے درجہ پر رکھنا ہم کبھی پسند نہیں کر سکتے “

” ہمارے لیے سیدھا راستہ کھلا ہوا ہے کہ جہاں تک ہم سے ہو سکے یورپین لٹریچر اور یورپین رٹین میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کریں ، جہاں تک ہلکو یونیورسٹی کے سچے خطاب حاصل ہو سکتے ہیں حاصل کریں ، جب اُس سے بھی زیادہ ہم میں ہمت ہو آکسفورڈ و کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کو جائیں ، اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی ڈگریاں حاصل کرنے میں کوشش کریں ، اپنے تئیں مذہب و تعلیم یافتہ جٹیلیں اُسکے اصلی حقیقی معنوں میں بنائیں اور جو فیض تعلیم و تربیت و تہذیب ہم نے اُن مذہب ملکوں میں حاصل کیا ہو اُس کو اپنے ہموطنوں اور ہم قوموں میں پھیلا دیں ۔ بے شک ہلکوا یا کرنے میں بہت مشکلات ہیں ؛ ادھر ہلکوا اپنی قوم کی جمالت و تعصب کے مقابلہ کرنا ہے اور ادھر اپنی فتح مند قوم کے اُن تنگدل لوگوں کی مزاحمت کا برداشت کرنا ہے جو ہماری سوشل ورپولسکل حالت کی ترقی اپنی طبعی تنگدلی کے برخلاف سمجھتے ہیں ، ہماری انگلش ٹف ، انگلش تمدن ،

کہ اس تعلیم سے مقصد ہی ہے کہ ایسے نہ ہونے پائین نسب کچھ تسلیم کیا جاسکتا ہے۔“

اسکے بعد سرسید نے اس اعتراض کا کہ۔ سائنٹفک سوسائٹی جو انھوں نے علیگڑھ میں قائم کی تھی وہ بھی تو اسی اصول پر مبنی تھی کہ مغربی علوم ترجموں کے ذریعہ سے ملک میں شائع کیے جائیں۔ جواب دیا ہے اور جو آسمان و زمین کا فرق سوسائٹی کے قیام کے وقت میں اور موجودہ زمانہ میں ہو گیا تھا اسکو دکھایا ہے اور لکھا ہے کہ ”اُس زمانہ کے مناسب حال بلاشبہ ایک شخص کو۔ جو سچے دل سے اپنی قوم اور ملک کی ترقی کا خواہاں ہو۔ اس خیال کا پیدا ہونا کہ ہم دیسی زبان کے ذریعہ سے اپنے ملک و قوم کو ترقی دین نہایت سچا اور واجب خیال ہو سکتا تھا؛ مگر رفتہ رفتہ تمام حجاب رفع ہوتے گئے اور خود زمانہ نے بتا دیا کہ کدھر جاتے ہو اور ٹھیک رستہ کدھر ہے۔“

پھر آرٹکل کو اس طرح ختم کیا ہے کہ ”ہم کہ چکے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی کسی اصول پر قائم ہو؛ صحیح پر۔ منط پر۔ ہلکو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتی اور اسیلے ہم ضرورت نہیں سمجھتے کہ پنجاب یونیورسٹی پر کوئی حملہ کریں۔ ہاں بلاشبہ ہلکوا سوقت خوف پیدا ہوتا ہے جبکہ ہم ایسے لوگوں کو۔ جنکے ہاتھ میں خدا نے ہمارے ملک کی بھلائی برائی نفع نقصان سپرد کیا ہے۔ مُردہ مشرقی علوم و مشرقی زبانوں کے زندہ کرنے پر مائل پاتے ہیں تو ضرور سمجھتے ہیں بلکہ بلحاظِ حُبِ قومی اپنا فرض جانتے ہیں کہ اس امر کو بیان کریں کہ مُردہ علوم مشرقی اور مشرقی زبانوں کے زندہ کرنے کی فکر میں پڑنا ہمارے لیے، ملک کے لیے، بلکہ گورنمنٹ کے لیے کچھ بھلائی نہیں ہے۔ اپنی قوم کو سمجھاتے ہیں کہ انکا مقصد مغربی علوم و مغربی زبان کو اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا ہونا چاہیے اور گورنمنٹ سے التجا کرتے ہیں کہ ہندوستان میں یورپ کے علوم اور یورپ کی حکمت کو ترقی دینا اسکا مقصد ہو۔“

پھر ۱۸۸۹ء میں جب کہ الہ آباد یونیورسٹی اُسی اصول پر جس پر پنجاب یونیورسٹی کے قائم ہونے کا

ہماری عین خوشی ہے کہ ملک کو فائدہ پہنچانے والی نہیں ہر تو
 اُسکو بے ذوق اس سے مخالفت کرنے کی کچھ ضرورت نہیں؛ خود اُسین ناکامی کا نتیجہ ہے اور وہ آپ ہی ناکام ہو جائیگی
 اسکے بعد وہ مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر کی تعلیم کے نتائج کی طرف اشارہ کر کے
 لکھتے ہیں کہ ”بنارس کالج نے سنسکرت زبان کی ترقی پر بہت توجہ کی مگر وہ ایک کو بھی سنسکرت میں اُن
 پنڈتوں کے برابر نہیں بنا سکا جو دھوتی باندھے کمرے پہنے منگنا اور شیوا لکھاٹ کی بیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنی
 مقدس زبان سنسکرت کو تحصیل کرتے ہیں۔ مگر انکی تحصیل سے ملک کو بجز اسکے کہ بنارس میں دس پانچ
 منگتا پنڈت اور زیادہ ہو گئے۔ کیا نتیجہ حاصل ہوا؟ یونیورسٹی کالج لاہور نے بلخ و بدخشان کے طالب علموں
 کو جو کچھ تعلیم دی ہو دی ہو، ہلکواسکا حال معلوم نہیں؛ مگر آج تک (ہندوستان میں) اُسے ایک کو بھی
 عربی یا فارسی میں اُن لوگوں کے برابر نہیں بنایا جنہوں نے مسجد کے چبوتروں اور خانقاہ کے تنگ و تاریک
 حجروں میں بیٹھ کر اور درود فاتحہ کی روٹی پر گزارا کر کر عربی و فارسی کو تحصیل کیا اور اعلیٰ درجہ کا تبحر اُن
 پیدا کیا۔ مگر اسکا نتیجہ بجز اسکے کہ مردوں کی روٹیاں کھانیوالے اور زیادہ ہو گئے۔ ملک کو کیا فائدہ پہنچا؟ اگر پنجاب
 یونیورسٹی قائم ہو جائے اور ہلکواسکا مشرقی میں ویسی ہی تعلیم دے (گو ویسی تعلیم بھی ممکن نہیں) تو بجز اسکے کہ چند
 بھکاری اور چند فاتحہ کی روٹی کھانیوالے ملک میں زیادہ ہو جائیں اور کیا نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے؟ ہلکواسکا
 بتاؤ کہ لاہور یونیورسٹی کالج نے جن لوگوں کو + + + پرورش کی اور ہائی پرورش کی کے خطاب مرحمت فرمائے ہیں
 وہ کس مرض کی دوا ہیں اور اُن سے ملک کو، قوم کو، اُسکی دولت کو، اُسکی حکومت کو، اُسکی تجارت کو، اُس کے
 اخلاق کو، اُسکی رہنمائی کو اور اُسکی وسعت خیالات کو کیا فائدہ پہنچا یا آئندہ پہنچ سکتا ہے؟ ہاں اگر یہ کہا جائے

اے جو آئین سر سید خانات لاہور سے نکلے تھے انہیں لکھا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کالج میں بلخ و بدخشان کے طالب علم تعلیم پاتے ہیں ۱۱

پنجاب یونیورسٹی اور الہ آباد یونیورسٹی کا مقصد مشرقی علوم کی آرٹین انگلش ہائی ایجوکیشن کو گھٹانا تھا یا نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ جو خیالات دونوں یونیورسٹیوں کی نسبت شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ گروہ میں پھیل گئے تھے۔ اور جہاں تک کہ معلوم ہوا ہے وہ خیالات محض بے بنیاد تھے۔ اب تک علانیہ طور پر انکا کچھ ظہور نہیں ہوا۔ بہ ظاہر دونوں یونیورسٹیوں میں کوئی ایسا قاعدہ نہیں پایا جاتا جو ہائی ایجوکیشن کا سد راہ ہو۔ بے شک پنجاب یونیورسٹی جس طرح بی اے اور ام اے کی ڈگریاں دیتی ہے اسی طرح اور نیٹل کالج کے طلبہ کو بی اے اور ام اے اور الہ آباد کے علوم اور مالک العلوم وغیرہ کی بھی ڈگریاں دیتی ہے مگر جیسا کہ سرید نے کہا تھا کہ ”اس میں ناکامی کا بیج ہے اسیلئے وہ آپ ہی آپ ناکام ہو جائیگی“ اور نیٹل کالج روز بروز تنہا کرتا جاتا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ ایک عرصہ کے بعد وہ فضول سمجھ کر توڑ دیا جائے۔

سرید نے جو مذکورہ بالا آرٹیکل میں مشرقی علوم (یعنی قدیم منطق فلسفہ طبیعیات اور ہیات وغیرہ) جنکا درس و تدریس مسلمانوں میں قدیم سے جاری ہے اور مشرقی زبانوں کو ترقی دینے یا دیسی زبانوں میں مغربی علوم کے شائع کرنے پر اس قدر دے کی ہے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اسکے بالکل مخالف تھے مشرقی زبانوں کی نسبت انھوں نے خود اپنے پہلے آرٹیکل میں لکھا ہے کہ ”بلاشبہ ہم اس بات کو کہ پنجاب یونیورسٹی کالج۔ قدیم مشرقی زبانوں کو ترقی دے۔ پسند کرتے ہیں کیونکہ قدیم لینگویج ماڈرن لینگویج کی زیور ہیں“ اسی طرح انھوں نے مغربی علوم کے دیسی زبانوں میں ترجمہ ہونے کی نسبت دوسرے آرٹیکل میں لکھا ہے کہ ”ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عام تعلیم کے لیے ہماری زبان نہایت عمدہ وسیلہ ہے جو تحصیل و دیہاتی مکتبوں میں محدود رہنی چاہیے“ اسکے سوا انھوں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں خود اس

گمان تھا۔ قائم ہونے لگی اور سرید کو معلوم ہوا کہ سرولیم میور لفنٹ گورنر سابق جو مشرقی علوم کے بڑے قدر دان تھے انکی پرانی تجویز کے موافق یہ یونیورسٹی بھی اسی غرض سے قائم ہونے والی ہے کہ مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کو ترقی دے تو انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی کی بھی اسی شد و مد کے ساتھ مخالفت کی جیسے کہ پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ انکے ایک آرٹیکل کے چند جملے بطور نمونہ کے بیان لکھے جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا ”افسوس ہے کہ لوگوں میں یہ خیال بچتا ہوتا جاتا ہے اور دن بہ دن اُسکو وسعت ہوتی جاتی ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی ایک نقل پنجاب یونیورسٹی کی ہوگی۔ شاید اُسکی صورت میں کچھ تبدیلی ہو مگر اُسکی پالیسی وہی ہوگی جو پنجاب یونیورسٹی کی تھی۔ پس علوم مشرقی کی ترقی کا دھوکا دیکر انگلش ہائی ایجوکیشن کو گھٹانا اور جس طرح ایک تیلی اپنے کو لھو کے بیل کی آنکھیں بند کر کے دن رات ایک ہی سرکل میں کوٹھو کے گرد پھرائے جاتا ہے اسی طرح ہندوستانی رعایا کی آنکھیں بند کر کے دن رات ایک ہی چکر میں ڈالے رکھنا ہے۔“

ایک مذب گورنمنٹ کا کام ہے +++ ہم اپنا یقین ظاہر کرتے ہیں کہ الہ آباد یونیورسٹی پنجاب یونیورسٹی کی بس نہیں ہونے لگی، وہ انگلش ہائی ایجوکیشن کے لیے بمنزلہ ایک مادہ جربان کے ہوگی۔ لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ ہمارا خیال غلط ہے تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے؟ ہماری رائے میں اس کا جواب صاف ہے؛ استقلال، استقلال، استقلال؛ ہمت، ہمت، ہمت؛ کوشش، کوشش، کوشش۔ ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پرواہ نہیں کرنی چاہیے اور خود اپنے لیے انگلش ہائی ایجوکیشن کے حاصل کرنی کوشش کرنی چاہیے اور اگر ہم میں سلف رسپیکٹ کا کچھ اثبات ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی راہوں پر نہیں۔“

اگرچہ بالیقین یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سرید کی تحریریں کا کیا اثر ہوا اور آیا نے الواقع

اور جبکہ حاصل یہ تھا کہ اگر ٹکنکل تعلیم کا بچوں اور اسکولوں میں محض ویشنل طور پر جاری کی جائے اور ہماری اعلیٰ درجہ کی لٹریٹری تعلیم کو اس سے کچھ صدمہ نہ پہنچے تو ہم کو اُس میں کچھ عذر نہیں ہو سکتا؛ لیکن اگر موجودہ طریقہ تعلیم میں کوئی ایسی تبدیلی کی جائے جو ہماری اعلیٰ درجہ کی لٹریٹری تعلیم میں مخل ہو تو ہم کو علانیہ یہ بات ظاہر کر دینی چاہیے کہ ہم ایسی تبدیلی سے سخت ناراض ہیں۔ سرید کو یہ خیال اس سبب پیدا ہوا تھا کہ الہ آباد یونیورسٹی میں بغرض ترقی ٹکنکل ایجوکیشن یا بہ خیال تکمیل تجاویز گورنمنٹ متعدد دفعہ ایسے امور پیش ہوئے تھے جو سرید کے نزدیک علانیہ لٹریٹری تعلیم کو روکنے والے تھے اور انھیں دنوں میں گورنمنٹ شمال مغرب نے ایک رزلوشن بغرض ترقی ٹکنکل ایجوکیشن مسترد کیا تھا اور ایک کمیٹی اس بات کے دریافت کرنے کو منعقد کی تھی کہ ٹکنکل تعلیم کو کن طریقوں سے ملک کے حق میں مفید بنایا جائے سرید نے اس خوف سے کہ کہیں یہ سب تمہیدیں ہائی ایجوکیشن کے موقوف کرنے کی رٹ یہ رزلوشن کانفرنس کے جلسہ عام میں جس میں ایک ہزار لائق ہندوستانی موجود تھے اس غرض سے پیش کیا تھا کہ اس باب میں ہندوستانیوں کی عام رائے معلوم ہونیکے بعد یونیورسٹی کو اس سے آگاہ کیا جائے چنانچہ یہ رزلوشن جسکی تائید مولوی حشمت اللہ ام لے اور مسٹر تھیوڈور بیک نے بڑے زور شور کے ساتھ کی تھی تمام مجمع کے اتفاق سے پاس ہوا اور الہ آباد یونیورسٹی اور گورنمنٹ شمال مغرب کو اس تمام کارروائی کی اطلاع دی گئی۔

سرید نے مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے لیے انھیں تدبیروں اور کوششوں پر بس نہیں کی جو انکی زندگی کے ساتھ ختم ہونے والی تھیں بلکہ وہ قوم کی تعلیمی مشکلات کی حل کرنے والی ایک ایسی انجمن چھوڑ گئے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے اس کو قائم رکھا تو وہ تمام معاملات میں جو قومی تعلیم سے علاقہ

مضمون کا رزلویشن پیش کیا تھا کہ "علوم عربی جو ہماری قومی نشانی ہیں اور علوم مذہبی جو ہماری حافی تربیت کا ذریعہ ہیں بدستور قائم رہیں اور مسلمانوں کے اوقات کار و سیرانی ترویج اور ترقی میں صرف کیا جائے۔ پس انھوں نے جو علی العموم مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر اور دیسی زبانوں کے ترجموں کی مخالفت کی ہے اس سے انکا صرف یہ مطلب ہے کہ ہندوستان کے کالجوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم محض انگلش لینگوج کے ذریعہ سے ہونی چاہیے نہ یہ کہ کالجوں میں انگلش لینگوج بطور سکند لینگوج کے برائے نام رہ جائے اور اصل مقصود مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کی ترقی اور مغربی علوم کو بذریعہ دیسی زبانوں کے تعلیم دینا قرار دیا جائے۔

مذکورہ بالا آرگکون کے سوا انکی بے شمار تحریریں اسی موضوع پر علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کی جلدوں میں موجود ہیں جن میں شاید سب اخیرہ آرٹیکل ہے جو علیگڑھ گزٹ مورخہ ۱۹ فروری ۱۹۹۰ء میں انکے مرنے سے سوا مینے پہلے شائع ہوا تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کے لحاظ سے درست ٹکنکل ایجوکیشن کی چندان ضرورت نہیں ہے بلکہ سب سے مقدم اعلیٰ درجہ کی داغی تعلیم کی ضرورت ہے جو اب تک بالکل یا پورے طور پر پوری نہیں ہوئی۔ چند برسوں سے جو اکثر اعلیٰ حکام اپنی اسپیکچون میں ٹکنکل ایجوکیشن کی ضرورت بیان کرتے تھے اس سے بھی سرمد کو یہی اندیشہ ہو گیا تھا کہ گورنمنٹ کا منشا ہائی ایجوکیشن یا لٹریری تعلیم کے موقوف کرنے کا ہے اور اسی لیے جب کوئی ایسی اسپیکچ انکی نظر سے گذرتی تھی وہ ضرور اس کے برخلاف کچھ نہ کچھ لکھتے تھے اور اسی بنا پر انھوں نے کانفرنس کے پانچویں اجلاس میں ایک رزلویشن ٹکنکل ایجوکیشن کے خلاف پیش کیا تھا اور رزلویشن کی تائید میں ایک طویل اسپیکچ کی تھی جو کانفرنس کی روئداد میں مندرج ہے

ٹکنکل ایجوکیشن کی مخالفت

رکھنے میں سرسید کا نعم البدل ثابت ہو گئی۔ انھوں نے ۱۸۸۶ء میں محمدن ایجوکیشنل کانفرس قائم کی جس کا ذکر پہلے حصہ میں تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔ انھوں نے اس قومی انجمن کو اپنی زندگی میں برابر گیارہ برس تک جاری رکھا اور اس عرصہ میں وہ تمام مرحلے جو ابتداءً ایسے کاموں میں پیش آتے ہیں نہایت خوبی کے ساتھ طے کر دیے اور آئندہ نسلوں کے لیے رستہ بالکل صاف کر دیا کہ سطح اُسکو چلائیں اور کیونکر اُس سے فائدہ اٹھائیں۔ جو کام قوم کے کرنے کے تھے ایک جم غفیر کے صلاح و مشورہ سے قوم کو اُنکے کرنے کی صلاح دی اور جو باتیں گورنمنٹ پر ظاہر کرنے کی تھیں اُنکو بطور ایک جماعت کی را کے با وقعت صورت میں گورنمنٹ کے کان میں ڈالا اور اپنی بے نظیر لیاقت اور حسن تدبیر سے ایک ایسی مجلس کو جس میں تعلیم و تعلم کی روکھی بھکی باتوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ چند سال کے عرصہ میں ایسا ویچسپ بنا دیا کہ پان پانسو اور ہزار ہزار کوس سے ہندوستان کے مسلمان جو ایسی صحبتوں سے کوسوں دور بھاگتے تھے خرچ کثیر برداشت کر کے ایسے چاؤ اور اُمنگ کے ساتھ جیسے کہ لوگ پھول والوں کی سیرت شالامار کے میلے میں دور دور سے آتے ہیں۔ اس علمی مجمع میں آکر شریک ہونے لگے۔

ایک اور تدبیر ترقی تعلیم کی۔ جو قوم کی معمولی بے پروائی سے براہِ رست پوری نہ ہو سکی۔ مول ٹرس کلاس اور مول سروس فنڈ ایسوسی ایشن کا قائم کرنا تھا جنکو سرسید نے اس غرض سے قائم کیا تھا کہ جو مسلمان اپنی اولاد کو ولایت کی تعلیم کے لیے تیار کرنا چاہیں اُنکو محمدن کالج میں ایک خاص طریقہ پر ابتدائی تعلیم دی جائے اور بعد امتحان کے جوڑے ولایت میں جانے کے قابل سمجھے جائیں اُنکو چندہ کے ذریعہ سے مدد دی جائے۔ یہ تجویز بھی اگر چل جاتی تو مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے حق میں نہایت مفید تھی۔ بیان تک کہ ایچو کیٹڈ کلاس کے ہندو بھی اس ایسوسی ایشن میں شریک ہونے کی دل سے آرزو کرتے تھے۔ چنانچہ

۱۵ البرٹ بل سے مراد وہ مشہور مسودہ قانون ہے جو لارڈ رپن کے عہد میں ویسٹمنسٹر کونسل کے لیگل ممبرسٹر البرٹ نے ۱۸۸۳ء میں ہاجلاس کونسل پیش کیا تھا اور اسی لیے یہ مسودہ البرٹ بل کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اس مسودہ کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی مجسٹریٹوں کو بھی مثل یورپین مجسٹریٹوں کے یورپین اور یوریشین باشندگان ہند فوجداری مقدمات کے فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے۔ چونکہ اس مسودہ کو یورپین اور یوریشین باشندوں کے حقوق سے تعلق تھا اس لیے جس قدر کہ ایجس لیٹو کونسل میں اور اخباروں میں اس مسودہ پر بحث اور نکتہ چینی اور مخالفت ہوئی تھی ویسی شاید ہی ہندوستان کے کسی مسودہ قانون پر ہوئی ہو۔ ہندوستانی ممبروں میں سے سر سید نے اور آرنیبل کرسٹوڈاس پال نے اس مسودہ کی بڑی زور سے تائید کی تھی مگر راجہ شیو پرشاد مثل اکثر یورپین ممبروں کے اس کے مخالف تھے جس کی وجہ سے بنگالی اخباروں میں اُنپر سخت لٹاڑ ہوئی تھی۔ جو اس سچ سر سید نے اس مسودہ کی تائید میں کی تھی اُس کو اسی قدر ختم کر کے ساتھ ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

”انھوں نے کہا ”مائی لارڈ! میں اس بات سے واقف ہوں کہ اس بل کی نسبت اخبارات میں بہت بحث ہوئی ہے اور یورپین اور یوریشین باشندوں کے غیر سرکاری گروہ میں اُسکی نسبت بڑا تملکہ مچا ہوا ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ قانون مجوزہ سے اُنکی آزادی خطرہ کی حالت میں ہے۔۔۔ اگرچہ ہر طرح پر میری یہ خواہش ہے کہ جو انہیں یورپین اور یوریشین لوگوں نے ظاہر کیں ہیں اُنپر بخوبی غور کیا جائے لیکن مائی لارڈ! میں اقرار کرتا ہوں کہ جو طریقہ مسودہ قانون کے برخلاف تحریک کرنے والوں نے اختیار کیا ہے اُس پر میں دلی افسوس کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ تحریک نیوالوں نے میرے ہموطنوں کے برخلاف نہایت سخت اور کسی قدر بے احتیاطی کے ساتھ کلمات استعمال کیے ہیں۔۔۔ مائی لارڈ! اس مقام پر میں اپنی دلی امید ظاہر کرتا ہوں کہ ہندوستان کے کسی حصہ میں میرے ہموطن اُن شخصوں کی بیروی نہ کریں گے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ واضعاً قانون کی غور کے واسطے دلائل اور دعویوں کے پیش کرنے کا سب سے عمدہ طریقہ عام طور پر جمع کر کے سخت گفتگو کرنا ہے۔۔۔ میرے نزدیک جو مخالفت اس مسودہ قانون کی نسبت کی گئی ہے وہ زیادہ تر اس سبب سے ہے کہ لوگوں کو اس قسم کے معاملات میں ہندوستان کے قوانین کی تاریخ سے واقفیت نہیں ہے اور جو خفیف تبدیلی قانون مروجہ میں اس بل کی رو سے کرنی تجویز کی گئی ہے اُسکے سمجھنے میں انھوں نے غلطی کی ہے۔ میں کانستبلویشنل لا کے مسائل سے واقف ہونے کا دعوے نہیں کرتا لیکن اس مسودہ قانون کے برخلاف جو یہ بحث پیش کی گئی ہے۔ کہ ہندوستان میں حضور قیصر ہند کی یورپین اور یوریشین رعایا ایسے حقوق رکھتی ہیں جنکے سبب

نہ انھوں نے اس کو دیکھا تھا نہ
 وہ کبھی اس کو دیکھا تھا نہ
 یہ کبھی اس کو دیکھا تھا نہ
 یہ کبھی اس کو دیکھا تھا نہ
 یہ کبھی اس کو دیکھا تھا نہ
 یہ کبھی اس کو دیکھا تھا نہ
 یہ کبھی اس کو دیکھا تھا نہ
 یہ کبھی اس کو دیکھا تھا نہ
 یہ کبھی اس کو دیکھا تھا نہ
 یہ کبھی اس کو دیکھا تھا نہ

لورنس کی بدگمانی کا نشانہ بنا لیتے اور جب آپ کوئی ایسا برا وقت آکر پڑتا جیسا بچے دنوں
 میں پونا کے برہمنوں پر پڑا تو جو سہمردی اہل پونا کے ساتھ ملے گا اس کی اور جتنی بھی

لہ البرٹ بل کا نوٹ آئندہ صفحہ ۱۲ پر دیکھو

کیجاتی ہے، عدالتوں دیوانی کی تجویزوں سے فریقین کی نیکنامی پر تقریباً اسی طرح دہتا لگ سکتا ہے اور انکی عزت برباد ہو سکتی ہے جیسی فوجداری عدالتوں کے احکام سے۔ پس میرے نزدیک دونوں عدالتوں کے جوڈیشل اختیارات میں امتیاز قرار دینے کے لیے کوئی معقول بنیاد موجود نہیں ہے۔ اگر بہت بازی انصاف اور قومی بے بسی دیوانی کے معاملات میں ہندوستانی جموں میں پائی جاتی ہے تو اس بات کا سمجھنا مشکل ہے کہ ان میں وہی خصلتیں فوجداری کے ان مقدمات میں نہ پائی جائیں جنہیں یورپین اور یوریشین شریک ہوں۔ تمام ہندوستانی مجسٹریٹ اب بھی ان مقدمات فوجداری میں۔ جنہیں اہل یورپ نالشی ہوں اور بطور فریق ضرر رسیدہ کے عدالتوں سے چارہ جوئی کریں۔ اختیارات عمل میں لاتے ہیں؛ میں نے اب تک کبھی یہ نہیں سنا کہ یورپین انگریزی رعایا نے ہندوستانی مجسٹریٹوں سے دادخواہی کرنے میں کوئی عذر کیا ہو؛ پس جب کہ یہ صورت ہے تو اس بات کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہندوستانی مجسٹریٹوں پر ان مقدمات میں۔ جنہیں یورپین انگریزی رعایا کی نسبت نالشی پیش کیجائیں۔ اُس قسم کا اعتبار نہ کیا جائے۔ جو مجسٹریٹ کہ دادرسی کے مجاز میں ضرور ہے کہ وہ سزا دینے کے بھی مجاز ہوں اور رعایا کے کسی فرقہ کا یہ کہنا ناواجب اور بے جا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہندوستانی مجسٹریٹوں کے روبرو چارہ جوئی کے واسطے تو جائینگے لیکن اس بات کو گوارا نہ کریں گے کہ جو نالشی ہم پر کیجائے اُس میں وہ ہماری نسبت تجویز کریں +++ میں یقین کرتا ہوں کہ مجھکو یہ صحیح اطلاع دی گئی ہے کہ جزیرہ لنکا میں۔ جو اس ملک کے متصل واقع ہے اور جو برطانیہ کی وسیع سلطنت کا ایک جزو ہے۔ ہندوستانی مجسٹریٹ اور جج یورپین انگریزی رعایا پر فوجداری کا اختیار عمل میں لاتے ہیں اور وہ ان اُس جوڈیشل ناقابلیت کو جو قومی تفرقہ پر مبنی ہو کوئی جانتا بھی نہیں حالانکہ انگریزی سرمایہ اور انگریزوں کی تجارتی اولوالعزمی کو۔ بجائے اسکے کہ وہ اس جزیرہ سے جاتی رہی ہو۔ نہایت ترقی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک لنکا میں قہوہ کے کاشتکاروں کے مطالب بنگالہ کے نیل کے کاشتکاروں کے مطالب سے کسی حالت میں کمتر نہیں ہیں اور لنکا کے باشندے ہندوستان کے باشندوں کی نسبت کسی طرح پر کچھ کم ایشیائی نہیں ہیں اور نہ لنکا میں انکا کوئی نہایت مضبوط محب قوم بھی میزان شایستگی میں اُس سے زیادہ تر اعلیٰ رتبہ کا دعوے کر گیا جو وہ ہندوستان کے باشندوں کی نسبت قرار دیا مگر باوجود اسکے یورپین انگریزی رعایا پر فوجداری کے اختیار کے معاملہ میں برٹش انڈیا کا قانون لنکا کے قانون سے پیچھے ہے پس مائی لارڈ! میرے نزدیک یہ کچھ

وہ ہندوستان کی لیجسلیٹو کونسل کے اختیار سے باہر ہے۔ اُسکی قانونی صحت کی نسبت میں بلا تامل شبہہ کر سکتا ہوں۔ میں ہندوستان کے لیجسلیٹو کونسل کا ایک ناچیز ممبر ہونے کی حیثیت سے اس قسم کی پابندی کو ناپسند کرتا ہوں۔ ہمنے اپنے اختیارات انگلستان کی بڑی پارلیمنٹ سے حاصل کیے ہیں اور جب تک ہم اُن اختیارات کی حد سے تجاوز نہ کریں اُسوقت تک میرے نزدیک اُن تمام معاملات میں۔ جو ہندوستان سے متعلق ہیں۔ اس کونسل کی قانونی حکومت کی نسبت شبہہ کرنا بیجا معلوم ہوتا ہے۔++ جو تحریک بالفصل اس مسودہ کے برخلاف کی گئی ہے اُس میں ہم انھیں دیلون اور رایون کی تکرار پاتے ہیں جواب سے پہلے خطبہ پیدا کرنے والوں نے اُسوقت پیش کی تھیں جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عدالتوں کے ہندوستانی ججوں کو صیغہ دیوانی کی اُن نالشات کی تجویز کا اختیار دیا گیا تھا جنہیں یورپین اور یوریشین فریق مقدمہ ہوں۔ میں بغیر اندیشہ تردید کے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ جن مقدمات میں یورپین شریک ہوتے ہیں اُن میں ہندوستانی ججوں کے اختیارات دیوانی کے عمل میں لانے سے قومی اختلاف کی بنا پر کوئی نا انصافی بلکہ شکایت بھی نہیں پیدا ہوئی ہے۔ بے شک اُس زمانہ کے خطرے پیدا کرنے والوں کے اندیشے بے اصل تھے اور اُنکی پیشین گوئی غلط ثابت ہونے والی تھی۔ اُسوقت نام برٹش انڈیا میں ہندوستانی جج اہل یورپ پر اختیارات دیوانی ایک ایسے طریقہ میں استعمال کرتے ہیں جو درحقیقت اس الزام کے لائق نہیں ہے کہ قومی امتیاز کا اُس میں اثر پایا جاتا ہے۔ نیکلن بعض اوقات یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ دیوانی کا اختیار فوجداری کے اختیار سے مختلف ہے؛ دیوانی کا اختیار صرف جائداد پر موثر ہوتا ہے اور فوجداری کا اختیار ذاتی خصلت اور آزادی پر۔ پس ہندوستانی ججوں کے دیوانی کے اختیار کی احاطت سے یہ لازم نہیں آتا کہ فوجداری کے معاملات میں بھی اُنکے اختیار پر رضامندی ظاہر کی جائے۔

”وائی لارڈ! میں اس وجہ کو نہیں سمجھ سکتا جس پر یہ امتیاز مبنی ہے۔ عدالت ہائے دیوانی کی دگریات ایک شخص کو دو متمند سے مفلس کر سکتی ہیں، دیوانی کے بعض صیغے صرف ذاتی تعلقات ہی سے متعلق نہیں ہوتے بلکہ اُن میں ذاتی گرفتاری کے اختیارات بھی شامل ہوتے ہیں اور انصاف کی غرض سے ان میں اُس قسم کی کارروائی کی اجازت دی گئی ہے جو فوجداری کی عدالتوں کے واسطے قرار دی گئی، دیوانی کے مقدمات میں واقعات کی نسبت نتیجوں کے قرار دینے کا قاعدہ زیادہ تر وہی ہے جیسا فوجداری کے مقدمات میں ہوتا ہے ہندوستان میں دیوانی اور فوجداری کی عدالتوں میں امر حق کی تحقیقات ایک ہی قانون شہادت کے بموجب

باشندوں کو یہ حقوق عطا کیے تھے کہ سلطنت کی ملازمت میں ہندوستانیوں کو اسی حیثیت پر نوکری دی جائے جیسی کہ خاص انگریزوں کو۔ اس فیصلہ کا پچھلے برسوں میں عملی طور پر نفاذ کیا گیا ہے اور انتظامی مصلحت اس خفیف تبدیلی کی مقتضی ہوئی ہے جو اس بل میں تجویز کی گئی ہے۔

”لیکن مائی لارڈ! اس سودہ کی تائید میں انتظامی مصلحت کی نسبت زیادہ اعلیٰ درجہ کی وجوہات وجود ہیں؛ یعنی میں آزادی انصاف اور انسانیت کے ان عمدہ اصولوں کا ذکر کرتا ہوں جنکی جائے قرار کمین باسقدر نہیں ہے جیسی کہ اس قوم کی طبیعت میں ہے جسے سب سے پہلے غلاموں کو آزاد کیا اور سب سے پہلے ہندوستانیوں کو اس امر سے مطلع کیا کہ کانسٹیٹوشنل حقوق کے معاملہ میں قوم و مذہب کے امتیازات کی قانون کی نگاہ میں کچھ وقعت نہیں ہونی چاہیے۔۔۔۔۔ تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ کسی ملک کی فلاح و بہبودی کی برباد کرنے والی اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہے کہ حاکم اور محکوم کے درمیان قومی تفرقہ قائم رکھا جائے۔ کوئی شخص مجھ سے زیادہ اس بات کا خواہاں نہیں ہو سکتا کہ انگریزی قوم اور ہندوستان کے باشندوں کے درمیان دوستانہ خیالات کو بہ نسبت اس کے جیسی کہ اب تک ہوئی ہے اور زیادہ ترقی ہو۔ قدرت نے دونوں قوموں کو ایک پولٹیکل (اور میں کہ سکتا ہوں کہ ایک سوشل) رشتہ میں ملایا ہے جس کو جون جون مانہ گذرنا جاوے گا اسی قدر زیادہ استحکام ہوتا جاوے گا۔۔۔۔۔ مجھ کو یقین واثق ہے کہ جب تک قومی امتیازات کو ملک کے عام قانون میں دخل ہوگا اس وقت تک دونوں قوموں کے درمیان اصلی دوستانہ خیالات کی ترقی کے باب میں مزاحمتیں قائم رہیں گی۔ زندگی کی سوشل خوشی اور موافقت۔ پولٹیکل ہمہ سہری سے اور ایک ہی قانون کے زیر حکم رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ذات کا سلسلہ شاید اس قدر عرصہ تک ہرگز قائم نہ رہتا اگر زمانہ قدیم کے مقتن۔ براہمن کے واسطے ایک قانون اور شدر کے واسطے دوسرا قانون نہ بناتے۔ خیر زمانہ سابق کی ضرورتیں کچھ ہی کیون نہ ہوں لیکن مائی لارڈ! میں امید کرتا ہوں کہ انگریزی حکومت کے ڈیرہ سو برس گذر جانے سے ہم شایستگی کے اس درجہ تک پہنچ گئے ہیں کہ قومی امتیاز کو بہر کیف ملک کے عام قانون میں کم کرنا ہر ایک وجہ سے مناسب ہے۔ میرے نزدیک یقیناً اب وہ زمانہ آگیا ہے جبکہ ہندوستان کے تمام باشندے۔ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان یورپین ہوں یا یوریشین۔ اس بات کو سمجھنے لگیں کہ وہ ہمہ سرعلیاہیں اور ان کے

نا واجب بات نہیں ہے کہ ہندوستان کے باشندے یہ خیال کریں کہ اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ قانون میں اصلاح کرنے کی شدید ضرورت ہو گئی ہے۔۔۔ مائی لارڈ! جیسا کہ میں نے اس مسودہ کو سمجھا ہوا کہ یہ تجویز نہیں کی گئی ہے کہ ہر ایک ہندوستانی مجسٹریٹ کو انگریزی یوروپین رعایا کی نسبت تجویز کرنے کا اختیار دیا جائے بلکہ صرف انھیں ہندوستانیوں کے معاملہ میں۔ جنھوں نے اپنی مسلمہ رست بازی اور لیاقت کے بدولت جوڈیشل سروس میں ایسے عمدے حاصل کیے جائیں جو رتبہ میں اعلیٰ درجہ کے انگریزی عمدہ داروں کے مساوی ہیں۔ اس مسودہ میں ان جوڈیشل نا قابلیتوں کے دور کرنے کی تجویز کی گئی ہے جو قومی امتیاز پر مبنی ہیں۔ اس قسم کے ہندوستانی عمدہ داروں کی تعداد نہایت محدود ہے اور اسی وجہ سے اس مسودہ کی نسبت یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ بغیر کافی غور و تامل کے پیش کیا گیا ہے یا اس کے سبب سے دادرسی کے موجودہ ذریعوں میں کسی بڑی عملی تبدیلی کا ہونا متصور ہے۔

”جس دلیل پر قومی امتیازات کا نہایت لحاظ کیا گیا ہے میرے نزدیک اُس میں بڑی غلطی ہے۔ جس چیز کی لوگ ان ملکوں میں۔ جنکو شاید گورنمنٹ کی برکت حاصل ہے۔ اطاعت کرتے ہیں۔ وہ کچھ خاص خاص شخصوں کی حکومت نہیں ہے بلکہ وہ قانون کے احکام ہیں۔ جب تک کہ قانون منصفانہ بے طرفدار اور باہم ہوگا اور جب تک اس قانون کا عمل درآمد ٹھیک ٹھیک طریق پر کیا جاسکے گا اس وقت تک ان شخصوں کی قومیت جو قانون کی تعمیل کریں۔ باریک خیال والوں کے نزدیک بھی چندان لحاظ کے قابل نہیں ہوتی چاہیے۔ جس چیز کی تعظیم اور ادب اور اطاعت درکار ہے وہ قانون کی حکومت ہے نہ کہ خاص خاص شخصوں کی۔ پس جو لوگ ہندوستانیوں کو اپنی برابری کا مستحق نہیں سمجھتے وہ اگر غور کریں گے تو ان کو معلوم ہو جائیگا کہ ہندوستانی مجسٹریٹ گورنمنٹ کے نوکر ہیں جن کے متعلق گورنمنٹ کے احکام کی تعمیل کرنا ہے۔ قانون کے مناسب عمل درآمد کے واسطے انتظام کرنا گورنمنٹ کا فرض ہے اور اس مقصد کے واسطے گورنمنٹ کو نہایت عمدہ ذریعے جو ہم پہنچ سکیں منتخب کرنے پڑتے ہیں اور یہ ایک پوچ اور غیر واجبی تجویز معلوم ہوتی ہے کہ گورنمنٹ کی کوئی رعایا اس بات پر اصرار کرے کہ عمدہ داروں کا انتخاب کسی خاص قوم یا فرقہ پر حصر رکھا جائے۔ میرے نزدیک یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے اصول کی نسبت کسی جدید فیصلہ کی حاجت نہیں ہے؛ اس سوال کی نسبت اس وقت بحث کی گئی تھی اور اس کا فیصلہ عمدہ طور پر ہو گیا تھا جبکہ انگلستان نے اپنی عالی حوصلگی اور انصاف سے ہندوستان کے

ڈفنس میں پیروی کی گئی اُسکا ستوان حصہ بھی بد نصیب مسلمانوں کے ساتھ نہ مسلمانوں کی طرف سے اور نہ غیر قوموں کی طرف سے۔ ظہور میں آنے کی امید تھی۔ اگر اس میں کسی کو شک ہو تو وہ مولوی ہدایت رسول کی مثال پر غور کرے جو کانگریس کے بعض جلسوں میں شریک ہو کر بنگالیوں سے آزادی کا سبق پڑھ کر آئے تھے۔ اگر عام مسلمانوں میں جو تعلیم سے عموماً بے بہرہ ہیں اور جنہیں مشکل سے پچاس ہزار میں ایک تعلیم یافتہ نکلیگا۔ کانگریس میں گروہ کے خیالات پھیل جاتے تو اُن سے اکثر ایسی ہی سخیف اور نالائق حرکتیں سرزد ہوتیں جیسی ہدایت رسول سے لکھنؤ کے ایک عام مجمع میں سرزد ہوئی "اور جب وہ عدالت میں ماخوذ ہوتے تو اپنے تئیں ویسا ہی بے یار و مددگار پاتے جیسا مولوی ہدایت رسول کا حال ہوا کہ اُس کو ضمانت تک میسر نہ آئی اور جو سزا عدالت ماتحت نے اُس کے لئے تجویز کی اُس کو بے چون و چرا قصاے مرہم سے بھگتنا پڑا۔

پس اگرچہ مسلمانوں کی علیحدگی سے ہندوؤں میں ناراضی پھیل جانے کا نہایت افسوس ہے لیکن کانگریس کی شرکت میں جو مضرت تاج مسلمانوں کے حق میں پیدا ہونے والے تھے وہ اُن کے لئے بہت زیادہ افسوسناک ہوتے۔ اسی لئے مسلمانوں کو سرسید کا دل سے شکر گزار ہونا چاہئے جس کی چیخ پکار سے وہ ایک ایسے ایجنٹیشن میں جو دیوانوں کے لئے ھو کی آواز اور ہمشیاروں کے لئے خالی بادل کی گرج تھی۔ شریک ہونے سے باز رہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جب ہم کانگریس کے بلند ارادوں پر نظر کرتے ہیں اور پھر اپنے گریبان میں مونہ ڈال کر دیکھتے ہیں تو ہم کو لامحالہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ "طواغوروں داروے بائ"

پونکل حقوق یا کانسٹیٹیوشنل رتبہ میں قانون کی نگاہ میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے اور ہندوستان میں انگریزی حکومت کے ماتحت جو حفاظت کا استحقاق انکو حاصل ہے وہ کچھ قوم یا مذہب کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس بڑے حق کے سبب سے ہے جس میں سب شریک ہیں یعنی اس جلیل القدر شاہنشاہ کی وفادار عایا ہونے کے حق کے سبب جس کے عہد دولت مہد نے ہندوستان کو امن و آسائش بخشی ہے اور اسکو تجارتی اولوالعزمی اور زمانہ شایستگی کے ہنر اور فنون کے اکتساب کے واسطے ایک مناسب مقام بنا دیا ہے۔

”مائی لارڈ! چونکہ یہ موقع غالباً اخیر موقع ہے جو قانونی کونسل سے مخاطب ہو کر گفتگو کرنے کا جھکو حاصل ہوگا اسلئے میں اس اخیر گفتگو کو بغیر کے اس بات کے ختم نہیں کر سکتا کہ حضور کا عہد حکومت اس بات پر دل سے مبارکبادی کا مستحق ہے کہ اُس میں ایک ایسا مسودہ قانون پیش کیا گیا جس کے ذریعہ سے میں یقین کرتا ہوں کہ حسد انگیز قومی امتیازات بہت کچھ دور ہو جائیں گے اور آخر کار حکام اور محکوم کے درمیان اس ملک میں۔ جس میں بہت سی قومیں مختلف مذاہب کی رہتی ہیں۔ دوستی اور باہمی ادب اور ہمدردی کو ترقی ہوگی۔“

کچھ مانگین۔ مانگنے کا استحقاق پیدا کرنا چاہیے اور پہلے اس سے کہ گورنمنٹ سے اُن اصلاحوں کے خواستگار ہوں۔ جو اُس کے اختیار میں ہیں۔ ہر کو وہ اصلاحیں کرنی چاہئیں جو خود ہمارے اختیار میں ہیں۔ ہر کو اپنی معاشرت، مذہب، اخلاق اور تعلیم و تربیت کے متعلق ہزاروں کام کرنے ہیں جنکے بغیر ہماری دنیا اور دین دونوں خراب ہیں پھر ہم سلطنت سے کس بات کی توقع رکھتے ہیں۔ ہر کو اپنے نبی کا یہ ارشاد یاد رکھنا چاہیے کہ ”اَعْمَا لَكُمْ عَمَّا لَكُمْ“ (یعنی جیسی تمہاری حالت ہوگی ویسی ہی تم پر حکومت کجائیگی) اسی لیے سرسید نے اپنی لکھنؤ والی ایلیج کے آخر میں مسلمانوں کو یہ نصیحت کی تھی کہ ”گورنمنٹ سے حقوق طلب کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اپنے تئیں اُن حقوق کا مستحق بناؤ“ اور کہا تھا کہ ”جو چیز تم کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانے والی ہے وہ صرف ہائی ایجوکیشن ہے، جب تک ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہ ہوں گے ہم ذلیل رہیں گے، اور وہ سب سے پست رہیں گے اور اُس عزت کو نہ پہنچیں گے جس پر پہنچنے کو ہمارا دل چاہتا ہے۔ یہ دلسوزی کی چند نصیحتیں ہیں جو میں نے تم کو کیں ہیں۔ مجھے ہسکی کچھ پروا نہیں ہے کہ کوئی مجھے دیوانہ کہے یا اور کچھ؛ میرا فرض تھا کہ میرے نزدیک جو باتیں قوم کی بھلائی کی ہیں وہ اُن سے کہہ دوں، اور اپنا فرض ادا کروں اور خدا کے سامنے۔ جو قادر مطلق اور رحیم اور گناہوں کا بخشنے والا ہے۔

”دون“

اپنے ہاتھ

ملہ سرسید کی سرکاری، ملی اور قومی خدمات کا جنہیں بعض ایسی جلیل القدر ہیں کہ جن قوم میں ایک مثال بھی ایسی خدمات کی پائی جائے وہ قوم کم سے کم دنیا کی نظر میں حقیر نہیں سمجھی جاتی۔ جیسا کہ کہا گیا

مَثَلُ نَحْوِ تَمِيمٍ مِنْ كَرِيمٍ وَمُسْلِمَةُ ابْنِ عَمْرِو بْنِ تَمِيمٍ

(یعنی جب کہ مسلمہ بن عمرو (یعنی میرا ممدوح) بنی تمیم میں ہو تو یہ کیونکر کہا جاسکتا ہو کہ بنی تمیم جو ان مردوں سے خالی ہیں)

ہماری قوم میں عموماً پھوٹ پڑی ہوئی ہے، مذہبی تعصبات مادہ اکالہ کی طرح قوم کو فنا کر رہے ہیں، ہر فرقہ دوسرے فرقہ کی جان کا مال کا عزت و ابرو کا خواہاں ہے، پولیس ہمارے مذہبی جھگڑوں کی تحقیقات کرتے کرتے اور حاکم سرائین دیتے دیتے تھک گئے مگر ہم لڑنے جھگڑنے کے لئے اسی طرح تازہ دم ہیں، تمام قوم ہزاروں بیہودہ رسموں کی پابندی میں گرفتار ہے، اسراف اور فضول خرچی ہماری قومی خصلت بن گئی ہے، صد ہا خاندان اپنی فضولیوں کے سبب بگڑ گئے اور بگڑتے چلے جاتے ہیں، کروڑ ہا روپیہ کی جائداد قرصہ کی ڈگریوں اور عدالت کے جھگڑوں میں غیر قوموں کے پاس منتقل ہوتی چلی جاتی ہے، تعلیم کے لحاظ سے اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو ابھی ہم نے الٹ بے تے شروع کی ہے، عورتوں کی تعلیم جو قومی ترقی کی جڑ ہے۔ اُس کے لحاظ سے ہم اب تک بالکل صفر ہیں، تجارت میں گویا ہمارا کچھ حصہ ہی نہیں، دولت کو ہمارے ساتھ وہ نسبت ہے جو پانی کو مچھلی کے ساتھ ہے، لاکھوں مسلمان شہر شہر اور گانوں گانوں بھیک مانگتے پھرتے ہیں مگر ہم اس کا کچھ تدارک نہیں کرتے، ہزاروں اشراف خاندانوں کے لاوارث اور مفلس بچے آوارہ اور مطلق العنان پھرتے ہیں مگر ہم سے اُن کی پرورش اور تعلیم کا کچھ انا ہو سکتا، ہماری حالت پر فی الواقع یہ مثل صادق آتی ہے کہ ”اونٹ رے او تیری کون سی گل سیدی“ جب کہ ہماری قوم کا یہ حال ہے تو کس پر ہم نمٹیں گے؟ میں شریک ہو سکتے ہیں اور کیا مونہ لیکر ہم گورنمنٹ سے اُن حقوق کا مطالبہ کر سکتے ہیں جن کے ہم مستحق نہیں ہوئے، ہکو پہلے اس سے کہ گورنمنٹ سے

لیکن ہم یہ ضرور کہتے ہیں اور کہیں گے کہ جس شخص کو کافر، ملحد، نیچری اور بد مذہب کہا جاتا تھا جو اسلام کی خدمت اُس سے بن آئی وہ نہ اُن مستفتیوں سے ہو سکی جنہوں نے مکہ میں جا کر اُس کے کفر کے فتوے لکھوائے اور نہ اُن مفتیوں جنہوں نے مسجد احرام میں بیٹھ کر اُس کے کفر کے فتوے پڑھیں۔ کہیں ہندوستان میں اسلام تین خطروں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری اُسکی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ اگرچہ قحط کے دوروں میں اُنکو دُلا پتلا شکار پیٹ بھراؤ مل جاتا تھا مگر وہ اسپر قانع نہ تھے اور ہمیشہ صید فریب کی تلاش میں رہتے تھے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ اُنکا دانت مسلمانوں پر تھا اور اسیلے اُنکی منادیوں میں، اُنکے اخباروں میں اور اُنکے رسالوں میں زیادہ تر جو چھاڑ اسلام پر ہوتی تھی۔ اسلام کی تعلیم کی طرح طرح سے بُرائیاں ظاہر کرتے تھے، بانی اسلام کے اخلاق و عادات پر انواع و اقسام کی نکتہ چینیاں کرتے تھے چنانچہ بہت سے مسلمان کچھ ناواقفیت اور بے علمی کے سبب واکثر افلاس کے سبب اُنکے دام میں آ گئے۔ اس خطرہ سے بلاشبہ بعض علمائے اسلام (شکراً اللہ مساعیئہم) جیسے مولانا رحمت اللہ مرحوم اور مولوی آل حسن اور ڈاکٹر وزیر خان وغیرہ۔ متنبہ ہوئے انہوں نے متعدد کتابیں عیسائیوں کے مقابلہ میں لکھیں اور اُنسے بالمشافہہ منظرے کیے جس سے یقیناً مسلمانوں کو بہت فائدہ ہوا لیکن اسکا اثر مسلمانوں ہی تک محدود رہا عیسائیوں کی غلط فہمیاں جو اسلام کی نسبت قدیم سے چلی آتی تھیں وہ بدستور قائم رہیں۔

دوسرا خطرہ جو پہلے سے زیادہ خوفناک تھا وہ مسلمانوں کی پوٹکل حالت سے علاوہ رکھتا تھا۔

اول تو مسلمان اس نظر سے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلش قوم نے مسلمانوں سے لی تھی۔ ہمیشہ

ہندوستان میں اسلام کن خطروں میں گھرا ہوا تھا
دوسرا خطرہ

دوسرا خطرہ

مذہبی خدمات

اس عنوان میں ہم سرسید کی وہ کوششیں اور خدمات دکھانی چاہتے ہیں جو دین اسلام کی حمایت میں زمانہ حال کی ضرورتوں کے موافق وہ اخیر دم تک انجام دیتے رہے۔ اگرچہ ابھی تک انکی مذہبی خدمات کی کچھ قدر نہیں ہوئی کیونکہ ایک محدود جماعت کے سوا اکثر مسلمان انکی مذہبی تصنیفات کو مخرب اسلام جانتے ہیں اور اکثر تکفیر یا تضلیل کے خوف سے محض مصلوۃ مخالفین کی بان میں بان ملا دیتے ہیں یا سکوت اختیار کرتے ہیں؛ لیکن چونکہ مخالفت کا سبب محض تعصب یا پاس دینداری ہی نہیں بلکہ اُسکے ساتھ ناواقفیت اور زمانہ کی ضرورتوں سے بے خبر ہونا بھی شامل ہے اسلئے امید ہے کہ جسقدر لوگ زمانہ کی ضرورتوں سے واقف ہوتے جائینگے اُسی قدر سرسید کی مذہبی خدمات کی قدر مسلمانوں میں روز بروز بڑھتی جائیگی۔

سرسید نے جو کچھ مذہب کے متعلق ابتدا سے اخیر تک لکھا ہے منجملہ اُسکے وہ کتابیں اور رسالے جو غدر کے زمانہ سے پہلے لکھے گئے اور جنکا ذکر پہلے حصہ میں اپنے اپنے موقع پر آچکا ہے وہ اس مقام پر ہماری بحث سے خارج ہیں؛ کیونکہ انہیں ہم کوئی چیز ایسی نہیں پاتے جسکے لحاظ سے انکو قدیم طرز کی تصنیفات میں کوئی ممتاز درجہ دیا جائے یا جو اسلام کی حمایت کے لیے اس زمانہ میں درکار ہے۔ پس جو کچھ ہم کو اس باب میں دکھانا ہے وہ صرف انکی وہ مذہبی خدمات ہیں جو غدر کے بعد انھوں نے انجام دیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جو کچھ انھوں نے غدر کے بعد مذہب کے متعلق لکھا وہ خطا اور غلطی سے بالکل پاک ہے۔ اور ایک فانی مخلوق کا کام ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔

تفسیر القرآن

ترجمہ قرآن کی کتاب کا جواب لکھنے کی تیاری

انھوں نے ان مقاصد کی طرف پہلے ہی بار اسوقت توجہ کی تھی جبکہ مراد آباد میں تبیین الکلام یعنی توریت و انجیل کی تفسیر لکھنے کی بنیاد ڈالی اس کتاب کا مفصل ذکر پہلے حصہ میں ہو چکا ہے یہاں اسکے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر جب سرولیم میور کی کتاب لائف آف محمد چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان میں پہنچی۔ جسکی نسبت عیسائیوں میں مشہور تھا کہ اُسے اسلام کے استیصال میں تسمہ لگانے میں رکھا۔ اسوقت جو حال سرسید کی بے چینی اور جوش و خروش کا تھا وہ ہمنے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ غالباً ۱۸۶۷ء یا ۱۸۶۸ء میں سائمنٹک سوسائٹی کا سالانہ جلسہ تھا اور دلی سے منشی امجد علی مرہوم ارجمند آباد سے نواب مصطفیٰ خان مرحوم۔ کہ یہ بھی اسوقت تک سوسائٹی کے ممبر تھے۔ علی گڑھ گئے تھے۔ نواب صاحب کی ہمراہ میں بھی گیا تھا گو اسوقت تک میری سرسید سے جان پہچان نہ تھی مگر چونکہ ہم انھیں کی کوٹھی میں ٹھہرے تھے انکے خیالات معلوم نہ ہوئے۔ وہ جب کبھی اور کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھتے تھے اکثر سرولیم کی کتاب کا پتہ اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام پر یہ حملہ ہو رہا ہے میں اور مسلمانوں کو بین۔ اُسی وقت ہمنے یہ بھی دیکھا کہ سرسید جاہلیت کے اشعار۔ جن سے اُس زمانہ کی بیہودہ اور نفرت انگیز رسمیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور جو خطبات احمدیہ میں بجنسہ نقل کیے گئے ہیں ایک مولوی سے انتخاب کر رہے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ انکا پختہ ارادہ سرولیم کی کتاب کا جواب لکھنے کا ہے۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار جب انھوں نے دیکھا کہ ۱۸۷۰ء کے ہنگامہ میں ہندوستان کے تمام اسلامی کتب خانے برباد ہو گئے ہیں اور جن کتابوں کی اس مضمون کے لیے ضرورت ہے وہ یہاں

حکمران قوم کی نگاہ میں کھٹکتے تھے دوسرے بسبب اُن غلط فہمیوں کے جو یورپ کی تمام عیسائی قوموں میں اسلام کی نسبت پھیلی ہوئی تھیں۔ انگریز مسلمانوں کے مذہب کو بغی و فساد کا سرچشمہ اور امن و عافیت کا دشمن خیال کرتے تھے۔

تیسرا خطرہ خاص کر مذہب اسلام کو انگریزی تعلیم کی طرف سے تھا جو روز بروز ہندوستان میں پھیلتی جاتی تھی اور جس سے ہندوستانیوں کو کسی طرح مفر نہ تھا۔ اگرچہ غدر سے پہلے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کچھ اشاعت نہیں ہوئی تھی لیکن غدر کے بعد اسکے بغیر مسلمانوں کا ابھرنا محال ہو گیا تھا یہاں تک کہ سرسید کو خود اُن میں تعلیم پھیلانی پڑی۔ حالانکہ انگریزی تعلیم کے نتائج اسلام کے حق میں مشنیریوں کی پر بھنگ سے بہت زیادہ اندیشہ ناک تھے۔

پچھلے دو نو خطروں کا سرسید کے سوا ہندوستان کے کسی عام کو احساس نہیں ہوا۔ مولویوں سے اسکے سوا۔ کہ چند روز دریا کی رو یعنی انگریزی تعلیم کو روکنے کے لیے ہاتھ پاؤ مار کر رہ گئے۔ اور کچھ نہیں ہو سکا۔ سید احمد خان پہلا شخص ہے جس نے ان تینوں خطروں کا جہانتک کہ اُسکی قدرت میں تھا مقابلہ کیا اور توقع سے زیادہ اُس میں کامیابی حاصل کی۔ اُس نے عام اعتراضوں کے جواب جنکے ذریعہ سے مشنیری مسلمانوں کو دام میں لاسکتے تھے۔ خود عیسائی عالموں کے اقوال کی سند پر لکھے، اُس نے اُن تمام غلطیوں کو رفع کیا جو اسلام کی نسبت عیسائی قوموں میں پھیلی ہوئی تھیں، اُس نے بدلائل قاطعہ ثابت کر دیا کہ دنیا میں کوئی مذہب اسلام سے زیادہ عیسائی مذہب اور عیسائی قوم کا دوست نہیں ہو سکتا اور اُس نے جب دیکھا کہ انگریزی تعلیم سے کسی طرح مسلمانوں کو مفر نہیں تو اپنی عمر کا ایک تہائی حصہ اسلام کو انگریزی تعلیم کے مضر نتائج سے بچانے میں صرف کیا۔

تیسرا خطرہ

کرسچینوں کی تینوں خطروں کا مقابلہ کیا

مین دیکھ رہا ہوں۔ اُس نے دل کو جلادیا اور اُسکی نا انصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا۔ اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلم کی سیر مین جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور مین فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔ مین نے فرانس اور جرمن سے اور مصر سے کتب سیر منگانی شروع کر دی ہیں، چٹھیاں روانہ ہو گئیں، سیرت ہشامی مطبوعہ اور چند کتابیں لیٹن کی خرید لین، ایک آدمی مقرر کر لیا جو لیٹن کا ترجمہ کر کر مضمون بتلا سکے۔

ایک اور خط مین لکھتے ہیں ”مواعظ احمدیہ (یعنی خطبات احمدیہ) لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں۔ اسکے سوا اور کچھ خیال نہیں۔ جانا آتا ملنا جلنا سب بند ہے۔ آپ اس خط کے پہنچنے پر میر ظہور حسین کے پاس جائیے اور دونوں صاحب کسی معاملہ میں میرے لیے ہزار روپیہ قرض لیجئے؛ سود اور روپیہ مین ادا کر دوں گا۔ +++ ہزار روپیہ بھیجنے کے لیے دلی لکھا ہے اور لکھا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف سی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیجو +++ کیا کیسے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہو گیا ہے خدا مدد کرے۔“

ایک اور خط مین لکھتے ہیں ”مین روز و شب تحریر کتاب سیر مصطفوی (یعنی خطبات احمدیہ) مین مصروف ہوں۔ سب کام چھوڑ دیا ہے۔ لکھنے لکھتے کمزور کرنے لگتی ہے +++ اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے کام اور بھی سخت ہو گیا ہے۔ ادا مہرجب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ آئی لکھنا اور چھپوانا تو شروع کر دیا روپیہ کہاں سے آئے گا۔ مسلمان البتہ استغنین چڑھا کر اس بات پر تو لڑنے کو تیار ہو جاؤ گے کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا کیوں کھایا؟ مگر جب کہو کہ مذہب کی نائید مین کچھ روپیہ خرچ کرو تو جان بچا جائینگے۔“

ایک اور خط مین لکھتے ہیں ”مین اپنا مال آپ کو کیا لکھوں؛ سکتہ سا ہو گیا ہے۔ دن رات کی تکلیف سے۔ جو میرا دل ہی خوب جانتا ہے۔ جلد اول خطبات احمدیہ کی تمام ہو گئی ہے اور اس میں نے مین چھاپہ بھی تمام

دستیاب نہیں ہو سکتین تو انکو ولایت جانے کا خیال ہوا۔ چنانچہ ایک ہی دو برس بعد حب سید محمود کا ولایت جانا قرار پایا تو وہ بھی اُنکے ساتھ روانہ ہو گئے۔

سرسید کے بعض خطوں سے جو انھوں نے ولایت سے سید ممدی علی خان کے نام بھیجے ہیں پایا جاتا ہے کہ ہندوستان سے چلتے وقت جب انھوں نے یہ ارادہ اپنے احباب پر ظاہر کیا تو اُن کے بعض دوست جو سرکاری عمدہ دار اور سر ولیم میور کی گورنمنٹ کے ماتحت تھے انکو ولیم کی کتاب کا جواب لکھنے سے مانع آئے تھے مگر سرسید نے اُنکا کہنا نہیں مانا اور ولایت پہنچتے ہی اس کی فکرتیں مصروف ہو گئے۔

انھوں نے انڈیا آفس کے کتب خانہ سے کتابیں بہم پہنچائیں، برٹش میوزیم کی لائبریری سے بہت سی اطلاعات حاصل کیں، سیر کی عربی کتابیں جو نصر و فرانس اور جرمنی میں چھپتی تھیں انہوں نے منگوائیں، اور چند لیٹن اور انگریزی کی پرانی کتابیں جو نایاب تھیں بہت گرا قیمت پر لندن کے بازار سے خریدیں اور شب و روز کی لگاتار محنت سے بارہ اتے یعنی خطا مضمون لکھ کر ایک لائق انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرائے اور لندن ہی میں خطبا کے نام سے اُسکو چھاپ کر شہر کیا۔

اس کتاب کے لکھتے وقت جس قدر جوش سرسید کے دل میں تھا اور جو مالی مشکلات اُنکو اسکے شایع کرنے میں پیش آئیں اور جو سخت محنت اُسکے لکھنے میں اُنکو کرنی پڑی اُسکا کسی قدر اندازہ اُنکے خطوں سے ہوتا ہے جو انھوں نے ولایت سے مولوی سید ممدی علی خان کے نام بھیجے ہیں۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں ”ان دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے۔ ولیم میور صاحب کی کتاب

تو لیم میور کا جواب لکھنے سے دو سوتوں کا بیغ کرتا

خطبات جو سرسید نے پیش کر دیے ہیں

خطبات کے لکھنے میں سرسید کی ولایت کے خطوط کی بانی

اور عین اسی صدمہ میں صدمہ غم انتقال ہمیشہ حامد و محمود کا لاحق ہونا جیسا کچھ مصیبت کا وقت مجھ پر گذرا واقعہ کربلا سے کم نہ تھا؛ رع این ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر پڑ آپنے جو الفاظ اپنی محبت اور الفت سے لکھے ہیں انکا بہت بہت شکر کرتا ہوں اور بے تکلف لکھتا ہوں کہ اب کچھ حاجت نہیں ہی؛ تین ہزار روپیہ قرض لیا گیا۔ سب بیباق ہو گیا۔ اب آپ نے کچھ قرض لیجیے نہ اپنی تنخواہ بھیجیے، مگر خارجاً معلوم ہوا کہ سید مہدی علی خان اس خط کے پہنچنے سے پہلے اپنی تنخواہ کار و پیہ روانہ کر چکے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سرسید اس کتاب کے لکھنے کو مذہبی فرائض میں سب زیادہ اہم اور ضروری فرض خیال کرتے تھے اور جب کہ وہ حسبِ تنخواہ تیار ہو گئی تو انکو بے انتہا خوشی اور فخر اسکے لکھنے پر ہوا تھا۔ وہ سید مہدی علی خان کو ایک کتاب میں لکھتے ہیں ”اگر میری یہ کتاب تیار ہو گئی تو میں لندن میں آنادس حج کے برابر سمجھوں گا؛ خدا قبول کرے“ ایک اور خط میں لکھتے ہیں ”میری کتاب خطبات احمدیہ ایک مسلمان عالم متحجر نے پڑھی جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے۔ جو الفاظ کہ اُس نے کہے اور مجھے لکھے اور جس طرح میرے ہاتھ چومے اُسکی لذت میں ہی جانتا ہوں“ ایک اور خط میں لکھتے ہیں ”آنحضرت صلعم کی بارہ برس کی عمر تک حال لکھ چکا اور سرولیم پیور صاحب اور آؤر مصنفوں نے یہاں تک کہ حال پر جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے۔ نہایت محققانہ جواب ہیں۔ اور یہ شرط ہے کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو تو میرا نام ورنہ میرا نام نہیں“

خیر یہ خیالات تو سرسید کے اپنی کتاب کی نسبت ایسے ہی ہیں جیسے ہر مصنف کے خیالات اپنی تصنیف کی نسبت ہوتے ہیں؛ اس سے سوا اسکے کہ وہ اسلام کی حمایت کرنے سے بے انتہا

ہو جائیگا۔ اب جو اندازہ اُسکی ایک جلد کے چھاپے کی لاگت کا کیا گیا تو ڈھائی ہزار روپیہ سے زیادہ کا معلوم ہوتا۔
 ہوش جاتے رہے ہیں اور جان میں جان نہیں۔ میر تراب علی نے نہایت مدد کی ہے؛ تین سو روپیہ اسکے چندہ
 کی بابت بھیجے ہیں۔ میر ظہور حسین صاحب نے ڈیڑھ سو روپیہ بھیجا ہے۔ مرزا رحمت الدربگ صاحب نے اپنا چندہ
 سو روپیہ کا بھیج دیا۔ +++ آپ زین العابدین سے روپیہ منگو اگر بھیجو ادبیجے۔ اپنا ذاتی چندہ سو روپیہ بھیج دیجئے
 جب ہندوستان سے سرسید کے دوستوں نے کچھ اور چندہ بھیجا ہے تو انکو بے انتہا تقویت
 ہوئی چنانچہ اُسکی رسید کے خط میں وہ لکھتے ہیں کہ ”اگر آپ کچھ مدد نہ کرتے تو ہر کھا کر مر جانے کے
 سوا کچھ چارہ نہ تھا“

مگر بعض خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تخمینہ کتاب کے چھاپے کا پہلے کیا گیا تھا اُس سے بہت
 زیادہ صرف ہو گیا تھا؛ یعنی قریب چار ہزار کے خرچ ہوا۔ جس میں سے کچھ کم سولہ سو روپیہ سرسید کے
 دوستوں نے ہندوستان سے چندہ کر کے بھیجا اور باقی روپیہ سرسید نے قرض لیکر ادا کیا۔ اُنکے ایک
 خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ولایت سے مراجعت کرتے وقت اُنکے پاس زادِ راہ کے لیے کچھ نہ رہا تھا
 اور نہایت پریشان تھے۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ”اب جب تک اور روپیہ قرض نہ لیا جائے
 مراجعت متعسر ہے۔ یہ ترددات ایسے جانکاہ ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ کتابیں مطبوعہ صندوق میں
 بند ہو رہی ہیں واسطے روانگی ہندوستان کے۔ اُنکے محصول وغیرہ میں بھی دو سو روپیہ سے کم خرچ نہیں
 ہونیکے۔ اب زیادہ حال ترددات کا لکھنا ناحق آپ کو تردد میں ڈالنا ہے“

شاید اسی اخیر خط کے جواب میں مولوی سید محمدی علی خان نے اپنی ساری تنخواہ بھیجنے
 اور کچھ قرض لینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا جس کے جواب میں سرسید نے اُنکو لکھا کہ ”کنکب افرا تاجا ہمدرد“

گوارہ سمجھتے تھے اُن پر اسلام کی حقیقت اور اُسکی خوبی ظاہر کرتے ، اُن کے ملکوں میں جا کر انھیں کی زبان میں وعظ کئے یا انھیں کی زبان میں اسلام کی حمایت پر کتابیں لکھتے میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں سید احمد خان سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو۔“

مسٹر آرنلڈ جنھوں نے ابھی پریچنگ آف اسلام لکھی ہے اور اُسکے لکھتے وقت مسلمانوں کے لٹریچر سے ہمیشہ واقفیت حاصل کی ہے۔ ایک نہایت سچے اور نہایت پختہ عیسائی ہیں۔ اُنکا بیان ہے کہ ”ایسی مثالیں تو پائی جاتی ہیں کہ کسی مسلمان نے بمقابلہ عیسائیوں کے اپنی زبان میں اپنی ہی ملک میں بیٹھ کر اسلام کی حمایت پر کوئی کتاب لکھی اور اُسکا ترجمہ کسی یورپ کی زبان میں ہو گیا لیکن مجھے کوئی ایسی مثال معلوم نہیں کہ کسی مسلمان نے یورپ میں جا کر یورپ ہی کی کسی زبان میں اس مضمون پر کتاب لکھ کر شائع کی ہو“ سرسید کہتے تھے کہ ”شعاع میں جبکہ خطبات احمدیہ چھپ کر لندن میں شائع ہوئی تو اسپر لندن کے ایک اخبار میں کسی انگریز نے لکھا تھا کہ عیسائیوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے انھیں کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اُس نے دکھایا ہے کہ اسلام اُن تمام داغوں اور دھبوں سے پاک ہے جو عیسائی اُسکے خوشنماچہ پر لگاتے ہیں“

دوسری خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ سرسید نے اس کتاب میں مناظرہ کے اُس فحاشانہ طریقہ کی جگہ۔ جو مسلمانوں میں عموماً دائر و سائر ہے اور جس سے فریق مخالف کے دل میں بجائے رغبت کے نفرت اور بجائے آشتی کے ضد پیدا ہوتی ہے۔ ایک ایسا دوستانہ اور بے تعصبانہ طریقہ اختیار کیا ہے جو کسی کو ناگوار نہیں معلوم ہوتا اور مسلمانوں کے لیے ایک ایسی مثال قائم کی ہے جسکی پیروی کرنے کی نہایت ضرورت تھی۔

خوش تھے اور کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ سرسید سے پہلے بے شمار عالموں نے بہت لمبے عیسائیوں کے اسلام کی حمایت میں کتابیں لکھیں ہیں، غدر سے پہلے خود ہندوستان کے علمائے اسلام نے (جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا) بڑی بڑی مسودہ کتابیں نہایت کوشش سے اسی مضمون پر تحریر کی ہیں؛ پس تا وقتیکہ خطبات احمدیہ میں کوئی وجہ ترجیح کی نہ پائی جائے اسکو اگلے علمائے کتابوں پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ مگر ہمارے نزدیک فی الواقع ایسی وجوہات موجود ہیں جنکی رو سے کہا جاسکتا ہے کہ سرسید سے پہلے کسی مسلمان اسلام کی ایسی خدمت بن نہیں آئی۔

اولاً۔ جہاں تک ہکو معلوم ہوا ہے۔ سرسید سے پہلے دنیا کے کسی مسلمان نے یورپ کا سفر محض اس غرض سے اختیار نہیں کیا کہ وہاں جا کر اسلام کی حمایت کے لیے بڑے بڑے کتب خانوں سے میٹرل جمع کرے، وہیں بیٹھ کر عیسائیوں کی تردید اور اسلام کی تائید میں کتاب لکھے، یورپ ہی کی کسی زبان میں۔ جو نام برا عظیم میں عموماً بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ اسکا ترجمہ کرانے اور وہیں اسکو چھپوا کر شائع کرے اور اسطرح اسلام کی خوبیاں اُن قوموں کے کان تک پہنچائے جنہوں نے تیرہ سو برس سے کبھی اسلام کی نسبت بُرائی کے سوا کوئی بات نہ سنی ہو۔

تجارتِ محمدیہ کی ترجمہ کی کتابیں

اس کا ترجمہ

ریورنڈ ہوپر۔ جو اب سے تقریباً بیس برس پہلے لاہور ڈیوٹی کالج میں پرنسپل تھے اور جس میں خود بارہا ملاہوں۔ انہوں نے میرے ایک دہلوی دوست سے۔ جو انکو اردو پڑھاتے تھے کہا کہ ”مسلمانوں سے نہایت تعجب ہے کہ وہ سید احمد خان کو کافر ٹھہرا رہے ہیں؛ ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خان نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا۔ جب کہ مسلمان اسلام کے سوا سب مذہبوں کو باطل یا غلط سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام بنی آدم پر فرض جانتے ہیں تو ان کا فرض تھا کہ جبکہ وہ

کامیابی نہیں ہوئی ترک کر دیا تھا اور اُسکی جگہ اپنی کتاب لائف اوف محمد مین نکتہ چینی کا ایک ایسا طریقہ اختیار کیا تھا جو خاص کر تعلیم یافتہ لوگوں پر۔ خواہ وہ مسلمان ہوں خواہ ہندو اور خواہ عیسائی۔ بہت زیادہ اثر کرنے والا تھا۔ مثلاً قدیم مشنیری مسلمانوں کی کتب سیر و احادیث پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ وہ مثل انجیلوں کے امام سے نہیں لکھی گئیں اور اسلئے جن روایتوں سے آنحضرت کے معجزات اور پیشین گوئیوں کی ثابت کی جاتی ہیں وہ اعتبار کے لائق نہیں ہیں۔ مگر سر ولیم میور نے اُنکے برخلاف تمام روایتوں کو۔ جو مسلمانوں کی حدیثوں تفسیر اور سیر کی کتابوں میں مندرج ہیں۔ صحیح تسلیم کر کے آنحضرت کی تعلیم اور اخلاق وغیرہ پر نکتہ چینی کی تھی۔ یا مثلاً پادری فائڈر وغیرہ اسلام کے برخلاف عقلی دلیلیں پیش کرتے تھے اور اُسکی تعلیم کو انبیاء کی روحانی تعلیم کے منافی بیان کرتے تھے؛ مگر سر ولیم میور نے بجائے عقلی دلیلوں کے تاریخی شہادتیں پیش کی تھیں اور بجائے اسکے کہ اسلام کی تعلیم کو روحانیت کے برخلاف ثابت کرین اُسکو زمانہ حال کی شایستگی اور تمدن و حسن معاشرت کے برخلاف ظاہر کیا تھا، مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تنزل کو اسلام کی تعلیم کا نتیجہ قرار دیا تھا اور مسلمان بادشاہوں کی ہوا پرستی و سفاکی و خونریزی کا جوابدہ اسلام کو ٹھہرایا تھا۔ یہ باتیں گوئی نفسہ صحیح ہوں یا غلط مگر تعلیم یافتہ جماعتوں کے دل پر جادو کا کام کر نیوالی تھیں۔ سرسید نے ان تمام مغالطوں کو نہایت معقول اور دلنشین دلائل سے رفع کیا ہے؛ اُنھوں نے دو طویل خطبوں میں صرف مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کا اور اُن کے مولفوں کا جو ان کتابوں میں درج ہیں مفصل حال بیان کیا ہے جو ان لوگوں کے لیے جو سچائی اور انصاف سے اسلام کے متعلق کچھ لکھنا چاہیں ہمیشہ کے واسطے ایک بے مثل رہنما ہو۔

کرنل گریم سرسید کی لائف میں خطبات احمدی کی نسبت لکھتے ہیں کہ ”اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے مصنف کا غیر معمولی تعمق نظر، غیر مذہبون سے بے تعصبی اور اصلی عیسائیت کے سچے اصول کا ادب“۔
 پھر اپنی قوم کے مذہبی لوگوں کو اس طرح آگاہ کرتے ہیں کہ ”جو لوگ مذہبی باتوں سے دیکھپی لکھتے ہیں انکو چاہیے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں۔ دین محمدی فی زمانہ انگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول اور سخت مسم دین ہے اور وہ اسکا ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں جیسے کہ ہمارے بزرگ اس صدی کے شروع میں ہونا پارٹ کو ایک جسمانی آفت خیال کرتے تھے۔ وہ (یعنی اسلام) عموماً ایک تلوار کا مذہب خیال کیا جاتا ہے اور ہر ایک چیز تعصب، بغیرت اور تنگدلی کی اُس میں خیال کیجاتی ہے۔ لیکن ہمارے ناظرین کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ جب سید احمد خان کی اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے خیالات لیکر اُٹھیں گے۔ ہمارے مصنف (یعنی سید احمد خان) نے اپنے دلی دوست سرولیم میور کی کتاب ”لائف آف محمد“ کی تحریروں کی مخالفت کی ہے اور خوب چٹکیاں لی ہیں۔ اور میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور نکتہ سنج ناظرین کتاب بہت سی باتوں میں سرولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے“۔ اس سے ہر شخص بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ خطبات احمدیہ انگریزوں کے دل پر کیا اثر کیا اور جو کتابیں مذہبی مناظرہ کے متعلق۔ برخلاف قدیم طریقہ کے شائستگی اور بے تعصبی کے ساتھ لکھی جاتی ہیں وہ کس قدر مفید اور کس قدر فریق ثانی کو انصاف پر اُبل کرنے والی ہوتی ہیں۔

تیسری خصوصیت اس کتاب میں یہ ہے کہ سرولیم میور نے وہ قدیم فرسودہ و بوسیدہ طریقہ جسکے بموجب مشنری اسلام پر نکتہ چینی کرتے تھے اور جس میں انکو کبھی بمقابلہ اہل اسلام کے

کر دیا ہے۔ مولانا رحمت اللہ اور مولوی آل حسن کے سرسید سے کچھ کم مداح اور شکر گزار نہیں ہیں جنھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو مشنیریوں کے حملوں سے بچایا اور اُن سے مناظرہ کرنے کی سب سے پہلے بنیاد ڈالی اور جنگی کتابیں دیکھ کر پھلن کو یہ خیال پیدا ہوا۔

عیسائیوں کا جو طعن آنحضرت صلعم پر بابت کثرت ازواج کے اور اسلام پر بابت اجازت تعدد ازواج اور اجازت طلاق کے ہے اُسکی تردید میں ہمارے علمائے بالکل الزامی جوابوں سے کام لیا ہے اور بلاشبہ اگر عیسائی اپنے مذہب کے اصلی اصول کے پابند نہ ہوں تو یہ جواب اُنکے سکوت کے لیے کافی دوائی ہیں مثلاً ازالۃ الاوہام میں توریت کے حوالوں سے نہایت تصریح کے ساتھ حضرت ابراہیم کے تین نکاح، حضرت یعقوب کے چار نکاح، حضرت موسیٰ کے نکاح، حضرت داؤد کی نوے سے زیادہ بیویاں۔ جنہیں سے بعض منکوحہ اور بعض غیر منکوحہ

ہیں۔ اور حضرت سلیمان کی ایک ہزار بیویاں اور بعض انبیاء کی کثرت ازواج کو ثابت کیا گیا۔ اسی طرح طلاق کی طعن پر توریت سے۔ جسکے احکام کو عیسائی منسوخ نہیں مانتے۔ ثابت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے جواز طلاق کا حکم دیا ہے کتاب تفسار، میں بھی اولیٰ قسم کے الزامی جواب دیے ہیں اور آخر میں جواب تحقیقی یہ لکھا ہے کہ کوئی دلیل عقلی یا نقلی توریت و انجیل سے بھی اس بات پر قائم نہیں ہے کہ جو بہت سی بیویاں کرے وہ نبی نہیں ہو سکتا یا خدا تعالیٰ کسی نبی کو بہت سی بیویاں کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اور طلاق کی نسبت یہ لکھا ہے کہ اگرچہ انجیل میں طلاق کو منع کیا گیا ہے مگر توریت میں اجازت دی گئی ہے اور عیسائیوں کا دعوے ہے کہ توریت اور انجیل آپس میں متحد ہیں ماسخ و منسوخ نہیں۔

ان خطبوں میں روایات کی تنقید کے جو اصول و قواعد محدثین نے مقرر کیے ہیں اور جو معیار انھوں نے معتبر اور غیر معتبر روایتوں کا قرار دیا ہے انکی تشریح ایسے بسط کے ساتھ کی گئی ہے کہ اُس پر غور کرنے کے بعد ان روایات کی کچھ وقعت باقی نہیں رہتی جنکی رو سے سرولیم میور نے اسلام کی تعلیم اور باقی اسلام کے اخلاق پر نکتہ چینی کی ہے۔ انھوں نے نہایت صفائی اور وضاحت بیان کیا ہے کہ اسلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو زمانہ حال کی شایستگی یا دنیوی ترقیات کی مانع ہو اور مسلمانوں کے اعمال اور کردار جنکے ثمرے وہ آج بھگت رہے ہیں انکے جوابدہ خود مسلمان ہیں نہ اسلام اور جو مباحث تاریخی یا جغرافی تحقیقات پر مبنی تھے انکا فیصلہ ایسی عمدگی سے کیا کہ کسی منصف مزاج آدمی کو۔ اگرچہ وہ اسلام کا کیسا ہی مخالف ہو۔ اُسکے تسلیم کرنے سے چارہ نہیں۔ مگر سب سے بڑی خصوصیت خطبات احمدیہ کی جو اُسکو اگلے علما کی کتابوں سے ممتاز ٹھیراتا ہے وہ یہ ہے کہ اُس میں برخلاف دیگر علماء اسلام کے الزامی جوابوں سے بہت ہی کم تعرض کیا گیا ہے۔ بلکہ ہر ایک اعتراض کا محققانہ جواب جو عیسائی اور لامذہب دونوں کو برابر دیا جاسکے لکھا گیا ہے۔ الزامی جوابوں سے سوا اسکے کہ صرف مسلمانوں کی تسلی ہو جائے یا بعض صورتوں میں عیسائی بھی ساکت ہو جائیں ان لوگوں کی زبان بند نہیں ہو سکتی جو اسلام اور عیسائیت دونوں مذہبوں کے الگ ہیں یا مطلقاً قید مذہب سے آزاد ہیں۔ یہاں بطور مثال کے مختصر طور پر ہم چند مقامات خطبات احمدیہ کے اس غرض سے دکھاتے ہیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ عیسائیوں کے مقابلہ میں سرسید کا طریق استدلال کیا ہے اور جنھوں نے اُنسے پہلے اس مضمون پر کتابیں لکھی ہیں انکا طریق استدلال کیا تھا؟ مگر ہم باوجود اسکے کہ سرسید نے اس مضمون کو پہلے کی نسبت بہت بلند

مذہب کلیات و جزئیات ہے وہ تمام مخلوقات سے اشرف ہے۔ ایسے اُسکا فرض ہے کہ جو قوتیں اور حقوق مثل اور فنی روحوں کے قدرت نے اُسکو عطا کیے ہیں اُنکو احتیاط سے اور موقع ہو تو بلحاظ امورِ طبیعی اور حسن معاشرت اور انتظام خانہ داری یا نظم مملکتی و قوانین حفظانِ صحت اور ممالک مختلفہ کی آب و ہوا کے کام میں لائے۔ ورنہ اُس میں اور دیگر حیوانات میں جو اُس کے پاس پھرتے ہیں کچھ فرق نہیں ہے اور ایک بکرے یا مرغے سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتا۔ پس حسبِ کثرتِ ازواجِ النحر حالتوں میں قابلِ نفرت ہے ویسے ہی ایک سے زیادہ نمونے کا قطعی التزام خلافِ فطرت ہے۔

اُس کے بعد سرسید نے معاشرت کے عاقلانہ اسی مسئلہ پر بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ”انسان مدنی اطمین پیدا ہوا ہے۔ اسی بات کو توحید میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ”جب خدا تعالیٰ کو یہ خیال آیا کہ انسان کا اکیلا ہونا اُس کے حق میں اچھا نہیں ہے تو اُس نے اُس کے واسطے ایک ساتھی پیدا کیا۔“ اور وہ عورت ہے جو اُس واسطے پیدا کی گئی ہے کہ انسان کی زندگی کے فکر و تردد اور رنج و راحت میں شریک ہو، اپنی مجالست سے اُس کی خوشی کو بڑھاوے، اپنی محبت بھری ہمدردی سے اُس کی تکلیف کو کم کرے اور سب اخیر غرض جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے یہ ہے کہ مرد کے ساتھ شریک ہو کر خدا کے اس بڑے حکم کی تعمیل میں کہ ”بڑھو اور پہلو اور زمین کو آباد کرو“ مرد سے۔ مگر جب کبھی یہہ دگار کسی سبب سے اپنے ان قدرتی فرائض کے ادا کرنے میں قاصر ہو تو اُس دشمنِ حکیم خالقِ زن و مرد نے اس نقصان کے رفع کرنے کی بالیقین کوئی تدبیر رکھی ہوگی اور وہ بجز اُس کے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ یا ایسی حالتوں میں ایک سے زیادہ مگر کسی خاص حد تک ایک ہی وقت میں جو روان رکھنے کی اجازت ہو اور یا پہلی زوجہ کو طلاق دینے کے بعد دوسری جو رو کرے۔ پچھلا حق عورت کو بھی حاصل ہونا چاہیے تھا؛ چنانچہ مذہبِ اسلام کی رو سے اُسکو حاصل ہے۔ سیاستِ مَدَن کے لحاظ سے صرف اتنا فرق ہے کہ مرد جب چاہے یہ علاج کر سکتا ہے

اگرچہ یہ جوابات جو ہمارے علمائے دیہ میں مسلمانوں کی تسلی کے لیے اور اگر عیسائی اپنے مذہبی اصول کے پابند ہوں تو اُن کے ساکت کر نیکے لیے کافی ہیں مگر عیسائی۔ باوجودیکہ توریت کو الہامی کتاب اور قیامت تک غیر منسوخ جانتے ہیں۔ نہ توریت کے کسی حکم کو مانتے ہیں اور نہ توریت کے حوالوں پر کان دھرتے ہیں۔ نیز عیسائی انبیاء کو مثل اہل اسلام کے معصوم نہیں سمجھتے یہاں تک کہ انہیں سے بعض کی طرف بدترین گناہوں کو منسوب کرتے ہیں پس تاوقتیکہ عیسائیوں کو تحقیقی جواب نہ دیا جائے اُنکی زبان بند نہیں کیجا سکتی اسکے سوا الزامی جوابات اُن لوگوں کے لیے جو توریت و انجیل کو نہیں مانتے کافی نہیں ہیں جب تک اس مانہ کی مسلمات کے موافق اُنکا جواب نہ دیا جائے۔

مسئلہ تعدد ازواج اور جواز طلاق کی بحث خطبات احمدیہ میں بھی آگئی ہے۔ اس میں سرسید نے اول سر ولیم میور کا اعتراض نقل کیا ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ تعدد ازواج اور طلاق کا حکم، اخلاق کی بچھلنی کرتا ہے، عام زندگی کو آلودہ اور ناپاک کرتا ہے اور حسن معاشرت کو درہم و درہم کر دیتا ہے۔

اسکے جواب میں سرسید نے اول تعدد ازواج پر لمبی بحث کی ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ ”اس معاملہ پر تین حیثیتوں سے بحث ہو سکتی ہے۔ اول قانون قدرت کے لحاظ سے؛ سو ہم قدرت کی بے خطا نشانیوں سے پاتے ہیں کہ جن ذی روح کی نسبت اُنکے خالق کا یہ منشا تھا کہ اُنکے صرف ایک ہی مادہ ہو۔ اُنکی نسل ہمیشہ جوڑا جوڑا پیدا ہوتی ہے جنہیں سے ایک مادہ اور ایک نہ ہوتا ہے؛ برخلاف اسکے جن ذی روح کی متعدد مادہیں ہوتی مقصود تھیں اُنکے ایک سے زیادہ بچے پیدا ہوتے ہیں اور نر و مادہ کی تعداد مناسب نہیں ہوتی۔ اس قانون کے بموجب جیسا کہ ظاہر ہے انسان دو سری قسم میں داخل ہے؛ مگر۔ چونکہ رتبہ میں بوجہ اس بیش بہا قوت کے جو

مناسب ہوگی وہ یورپ کے واسطے نامناسب ہوگی۔“

ان دونوں مذکورہ بالا رایوں پر سرسید یہ ریمارک کرتے ہیں ”افسوس کہ ان دونوں صاحبوں نے تعددِ ازواج پر صرف امورِ طبیعی کے لحاظ سے نظر کی ہے مگر مذہبِ اسلام میں یہ اجازت خاص حالتوں میں صرف امورِ طبیعی کے لحاظ سے نہیں دیکھی بلکہ زیادہ تر اس لحاظ سے دیکھی ہے کہ ترویج کی تلخون کے واسطے اور مقاصدِ ترویج کے فوت ہو جانے کی حالت میں ایک تدارک حاصل ہو جو عین مرضی آدم و حوا کے پیدا کر نیوالے کی اُسکے قدرت کے کاموں کی نشانیوں سے معلوم ہوتی ہے۔“

اسکے بعد سرسید ان اخلاقی خرابیوں کا ذکر کرتے ہیں جو آنحضرت سے پہلے عرب اور اُسکے گرد و نواح کے ملکوں میں ازواج کے متعلق واقع تھیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ”ایران میں قوانین نکاح بالاس طاق رکھ دیے گئے تھے؛ یہاں تک کہ بیٹے کو اُسکی ماں ایسی ہی مباح تھی جیسے باپ کو اُسکی بیٹی اور بھائی کو اُسکی بہن۔ یہودیوں کے ہاں جو ایران کے گوشہ شمال مغرب میں بکثرت آباد تھے تعددِ ازواج کی رسم بلا کسی قید اور حد کے بے روک ٹوک جاری تھی۔ عرب میں ایرانیوں اور یہودیوں دونوں کی رسمیں یکساں جاری تھیں۔ تعددِ ازواج کی کچھ انتہا نہ تھی۔ تمام عورتیں بغیر کسی امتیاز یا رتبہ یا عمر یا رشتہ داری کے مردوں کی وحشیانہ خواہشوں کے پورا کرنے کا کام دیتی تھیں۔ عیسائیوں کا حال ان سب برخلاف تھا؛ اُنکے ہاں ایک جو رو کرنی بھی کچھ نیکی نہیں گنی جاتی تھی بلکہ زہنیانیت اور تجردِ محض کی علم ہدایت تھی اور مرد و عورت دونوں کے لیے وہی نیکی گنی جاتی تھی۔ ایسے زمانہ میں جبکہ عقل اور دل کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اخلاق و معاشرت اس قدر بگڑ گئی تھی بانیِ اسلام نے ایک ایسا عمدہ قانون جاری کیا جو بلحاظ اپنی اصلیت کے نہایت کامل اور عقلِ کامل کے بالکل مطابق اور انسان کی تندرستی اور بہبودی اور حسن معاشرت کی ترقی کا نہایت عمدہ ذریعہ اور زن و مرد کی حالتِ زوجیت کے

لیکن عورت کو اول قاضی کی اجازت حاصل کرنی چاہیے۔“

”اگر اس تدارک کی انسان کو اجازت نہ دیتی تو اسکے سبب حسن معاشرت میں بڑا خلل واقع ہوتا اور انسان کو بدترین گناہوں کی عرف مائل ہونا پڑتا۔ اگرچہ تعلیم و تربیت سے اس ضرورت کا کم ہونا ممکن ہو لیکن مٹنا محالات سے ہو۔ پس جہان اسکی ضرورت ہو وہاں اُسکے عمل میں نہ لانے سے وہی تمام نقصان پیدا ہوتے ہیں جو حسن معاشرت کے لیے سم قاتل ہیں۔“

اسکے بعد وہ ڈیون پورٹ کی کتاب سے سائنس کیسے کی رلے تعدد ازواج کی تائید میں نقل کرتے ہیں جسکا حاصل یہ ہے کہ ”گرم ملکوں میں جہاں عورتیں جد بڑھیا ہو جاتی ہیں ضرور ہے کہ تعدد ازواج کا قاعدہ جاری کیا جائے۔“ پھر مسٹر بگننر کی رلے لکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ”علم قوامی انسانی اور علم طبیعیات کے ماہرین نے بعض وجوہات ایسی دریافت کی ہیں جو کثرت ازواج کے واسطے بطور ایک عذر کے تصور ہو سکتی ہیں اور ہم شمالی ملکوں کے سرد خون والے مینڈک کے سے مزاج کے جانوروں سے متعلق نہیں ہو سکتیں؛ مگر بنی اسمیل سے جو گرم ریگستان کے رہنے والے ہیں متعلق ہو سکتی ہیں۔“ اس کے بعد مسٹر بگننر نے سرد بلیو او سلی صاحب کی یہ رلے نقل کی ہے کہ ”ایشیا کے گرم ملکوں کی تاثیر سے دونو گروہ یعنی مرد و عورت میں ایک ایسا اختلاف ہوتا ہے جو یورپ کی آب و ہوا میں نہیں ہے جہاں دونو برابر برابر اور بتدریج عالم ضعیفی کو پہنچتے ہیں مگر ایشیا میں صرف مرد ہی کو یہ بات حاصل ہے کہ ضعیفی میں بھی قوی اور طاقتور رہتا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو بانی اسلام کے لیے اس بات کی۔ کاکھوں نے متعدد جو روون کی اجازت دی ایک بڑی وجہ تھی اور یہ ایک کافی سبب اس بات کا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اس مضمون کی نسبت اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی بلکہ اسکو ملکوں کی گورنمنٹوں کے آئین پر چھوڑ دیا؛ کیونکہ جو بات ایشیا کے واسطے

کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا جو اسکی مرضی کے موافق ہو جسے مرد و عورت کو جوڑنا پیدا کیا۔ ضرور ایسا ہوگا جو قانونِ قدرت کے تو بر خلاف نہ ہو اور معاشرت میں کوئی نقصان نہ پیدا کرے۔ اور وہ یہی ہو سکتا ہے کہ عموماً کثرت ازواج کی ممانعت اور صورت ہائے خاص اور حالاتِ مستثنیٰ میں اجازت ہو۔ اور یہی مسئلہ ٹھیکٹ اسٹام کا ہو۔ قرآن مجید نے اس نازک معاملہ اور دقیق اور پُر تہج مطلب کو نہایت فصیح و بلیغ دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے جہاں فرمایا ہے ”وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً“ (یعنی اگر تم خوف ہو کہ متعدد جوڑوں میں عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک ہی جوڑ رکھنی چاہیے) اسکے بعد انکی تقریر کا حاصل یہ ہے کہ ”اس آیت کے اگر وہی ظاہر ہی حسنی لیے جائیں جیسے کہ اکثر فقہاء اور علمائے اہلِ یمن تو بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شارع نے تعدد ازواج کو گویا بالکل رد کر دیا ہے؛ کیونکہ جو سچا دیندار ہوگا وہ بغیر اشد ضرورت کے کبھی تعدد ازواج کی جو ایسی سخت شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے برأت نہیں کریگا۔ لیکن اگر اس آیت کے الفاظ کو بہ تعمق نظر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعدد کو شاید و ناد صورتوں کے ہوا قطعاً ناجائز ٹھہرا دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ نہیں کہا گیا کہ اِنْ لَمْ تَعْدِلُوا بَلْکَ یہ فرمایا گیا ہو کہ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوا پس اگر یہ ممکن بھی ہو کہ مرد متعدد عورتوں میں عدل کر سکے تو بھی عدل نہ ہو سکے گا پھر شہ گمبی زائل نہیں ہو سکتا“ اسکے بعد انھوں نے دوسری آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ عدل کرنا مرد کی طاقت سے باہر ہے اور اس لیے مستثنیٰ صورتوں کے سوا اُس کو متعدد جوڑوں میں کرنے کی کسی حالت میں اجازت نہیں دی گئی اور وہ آیت یہ ہو وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا اَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ“ (یعنی تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں عدل کر سکو) اسکے بعد وہ خاص خاص صورتوں کو جن میں تعدد ازواج کی اجازت دی گئی ہے بیان کر کے لکھتے ہیں۔

”ہاں بلاشبہ اس اجازت سے ادبائش اور شہوت پرست آدمیوں کو جنکی زندگی کا منشا ”ٹٹھی کی اوچھل“

حق میں اور دھوکے لیے اُس کی ٹانگوں کے دو کر کے مین نہایت ہی مفید ہے۔“

اسکے بعد انھوں نے مذہب کی حیثیت سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ”جس خوبی سے اسلام نے تعدد ازواج کو روکا ہے اس طرح یہودیوں کے مذہب اُسکی بندش کی ہے اور نہ عیسائی مذہب۔ یہودیوں کے ہاں بکثرت اور باقین حجاز و وادج موجود ہے۔ عیسائی مذہب نے بھی تعدد ازواج کی کہیں مانعت نہیں کی؛ چنانچہ مسٹر ہگنر لکھتے ہیں کہ ”میں نہیں جانتا متعدد بیویوں کی اجازت کی نسبت اسلام پر ایسا سخت طعن کیوں کیا جاتا ہے؟ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد کی تطہیر پر جو خدا کی دلی مرضی کے مطابق چلتے تھے اور جنکو خدا نے خاص اپنی شہادت کے احکام کی تعمیل کے لیے بنایا تھا۔ یہ امر ہرگز اعتراض کے لائق نہیں ہے؛ خصوصاً اسوجہ کہ عیسے مسیح نے بھی ان میں انجیلوں میں سے۔ جن لوگوں نے عقائد ان کے احکام و قلمبند کرنے کے واسطے تحریر کیا تھا۔ کسی انجیل میں اسکی مانعت نہیں کی“ جان زیون پورٹ نے بھی اپنی کتاب میں بائبل کی بہت سی آیتوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ”ان آیتوں سے پایا جاتا ہے کہ تعدد ازواج صرف پسندیدہ ہی نہیں ہے بلکہ خاص خدا سے اس میں برکت دی ہے۔“

اسکے بعد سر سید نے نہایت مشہور و معروف عیسائی عالم جان ملٹن۔ جو تعدد ازواج کا ایک شہسوار حامی ہے اور جس نے اس امر کی تائید میں بائبل میں سے بہت سی آیتیں نقل کی ہیں اسلی تقریر نقل کی ہے جس میں تعدد ازواج کے جواز پر ایک لطیف اور دقیق استدلال کیا گیا ہے۔ اسکے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”یہ حال تو تعدد ازواج کی نسبت مذہب موسوی اور عیسوی میں تھا؛ اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدد ازواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے اور صرف ایک ہی بیوی کرنے کو پسند کیا ہے اور تعدد کو صرف ایک نہایت محدود و خاص حالت میں جائز رکھا ہے۔ ہر کچھ شہسوار نہیں

زندگی تلخ ہو گئی تھی۔ با اینہم اگرچہ طلاق ایک شخص واحد کے حق میں مفید ہو لیکن بلحاظ اُن بد اخلاقیوں کے۔ جو اکثر اوقات نہایت آشکارا طور پر وقوع میں آتی ہیں۔ اور نیز اُس مضرت بخش اثر کی وجہ سے جو طرفین کی اولاد پر اپنے والدین سے جدا ہونے سے ہوتا ہے تمدن کے حق میں کچھ کم مضرت پہنچانے والا نہیں ہے۔ پس جبکہ طلاق کے ساتھ ایسی نثر بیان لگی ہوئی ہیں تو اُس کو بطور ایک علاج کے سمجھ کر اُسی حالت میں اُسکی جانب رجوع کرنا جائز ہو سکتا ہے جبکہ اُسپر عمل کرنے سے ایسی مصیبتیں۔ جو طلاق کی مصیبتوں سے بھی زیادہ ناقابل برداشت ہوں، اور ایسے ترددات و تفکرات میں ڈالنے والی ہوں۔ جو طلاق کے رنجوں سے بھی زیادہ رنج دینے والے، اور روز افزون رنجشیں پیدا کرنے والے، اور باہمی معاشرت کے بدلے دن رات کی لعن و طعن و جوتی پزیر میں رکھنے والے ہوں۔ دور ہو سکتے ہوں۔ اگر ایسی حالت میں طلاق کو جائز رکھا جائے۔ جیسا کہ اسلام نے اسی حالت میں جائز رکھا ہے۔ تو وہ کسی طرح حسن معاشرت کے مخالف نہیں ہے بلکہ اُسکی اصلاح کرنے والی اور ترقی دینے والی ہے۔“

اسکے بعد مسئلہ طلاق پر اسلام اور مذہب موسوی و عیسوی کے بموجب گفتگو کی ہے جسکا ماحصل یہ ہے کہ ”یہودیوں کے ہاں طلاق دینا بغیر کسی قید و شرط و حالت کے مرد کے اختیار میں تھا؛ جبہ چاہے اسی طلاق نامہ لکھ کر جو رو کو عیدیتا تھا اور اسپر کوئی گناہ عائد نہ ہوتا تھا۔ حضرت عیسیٰ نے اس حکم کو منسوخ کیا اور جیسا کہ اس زمانہ کے عیسائی سمجھتے ہیں۔ سولے زنا کے اور کسی حالت میں طلاق کو جائز نہیں رکھا۔ لیکن اگر فی الواقع عیسائیوں کے خیال کے موافق طلاق کی امتناع سے حضرت عیسیٰ کا یہی مطلب تھا تو یہ ایک ایسا سخت حکم تھا جسکی بدہشت انسان کی طاقت سے باہر تھی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ کے معتقدوں نے اُن سے کہا کہ اگر جو رو سے مرد کا یہ طور ہے تو جو رو کرنا خوب نہیں۔ اگر یہ حکم اسی طرح مانا جائے جیسا کہ آج کل عیسائی مانتے ہیں۔ تو

شکار کھیلنا ہے ایک جیلہ ہاتھ آگیا ہے۔ مگر اُس عمدہ اور مفید قاعدہ کی بجائے عمل درآمد کرنے سے وہ لوگ اُس خدا کے سامنے جوابدہ ہونگے جو انسانوں کے دلوں کا محرم راز ہے اور وہ یقیناً اُنکو اس قسم کی سزا دیگا جو انکے گناہ کے لحاظ سے واجب ہوگی۔“

”ان تمام باتوں کے سمجھنے کے بعد ہمارے اس خطبہ کے پڑھنے والے یقین کرینگے کہ جو تعدد و ازواج اُس زمانہ میں رائج ہے کہ جہان ذرا دولت ہوئی، اور دو-دو-تین-تین اور چار-چار جو روان کرنے لگے، اور ایک باہر کی عورت کو داؤن پر پڑھایا اور نکاح کر مارا، جہان مقدس بزرگ مولوی ہوئے اور اللہ میاں کے ساند بنے، اُس عورت کو لے ڈالا، وہاں وعظ کہنے لگے اور سنت نکاح ثانی کو جاری کیا، قرآن پڑھاتے پڑھاتے دوسرا سبق خطبہ النکاح کا پڑھانے لگے؛ اور ہمارے دوسرے بھائیوں نے ایک جیلہ متعہ کا جو جاہلیت میں تھا اسلام میں پیدا کر کے عورتوں کو کھٹکانا شروع کر دیا؛ ان سب باتوں کو مذہب اسلام سے کچھ تعلق نہیں ہے؛ یہ سب ایک قسم کی اوباشی کے ڈھنگ ہیں جنسے اسلام نفرت کرتا ہے؛ اور وہ سب ہوا پرست اوباش ہیں جنسے اسلام کا نام بدنام ہوتا ہے۔ پس ایسے شخص کے افعال پر اسلام کی خوبی و حقیقت کچھ پوشی کرنا چکا ڈرون کے لیے آفتاب کا سیاہ کرنا ہے۔“

اسکے بعد سرسید نے طلاق کے مسئلہ پر بحث کی ہے۔ وہ اول حسن معاشرت کی نظر سے اُس پر نظر ڈالتے ہیں اور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ سب بڑا دشمن حسن معاشرت و تمدن کا طلاق ہے جس سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور عورت کی وفاداری کا مرد کے ساتھ اعتبار نہیں رہتا۔ اسکے بعد لکھتے ہیں ”لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر کسی سبب ایسی خویاں مرد و عورت میں پیدا ہو جائیں جو کسی طرح صلاح کے قابل نہوں تو انکا بھی کچھ علاج ہونا چاہیے اور وہ علاج طلاق ہے؛ کیونکہ اس سے مرد و عورت کو آدوی ہو جاتی ہے جسکے مزاج کے اختلاف سے دونوں کی

مفتی کے فتوے پر بلکہ صرف شوہر کی رے اور اخلاق پر جسکی تسلی اور موافقت کے لیے ابتدا میں عورت بطور ایفیس دلنوازا اور مونس نگسار کے پیدا ہوئی تھی “

”اب اس بات کی بندش کہ وہ علاج بے عمل و بے موقع نہ استعمال کیا جائے صرف مرد کے اخلاق اور دلی نیکی اور روحانی تربیت پر منحصر تھی جو نہایت اعلیٰ درجہ پر خاص اسی معاملہ میں مذہب اسلام نے اپنے سچے مریدوں اور ٹھیٹ مسلمانوں کو کی ہے “

”بانی اسلام نے اسلام کے سچے پیروں کو بتایا کہ ”ما خلق اللہ شیئاً علی سجدۃ لارض البغض الیہ من الطلاق“ (یعنی کوئی چیز خدا تعالیٰ نے زمین کے پردہ پر ایسی پیدا نہیں کی جو خدا کے نزدیک طلاق سے زیادہ مبغوض ہو) “

”بھرا ایک دفعہ یون فرمایا کہ ”البغض الحلال الی اللہ الطلاق“ (یعنی خدا کے نزدیک مباح چیزوں میں سے زیادہ مبغوض اور مکروہ چیز طلاق ہے) “

اسکے بعد لکھتے ہیں ”کہ یہ ہدایت تو مردوں کی نسبت تھی اور عورتوں کو جو طلاق لینا چاہتی ہیں یہ فرمایا ”ایما امرأت سالت زوجها طلاقاً فی غیر ما بائس فحرام علیہا راحة الجنة“ (یعنی جو عورت اپنے خاوند سے بغیر سختی کی حالت کے طلاق چاہے اُس پر جنت کی بوتل حرام ہے) “

پھر لکھتے ہیں کہ ”یہ بغیر خدا صلعم طلاق دینے والے سے ایسے ناراض ہوتے تھے جس سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہو گیا کہ جو شخص اپنی جو رو کو دفعۃً قطعی علاقہ دیدے وہ قتل ہونے کے لائق ہے۔ چنانچہ انسانی بے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے اپنی جو رو کو دفعۃً تین طلاقیں دیدیں۔ یہ سنکر آنحضرت صلعم غصہ میں بھرے ہوئے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ کیا اسے خدا کے حکم کو کھیل بنایا ہے؟ اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ میں تم میں موجود ہوں

حسن معاشرت کے لیے نہایت ہی مضر ہے : اور جو رنج و شور زن و شوہر میں واقع ہو جاتے ہیں جن سے تمام اغراض تزوج برباد ہو جاتے ہیں اُسکا کچھ بھی علاج نہیں ہے اور زن و مرد دونوں کے لیے اُور بہت سی خرابیوں اور خوفناک حالتوں میں پڑنیکا اندیشہ ہے۔“

اسکے بعد سرسید نے یورپ کے مشہور و نامور عیسائی عالم جان ملٹن کی بہت لمبی تقریر اور محققانہ رے جو وہ اس مسئلہ کے متعلق لکھتے ہیں نقل کی ہے اور بائبل کی جن آیتوں سے اُنھوں نے جو طلاق پر استدلال کیا ہے وہ سب آیتیں نقل کی ہیں۔ جس سے نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ ”حضرت عیسیٰ نے جو یہ فرمایا تھا کہ۔ جو کوئی اپنی جو رکھو سولے زنا کے کسی سبب سے طلاق دے اور دوسرے سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی اُس چھوڑی ہوئی عورت سے بیاہ کرے وہ بھی زنا کرتا ہے۔ اُسکے برگزیدہ معنی نہیں ہیں جو اس زمانہ کے عیسائی سمجھتے ہیں“ اس سے آگے چلکر وہ لکھتے ہیں کہ ”اگر غور کیا جائے تو یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ جان ملٹن نے اپنی بحث میں جو کچھ روشنی بائبل کے ورسوں پر ڈالی ہے وہ سب اسلام کی روشنی سے لی گئی ہے کیونکہ اسلام نے بارہ سو برس پیشتر بتا دیا تھا کہ طلاق نہ بطور معجون مفرج کے استعمال کرنے کو ہے بلکہ صرف ایک مرض لا علاج کا علاج ہے۔“

جان ملٹن کی تقریر نقل کر نیکی بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”اب دیکھنا چاہیے کہ اسلام نے نسبت طلاق کے کیا کیا ؟ اُسے طلاق کو بطور ایک مرض لا علاج کے جائز و مباح بتایا ہے۔ مگر زن و شوہر کا معاملہ ایک ایسا نازک اور ایک عجیب قسم کے ارتباط و اختلاط کا معاملہ ہے کہ جو ایمن بیماری پیدا ہو سولے اُنھیں دونوں کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کی تشخیص نہیں کر سکتا کہ آیا وہ اُس حد تک پہنچ گئی ہے جس کا علاج بجز طلاق کے اور کچھ نہیں۔ اسیلے بانی اسلام نے اس مرض کی تشخیص کسی جج یعنی قاضی کی رے پر منحصر کی ہے نہ کسی

طریقہ پر استعمال کیا ہے؛ پس اُنکے افعال کی نفیریں اُنھیں پر ہونی چاہیے نہ مذہب اسلام پر۔ ہلکوا مید ہے کہ تمام منصف مزاج لوگ جب اسلام کے اس مسئلہ پر غور کریں گے تو قبول کرینگے کہ جو عمدہ طریقہ اس باب میں اسلام نے اختیار کیا ہے وہ عقل، انصاف اور معاشرت کی نظر سے ایسا عمدہ ہے کہ اُس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا اور صاف صاف یقین دلاتا ہے کہ یہ مسئلہ اُسی استاد کا بتایا ہوا ہے جس نے انسان کو پیدا کر کے اُنکے لیے اُسکا جوڑا پیدا کیا تاکہ اُسکی تسلی اور دل کی خوشی کا باعث ہو۔

دوسری مثال

جہاد کے طعن پر بھی ازالۃ الاولیاء اور تفسار وغیرہ میں عمدہ عتیق کے بے شمار حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ جس شدت اور سختی کے ساتھ جہاد کا حکم انبیاء بنی اسرائیل کو دیا گیا اور جس طرح انبیاء نے اس حکم کی تعمیل کی۔ اسلام میں ویسی شدت اور سختی جہاد کے حکم میں نہیں ہے۔ یہ جو ابھی بلاشبہ عام مسلمانوں کے اطمینان اور عیسائیوں کے ساکت کرنے کے لیے۔ جو کہ تمام عمدہ عتیق کو الہامی جانتے ہیں۔ کافی تھا؛ مگر جو لوگ یہودی یا عیسائی مذہب کے قائل نہ تھے اور جہاد کو عموماً۔ خواہ وہ کسی مذہب میں ہو۔ اصولی تھوں اور حسن معاشرت کے خلاف جانتے تھے اور مسلمان فاتحوں کے افعال کی بدولت خود اسلام کو سب مذہبوں سے زیادہ نوع انسان کی آزادی کا دشمن سمجھتے تھے اُنکے لیے اور اُن تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے جو ان معترضین کی تحریریں دیکھتے تھے کافی نہ تھا۔ سرسید نے خطبات احمدیہ میں اور اُسکے سوا اپنی اور بہت سے تقریروں میں اس مغالطہ کو اس طرح رفع کیا ہے کہ فی الواقع کسی انصاف پسند کو۔ خواہ وہ عیسائی ہو اور خواہ غیر عیسائی۔ اسلام کے مسئلہ جہاد پر نکتہ چینی کرنے کا محل باقی نہیں رہا۔ سب سے زیادہ مفصل بحث اُنھوں نے اس مسئلہ پر اپنی تفسیر میں کی ہے؛ مگر بیان ہم صرف اُنکی اُس تحریر کا بہت مختصر خلاصہ۔ جو خطبات میں

یہ شکر ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں اس کو قتل نہ کر ڈالوں ؟ یعنی وہ شخص آنحضرت کی شدتِ غضب یہ سمجھا کہ اس شخص نے تمہارے جانے کے لائق کام کیا ہے ۔

اس کے بعد ان کی تقریر کا حاصل یہ ہے کہ نبی اسلام نے طلاق کے روکنے میں انہیں تہدیدیں اور ہدایتوں پر بس نہیں کی بلکہ کماحقہ اور طاپ قائم رکھنے کے لیے یہ تدبیر رکھی ہے کہ جب تک تین دفعہ طلاق نہ دی جائے زن و شوہر میں پوری تفریق نہ ہو اور دفعہ تین طلاقین دینے کی ممانعت فرمائی اور حکم دیا کہ سوچ سوچ اور سمجھ سمجھ کر مناسب مناسب فاصلہ سے طلاق دیجائے کہ ہر ایک میں تقریباً پچیس روز کا فاصلہ ہوتا ہے ؛ تاکہ پہلی طلاق کے بعد اگر آپس میں صلح ہو جائے تو بدستور زن و شوہر میں اور دوسری طلاق کے بعد بھی بشرطِ معتد کے اسی طرح عا پ ہو جائے لیکن اگر تیسری طلاق بھی واقع ہو جائے تو سمجھا جائے کہ یہ جیل منڈھے چڑھنے والی نہیں ہے اور پھر دائمی تفریق ہو جائے ۔

علامہ ان ہدایتوں کے عورتوں کے ساتھ محبت رکھنے اور ان کے ساتھ مہربانی اور خاطر داری سے پیش آنے اور ان کی سختی اور بد مزاجی کو تحمل کے ساتھ برداشت کرنے کی نہایت تاکید سے ہدایت فرمائی ہے اور یہ سب باتیں اسی مکروہ چیز یعنی طلاق کے روکنے کو ہیں ۔

اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام صرف اسی حالت میں طلاق کی اجازت دیتا ہے جب کہ وہ زن و شوہر کے حق میں ایک بیش بہا نعمت ثابت ہو اور اس کے ذریعہ سے حالتِ زوجیت کی تمام تلخیان رفع ہو جائیں یا کم ہو جائیں اور بغیر اس کے حالتِ معاشرت روز بروز خراب ہوتی جائے ۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ طلاق بجا ہے اس کے کہ حسن معاشرت کے حق میں مضر ہو وہ زن و شوہر دونوں کے حق میں ایک برکت اور حسن معاشرت کی ترقی کا کامل ذریعہ ہوگی ۔ ہاں میں اس بات کو قبول کر دوں گا کہ مسلمانوں نے اس عمدہ حکم کو نہایت قابلِ نفرت

مسلمانوں پر بہت بڑا فرض تھا اور اب بھی بقدر ضرورتِ وقت کے اُن پر فرض ہے کہ کافروں کے ملکوں میں جائیں اور خدا کی توحید کا یقین اُن کے دل میں بٹھائیں۔ جہاں کوئی ایسے وعظ و نصیحت کا مانع نہیں ہے وہاں اسلام نے تلوار نکالنے کی ہرگز اجازت نہیں دی۔ مگر جب خدا کے نام کی منادی روک دی جائے اور وہ خدا کو امن میسر نہ ہو۔ جیسا کہ مکہ میں کافروں نے کیا کہ جب مسلمان مکہ سے نکل گئے تو بھی اُن کا تعاقب نہ چھوڑا۔ اُس وقت بلاشبہ اپنے بچاؤ اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اسلام نے تلوار نکالنے کی اجازت دی ہے۔“

مذکورہ بالا مضمون کو نہایت مفصل و شرح بیان کر نیکی بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”اس بیان سے اُن عیسائی مصنفوں کی بھی غلطی صاف صاف ظاہر ہوتی ہے جو لکھتے ہیں کہ اسلام میں دوسرے مذاہب کو آزادی سے رہنے دینا مطلق نہیں ہے۔“ پھر لکھتے ہیں کہ ”ہاں ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ مسلمان فتح مندوں میں بعضوں نے نہایت بیرحمی سے دوسرے مذاہب کی آزادی کو برباد کیا؛ مگر مذاہب کا اندازہ اُن کے افعال سے نہیں بلکہ اس بات سے کرنا چاہیے کہ آیا اُنھوں نے اسلام کے مطابق عمل کیا یا نہیں؟ اُس وقت صاف کھل جائیگا کہ اُن کے افعال اسلام کے بالکل برخلاف تھے۔ مگر اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو مسلمان فتح مند اپنے مذاہب کے پابند تھے وہ دوسرے مذاہب کی آزادی میں خلل انداز نہ تھے اور اپنی تمام رعایا کو بلا لحاظ قوم و مذاہب کے ہر طرح کا امن آزادی بخشتے تھے۔“ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ”چمبرز انسائیکلو پیڈیا میں ایک عیسائی مصنف نے جس اسلام کی طرف اشارہ کیا بالکل موقع نہ تھی۔ اسپین کے علم تاریخ پر ایک رُکھ لکھا ہے اسپین وہ لکھتا ہے کہ ”اسپین کے بنی امیہ خلفاء کی حکومت کی ایک مشہور و معروف بات قابل بیان ہے کیونکہ اُس سے اسپین کے ہمعصر۔ یعنی عیسائی۔ اور پچھلے مسلمان بادشاہوں کے مقابلہ میں بلکہ اس اُنیسویں صدی کے زمانہ تک اُن بادشاہوں کی بڑی عمدگی پائی جاتی ہے؛ یعنی اُن کا عام طور سے دوسرے مذاہب کو مذہبی معاملات میں آزادی کا دینا۔“

درج ہے۔ لکھتے ہیں۔

سرولیم میور نے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں اسلام پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اُسے مذہب کے معاملہ میں رے کی آزادی بالکل روک دی بلکہ بالکل معدوم کر دی ہے۔ سرسید نے اُسکے جواب میں اول ایک لمبی تحریر میں اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ جیسی آزادی رے کی روک عیسائی مذہب میں ہے ایسی دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”اگر عیسائیوں کے قول کے موافق اسلام میں آزادی رے نہ ہونے کے معنی ہیں کہ اسلام کے قبول کرنے کی لازمی سزا تلواریں تو یہ اسلام پر اُن جھوٹے الزامات میں سے ہے جو غیر مذہب الون نے نا انصافی سے اُسپر لگائے ہیں۔ یا تو وہ لوگ اصول اسلام سے ناواقف ہیں یا بیدہ و الاستہ حق پوشی کی نظر سے ایسا کیا ہے۔ جبکہ اسلام دلی یقین اور قلبی تصدیق پر منحصر ہے تو کیونکر یہ بات خیال میں آسکتی ہے کہ وہ زبردستی منوایا اور قبولوایا جاتا ہے۔ جو لوگ اسلام سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ الزام قرآن مجید کے اس صاف اور روشن حکم کے کس قدر برخلاف ہے کہ ”لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ“ (قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ) (یعنی دین کے معاملہ میں کچھ جبر نہیں) کیونکہ ہدایت اور گمراہی میں صاف فرق ظاہر ہو گیا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”جس اصول پر حضرت موسیٰ نے کافروں پر تلوار کھینچی تھی۔ اور یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک خدا کے حکم سے وہ تلوار کھینچی گئی تھی۔ کہ تمام کافروں اور بت پرستوں کو بغیر استثنا کے قتل و غارت اور نیست و نابود کر دیں۔ اُس اصول پر اسلام نے کبھی تلوار میان سے نہیں نکالی: اُسے کبھی تمام کافروں اور بت پرستوں کے نیست و نابود کرنے کا یا کسی کو تلوار کی دھار سے مجبور کر کے اسلام قبول کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ ہاں بلاشبہ اُسے بھی تلوار نکالی مگر دوسرے مقصد سے۔ یعنی خدا پرستوں کی جان و مال کی حفاظت اور اُنکو خدا پرستی کا موقع ملنے کو۔ اور یہ وہ منصفانہ اصول ہے جس پر کوئی شخص الزام نہیں لگا سکتا۔ ابتدائے اسلام میں

”خلفا کی تمام تاریخ کی کوئی بات ایسی نہیں مل سکتی جو ایسی رسوائی کا باعث ہو جیسے (عیسائیوں میں) مذہبی عدالت سے سزا دینا تھا اور نہ کوئی مثال اس بات کی پائی جاتی ہے کہ کوئی شخص اپنا مذہب چھوڑنے کے سبب آگ میں جلا یا گیا ہو اور نہ مجھ کو یقین ہے کہ زمانہ امن میں صرف اسوجہ قتل کیا گیا ہو کہ اُسے اسلام قبول نہیں کیا“

اسکے بعد جان ڈیون پورٹ کی کتاب اپالوجی سے مندرجہ ذیل عبارت نقل کرتے ہیں

”خونریزی اور بربادی اُن نو احمقانہ جہادوں کی جو عیسائیوں نے تقریباً دو سو برس تک ترکوں پر کیے اور جس میں کئی لاکھ آدمی ہلاک ہوئے، پھر قتل کرنا اُن شخصوں کا جو اس عقیدہ کو نہیں مانتے تھے کہ انسان کو دوبارہ اصطبار ہونا چاہیے، نو تھر کے پیروں اور رومن کیتھولک مذہب والوں کا دریائے رائن سے لیکر انتہائی شمال تک ہنری ہشتم اور اُسکی بیٹی میری کے حکم سے قتل ہونا، فرانس میں سینٹ بارتھولومیس کا قتل ہونا، چالینسس تک اور بہت سی خونریزیوں کا ہونا، فرانس اول کے عہد سے ہنری چارم کے پیرس میں داخل ہونے تک عدالت مذہبی کے حکم سے قتل کا ہونا۔ جو اب تک اسلئے قابلِ فخر ہے کہ وہ عدالت کی رائے سے ہوا تھا۔ علاوہ اسکے وہ بیس برس کی خرابیاں جبکہ پوپ کے مقابلہ میں اور بشپ بشپ کے مقابلہ میں تھے، زہر خورانی اور قتل کی وارداتوں کا ہونا۔ ++ اور آخر کار اس خوفناک فحشت کا خاتمہ ہونیکے لیے ایک کروڑ بیس لاکھ نئی دنیا کے باشندوں کا صلیب ہاتھ میں لیے قتل ہونا، اس میں شک نہیں کہ ایسا مکروہ اور گویا ایک غیر قطع سلسلہ مذہبی لڑائیوں کا چودہ سو برس تک سولے عیسائیوں کے اور کمین ہرگز جاری نہیں رہا“

اسکے بعد مشہور عیسائی مؤرخ مسٹر گین کی رائے اُس آزادی کی تائید میں جو اسلام نے غیر قوموں کو دی ہے نقل کی ہے۔ پھر ایک آرٹیکل سے جو کسی یورپین مصنف نے ایسٹ اینڈ ویسٹ اخبار میں چھپوایا تھا۔ مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے ”اسلام نے کسی مذہب کے مسائل میں دست اندازی

اسکے بعد گاؤ فری ہگنر کی رائے اس امر کے متعلق نقل کی ہے جسکے چند فقرے یہاں نقل کیے جاتے ہیں ”کوئی بات ایسی عام نہیں ہے جیسی کہ پادریوں کی زبانی اسلام کی مذمت اسوجہ سے سننے میں آتی ہے کہ مسیحین تعصب زیادہ ہے اور دوسرے مذہب کو آزادی نہیں ہے۔ یہ عجیب نم عم اور محض ریاکاری ہے؛ وہ کون تھا جسے مور مسلمان باشندگان اسپین کو بائین وجہ کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے جلاوطن کر دیا تھا؟ اور وہ کون تھا جس نے میکسیکو اور پیرو کے لاکھوں باشندوں کو قتل کیا تھا اور ان سب کو بطور غلام کے دیدیا تھا اسوجہ سے کہ وہ عیسائی نہ تھے؟ مسلمانوں نے بمقابلہ اسکے یونان میں کیا کیا؟ کئی صدیوں سے عیسائی امن و امان کے ساتھ اپنی ملکیت پر قابض چلے آتے ہیں۔ اور انکے مذہب، انکے پادریوں، انکے شپ، انکے بزرگوں اور انکے گرجاؤں کی نسبت دست اندازی نہیں کی گئی ہے۔ جو لڑائی بالفصل یونانیوں اور ترکوں میں ہو رہی ہے وہ بہ نسبت اس لڑائی کے جو حال میں ڈیمیرا کے حبشیوں میں ہوئی تھی کچھ زیادہ مذہبی نہیں ہے۔“

”ایک نہایت دشمن مگر غیر متعقد عالم نے مسلمانوں کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ ”وہ کسی شخص کو ایذا نہیں دیتے تھے اور یہودی اور عیسائی سب ان میں خوش و خرم تھے۔ اگرچہ بظاہر موزاسوجہ سے جلاوطن کیے گئے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے مگر جھکوا گمان ہے کہ وہ اپنی دلیلون سے عیسائیوں پر اس قدر غالب آ گئے تھے کہ نادان عیسائی منک (راہب) سمجھتے تھے کہ انکی دلیلون کا جواب صرف مذہبی عدالت کی سزا اور تلوار سے ہو سکتا ہے اور جھکوا کچھ شبہ نہیں کہ جہاں تک انکی ناقص قوت جواب دینے کے باب میں تھی وہاں تک انکا یہ خیال صحیح تھا۔“

آسانی سے ہو سکے کہ مثلاً جبل فلران۔ جسکا نام توریت کی ایک آیت میں آیا ہے اور جس سے مسلمان آنحضرتؐ کی نبوت کی بشارت نکالتے ہیں۔ آیا وہ بقول اہل اسلام جبال عرب میں ہے یا بقول سرولیم میور کے جبال شام میں؟ یا یہ کہ فی الواقع حضرت اسمعیل اور اُنکے بیٹے عرب کے مختلف حصوں میں۔ جیسا کہ مسلمان کہتے ہیں۔ آباد ہوے یا بقول سرولیم میور کے آباد نہیں ہو؟ یا یہ کہ آنحضرتؐ کا اسمعیل کی اولاد میں ہونا ثابت ہے یا بقول سرولیم میور کے ثابت نہیں ہے؟ اس خطبہ میں سرسید نے توریت کے حوالوں اور عیسائی محققوں کی شہادتوں سے اپنے ہر ایک دعوے پر سرولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کے برخلاف استدلال کیا ہے۔

دوسرے خطبہ

دوسرے خطبہ میں عرب جاہلیت کی رسوم و عادات اور خیالات و عقائد اچھے یا بُرے جہان تک کہ شعرے جاہلیت کے اشعار اور دیگر معتبر ذریعوں سے معلوم ہوئے۔ بیان کیے ہیں کہ حقہ دربا تین اشعار سے استنباط کی ہیں اُنکے ساتھ وہ اشعار یا مصرعے بھی نقل کر دیے ہیں جن سے ان باتوں کا سراغ لگایا گیا ہے۔ یہ خطبہ اس غرض سے لکھا گیا ہے تاکہ لوگوں کو اس بات کے اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ اسلام سے پہلے عرب کی کیا حالت تھی اور اسلام کے بعد اُنکے اخلاق اور عادات اور عقائد و خیالات کس درجہ تک تبدیل ہو گئے۔

تیسرے خطبہ

تیسرے خطبہ میں اُن ادیان مختلفہ کا جو اسلام سے پہلے عرب میں شائع تھے اور اس بات کا بیان ہے کہ اسلام ان تمام ادیان میں کونسے دین سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے؟ اس خطبہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اہل عرب اسلام سے پہلے چار فرقوں میں منقسم تھے۔ بت پرست۔ خدا پرست۔ لامذہب اور متقدین مذہب الہامی۔ ان میں سے اول کے تین فرقوں کا ذکر کرنے کے بعد عرب کے

نہیں کی، کسی گواہ یا نہیں پہنچائی، کوئی مذہبی عدالت خلاف مذہب والوں کو سزا دینے کے لیے قائم نہیں کی اور کبھی اسلام نے لوگوں کے مذہب کو بھرپور تبدیل کرنے کا قصد نہیں کیا۔ ان اُسے اپنے مسائل کا جاری ہونا چاہا مگر اسکو جبراً جاری نہیں کیا۔ اسلام کی تاریخ میں ایک ایسی خاصیت پائی جاتی ہے جو دوسرے مذہب کے غیر آزاد رکھنے کے بالکل برخلاف ہے۔“

اسکے بعد فلسطین کے ایک عیسائی شاعر لارمین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”صراطِ سلیمان ہی تمام روئے زمین پر ایک قوم ہیں جو دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھتے ہیں۔“

پھر ایک انگریزی سیاح سیلٹن کا یہ قول نقل کیا ہے جو اُسے بطور طعن کے مسلمانوں کی نسبت کہا ہے یعنی یہ کہ ”وہ حد سے زیادہ دوسرے مذہب کو آزادی دیتے ہیں۔“

یہ تمام اقوال نقل کرنے کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ ”دیکھو یہ سب رائیں بہت سے بے طرفدار اور فیاض طبع عیسائی مصنفوں کی سرولیم میور کے اس بے سند دعوے کے کیسے برخلاف ہیں کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزاد رکھنے کا نام بھی نہیں ہے۔“

ان دو مثالوں کے بعد ہم سرسید کی کتاب کی نہایت مختصر کیفیت - جسے مصنف کی محنت اور جانفشانی کا - جو اس کتاب کے لکھنے میں اُسے کی ہے - کسی قدر اندازہ ہو سکے اور ناظرین کے ذہن میں کتاب کی حقیقت کا ایک فہم پیدا ہو جائے - بیان کرتے ہیں۔

پہلے خطبہ میں - جو سب سے بڑا اور بجا ہے خود ایک کتاب ہے - عرب کا نہایت مفصل تاریخی جغرافیہ مسلمانوں کے ان بعض مسلمات کے ثابت کرنے کے لیے - جن کا سرولیم میور نے اپنی کتاب میں انکار کیا ہے - بطور بنیاد مباحثِ آئندہ کے بیان کیا گیا ہے تاکہ آئندہ خطبات میں اس بات کا فیصلہ

رحمت ہے اور اس سے موسوی اور عیسوی مذہب کو نہایت فائدے پہنچے ہیں۔ اس خطبہ کو سرسید نے اس طرح شروع کیا ہے کہ ”یہ مضمون جسکو اب ہم لکھنا چاہتے ہیں ایک ایسا مضمون ہے کہ ہم کو اسکا لکھنا یا پڑھنا شروع کرنے سے پہلے نہایت بے تعصب لی پیدا کرنا چاہیے کیونکہ طرفداروں سچے اور صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچتا اس الزام کے رفع کرنے سے تو ہم مجبور ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان مذہب میں جو فی الواقع خوبی ہے اسکو ظاہر کریں مگر جہاں تک ہم سے ہو سکا ہے ہم نے نہایت ٹھنڈی طبیعت اور ناظر فار دل اور سیدھی سادی سچی نیت سے یہ مضمون لکھا ہے اور اسی لیے ہم کو یقین ہے کہ اگر ہم اپنی اس رائے پر دو سکر کو یقین نہ دلا سکیں تو اسکو بخیرہ بھی نہیں کہیں گے“

مصنف نے اس مضمون کو چار حصوں پر منقسم کیا ہے جن میں سے پہلے حصہ میں وہ فائدے بیان کیے ہیں جو اسلام سے عموماً انسان کی معاشرت کو پہنچے ہیں اور اس کے ثبوت میں اُن مشہور اور نامور عیسائی مصنفوں کے اقوال نقل کیے ہیں جنہوں نے اسلام کے حق میں مذہب اسلام کے مفید ہونے کی نسبت شہادتیں دی ہیں جیسے سرویلیم میور۔ جنکی نسبت سرسید لکھتے ہیں کہ وہ ایک نہایت دیندار عیسائی ہیں اور جب تک کہ علانیہ اور نہایت روشن بات نہوا سلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے۔ ایڈورڈ گبن۔ جان ڈیون پورٹ، ٹامس کرائفل وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے حصہ میں اُن عیسائی مصنفوں کی رائے کی تردید کی ہے جنہوں نے اسلام کو فوہ سان کی معاشرت کے حق میں مُضر بتایا ہے اور اُس میں بھی یورپ کے بہت سے نامور اور محقق مصنفوں کی شہادتوں سے استدلال اور اسلام کا مقابلہ حسن معاشرت کے لحاظ سے عیسائی مذہب کے ساتھ کیا ہے۔

یہ خطبہ سرسید

دوسرے

تیسرے

تیسرے حصہ میں اُن فائدوں کا بیان ہے جو یہودی اور عیسائی دونوں مذہبوں کو بالاشتراك

الہامی مذاہب کی تفصیل بیان کی ہے۔ اول مذہب صائبین۔ (۲) مذہب براہیم اور دیگر انبیاء عرب یعنی یہود صالح اسماعیل اور شعیب کا (۳) مذہب یہود (۴) مذہب عیسوی۔

اسکے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”ان مذاہب کے بھاری بوجھ کے نیچے ملک عرب ایک مذہبی حرکت کر رہا تھا کہ دفعۃً اسلام نمودار ہوا اور اُسکو حیرت آمیز سرور میں ڈالکر اُسکا غیر تحمل بوجھ دور کر دیا اور دفعۃً جزیرہ عرب کے چاروں کونوں کو صدق کے نور سے بھر پور کر دیا“ اسکے بعد انھوں نے مفصل بیان کیا ہے کہ اسلام عرب کے مذاہب مذکورہ میں کیا کیا اصلاحیں کیں؟ کن باتوں کو قائم رکھا اور کن امور میں ان سے نفی کی؟ اسکے بعد جو اکثر عیسائی اعتراض کرتے ہیں۔ کہ اسلام درحقیقت اصول و عقائد متفرقہ و منتشرہ مذاہب سابقہ کی محض ایک ترتیب اور اجتماع کا نام ہے۔ اُسکا اس طرح جواب دیتے ہیں کہ ہر ذی فہم شخص پر یہ بات ظاہر ہوگی کہ یہ مشابہت اصول اسلام کی دیگر مذاہب الہامی کے اصول سے اسلام کے پاک اور الہامی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تمام چیزیں۔ جن کا مبداء ایک ہی غیر فتنے اور کامل ذات ہو۔

ضرور ہے کہ ایک ہی قسم کی اور ایک ہی کامل اصول پر ہونگی۔ جس طرح کہ خدا تعالیٰ سے اپنا مثل پیدا کرنا غیر ممکن ہے اور جس طرح کہ اُسکی ذات سے کسی پیدا کی ہوئی چیز کو اپنی مرضی اور اپنی حکومت کے احاطہ سے خارج کر دینا محال ہے۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ہی غرض کے انجام دینے کے لیے دو متناقض اصول اور احکام اُسکی ذات سے صادر ہوں۔ مسلمانوں کو بلکہ تمام دنیا کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ ممنون رہنا چاہیے جنھوں نے ابتداءً دنیا سے اپنے زمانہ تک کے تمام نبیوں کی رسالت کو برحق ٹھیرایا، جنھوں نے دنیا کے تمام الہامی مذہبوں کی تکمیل کی اور جنھوں نے اپنے باایمان تبعین کے لیے بے با اور لازوال نور کے دروازے کھول دیے۔“

چوتھے خطبہ میں اس بات کا نہایت شافی ثبوت دیا ہے کہ اسلام انسان کے حق میں

ان تمام بزرگوں کی بزرگی دنیا میں اُس حد تک پہنچادی جسکے وہ مستحق تھے۔“

پھر اسی خطبہ کے چوتھے حصہ میں اُن فائدوں کو بیان کیا ہے جو اسلام کی بدولت خاص

عیسائی مذہب کو پہنچے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ”دنیا میں مذہب اسلام سے زیادہ کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست نہیں ہے اور اسلام نے کسی مذہب کو مسقدر فائدے نہیں پہنچائے جیسا کہ عیسائی مذہب کو پہنچائے ہیں عیسائی مذہب کی بنیاد اُس نیک و عظیم شخص (یعنی حضرت عیسیٰ بن مریم) سے ہے جو خدا کا راستہ درست کرنے آیا تھا اور پھر بالکل دار و مدار اُس عجیب شخص پر ہے جسکو انھوں نے تانا بزرگ و مقدس سمجھا کہ خدا یا خدا کا بیٹا مانا (یعنی حضرت عیسیٰ پر) مذہب اسلام ہی کا یا احسان عیسائی مذہب پر ہے کہ وہ نہایت مستقل ارادہ اور بڑے دل اور نہایت ہتھوڑا ثابت ہوئی سے عیسائی مذہب کا طردار ہوا اور یہودیوں سے مقابلہ کیا اور علانیہ اور طیارانہ اس بات کا اعلان کیا کہ جان دی بائیسٹ (یعنی حضرت عیسیٰ) بلاشبہ سچے پیغمبر اور حضرت عیسیٰ بے شک عبد اللہ اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ تھے پس کونسا مذہب اس بات کا دعوے کر سکتا ہے کہ وہ عیسائی مذہب کی حمایت میں اسلام سے زیادہ ترمذیدار اور اُس نے عیسائی مذہب کی حمایت میں اسلام سے زیادہ کوشش کی ہے۔“

”جو سب بڑی خرابی حواریوں کے بعد عیسائی مذہب میں پیدا ہو گئی ہے وہ تثلیث فی التوحید اور توحید ثلاثی کا مسئلہ تھا اور یہ مسئلہ اُس لازوال سچ کے بھی متناقض تھا اور اُن خاص نصیحتوں کے بھی برخلاف تھا جو حضرت عیسیٰ نے فرمائی تھیں اور حواریوں نے انجیل میں لکھی تھیں۔ یہ امر اسلام کی لازوال عظمت کا باعث ہے کہ اُس نے خدا کے ذوالجلال کی پرستش کو پھر جاری کیا اور اُس خاص مذہب کو پھر سرسبز کیا جسکی خاص تلقین حضرت عیسیٰ نے کی تھی۔ اسلام ہمیشہ اُس زمانہ کے عیسائیوں کو انکی غلطیوں سے متنبہ کرتا رہا اور اب بھی متنبہ کرتا رہتا ہے۔ اسلام نے عیسائیوں سے اسی سچے مذہب کے قبول کرنے کی استدعا کی جسکا وعظ حضرت مسیح نے کیا تھا جیسا کہ قرآن میں آیا ہے

اسلام کی بدولت حاصل ہوئے ہیں۔ یہ دونوں حصے خطبہ مذکور کے چونکہ بہت طولانی ہیں اور خلاصہ میں اسکی خوبی باقی نہیں رہ سکتی اسلئے انکو اصل کتاب میں دیکھنا چاہیے۔ مگر تیسرے حصہ کا صرف ایک فقرہ بطور نمونہ کے بیان لکھا جاتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ ”اسلام سے پہلے یہودی اور عیسائی اکثر پیغمبروں اور پاک شخصوں سے نہایت بد اخلاقی کے افعال قبیحہ منسوب کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک ان مخبروں کو امام ربانی سے کچھ تعلق نہ تھا مگر تمام یہودی اور عیسائی ان تمام مخبروں کو امام ربانی اور ان نبیوں اور مقدس لوگوں کو ان افعال قبیحہ کا مرتکب یقین کرتے تھے۔ اسلام نے ان معصوم نبیوں اور خدا پرست شخصوں اور پاک خصلت بزرگوں کو ان تمثیوں سے بچایا اور جو اتنا یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنا لگائے تھے انکو فحشندی سے دفع کیا اور ان بزرگوں کے معصوم اور بے گناہ ہونے کا دنیا کے بہت بڑے حصہ پر یقین کرا دیا۔ مسلمان عالموں نے اسلام کے اس مسئلہ پر یقین دلانے سے کہ انبیاء و پیغمبر پاک و معصوم ہیں۔ تو ریت کو بڑے غور سے پڑھا اور عیسائیوں اور یہودیوں کی تمام غلطیوں کو ظاہر کر دیا اور جن وجہ سے وہ غلطی میں پڑے تھے انکو بخوبی دریافت کیا۔ پس اگر اسلام نہ ہوتا تو ان پیغمبروں اور نبیوں اور خدا کے پاک بندوں یعنی حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، انکی بیٹیوں، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت یعقوبؑ کی بیویوں اور بیٹوں، ہارونؑ، داؤد اور سلیمانؑ کی دنیا میں ایسی ہی مٹی خراب رہتی جیسی ایک بدکار آدمی کی خراب ہوتی ہے۔ وہ تمام دنیا کی نظروں میں ایسے ہی حقیر ہوتے جیسے کہ ایسے جرموں کے مجرم حقیر ہوتے ہیں جنکو دائم الجس کر کے کالے پانی بھیجتے ہیں یا اُنکے گناہوں کی سزا کے لیے انکو سولے پر لٹکاتے ہیں۔ صرف یہ اسلام ہی کا احسان ہے جس نے

سے یہ عہد عتیق کے ان درسون کی طرف اشارہ ہے جنہیں حضرت لوطؑ حضرت داؤدؑ وغیرہ کی طرف زما اور دیگر افعال قبیحہ کی نسبت کی گئی ہے ۱۲

دروازوں کے کھولنے کا پوپ کو بالکل اختیار ہے۔ پوپ گنگارون کے گناہوں کے بخشدینے کا دعویٰ رکھتا ہے۔ پوپ نو پورا اختیار تھا کہ جس ناجائز چیز کو چاہے جائز کر دے۔ حقیقت پوپ بلحاظ ان اختیارات کے جو اسکو حاصل تھی اور جنکو وہ کام میں لاتا تھا۔ کسی طرح حضرت عیسیٰ سے کہ نہ تھا بلکہ دو چار قدم آگے بڑھتا ہوا تھا۔ قرآن ہی نے عیسائیوں کو اس خرابی سے مطلع کیا اور جو خرابیاں اُس سے پیدا ہوتی ہیں انکو بتلایا اور حاجی عیسائیوں کو اس غلامانہ اطاعت پر ملت کی اور انکو سمجھایا کہ اس رسوائی اور بے عقلی کی اعانت کو چھوڑیں اور خود آپ اپنے لیے سچی جستجو کریں چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا ”قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ“ اور پھر دوسری جگہ فرمایا ”اتَّخِذُوا الْحَبَارَ هُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَهًا وَاحِدًا أَلَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ“

”جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدی بن حاتم جو اُس وقت عیسائی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اُنکے گلے میں سونے کی صلیب پڑی ہوئی تھی۔ آنحضرت نے فرمایا کہ اے عدی اس بت کو اپنے گلے سے نکال پھینک چنانچہ نکال ڈالی۔ جب وہ پاس آئے تو آنحضرت قرآن کی یہ آیت پڑھتے تھے ”اتَّخِذُوا الْحَبَارَ هُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ“ جب آپ پڑھ چکے تو عدی نے عرض کیا کہ ہم تو انکی پرستش نہیں کرتے آپ نے فرمایا کہ کیا یہ نہیں ہے کہ وہ حرام کر دیتے ہیں اُس چیز کو جسے خدا نے حلال کیا پھر تم بھی اُسکو حرام سمجھتے ہو اور حلال ٹھہراتے ہیں وہ اُس چیز کو جسے خدا نے حرام کر دیا سو تم بھی اُسکو حلال سمجھنے لگتے ہو؟ عدی نے کہا ہاں یہ تو ہے۔ آنحضرت نے فرمایا بس یہی اُنکا پوجنا ہے“

”ایک مدت تک عیسائی اسلام کو عداوت سے دیکھا کیے اور اُسکے ہر ایک مسئلہ سے بے سمجھی سے نفرت کرتے رہے

”قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا“ بہت سے عیسائیوں کی آنکھیں اسلام کی روشنی سے کھل گئیں اور اُس ذلیل حالت سے وہ خبردار ہو کر جسمیں مبتلا تھے اور انھوں نے چارسی رتبہ کے حامل کرنے کی کوشش کی جو پہلے انکو حامل تھا یعنی انھوں نے صرف قرآن کی ہدایت سے تثلیث کے عقیدے کو غلط سمجھا اور خدا کو وحدہ لا شریک نہ اور عیسیٰ مسیح کو خدا کا مقدس بندہ مانا جو عین مسئلہ مذہب اسلام کا ہے چنانچہ وہ فرقہ اب موجود ہے اور نہایت معزز لقب یونیٹیرین (یعنی موحّدین) سے معزز ہے۔“

”اگر یہ عقیدہ تھوڑی دیر کے لیے دنیا سے اٹھالیا جائے تو مسٹر گین کی یہ رائے عیسائیوں کے حال پر بالکل مطابق ہو جائیگی کہ ”اگر سینٹ پیٹر یا سینٹ پال پوپ کے محل میں آجائیں تو غالباً وہ اُس دیوتا کا نام دریافت کرینگے جسکی پرستش ایسے پراسرار رسومات کے ساتھ اُس عظیم الشان عبادت گاہ میں کی جاتی ہے۔ افسوس! جنیوا میں جا کر انکو چند دن حیرت نہوگی مگر گرجا میں جا کر سوال و جواب کا پڑھنا اور جو کچھ صادق بقول مفسرین نے انکی تحریرات اور اُنکے مالک کے کلمات کی تفسیر کی ہے اُس پر غور کرنا پڑیگا“

اسکے بعد سر سید لکھتے ہیں کہ ”جو فائدے اسلام نے عیسائی مذہب کو پہنچائے انہیں سب بڑا فائدہ یہ ہے کہ اُسے عیسائیوں کو پوپ کے بے انتہا اختیارات ناجائز سے نجات دی اور عیسائیوں میں ایک مذہبی کی روح پھونک دی۔ تمام عیسائی پوپ کو حضرت عیسیٰ کا پورا بااختیار نائب سمجھتے تھے اور اُسکو معصوم جانتے تھے جیسے کہ اب بھی بہت سے فرقے عیسائیوں کے سمجھتے ہیں۔ انکا یقین تھا اور بہتوں کا اب بھی یقین ہے کہ وہ فرخ اور اعوان اور نبوت کے

۱۔ سینٹ پیٹر یعنی پطرس حواری اور سینٹ پال یعنی پولوس مقدس ۱۲

۲۔ صادق بقول کا لفظ مسٹر گین نے بطور طنز کے لکھا ہے جس سے مراد قرین کر نیوالے مفسر ہیں ۱۳

تاہم لو تھرنے اپنی کوشش کو نہیں چھوڑا اور آخر کار اُس عظیم الشان اصلاح کرنے پر کامیاب ہوا جو عموماً مذہب پر ٹسٹنٹ یا رفاہیشن کے نام سے مشہور ہے : اور طبیعت انسانی کو تمام غلامیوں کی بدترین غلامی سے جو ایک مرشدانہ غلامی تھی آزاد کر دیا ۔ ہکویلقین ہے کہ اگر لو تھرن مقدس اور زندہ رہتے تو ضرور وہ مسئلہ تثلیث کے مخالف ہوتے اور اسلام کی ہدایت سے خدا کی وحدانیت کے مسئلہ کو بھی جو حقیقت حضرت عیسیٰ نے بھی یہی مسئلہ تلقین کیا تھا ۔ لوگون مین پھیلاتے اور آخر اُس نبی آخر الزمان پر یقین کرتے جیسے ایسی ایسی بڑی غلطیوں سے عیسائی مذہب کو بچایا تھا ۔ پس مذہب عیسوی کو ہمیشہ اسلام کا احسان مند رہنا چاہیے “

پانچویں خطبہ مین نہایت تفصیل کے ساتھ مسلمانوں کی مذہبی کتابوں یعنی کتب حدیث کتب سیر تغایر اور کتب فقہ کی تصنیف کا منشا اور غرض اور ڈھنگ بیان کیا ہے تاکہ غیر مذہب کے محقق اور نکتہ چین جو اسلام کی نسبت آئندہ زمانہ مین کچھ لکھنا چاہیں اُنکو مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کی طرز تصنیف سے آگاہی اور بصیرت حاصل ہو اور وہ اُن مصنفوں کی طرح جو اسلام کی مذہبی کتابوں کے ناواقفیت کے سبب فطلی مین پڑے ہیں گمراہ نہوں اور اُنکی رہبری کے لیے ایک سیدھا راستہ بن جائے ۔

چھٹا خطبہ مذہب اسلام کی روایت پر لکھا گیا ہے یہ خطبہ کسی قدر طولانی ہے اسلئے صرف اُسکی سرخیان لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے اس مین اول روایت کی صلیت اور یہ کہ اُنکے رواج کی ابتدا کو نوکر ہوئی اور نیز یہ کہ دین اسلام صرف انھیں صحیح روایتوں مین منحصر ہے جو تبلیغ رسالت سے علاقہ رکھتی ہیں نہ دیگر دنیوی امور سے ۔ بیان کیا ہے ۔ پھر چھوٹی روایت کرنے کا امتناع اور اُسکی سزا جو اسلام مین مقرر ہے ، درجات احادیث بلحاظ ثقہ ہونے زواۃ کے ، راویوں کا درجہ اعتبار بلحاظ ثقہ کے ، یہودیوں سے روایت کرنے کی اجازت جو آنحضرت نے صحابہ کو دی ، اختلاف

مگر بعض نیک دل عیسائیوں نے کچھ تھوڑی بہت غور سے اُسے دیکھا اور کالین اور لو تھر مقدس کے دل پر اُسکا کچھ کچھ اثر ہوا جب کہ اُن دونوں نے قرآن مجید کی اس قسم کی آیتوں کو پڑھا جنہیں پوپ کو اور پادریوں کو خدا کے سوا دوسرے خدایا جھوٹے خدا ماننے کی مذمت تھی تو وہ سمجھے اور اس سچے مسئلہ نے اُنکے دل پر اثر کیا اور جیسی کہ قرآن نے ہدایت کی تھی وہ سمجھے کہ ہر شخص فی الواقع آپ اپنا پوپ اور پادری ہے وہ چلا اٹھے کہ چالیا پالیا اور اسی وقت پوپ کی غلامی سے آزاد ہوئے اور غلامانہ اور ذلیل حالت سے جس میں وہ خود اور اُنکے تمام ہم مذہب مبتلا تھے نکل آئے اور صاف صاف اُسکے خلاف وعظ کرنے کو کھڑے ہو گئے جسکی بدولت ہم کروڑوں عیسائیوں کو پڑوسٹ مذہب میں دیکھتے ہیں۔ اگر اسلام عیسائی مذہب کو نعمت مذبحستا تو آج تمام دنیا کے عیسائی ایسے ہی بت پرست ہوتے جیسے کہ اب تک رومن کیتھولک فرقہ کے لوگ بت پرست ہیں اور حضرت مسیح کی مجسم مورت صلیب پر لٹکی ہوئی کے آگے سجدہ کرتے ہیں بس عیسائی مذہب پر یہ کتنا بڑا احسان اسلام کا ہے۔

”جو کہ درحقیقت لو تھر مقدس نے مذہب اسلام سے یہ ہدایت پائی تھی ایسے اُسکے مخالف علانیہ اُس پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ دل سے مسلمان تھا۔ کو ارٹری ریویو نمبر ۲۵۴ میں لکھا ہے کہ جینی براؤڈ نے پوپ کی طرف سے جرمنی کے رفاہیوں اور خصوصاً لو تھر کے ذمہ یہ الزام لگایا تھا کہ وہ عیسائیوں میں مذہب اسلام کو جاری کرنے اور تمام پادریوں کو اس مذہب میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مراکسی کی یہ رائے ہے کہ اسلام میں اور لو تھر کے عقیدہ میں کچھ بہت فرق نہیں ہے، چنانچہ دونوں کا میلان جو بت پرستی کے برخلاف ہے اُس پر غور کرو۔ مارٹینس الفانسس اور والدس کہتے ہیں کہ تیرہ نشانیاں اس بات کے ثابت کرنے کو موجود ہیں کہ اسلام میں اور لو تھر کے مذہب میں ایک رفق بھرا بھی تفاوت نہیں ہے۔ محمد (صلعم) نے انھیں باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہ مرتد (یعنی پیروان لو تھر کرتے ہیں)“

بنایا جاتا۔ ایک بے قر اور خراب شرح اسکے ساتھ لگی ہوتی؛ تو اُس ذریعہ کا کسی قدر تصور بندھ سکتا جسکی وساطت سے یورپ میں قرآن کی اشاعت ہوئی۔“

اسکے بعد سرسید نے سرولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کی غلطیوں کی تشریح کی ہے اور جو اعتراض انھوں نے غلط فہمی سے قرآن پر وارد کیے ہیں ہر ایک کا جواب دیا ہے۔

خطبہ
آخر ان خطبہ

آٹھواں خطبہ خانہ کعبہ کے حالات اور اُسکی تاریخی اور جغرافیائی تحقیقات پر مشتمل ہے۔ یہ خطبہ اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ سرولیم میور نے اپنی کتاب لائف آف محمد میں اس بات کا دعو کیا ہے کہ یقطان جسکا ذکر تورات میں جا بجا آیا ہے اہل عرب کا اُسکی اولاد میں ہونا، حضرت اسمعیل کا مکہ کے قریب آباد ہونا، خانہ کعبہ کی تعمیر اور اُسکی تمام مراسم کا ابراہیم و اسمعیل سے تعلق ہونا، یہ سب بناوٹ اور افسانہ ہے اور ہر قسم کی تاریخی سچائی اور مؤرخانہ احتمالات و قیاسات سے نہایت بعید ہے۔

پہلے وہ لکھتے ہیں کہ ”حجر اسود کو بوسہ دینا، کعبہ کے گرد طواف کرنا، مکہ اور عرفات اور منامین ریمات کا ادا کرنا اور مقدس مہینوں اور مقدس ملک کی تعظیم کرنا ان سب باتوں کو حضرت ابراہیم سے یا اُن خیالات و اصول سے جو غالباً اُنکی اولاد کو اُن سے پہلے کسی طرح کا تعلق نہیں ہے۔ یہ باتیں یا تو ٹھیک ٹھیک مختص المقام تھیں، یا انکو بت پرستی کے اُن اصول سے جو جزیرہ عرب کے جنوب میں جاری تھے تعلق تھا“ اس دعوے سے انکا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے جو آگے چل کر حضرت صلح کے بنی اسمعیل ہونے سے انکار کیا ہے اور آپ کے نسب نامہ شہادت وارد کیے ہیں اُنکے لیے ایک جہ ہاتھ آئے۔

سرسید نے اس خطبہ میں نہ صرف مسلمانوں کی تاریخوں سے بلکہ زیادہ تر یورپ کے عیسائی محققوں اور جغرافیہ دانوں کی تحقیقات سے حضرت اسمعیل و اُنکی اولاد کا حجاز یا عرب میں آباد ہونا

روایات کے اسباب، احادیث موضوعہ کا بیان، یہ تمام باتیں مفصل بیان کی گئی ہیں اسکے بعد سرولیم میور نے جن روایات سے استدلال کر کے اسلام اور بانی اسلام پر اعتراضات وارد کیے ہیں اُن اعتراضوں کا نہایت شافی جواب الزامی اور تحقیقی دو نواطع سے دیا ہے۔

یہ دونوں خطبے یعنی پانچواں اور چھٹا نہایت ضروری اور مفید اطلاعوں پر مشتمل ہیں جو اسلام کی مذہبی کتابوں اور روایتوں پر ایسی روشنی ڈالتے ہیں جسکے اُجالے میں کوئی غیر مذہب مصنف بشرطے کہ اُسے آنکھیں بند نہ کر لی ہوں ٹھوکر نہیں کھا سکتا۔

ساتویں خطبہ میں اول قرآن مجید، اُسکا نزول، اُسکی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب، اُسکی مختلف قراءتیں، آیات ناسخ و منسوخ کی بحث، اُسکے جمع ہونے کا زمانہ، اُسکی نقلوں کی اشاعت، اور اُسکا کامل وراثہ نامی ہونا بیان ہوا ہے اور اسکے بعد سرولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کی غلطیاں جو انھوں نے قرآن مجید کے متعلق کی ہیں بیان کی ہیں۔

ان غلطیوں کا اصل منشا وہ اسطرح بیان کرتے ہیں کہ ”مسلمان بادشاہوں یا عالموں کو تو خدا نے توفیق نہیں دی کہ قرآن مجید کو خود دوسری زبانوں میں ترجمہ کراتے اور مختلف ملکوں میں شائع کرتے، یورپ کی زبانوں میں بے شک اسکے ترجمے ہوئے مگر وہ سب غیر مذہب کے لوگوں یعنی عیسائیوں نے کیے۔ ابتدا میں جب طح پر پندرہ اُن ترجموں کے قرآن مجید کا رواج یورپ میں ہوا اسکا بیان گاؤ فری گسنر نے عمدہ طح پر ان الفاظ میں کیا ہے کہ ”اگر عبرانی توریت کا ترجمہ اس طح پر شائع ہوتا کہ ہر لفظ قابل تبدیل (یعنی ختم المعینین) متین اور شایستہ معنی سے ذلیل اور غیر مذہب معنی میں بدل دیا جاتا اور ہر آیت۔ جسکا مضمون کسی جوڑ توڑ اور ناقابل برداشت غلط ترجموں اور غلط تاویلوں کے ساتھ مصنف پر معیوب معنی پنھانے کا ذریعہ

(یعنی داؤد) جسے خرمنگاہ ارنان بیوسی کو خدا کا گھر بنانے کو مولا یا اور پتھر و لکڑی و لوہا و پتیل اُسکے بنانے کو جمع کیا +++ اور وہ کون تھا (یعنی سلیمان) جسے بعد کو خرمنگاہ ارنان بیوسی میں نہایت عالی شان مکان بنایا جسکو خدا کا گھر اور بیت المقدس نام ملا +++ پس کعبہ کی بنا کو اور اُسکو خدا کا گھر قرار دینے کو ابراہیم کی طرف منسوب نکرنا بلکہ عرب کے بت پرستوں کی رسم بتانا نہایت تعجب کی بات ہے “

اسکے بعد عرفات کی نسبت وہ لکھتے ہیں کہ ”عرفات۔ جسکو سرولیم میور بت پرستوں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ایک ایسی چیز ہے جو خاص ابراہیم اور اُسکی اولاد سے علاقہ رکھتی ہے۔ ہزاروں جگہ تورات میں آیا کہ خدا ابراہیم کو مرنی ہوا، خدا اسحق کو مرنی ہوا، خدا یعقوب کو مرنی ہوا، خدا موسیٰ کو مرنی ہوا، پس ٹھیک یہی معنی عرفات کے ہیں۔ جس پہاڑ پر۔ جو قریب مکہ کے ہے۔ خدا ابراہیم و اسمعیل کو مرنی ہوا اس پہاڑ کا نام جبل عرفات علوم نہیں کہ سرولیم میور نے جبل عرفات کو کیا سمجھا جو اُسکی نسبت کہا کہ اُسکو ابراہیم سوم یا حالات کچھ تعلق نہیں ہے“ عرفات ایک ایسی چیز ہے جو تمام دنیا کے بت پرستوں سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتی +++ عرفات کا استعمال بجز خاندان ابراہیم کے دنیا کے اور کسی خاندان یا مذہب میں نہ تھا +++ یہی وہ مقام ہے جہاں حاضر ہونے کو حج کہتے ہیں وہاں کوئی چیز نہیں ہے؛ پہاڑ تلے کا میدان ہے؛ اس میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور خدا کی یاد کرتے ہیں؛ وہاں خطبہ پڑھا جاتا ہے جس میں خدا کی تعریف ہوتی ہے اور خدا کے احکام سنائے جاتے ہیں۔ ٹھیک اُسی طرح جس طرح کہ موسیٰ نے کوہ سینا کی تلیٹی میں سنائے تھے پس غور کرنا چاہیے کہ اس رسم کی اصلیت بت پرستوں سے پائی جاتی ہے یا خاص ابراہیم سے “

اسکے بعد منا کی نسبت لکھتے ہیں کہ ”منا کا مقام صرف قربانی کے لیے ہے؛ وہاں بجز قربانی کے اور

کوئی رسم نہیں ہوتی۔ تمام تورات قربانی کی رسم سے بھری پڑی ہے۔ جہاں بیت اللہ بنا تھا وہاں قربانی ہوتی تھی

ثابت کیا ہے اور اسکے بعد توریت کی نہایت صریح شہادتوں سے اس امر کا ثبوت پایا کہ حجرِ اسود اور قربانی کی رسم اور کعبہ کا بیت اللہ نام ہونے کو خاص حضرت ابراہیم اور انکی اولاد سے تعلق ہے۔ انھوں نے توریت کے بہت سے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم اور انکی اولاد یعنی حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت موسیٰ سب کا یہی طریقہ تھا کہ خدا کی عبادت کے لیے ایک بن گھرا پتھر مثل حجرِ اسود کے گھر اگر کے مذبح بناتے تھے اور اسکو بیت ایل یعنی بیت اللہ کہتے تھے۔ اور تمام مراسم جو موسم حج میں خانہ کعبہ اور اس کے قرب و جوار میں مسلمان ادا کرتے ہیں ان سب کا تعلق حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے ساتھ ایسے طور پر ثابت کیا ہے جس سے فی الواقع سر ولیم میور کے شبہات ہر نصف مزاج آدمی کی نظر میں نہایت بے وقعت ہو جاتے ہیں۔

مثلاً وہ کعبہ اور حجرِ اسود کی نسبت کتابِ پیدائش اور کتابِ خروج کے متعدد بابوں اور آیتوں کا حوالہ دیکر لکھتے ہیں کہ ”حجرِ اسود ہی مذبح ہے جسکو خدا کے حکم سے ابراہیم، اسحاق، یعقوب اور موسیٰ بناتے۔

+++ یہ سب بزرگ ایسے پتھر کی تعظیم کرتے تھے، یعقوب نے اُس پر تیل ڈالا۔ جو اُس زمانہ کے دستور کے موافق نہایت الغایت تعظیم پرستش کے قریب تھی۔ یعقوب کہا کہ یہ جگہ خانہ خدا ہوگی +++ اور خدا نے منع کیا کہ اس گھر کے اوپر ست پڑھو تاکہ تمھاری شرمگاہ اُس کے اوپر نہ لگی نہ جائے۔ پس اب کو نسا دقتہ تعظیم کا باقی رہ گیا جو اس قسم کے پتھروں کی نسبت بنی ابراہیم میں جاری نہ تھا چہر سر ولیم میور حجرِ اسود کی اس خفیف تعظیم کو بنی ابراہیم کی رسم سے جدا کر کے عرب کے بت پرستوں کی رسم بتاتے ہیں “

”ایک گھر کا خدا کے واسطے بنانا اور بیت اللہ اس کا نام رکھنا۔ جیسے کہ کعبہ ہے۔ اگر ابراہیم کی رسومات سے نہ تصور کیا جائے تو وہ کون تھا (یعنی موسیٰ) جس نے بمقام کعبوں بیابان میں خدا کا گھر بنایا۔ +++ اور وہ کون تھا

اسی بنا پر اس خطبہ کے اول میں سرسید نے ایک نہایت عمدہ تمہید لکھی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ”زمانہ جاہلیت میں عرب کے لوگ کوئی فن نہیں جانتے تھے مگر دو باتیں انہیں بے مثل تھیں ؛ ایک شاعری ، دوسرا علم الانساب ۔ چونکہ ان کے ہاں کتابت کا رواج نہ تھا اور صرف حافظہ پر مدار تھا اسلئے وہ اپنے اپنے قبیلہ کی تمام پشتیں اور اسی طرح دوسرے ہمسایہ قبیلوں کی تمام پشتیں تا بقدرِ آرزو یاد رکھتے تھے اور اپنے نسب پر فخر کرتے تھے اور اپنے حریفوں کے نسب میں عیب نکالتے تھے ۔ مگر چونکہ بغیر کتابت کے کسی قبیلہ کی تمام پشتوں کو ترتیب یاد رکھنا غیر ممکن تھا اسلئے بڑے بڑے جلیل القدر اور مشہور اشخاص کے نام تو ضرور یاد رہتے تھے ؛ باقی کے نام کچھ یاد رہتے تھے کچھ بھول جاتے تھے ۔ مشاہیر کے نام یاد رہنے کا ایک یہ بھی سبب تھا کہ ان کے نام اور ان کے کارنامے اشعار میں بیان ہوتے تھے اور بڑے بڑے معرکوں میں وہ اشعار پڑھے جاتے تھے ۔ ان وجوہات سے ہر شخص اپنے تئیں اور اپنے ہمسایہ اور مخالف کو بخوبی جانتا تھا کہ وہ کس قبیلہ اور کس نسل سے ہے اور کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ اپنی قوم اور نسل کو بدل سکے اور جھوٹ موٹ اپنے کو کسی دوسری نسل کا بتا سکے ۔ اگرچہ کسی کو کسی قبیلہ کی نسلیں بترتیب یاد نہ ہوں مگر ہر ایک قبیلہ میں جو نامور اور قابل فخر اشخاص ہوتے تھے وہ سب کو یاد رہتے تھے ۔ اسی لیے جب اسلام کے زمانہ میں کتابت اور تصنیف و تالیف کا رواج ہوا اور ایک مدت کے بعد مؤرخین نے کسی کا پورا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنا چاہا ان کو ایسی دقیقین پیش آئیں جن کا حل کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ نسب ناموں کے یہ ترتیب یاد نہ ہونے کے علاوہ دوسری مشکل یہ تھی کہ ایک ہی نام کے کئی کئی شخص نسب ناموں میں ہوتے تھے اور پھر ایک ہی شخص کے کئی کئی نام ہوتے تھے ۔ شام و عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ نسب نامہ کے اشخاص میں جو شخص مشہور و معروف ہوتا باپ کی جگہ اس کا نام لے دیتے تھے ؛ جیسا کہ انجیل متی میں حضرت عیسیٰ کی نسبت لکھا ہے کہ ”نسبہ عیسیٰ مسیح بن داؤد ابن ابراہیم“ حالانکہ مسیح سے داؤد تک اور داؤد سے ابراہیم تک بہت سی پشتیں درمیان تھیں ۔

اور اسی قربانی کے سبب بیت اللہ بنح کے نام سے پکارا جاتا تھا مٹا اور خانہ کعبہ نہایت قریب ہے اسلئے قربانی نذر کرنے کے لیے وہ مقام قرار دیا گیا تھا۔ بان ابراہیم و یعقوب و اسحق اور موسیٰ اور داؤد و سلیمان کی قربانی اور اسلام کی قربانی میں یہ فرق ہے کہ اس قربانی میں جانور کو مار کر اسکی لاش کو آگ میں جلا دیتے تھے اس خیال سے کہ خدا کو اسکی خوشبو یعنی چرائند پسند آتی تھی اور اسلام میں وہ قربانی غریب محتاج کو کون تو تقسیم کی جاتی ہے تاکہ وہ بھوک کی سختی سے محفوظ رہیں۔ اگر اسی امر کے سبب سرو لیم میور نے مٹا کی رسومات کو بت پرستی کی رسوم تصور کیا ہے تو کچھ افسوس کی بات نہیں کیونکہ ہر ذی عقل اس پہلی قربانی سے اس پچھلی قربانی کو نہایت عمدہ اور بہتر سمجھتا ہوگا۔

یہ خطبہ بہت لمبا ہے۔ اسکی اصل خوبی بغیر اسکے کہ اسکو اول سے آخر تک اصل کتاب میں دیکھا جائے معلوم نہیں ہو سکتی۔ امین سرو لیم میور کے شبہات کی تردید کرنے کے بعد خانہ کعبہ اور مکہ معظمہ کی تمام تاریخ تحقیقاتہ طور سے مفصل بیان کی گئی ہے۔

نوان خطبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب کی تحقیقات پر ہے۔ اس خطبہ کے لئے شاید تھا کہ سرو لیم میور نے اپنی کتاب میں آنحضرت صلعم کے بنی اسمعیل ہونے سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ”غالباً یہ کوشش کہ وہ (یعنی آنحضرت) اسمعیل کی نسل سے ثابت کیے جائیں انکی حیات میں پیدا ہو گئی تھی اور اس طرح پر محمد (صلعم) کے ابراہیمی نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے تھے اور اسمعیل و بنی اسرائیل کے بے شمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی ساپنچے میں ڈھلے گئے تھے“ سرو لیم میور کو نسب پر نکتہ چینی کرنے کی جرأت غالباً اس سبب ہوئی کہ آنحضرت کا نسب سیر کی کتابوں میں صرف عدنان تک مسلسل بیان ہوا ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے مگر عدنان کے بعد حضرت اسمعیل تک جتنی پشتیں اہل سیر نے لکھی ہیں ان میں اختلافات واقع ہوئے ہیں۔

خود معد بن عدنان کے زمانہ میں تھے اور نجات نصر کے ہنگامہ میں انھوں نے معد کو بچا یا تھا اور اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ یہ قوی قرینہ اس بات کا ہے کہ انکو معد کا نسب نامہ اسمعیل بن ابراہیم تک لکھنے کی ضرورت پڑی ہوگی اور اس نسب نامہ کو مسعودی اور واقفی دونوں نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے مگر اس نسب نامہ سے بھی اگر اُس میں آنحضرت سے عدنان تک جتنی پشتیں ہیں انکو شامل کر لیا جائے تو وہ زمانہ جو آنحضرت سے ابراہیم تک ہے پورا نہیں ہوتا۔

جو شجرہ الجوانے لکھا ہے وہ بھی اب تک ایک جدا نسب نامہ سمجھا جاتا تھا مگر سرسید نے نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ وہ جدا نسب نامہ نہیں ہے بلکہ برخیا کے نسب نامہ کا تتمہ ہے کیونکہ اُسکو تتمہ فرض کرنے کی صورت میں آنحضرت سے اسمعیل تک ستر پشتیں ہوتی ہیں جو فیصدی تین پشت کے سلسلہ قاعدہ کے موافق اُس زمانہ پر بالکل منطبق ہو جاتی ہیں جو اسمعیل کی ولادت اور آنحضرت کی ولادت کے درمیان گزرا ہے یعنی دو ہزار چار سو چہتر برس کا زمانہ۔

سرو لیم میور بطور طعن کے لکھتے ہیں کہ ”آنحضرت کا نسب نامہ عدنان تک خاص عرب کی علی روایتوں سے لیا گیا ہے اور عدنان سے آگے یہودیوں سے“ اسپر سرسید لکھتے ہیں کہ ”بہا شبہ اہل عرب بنی اسرائیل سے نہایت قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ وہ اسمعیل کی اولاد تھے اور بنی اسرائیل اسحق کی۔ وہ ان پڑھ جاہل تھے اور یہ لکھے پڑھے قابل۔ پس یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جس بات سے وہ ناواقف ہوں اپنے اسرائیلی بھائیوں سے اُسکو دریافت کریں یا جس بات کی تفصیل آنحضرت نے نہیں فرمائی اُسکا مفصل حال اپنے اسرائیلی بھائیوں سے پوچھیں خصوصاً اُس وجہ سے کہ آنحضرت نے بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت دی تھی“

”پس جب کہ مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے نسب نامہ لکھنے کا خیال ہوا۔ جسکا کبھی مذکور آنحضرت کی زندگی میں نہیں ہوا۔“

مگر چونکہ داؤد اور ابراہیم نہایت مشہور اشخاص تھے اس لیے مسیح کو داؤد کا اور داؤد کو ابراہیم کا بیٹا بتا دیا۔
 ”عرب کے لوگوں کی یہ بھی عادت تھی کہ اپنا کرسی نامہ بیان کرتے وقت جب آباؤ اجداد کے نام انکی یاد کے قوی
 ختم ہو جاتے تو اخیر یاد رہے ہوئے شخص کو اُس شخص کا بیٹا کہہ دیتے تھے جس سے وہ نسل چلی ہے۔ ان اسباب سے
 مؤرخوں کو ان کے نسب نامے سلسلہ وار لکھنے میں سخت مشکلات پیش آئیں۔“

”آنحضرت کا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنے والوں کو بھی یہی مشکلیں پیش آئیں۔ آپ کو اپنا کرسی نامہ بیان
 کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ ہم عرب کے لوگ یقیناً آپ کو قبیلہ قریش سے اور قریش کو معد بن عدنان کی
 اولاد میں اور عدنان کو قیدار بن اسماعیل ابن ابراہیم کی اولاد میں جانتے تھے اور اسی قدر اُفکا جانا آپ کے نبی اہل
 ہونے کے لیے کافی تھا؛ گو کہ درمیان میں کتنی ہی پشتیں گزری ہوں۔ اسی لیے کوئی صحیح روایت آپ کے
 نسب نامہ کے متعلق موجود نہیں ہے سوا اسکے کہ آپ نے فرمایا ”ابراہیم خلیل اللہ میرے باپ و میرے ولی ہیں“
 ”پس جب لوگوں نے آنحضرت کا نسب نامہ ترتیب لکھنا چاہا تو انہیں اختلاف ہونا ایک ضروری امر تھا۔
 آنحضرت سے لیکر معد بن عدنان تک کسی مؤرخ کا اختلاف نہیں ہے؛ جو کچھ اختلاف ہے وہ معد بن عدنان
 اسماعیل تک کی پشتوں میں ہے صرف پانچ شخص ہیں جن کے لکھے ہوئے نسب ناموں میں معد بن عدنان سے لیکر
 ابراہیم تک پشتوں کا بیان ہوا ہے۔“

اس کے بعد سرسید نے تین نسب ناموں کو غلط بتایا ہے؛ کیونکہ انہیں قطع نظر اختلافات کے
 بڑی خرابی یہ ہے کہ جو زمانہ عدنان اور ابراہیم کے درمیان گزرا ہے وہ تو یادس یا گیارہ پشتوں سے
 (یعنی فیصدی تین پشتوں کے مسئلہ قاعدہ کے موافق پورا نہیں ہوتا۔ اب دو نسب نامے باقی
 رہ گئے ایک برخیا کا تبار لوحی ارمیانی کا، دوسرا ابجرا کا۔ ارمیانی جیسا کہ بائبل سے ثابت ہے۔

تمام عرب اور یہود اور عرب کی قرب و جوار کی تمام قومیں اور تمام اگلے اور پچھلے مؤرخ خواہ عرب کے رہنے والے ہوں یا کسی اور ملک کے اور مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب کے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کرتے بلکہ بالکل تسلیم کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ بنی ہاشم - قریش - اسمعیل ابن ابراہیم کی اولاد میں ہیں۔ محمد رسول اللہ نے قریش کو پکار کر مخاطب کیا کہ ابراہیم جسکو سب نے تسلیم کیا اور کون ایسا شخص ہو کہ جہین اس قدر جرات ہو کہ وہ سچ بات کو تسلیم کرے۔

اسکے بعد ابوالفدا مسلمان مؤرخ اور سٹرگین اور ریورنڈ فاسٹر عیسائی مؤرخوں کی شہادتیں نقل کی ہیں جنہیں سے گبن کا قول یہ ہے کہ ”محمد (صلعم) کو حقیر اور مبتذل نسل سے کہنا عیسائیوں کا ایک احمقانہ افتراء ہے؛ ایسا افتراء کرنے سے بجائے اسکے کہ اس سے مخالفت کی خوبیوں کو گھٹائیں اُنکو اور زیادہ بڑھاتے ہیں اسمعیل سے اُنکی نسل کا ہونا ایک قومی تسلیم کی ہوئی بات اور ملکی روایت سے ثابت شدہ امر ہے۔ بالفرض اگر گرنسی نامہ کی پہلی نسلیں بخوبی معلوم نہ ہوں اور ابامین ہوں تو اور بہت پشتیں ایسی ہیں جو صاف صاف شریف و نجیب ہیں قریش اور بنی ہاشم ہیں جو اہل عرب میں نہایت نامی اور مکہ کے فرمانروا اور کعبہ کے موروثی محافظ تھے“ یہی برا مسلمان مؤرخ یعنی ابوالفدا کی ہے اور یہی گواہی ریورنڈ فاسٹر نے دی ہے۔

اسکے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ ”اب ہم اس خطبہ کے خاتمہ میں اپنے پیغمبر کا نسب مد جس طرح پر کہہ رہے تھے تحقیق کیا مندرج کرتے ہیں اور جو کہ مجھ کو بھی اس بات کا فخر حاصل ہے کہ میں بھی اُسی آفتابِ لبنان کے ذروں سے ہوں ایسے اپنے نسب کو بھی اسکے ساتھ شامل کر دیتا ہوں تاکہ جو روحانی ارتباط مجھ کو اُس سرورِ دو جہان سے ہے اور جو خون کا اتحاد مجھ میں اور اُس سرورِ عالم میں ہے اور جس کے سبب لَحْمًا لِحْمٰی وَ دَمًا دَخِی ہمارا موروثی خطاب ہے اس ظاہری ارتباط سے معزز ہو جائے“

”گرچہ شہرِ دیم نسبتے ست بزرگ ذرہ آفتاب تابا نیم“

تو بلاشبہ انھوں نے اپنے بنی اسرائیلی بھائیوں سے جو لکھے پڑھے تھے اور تاج نویسی اور نسب ناموں کی تحریر کا اُنکے ہاں رواج تھا۔ مدد لی“

اسکے بعد سرسید کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ”نہایت تعجب ہے کہ عیسائیوں نے کیوں اس امر کے ثابت کرنے میں بے فائدہ سعی کی ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے مذہب میں ایک تعلق ہے۔ اور کچھ پلٹ پلٹ پر مبنی ہے اور ازراہ معن ہماری نسبت کتے ہیں کہ ہم نے فلان فلان بائین یہودیوں سے لی ہیں۔ گویا وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام یہودیوں کے ہاں سے چرایا ہوا مذہب ہے اور جیسے کہ عیسائی مذہب یہود کا بالکل محتاج ہے اس طرح اسلام بھی مذہب یہود کا محتاج ہے۔ ہم نہایت خوشی سے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور جو مشابہت ان دونوں تباہی الہامی مذہبوں میں پائی جاتی ہے اُس سے انکار کرنے کے بجائے ہم اُسکو نہایت فخر سمجھتے ہیں۔ صرف ہم مسلمان ہی ہیں جو ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے نبی کے سچے پیرو ہیں۔ ہم ہی یقین کرتے ہیں کہ آدم و نوح اور ابراہیم و یعقوب و اسحاق و اسماعیل و موسیٰ و عیسیٰ اور محمد صلوات اللہ علیہم اجمعین سب کا ایک ہی دین تھا جیسا کہ ہمارے پیغمبر کو خدا نے فرمایا کہ ”قل یا اہل الکتاب دعوا الی کلمۃ سوا بیننا و بینکم ان لا نعبد الا اللہ“ ہم مسلمانوں کا فخر یہی ہے کہ ہم یہودیوں سے زیادہ موسیٰ و عیسیٰ کے اور عیسائیوں سے زیادہ عیسیٰ و روح اللہ کے پیرو ہیں جنھوں نے عیسیٰ و عیسیٰ اور محمد رسول اللہ کے مبعوث ہونے کی خبر دی تھی اور اُنکی پیروی کی ہدایت کی تھی۔ مگر یہودیوں نے اُن مینہ ان کو اور عیسائیوں نے اسے پچھلے کو جیسے پرانے کا خاتمہ ٹھاننا اور اُنکی سچی پیروی ہم مسلمانوں ہی نے کی“

اسکے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”آنحضرت کے نسب نامہ کی نسبت کیا یہودہ گفتگو عیسائیوں نے کی ہے! خدا کے اُس وعدہ کا پورا ہونا۔ جو اُس نے بنی اسرائیل سے موسیٰ کی زبانی کیا تھا کہ ”میں تمھارے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے موسیٰ کی مانند ایک نبی پیدا کروں گا“ کچھ اس بات پر منحصر تھا کہ بنی اسماعیل کی نسلیں محمد سے لیکر اسماعیل تک بہکوت ترقی دار اور پوری پوری یاد ہوں! اور نہ اس بات پر منحصر تھا کہ وہ کرسی نامہ ہم عرب کی ملکی روایتوں سے یاد کریں یا یہود کی روایتوں اور برخیا کی تحریروں سے لین! وہ اسماعیل کی اولاد میں سے ایک کے لیے ہونا تھا سو محمد رسول اللہ کی نسبت ہونا

مسلمہ مجموعہ عہد عتیق و عہد جدید میں موجود ہیں جسکو تمام یہودی اور عیسائی مانتے ہیں اس خطبہ میں بیان کی ہیں ۔

اسکے بعد انھوں نے وہ طریقہ جس طریقہ سے کہ بائبل میں پیشین گوئیوں آنے والے پیغمبر کی نسبت بیان ہوئی ہیں بتایا ہے اور لکھا ہے کہ انکا بیان بالکل ایسا ہی ہے جیسے پہلی یا مسمتے کا بیان ہوتا ہے ۔ جب تک انکی تشریح نہ کی جائے اور انکا حاصل نہ بتایا جائے انکا مطلب ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتا ۔ اسلئے پہلے اس سے کہ آنحضرت کی بشارتیں بیان کریں انھوں نے اول بطور مثال کے عہد عتیق کی وہ بشارتیں لکھی ہیں جنکو حواریوں نے حضرت عیسیٰ کے حق میں بتایا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بائبل میں پیشین گوئی کس طریقہ سے بیان کی جاتی ہے اور نیز حضرت عیسیٰ اور آنحضرت صلعم کی بشارتوں کے مقابلہ کرنے سے ظاہر ہو جائے کہ کونسی بشارت زیادہ روشن اور صاف ہیں اور کونسی مبہم اور دھندلی ۔

اسکے بعد انھوں نے چھ بشارتیں عہد عتیق سے اور تین بشارتیں عہد جدید سے آنحضرت صلعم کی نسبت بیان کی ہیں ۔ از انجملہ عہد عتیق کی تین بشارتیں جنہیں سے ایک توریت کتاب استنباب (۱۸) میں اور دوسری کتاب استنباب (۳۳) و کتاب حقوق نبی باب (۳) میں اور تیسری کتاب تسبیحات سلیمان باب (۵) میں مندرج ہے اور انجیل یوحنا باب (۱۴) میں سے ایک بشارت یہ چار بشارتیں نہایت معرکہ آرا ہیں ۔ جنکی یہودیوں اور عیسائیوں کو عجیب عجیب تاویلین کرنی پڑی ہیں اور عیسائیوں نے انکے ترجموں میں عجیب عجیب رشتانیان کی ہیں ۔ سرسید نے ان چاروں بشارتوں کی جیسے کہ چاہیے اُس سے بھی کچھ بڑھکر تحقیقات کی ۔

دسوان خطبہ اُن بشارتوں کے بیان میں ہے جو توریت اور انجیل میں آنحضرت صلم کے نبی ہونے کی بابت مذکور ہیں اس خطبہ میں اول سرسید نے قرآن مجید کی وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں اس بات کا بیان ہے کہ توریت و انجیل میں آپ کی نبوت کی خبریں دی گئی ہیں۔ اسکے بعد انھوں نے وہ وجوہات بیان کی ہیں جنکے سبب اکثر قدیم مسلمان عالموں نے انبیاء سابقین کی کتابوں کا پورا پورا اعتبار نہیں کیا اور ایسے انھوں نے توریت و انجیل میں اُن بشارتوں کی زیادہ تفتیش نہیں کی اور تحریف کا عذر پیش کر کے اُن بشارتوں کے نشان دینے سے جنکی قرآن میں جا بجا خبر دی گئی تھی دست بردار ہو گئے۔ پھر اُن محققین کا ذکر کیا ہے جنھوں نے نہایت کوشش و استقلال سے اُنکی تفتیش کی اور توریت و انجیل میں بہت سے ایسے مقامات دریافت کیے جہاں آنحضرت کے نبی ہونے کی بشارتیں موجود تھیں۔ مگر چونکہ اُنکی نشان دی ہوئیں بشارتیں جو ہماری مذہبی کتابوں اور تفسیرین اور سیر و توارخ میں مذکور ہیں اُنکی بابت کچھ بتا نہیں دیا گیا کہ وہ بائبل کی کون سی

اور کون سے باب اور کون سے درسوں میں بیان ہوئے ہیں اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ قلمی قدیم نسخے جن میں اکثر سے اختلاف عبارت تھا اور جنکے جدا جدا نام تھے انہیں سے کون سے نسخہ میں وہ بشارتیں پائی گئیں اور نہ یہ بتایا گیا کہ بائبل کی بہت سی کتابیں جو اب مفقود ہیں یا جن کو عیسائی اب نامعتبر سمجھتے ہیں وہ بشارتیں انہیں سے لی گئی ہیں یا موجودہ مسلمہ کتابوں میں سے۔ اسلئے

صرف چند بشارتیں جو آنحضرت کے حق میں نہایت صراحت کے ساتھ صادق آتی ہیں اور جو موجودہ

سہ انہیں سے اکثر بشارتیں سرسید سے پہلے ہمارے زمانہ کے بعض علمائے مسلمہ مجوزہ بائبل سے مجوزہ باب اور درس کے نقل کی ہیں

مگر جس عمدگی کے ساتھ خطبات میں انکا بیان ہوا ہے ویسا کسی نے بیان نہیں کیا ۱۲

بیٹھے ہوئے پرندوں کو اڑا دینا، اپنی رضاعی بہن کی پیٹھ میں کاٹ کھانا، مرنے سے حدیبیہ کو جاتے وقت اپنی ماں کی قبر پر رونا۔ اس پر سرسید لکھتے ہیں کہ ”اگرچہ ان باتوں کی کوئی معبرند نہیں ہے لیکن اگر یہ سب باتیں تسلیم بھی کر لی جائیں تو یہ ایسی باتیں ہیں جو ایام طفولیت میں انسانی فطرت کے موافق ہمیشہ ہوا کرتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ خدائے اور نہ خدا کے بیٹے انھوں نے آپ کو صرف یہ کہا تھا کہ ”إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ“ پس ایسی باتیں اگر ہوئیں بھی تو انسانی فطرت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتیں۔“

یامثلًا سرولیم میور بارہ برس کی عمر میں آنحضرت کے سفر شام کا حال ابوطالب کے ہمراہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ”زمانہ سابق کے منہدم اور اُجڑے ہوئے مقاموں نے جنکو خیالی قصوں اور عجیب غریب بیانون اور دل انگیز روایتوں نے اُور بھی پُر اثر کر دیا تھا اور گرجاؤں کی صلیبوں اور مورتوں اور دینی تون سے آراستہ ہونے اور گھنٹوں کے بجنے کی قومی رسموں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے غرض کنندہ دل و دماغ پر گہرا نقش اور پائدار اثر کر دیا تھا“

سرسید اول تو سفر شام میں چچا کے ساتھ آنحضرت کے جانے کی روایت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے اور اس کے بعد بر تقدیر تسلیم لکھتے ہیں کہ ”ہم نہایت ادب سے سرولیم میور سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایک مصرع شخص (جیسا کہ سرولیم میور نے آنحضرت کی نسبت لکھا ہے) کا دل و دماغ ایسا اثر قبول کر سکتا ہے؟ اور کیا ایک مصرع شخص غرض کنندہ دل و دماغ رکھتا ہے؟ اگرچہ یہ بیان سرولیم میور کا نہایت دلچسپ مگر فاسوس کا یہ ہم

اس بیان سے متعلق نہیں کر سکتے: کیونکہ اسی رد کے لئے جملہ دلائل صلیبیت اور مورتوں اور غرض کنندہ دل و دماغ سے اس خدا ترن پر ہوا تھا۔ بعد کو انہیں چیزوں سے مخالفت اختیار کی: صلیب کو توڑنا، مورتوں کو پھوڑنا، ہنگامی پیشکش سے منع کیا اور بتایا کہ خدا کا کوئی میا نہیں، تثلیث کے جذبہ کو جھٹلایا، خدا کو وحدہ شکیبہ بتوایا

بڑے بڑے عیسائی محققوں کے اقوال اور بائبل کے حوالوں سے اپنے استدلال کو تقویت دی ہے اور اپنے بیان کو فی الواقع اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ کسی عیسائی کو باوجود ماننے عیسے مسیح کی پیشین گوئیوں کے آنحضرت کی پیشین گوئیوں سے انکار کرنے کا محل باقی نہیں رہا۔

گیارھویں خطبہ میں معراج اور شق صدر کی حقیقت متفقانہ طور سے بیان کی ہے اور اس باب جس قدر مختلف اور متناقض روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں انکا اختلاف اور تناقض دکھایا ہے اور اسلئے جس قدر کہ قرآن مجید میں معراج کی نسبت بیان ہوا ہے صرف اسی پر معراج کے واقعہ کا انحصار رکھا ہے اور معراج کو روایہ پر محمول کیا ہے جسکا ایک جزو شق صدر بھی تھا اور عیسائیوں کی طعن کا جواب الزامی اور تحقیقی دونوں طرح کا دیا ہے۔

مگر یہ دونو بحثیں یعنی معراج اور شق صدر کی سرسید نے خطبات لکھنے کے بہت بعد اپنی تفسیر میں بہت زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کی ہیں جیسی کہ انسے پہلے شاید کسی نے نہیں بیان کیں اسلئے ان دونو بحثوں کو تفسیر میں دیکھنا چاہیے۔

بارہویں خطبہ میں آنحضرت صلعم کی ولادت سے بارہ برس کی عمر تک کا حال جس قدر کہ معتبر

اصحیح روایتوں سے ثابت ہوتا ہے بیان کیا ہے اور جو بے شمار طب و یا بس روایتیں اہل سیر نے اپنی

کتابوں میں بحدیث اور جنگی رو سے سرولیم میونس نے اپنی کتاب میں جا بجا تعریفیں کی ہیں انکی تضعیف کی ہے اور اکثر جگہ بر تقدیر رائی صحت کے نہایت لطیف جواب سرولیم میونس کی تقریرات کے دیے ہیں۔ مثلاً سرولیم میونس نے جو بارہ برس تک کے بعض واقعات تعریف کیا ہیں جیسے

بیموئی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ آنحضرت کا کھیل کود میں مصروف رہنا، اپنے مکان کی چھت پر

گیارھویں خطبہ

بارہویں خطبہ

محبت کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ یہ کتاب زیادہ تر مالی مشکلات کے سبب سرسید کے ارادہ کے موافق پوری نہ ہو سکی۔ اُنکا ارادہ سرولیم میور کی چاروں جلدوں کا جواب لکھنے کا تھا جس میں سے صرف ایک جلد لکھنے پائے تھے کہ ولایت میں ٹھہرنا ناممکن ہو گیا اور ہندوستان میں پہنچ کر کچھ سوچتے کہ یہاں اگر وہ کلج کی فکر میں مصروف ہو گئے اور زیادہ تر اس سبب کہ جو کتابیں ہندوستان میں آسانی سے آسکتی تھیں اُنکا ہندوستان میں کہیں وجود نہ تھا۔ وہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ مگر جو حشیم میور کی کتاب میں زیادہ اہم تھے انہیں سے چند کے سوا سب کا تفصیلی یا اجمالی جواب اب سی ایک جلد میں آ گیا ہے؛ کیونکہ جس اصول پر سرولیم میور نے اپنی تمام اعتراضات کی بنیاد قائم کی ہے خطبات احمدیہ میں اُسکی جڑ کاٹ دی گئی ہے اور نہایت واضح طور پر جہاد یا گیا ہے کہ اسلام پر پختہ نہیں کا کوئی اعتراض سو وقت تک وارد نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ قرآن یا اُن حدیثوں کی سند پر۔ جو اصول علم حدیث کے موافق واجب التسليم قرار پائیں۔ بنی نہو۔ اور اس قاعدہ سے وہ اعتراضات بکلم ساقط ہو جاتے ہیں جو عام تاریخ و سیر کی کتابوں یا اجتہاد فقہاء یا اقوال علماء و آراء مفسرین کی رو سے مذہب اسلام پر ایراد کے جاتے ہیں۔

جس وقت سرسید نے خطبات احمدیہ لکھی ہے اُس وقت تک مذہبی تحقیقات کے متعلق انہیں یہ آزادی پیدا نہیں ہوئی تھی جیسی تفسیر القرآن میں دیکھی جاتی ہے اور اس لیے خطبات احمدیہ میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جس کو اسلام کے اصول متعارفہ کے خلاف سمجھا جائے۔ البتہ وہ ایک جگہ کسی قدر انھوں نے جمہور کے خلاف لکھا ہے جیسا کہ علمای محققین نے صد ہا مسائل میں جمہور سے اختلاف کیا ہے مثلاً معراج کے مضمون کو۔ جیسا کہ بعض صحابہ کا مذہب ہے۔ رویا پر محمول کیا ہے

اور اسی کی عبادت کا دعوٰ کیا اور تمام دنیا میں اسی کو رواج دیا۔“

”لیکن اس بات کو تسلیم کر کے کہ درحقیقت مذکورہ بالا چیزوں نے اس لڑکے کے دل پر اثر کیا تھا ایک اور خیال خود بخود دل میں آتا ہے؛ اور وہ یہ ہے کہ ایسا لڑکا۔ جس کے ابتدائی چار برس ایک صحرا میں گئے تھے اور پھر آٹھ برس تک مُشرک اور بت پرست لوگوں میں گھرا رہا۔ صرف بارہ برس کی عمر میں ایک ایسا دل رکھتا تھا کہ ہر چیز سے۔ جو اُسکی نظر سے گذرتی تھی، پرانی منہدم عمارتوں کے آثار سے، گرجاؤں، صلیبوں، مورتوں اور علامات دین عیسوی کے دیکھنے سے۔ ایک گہرا اثر قبول کرنے کے قابل تھا اور اس قدر عقل و فہم دُکا سے آراستہ تھا کہ ان چیزوں کے اُنکے برخلاف ایسے کامل نتائج اور معبود غیر ظاہر اور بقا سے روح انسانی کے بارہ میں ایسے ایسے عالی خیالات مستنبط کر سکا۔ وہ بلاشبہ درزا و پیغمبرِ حق تھا جسکی فطرت خود اسکی معلّم تھی اور وہ وہی تھا جسکی نسبت خود عیسیٰ نے یہ کمکرِ بشارت دی ہے کہ ”سچ تو یہ ہے کہ میرا چلا جانا تمہارے لیے ضرور ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو قافّٰ یعنی احمد مجھے تمہارے پاس نہیں آویگا اور اگر میں چلا جاؤں تو اُسکو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔“

اس خطبہ میں بمقابلہِ سرّیم میور کی تعریضات کے اور بہت سے لطیف مباحث ہیں جنکو خطبات احمدیہ میں دیکھنا چاہیے۔

یہ جو کچھ ہنر خطبات احمدیہ میں سے ناظرین کے سامنے پیش کیا ہے اسکو ایک بہت بڑے حوض یا تالاب میں سے چلّو دو چلّو پانی سمجھنا چاہیے۔ اس کتاب کی خوبی اور جو کچھ کمات میں لکھا گیا ہے اُسکی حقیقت جب تک کہ اصل کتاب کو نہ دیکھا جائے ہرگز معلوم نہیں ہو سکتی خصوصاً اُردو خطبات جو سرّید نے ولایت سے آکر بہت مدت کے بعد لکھی ہے اور جس میں بہ نسبت انگریزی ترجمہ کے ہر ایک بات زیادہ وسعت کے ساتھ لکھی ہے اُس سے مصنف کی محنت۔ لیاقت۔ اور اسلام کی

اختلاف کے ایک نوع کا اتحاد بھی رکھتے ہیں۔ ہوتا چلا ہے؛ گو ہم پہلے ہی سے یمنین کہہ سکتے کہ یہ خیالات کا مبادلہ زمانہ
 آئندہ میں کمان تک جاری رہیگا یا اس سے کیا کیا نتیجے پیدا ہوں گے۔ لیکن بہر حال ہم سید احمد کو۔ جو اپنے ملک میں
 رفاہ عام کے سرگرم کار گزار اور اپنے مذہب کی اُرگر حمایت کرنے والے ہیں۔ و نگہ کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی مذہبی
 تحریریں ہمارے سامنے پیش کی ہیں۔ مسلمانوں کو بلاشبہ اس بات کا حق ہے کہ انجیل کی تفسیر کے متعلق جو کچھ وہ
 کہیں اُسکی سماعت کیجائی؛ خصوصاً اس وجہ سے کہ شاید وہ روایات کے نئے ذریعے ہم پر ظاہر کریں۔ سائنسک
 مذہب کا فرض ہے کہ وہ کسی شہادت کے سُنے سے جو اُسکول سکے انکار نہ کرے؛ مگر مصنف کو اس سے زیادہ
 ہم سے توقع رکھنی نہیں چاہیے کہ ہم اُسے خیالات سے ایک حد تک تفاق کریں گے۔“

اس سے آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ ”محمد (صلعم) جیسے شخص کے کیرکٹر معلوم کرنے کے لیے ایک ایسی
 سائیکولوجی کا جو تاریخ کے ذریعے سے منکشف ہوئی ہے ایک سخت دشوار اور دقیق مسئلہ حل کرنا پڑتا ہے۔ میور
 اور اسپرنگر نے زمانہ حال کی نکتہ چینی کا طریقہ۔ جسکو مشرعی عیسائی (اپنے مذہب کی نسبت) ناپسند کرتے ہیں۔
 اسلام کی اصل و اُسکی ترقی کے حالات دریافت کرنے میں برتا ہے؛ اور بار تھیلی سینٹ ہلیر نے ہمارے سامنے
 ایک مفصل تاریخی تصویر پیش کی ہے۔ ہم عام طور پر یہ ظاہر کر سکتے ہیں کہ ہم نے محمد (صلعم) کی تعریف اور عزت
 دل میں رکھنی سیکھ لی ہے؛ لیکن ہم میں ایسے کم ہیں جو کبھی قرآن کو پڑھتے ہوں۔ یہاں تک کہ سبیل نے
 جو ابتدائی بحث اس کتاب (یعنی قرآن) کی نسبت کی ہے اُسکو بھی نہیں پڑھتے؛ اور اُنہی بھی کم وہ لوگ ہیں
 جو اسلام کو کیا بلحاظ ملکی اور کیا بلحاظ مذہبی قوت کے ایک ایسی زندہ طاقت سمجھتے ہوئے ہیں جو اپنی موجودہ یا کسی تبدیل شدہ
 حالت میں آنے والی صدیوں میں حکمران طاقتوں میں سے ایک طاقت شمار ہوگی۔“

۱۔ یہ اشارہ ہر خطبات احمدیہ کے ان بیانات کی طرف جہاں سرسید گھبراہٹ میں عیسائی مفسرین کی سند اور کتب و لائبریری کے منجمل کے منجمل جیسا کہ یورپ میں بیان کیے ہیں ۱۱

اور شق صدر اور براق کی سواری کو اسی رویہ میں داخل کیا ہے یا اور ایک آدھ بات اسی قبیل کی
 جمہور کے خلاف بیان کی ہے۔ لیکن اس سے اصول اسلام کی مخالفت لازم نہیں آتی۔ تعجب ہی
 کہ سرولیم میور نے جیسا کہ سرسید کی زبانی سنا گیا ہے۔ جس وقت خطبات احمدیہ کو پہلی مرتبہ دیکھا تو یہ
 کہا کہ ”میں نے سید احمد کے اسلام پر اعتراض نہیں کیے بلکہ اُس اسلام پر اعتراض کیے ہیں جسکو تمام دنیا کے مسلمان
 مانتے چلے آئے ہیں“ یہ بعینہ ایسی ہی بات ہے کہ ایک تیر انداز کسی گروہ کو نہتا سمجھ کر اُس پر تبریر سنانے
 شروع کرے اور جب اُدھر سے بھی خلاف توقع تیر آنے لگیں تو یہ کہے کہ میرا مقابلہ نہتوں سے ہے
 تیر اندازوں سے نہیں ہے۔ سرولیم میور نے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ایک نئے طریقہ سے نکلتے چھٹی
 کی تھی اور چونکہ مسلمانوں نے اس قسم کے اعتراض پہلے عیسائیوں سے بہت کم سنے تھے۔ اس لیے
 سرولیم میور کو یقین تھا کہ کوئی مسلمان میرے اعتراضوں کا جواب نہیں دے سکیگا مگر جب انھوں نے
 دیکھا کہ جس قسم کے آلات انھوں نے اسلام کے برخلاف استعمال کیے تھے اُسی قسم کے آلات اسلام کی
 حمایت میں ایسے طور پر استعمال کیے گئے ہیں جسکی اُنکو بالکل توقع نہ تھی تو مذکورہ بالا الفاظ اُنکی
 زبان سے نکلے جنکا یہ معنی ہیں کہ میں نے تو اسلام کو نہتا سمجھ کر اُس پر حملہ کیا تھا۔

انگلستان کے اخبار ”انکوائر“ مورخہ ۱۱۔ مئی ۱۸۹۷ء میں۔ جبکہ سرسید کو ولایت سر
 ہندوستان میں آئے ہوئے دو برس گزر چکے تھے۔ کسی آزاد خیال انگریز نے خطبات احمدیہ پر ایک
 مفصل ریویو چھپوایا تھا۔ اُسکے چند وچپ فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

وہ لکھتا ہے کہ ”ہمیں اس کتاب کے مضامین کو خوشی سے لینا چاہیے کیونکہ وہ مسلمانوں کی طرف سے لازم
 پہلے پہل ہیں اُس مہادہ خیالات اور فیلنگز کے جو مشرق اور مغرب میں اُن مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں۔ جو باوجود

(یعنی عیسائی مذہب) کو عطا کیے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ عیسائی قومیں کافی طور پر شکر گزار ہونگی ان فوائد میں سے ہر ایک فائدہ کے لیے اور سب فوائد میں کے لیے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہ فوائد مشکل سے کافی بیان ہیں اس زبردست تحریک کا جو یورپ میں انڈلس کے مسلمانوں سے پیدا ہوئی اور جو فن تعمیر، شاعری، معاشرت اور آداب سب پر حاوی ہے۔“

اس کے بعد نوین خطبہ کے متعلق جیمین آنحضرت صلعم کا نسب بیان کیا گیا ہوا اول سرسید کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ ”عدنان تک۔ جو کہ پیغمبر خدا صلعم کے نسب نامہ میں اتنا لیسواں ہے۔ مطلقاً عربی روایات سے لیا گیا ہے اور عدنان سے اوپر یہودی تاریخ سے لیا گیا ہے۔ ہیکو بہت تعجب ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے عیسائی مصنفوں نے اپنا وقت ضایع کیا اور بے فائدہ دماغ صرف کیا اس بے فائدہ تلاش میں کہ اسلام اور یہودی مذہب میں تعلق ہے حالانکہ کسی مسلمان نے اس سے انکار کرنے کا خیال تک نہیں کیا۔ عیسائیوں کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے طنز کے ساتھ ہلکا الزام لگایا کہ تم نے یہ چیز یہودیوں سے لی اور وہ چیز ان کے ہاں سے چرائی۔ گویا اسلام کوئی بنیاد نہیں رکھتا جیسو وہ قائم ہو بلکہ بالکل عیسوی اور یہودی دین پر منحصر ہے۔ ہم مسلمانوں کو دونوں الہامی مذہبوں سے انکار کرنا تو کیسا ہم تو اپنی سب سے بڑی عزت سمجھتے ہیں کہ اگر ہم سچے اور ایماندار پیر وہیں ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر کے“ اسپر لوئیو لگا لکھتا ہے کہ ”آخر کے جملہ کو ہم نے متنازعہ فون میں لکھا ہے کیونکہ وہ توجہ کے قابل ہے اور اس قابل ہے کہ یاد رکھا جائے۔ ہیکو یقین ہے کہ اس جملہ کے الفاظ ایسے ہیں جو کم سے کم اسلام کی اصولی تعلیم پر مبنی ہیں اور اس میں تو شک ہی نہیں کہ وہ مصنف کے نزدیک مسلم ہیں۔ یہ الفاظ ہم کو ایک شریف قول معلوم ہوتے ہیں اور ایسے ہیں جو بالکل تسلیم کیے جانے کے قابل ہیں۔ انہی فی الحقیقت

سر سید نے جس خطبہ میں آنحضرت (صلعم) کی نسبت بائبل کی پیشین گوئیاں بیان کیں ہیں اُس کے متعلق فاران اور فارقلیط کی پیشین گوئی کا ذکر کر کے لکھتا ہے کہ ”سید احمد بار بار اس بات پر اطمینان ظاہر کرتے ہیں کہ اُن کے دلائل اسی درجہ کے ہیں جیسے کہ عیسائی عموماً استعمال کرتے ہیں +++ اگر وہ ہلکے اپنے دلائل کا یقین دلانا چاہتے ہیں تو اُن کو چاہیے کہ عیسائیوں کی طرح صرف عمدہ ہی نہیں بلکہ عمدہ ترین دلیلیں ہمارے سامنے پیش کریں۔ اُنھوں نے اپنے دو دشمنوں کو ایک کر دیا ہے: وہ خیال کرتے ہیں کہ عیسائی مذہب ہی اُن پر حملہ کر رہا ہے حالانکہ اُس کے ساتھ ہی آج کل کی نکتہ چینی کا طریقہ اُن کے ذہن کے ساتھ بھی ویسا ہی برتاؤ کر رہا ہے جیسا کہ وہ اُن پر مذہبوں کے ساتھ جنمیں کر رہی اُس کو منظور ہوتی ہے۔ کرتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ سید احمد میسور اور اسپرنگر جیسے لوگوں کے مقابلہ میں اپنی جگہ پر قائم رہنا بخوبی جانتے ہیں“

اُس کے بعد چوتھے خطبہ کے اُس مقل بیان پر جو سر سید نے تعدد ازواج کی بحث میں لکھا ہے کہتا ہے کہ ”فی الواقع یہ مضمون مصنف کو بہت عزت دیتا ہے کہ وہ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ پوسگی (یعنی تعدد ازواج) مضر نہیں ہے۔ اپنے اونٹ کو سوئی کے تاکے سے نکال بیگیا ہے؛ گو اُسے اس کی جرات نہیں کی کہ اُس کو حقیقی فوائد میں سے شمار کرتا۔ بہر حال ایسے مضمون پر اگر ہلکے سید احمد سے اتفاق بھی ہو تو ہم اُس کو ظاہر کرینگے کیونکہ ہلکے اس موقع پر ایک خوشگوار سکوت ہی کو ترجیح دینی چاہیے“ پھر اسی خطبہ کے متعلق اُس بیان پر جس میں سر سید نے ثابت کیا ہے کہ اسلام عیسائیوں کے لیے رحمت تھا کہتا ہے کہ ”ہم دیکھتے ہیں کہ ہیئت اور طب یہ دونوں علم اور پرنسٹنٹ اور یونیورسٹی میں یہ دونوں مذہب اُن فوائد میں سے ہیں جو اسلام نے کر سچینی

نے جو نگہ رویوں کا ایک راہ خیال آدمی ہے ایسے وہ جس طرح عیسائیوں کی پیشین گوئیوں کو تسلیم نہیں کرتا اسی طرح مسلمانوں کی پیشین گوئیوں کو نہیں مانتا اور اثبات نبوت کے لیے ایسی دلیلوں کو کافی نہیں سمجھتا ۱۲

۱۳ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سوسائٹی کے خوف سے اپنا عہد یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا اور نہ سر سید کے استدلال کو دل میں مان گیا ہو ۱۴

ہندوستان میں آکر ان لوگوں کے لیے جنگو مشنریوں سے مذہبی گفتگو کرنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ پانسو روپیہ خرچ کر کے اُسکا اُردو ترجمہ بھی جو حمایت الاسلام کے نام سے مشہور ہے شائع کر دیا۔

اگرچہ یہ مضمون بقدر ضرورت خطبات احمدیہ میں لکھا جا چکا تھا مگر ولایت سے آنے کے بعد سرسید نے اس مضمون پر ایک مستقل رسالہ لکھ کر اول تہذیب الاخلاق کے متعدد پرچوں میں شائع کیا اور پھر اُسکو علیحدہ کتاب کی شکل میں چھپوایا۔ ہمارے علما جنہوں نے اُن اعتراضوں اور طعنوں سے کان بند کر رکھے ہیں جو یورپ کی قومیں اسلام اور اہل اسلام پر کرتی ہیں اُنکو تو آج تک یہ بھی احساس نہیں کہ بردہ فروشی کا دستور جو عرب اور افریقہ میں جاری ہے یا سہین کیا بُرائی ہے اور وہ اصول اسلام کے موافق صحیح ہے یا نہیں؟ اُنکے نزدیک حمیت اسلامی اسی کا نام ہے کہ جو شخص اسلام پر اعتراض کرے اگر قدرت ہو تو اُسکا مونہ بند کر دین ورنہ اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ مگر جو لوگ اس قسم کے مطاعن کتابوں اور اخباروں میں دن رات دیکھتے اور پڑھتے ہیں اور جنگو معلوم ہے کہ یہ مطاعن مسلمانوں کی نئی پود پر جو دنیا کے حالات سے روز بروز زیادہ باخبر ہوتی جاتی ہے۔ کیا اثر کرتے ہیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ اگر معترضین کی غلط فہمیوں کو اسوقت رفع نہ کیا جائے تو ہماری نسلیں۔ جو ہمارے بعد اسلام کی وارث ہونیوالی ہیں۔ وہ اسلام کو کس نگاہ سے دیکھیں گی اور تمام عیسائی قوموں میں اور خاص کر انگریزوں کی قوم میں جو ہندوستان کے مسلمانوں پر حکمران ہیں۔

اکتھوٹی کے سچے اصول کی مہر ہے۔ فی الواقع اگر کوئی جامع اصول مختلف مذہبوں میں مصاحمت پیدا کر سکتا ہے تو وہ صرف یہی اصول ہوگا۔ شاید ہم سید احمد کو بغیر ناراض کیے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ مکی یا عربی کی تھولک ہے۔ بہر حال انھوں نے تریچر کلام میدان ہونیکا حق بخوبی ثابت کر دیا ہے +++ اور انکے مضامین کو وہ لوگ توجہ سے پڑھینگے جنکو اس سبک میں دیکھی حاصل ہو چکی ہے اور جو ہمیں زیادہ معلومات حاصل کرنیکی تلاش میں ہیں لندن ہی میں سرسید نے جان دیون پورٹ کی کتاب ”اپالوجی فور محمد اینڈ قرآن“ کو جو انھوں نے عیسائیوں کے برخلاف اسلام کی حمایت میں لکھی تھی خود اپنے روپیہ سے چھپوایا۔ سرسید کے خطوط سے جو سید ممدی علی خان کے نام میں معلوم ہوتا ہے کہ لندن کا کوئی پبلشر اس کتاب کے چھاپنے کی ہامی نہیں بھرتا تھا اور خود مصنف کو استعداد استطاعت نہ تھی کہ اپنے روپیہ سے اسکو چھپوا کر شائع کر دے۔ سرسید نے وہاں پہنچکر جب اس کتاب کے مضامین نے تو انھوں نے فوراً اپنے پاس سے روپیہ کی تدبیر کر کے وہ کتاب جھٹ پٹ چھپوا دی اور اسلی کئی سو جلدیں ہندوستان بھجوا دیں۔ یہاں اسکا ایک اردو ترجمہ مولوی عنایت الرحمن خان صاحب ملوی نے اور دوسرا مولوی ابوحسن نے کیا اور دونوں ترجمے چھپکر شائع ہو گئے۔

آپ کا پتہ پورٹ
آپ کا پتہ پورٹ

انگلستان کے ایک ورزی وقت مصنف گاڈفری گنٹر کی کتاب جو کسی زمانہ میں مصنف مذکور نے اسلام کی تائید میں لکھی تھی اور اب نایاب ہو گئی تھی ایک جرمن کتاب فروش کی مشہودکان سے۔ جہاں ہرزبان کی پرانی اور نایاب کتابیں بکتی ہیں۔ سرسید نے دس گنی قیمت پر لندن میں خریدی۔ اصل مطلب اسکے خریدنے سے یہ تھا کہ خطبات احمدیہ کی تصنیف میں اس سے مدد لی جائے مگر انھوں نے

گاڈفری گنٹر کی
کتاب کا ترجمہ کرنا

لے اکتھوٹی ایک لفظ مشترک بہت سے معنوں میں آتا ہے جن میں سے ایک معنی مذہبی فرائض کو ملکی یا بے تعصبی اور ناظر فداری کے ہیں ۱۲

سر سید اپنے ایک آرٹیکل میں۔ جو رسالہ ابطال غلامی کے علاوہ انھوں نے اسی
مضمون پر لکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ”ولیم ہوردرسل صاحب جو نہایت نامی گرامی ہیں۔ اپنے
روزنامہ میں اسماعیل پاشا خدیو مصر کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ”اُسے اس نیکی کے
حاصل کرنے اور رسم بد کے موقوف کرنے میں بڑی کوشش کی ہے اور کسی قدر کامیاب بھی ہوا ہے۔“
اس کے بعد سر سید کہتے ہیں کہ ”اگرچہ مسٹر رسل کی کتاب پڑھ کر ہمارا دل خوش ہوا مگر جس لفظ نے ہمارے
دل کو رنجیدہ کیا اُس کا بیان کرنا بھی ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں انھوں نے اسماعیل پاشا کے اس نیک
کام کی تعریف ہو وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ اُسے برخلاف اپنے مذہب ایمان کے یہ نیک کام کیا ہے اس تحریر
پر ہم کچھ مسٹر رسل سے ناراض نہیں ہوئے انھوں نے ٹھیک لکھا ہے مگر اُن کافر مسلمانوں سے ناراض
ہوئے جنھوں نے اپنے افعال نا شایستہ کو ایسے طور پر رواج دیا ہے جس کے سبب غیر توہین اُن افعال کو
مذہبی اور ایمانی افعال سمجھتی ہیں اور مذہب اسلام کو حقارت دیکھتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ تعذیب اور
شدت کی اور انسانیت مذہب اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔“

اگرچہ مسلمان سلطنتوں میں سلطان عبد المجید خان اور اسماعیل پاشا خدیو مصر کے
وقت سے بردہ فروشی کا انسداد محض بطور مصلحت ملکی کے ہونے لگا مگر ۱۸۸۹ء تک یہاں بھی
کسی مسلمان عالم کو یہ خیال نہیں آیا کہ عیسائی۔ جو بردہ فروشی کے نالائق طریقہ کو دین اسلام
کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس غلط فہمی کو رفع کیا جائے۔ حالانکہ ترکی، مصر اور افریقہ کے دیگر
ممالک اسلامیہ کے علما کا سب سے مقدم فرض تھا کہ وہ اسلام پر سے اس الزام کو رفع کرتے؛ کیونکہ دنیا میں
کوئی مرکز بردہ فروشی کا اب سوا افریقہ کے سوا باقی نہیں رہا تھا جہاں ایک مدت سے سلاطین یورپ

مذہب اسلام کس نظر سے دیکھا جائیگا ۔

انھیں مطاعن مین سے ایک طعن جو از استرقاق یعنی لونڈی غلام بنانے کا ہے جو عیسائی قومین مذہب اسلام پر ایسے کرتی ہیں کہ نصف صدی سے مسلمانوں کے سوا اور کسی قوم مین یہ دستور باقی نہیں رہا۔ اگرچہ اٹھارویں صدی تک جو غلاموں کی حالت زار یورپ اور امریکا مین تھی اُس بے رحمی اور سنگدلی کی سنین اسلام مین کہیں نظیر نہیں پائی جاتی چنانچہ فرانس کے مشہور محقق ڈاکٹر لی بان نے۔ جیس کا ترجمہ تفتیق یک نے اپنے رسالہ مین نقل کیا ہے اپنی کتاب تہذیب عرب مین اُن بی رحمیوں کا بیان کر نیکی بعد جو عیسائی قومین غلاموں پر کرنی تھیں۔ صاف اقرار کیا ہے کہ ”حق بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی غلامی بالکل اس غلامی کے برعکس ہے جو عیسائیوں مین جاری تھی“ لیکن اسی بی رحمی کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ نیکدل لوگوں کو غلاموں کی حالت پر رحم آیا اور وہ اُنکی حمایت کے لیے کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ غلامی کا نام و نشان تک یورپ اور امریکا سے مٹا دیا گیا۔ پس اس سے زیادہ اور کیا افسوس کی بات ہو سکتی ہے کہ جو قومین غلاموں پر ایسی بی رحم تھیں اور جنکے مذہب مین کوئی خاص رعایت غلاموں کے ساتھ نہیں کی گئی وہ تو تمام دنیا مین غلامی اور بردہ فروشی کا انسداد کرتی پھرتی ہیں اور مسلمان جنکے مذہب نے تمام دنیا کے مذاہب سے بڑھکر غلاموں کی حمایت کی اور اگر سچ پوچھیے تو گویا غلامی کو بالکل معدوم کر دیا وہی تمام دنیا مین بردہ فروشی کے ناجائز و ناشایستہ رواج مین سب سے زیادہ بدنام ہیں اور انھیں کے مذہب پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ نوع انسان کا دشمن اور ظلم و بی رحمی کا سرچشمہ ہے ۔

تھاری جانب ہو۔“ اسی طرح فرانس کے آٹھ بڑے بڑے مشاہیر نے رسالہ مذکور کی نہایت تعریف اور اس کے لکھنے پر مبارکباد لکھی۔ خصوصاً موسیو بوبکار انسپکٹر چینی نہرویس نے لکھا کہ ”میں نہایت قدر کرتا ہوں تمہارے اس کام کی جو تینے اپنے مذہب اور اپنے ملک کی حمایت کے لیے کیا ہو اور کیا اچھا ہو اگر فرانس کا ہر فرد اسی طرح اپنے مذہب اور اپنے ملک کی حمایت کے لیے کھڑا ہو“ رستم پاشا سفیر سلطانی جو اُس وقت لندن میں تھے انھوں نے رسالہ مذکور کی رسید میں نہایت شکریہ کے بعد مصنف کو لکھا کہ ”اس رسالہ سے نہایت عمدہ نتائج پیدا ہونگے اور میں ان نسخوں کو نہایت خوشی سے انگریزوں میں اور ان اخباروں میں جو انگریزوں کی نظر سے گذرتے ہیں۔ تقسیم کروں گا“ احمد ذکی افندی مترجم رسالہ مذکور لکھتے ہیں کہ ”بہت دن گذرنے نہ پائے تھے کہ یہ مضمون تمام یورپ میں مشہور ہو گیا، یورپ کے بڑے بڑے اخباروں میں اُسپر عمدہ عمدہ ریویو لکھے گئے اور بعض اخباروں میں یہ رسالہ مجنبہ اول سے آخر تک چھاپ دیا گیا“

الغرض اسلام کی اس ضروری اور مہتمم بالشان خدمت کی نسبت غالباً تمام اسلامی دنیا میں سب سے پہلے سید احمد خان کو اس بات کا خیال پیدا ہوا کہ غلامی کے باب میں جو فضیلت اور فوقیت مذہب اسلام کو تمام دنیا کے مذاہب پر ہے اور جو نیکی اور سلوک و احسان اُس نے لوندھی غلاموں کے ساتھ کیا ہے اُسکو صاف صاف دنیا پر روشن کریں۔ انھوں نے اول شہ ۱۲۸۶ میں جہان سرولیم میور کے اور مطاعن و اعتراضات کے جواب خطبات احمدیہ میں دیے ہیں انھیں کے ذیل میں غلامی پر بھی بہت شافی بحث کی ہے۔ جس کے بعد

۱۔ چونکہ سر سید غلامی پر کوئی عمدہ مضمون لکھا انگریزی میں شائع نہیں کیا تھا بلکہ خطبات کے ضمن میں اسکا ذکر کیا تھا اور خطبات کی بہت کم جلدیں انگریزی میں شائع ہوئی تھیں ایسے اسکی شہرت یورپ میں نہیں ہوئی جیسی احمد شفیق بک کے رسالہ کی ہوئی ۱۲

النداء بآلہ فرشی کی تدبیر میں مصر میں اور عیسائی مشنری تمام یورپ اور افریقہ میں
مناوی کرتے پھرتے ہیں کہ مظلوم حبشیوں کو اسلام کے پنجہ ظلم سے نکالو۔
بارے ۱۸۸۸ء میں۔ یعنی سرسید کی تصنیف سے اٹیس برس بعد۔ مصر کے ایک
روشن ضمیر فاضل احمد شفیق بدک کو۔ جس نے فرانس میں تعلیم پائی ہے۔ یہ خیال اُس وقت
پیدا ہوا جبکہ کارڈنل لافچیری پیرس کے ایک چرچ میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ
برودہ فرشی کے مظالم پر لکچر دے رہا تھا اور اس کا الزام صرف مسلمانوں ہی کے اعمال و افعال پر
نہیں بلکہ مذہب اسلام پر لگاتا تھا کہ وہ علانیہ اس رسم بد کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے بعد احمد شفیق بدک نے
دیکھا کہ وہ لکچر یورپ میں عام طور پر شائع ہو گیا اس لیے انھوں نے ایک سالہ فرانسیسی زبان
میں لکھا جس کا ترجمہ احمد ذکی افندی نے عربی میں کیا ہے۔

اس رسالہ کی جس قدر شہرت اور وقعت یورپ کی عیسائی قوموں میں اور مصر و ترکی
کے مسلمانوں میں ہوئی ہے اُس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ مضمون۔ جس کو اب سے اٹیس برس
پہلے سرسید لکھ چکے تھے اور جس کا صلیب ان کو یہ ملا تھا کہ بجای عیسائیوں کے خود مسلمانوں نے اُس کے
رد لکھے۔ کس قدر ضروری تھا۔ مصر کے اسلامی اخبار المؤید مورخہ ۲۔ ستمبر ۱۸۹۱ء میں
اس کی نسبت لکھا گیا تھا کہ ”اسلام کی حمایت میں اس سے عمدہ اور افضل کوئی تصنیف نہیں ہوئی“ چنانچہ
کبر و فضلالی اہل اسلام نے۔ جو ایسے کاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ احمد ذکی افندی سے نہایت التجا کے ساتھ
اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان سے عربی میں کرایا۔ اس کے سوا فرانس کے مشہور عالم موسیو میمر نے اس
رسالہ کو دیکھ کر مصنف کو لکھا ”کہ تم نے اپنے حریف (یعنی کارڈنل لافچیری) کو جواب کر دیا اور بے شک حق

مگر انکی تدبیروں میں اور بانی اسلام کی تدبیروں میں یہ فرق تھا کہ انکی تدبیریں زیادہ ترقی پزیر تھیں اور بانی اسلام کی تدبیریں زیادہ تر روحانی چیزوں سے علاقہ رکھتی تھیں۔ پس اسلام نے جس طرح شراب خواری کو بتدریج موقوف کیا تھا اسی طرح غلامی کے رفتہ رفتہ مسدود کرنے کی بنیاد ڈالی۔ اول طرح طرح سے غلاموں کے آزاد کرنے کی مسلمانوں کو ترغیب دی یہاں تک کہ بڑے آزاد کرنے کو تمام دنیا کی نیکیوں سے افضل بتایا، بعض گناہوں کے کفارہ میں بڑے آزاد کرنا حکم دیا، اور بتایا کہ جو غلام اپنی قیمت اپنی کمائی سے ادا کرنی چاہیں اُسے یہ اقرار نامہ لیکر چھوڑ دو، جسے اُنکے مالک اس طرح آزاد کرنے کا وعدہ کریں اُنکی خیرات یا چندہ سے مدد کرو، بیت المال میں مکاتب غلاموں کی آزادی کے لئے روپیہ دینا تجویز کیا، بعض صورتیں ایسی بتائیں کہ لونڈی غلام بغیر آزاد کرنے مالک کے خود بخود آزاد ہو جائیں۔ اسی طرح اور طرح طرح کی سلیپیں اُنکے آزاد کرنے کی نکالیں۔ مالک کو اُنکے ساتھ رعایتیں کرنے کی نہایت تاکید کی کہ اُسے زیادہ خدمت نہ لیں، اُنہیں لونڈی غلام کہہ کر نہ پکاریں۔ اُنکو مثل اپنے کھانا اور کپڑا دیں، اُنکو اُنکے رشتہ داروں سے جدا نہ کریں وغیرہ وغیرہ۔

یہاں تک سرسید کا بیان جمہور علمای اسلام کے مطابق ہے۔ مگر اسکے بعد اُنھوں نے دو دعوے نہایت شد و مد کے ساتھ کیے ہیں جنہیں بظاہر وہ متفقہ و معکوم ہوتے ہیں پہلا دعویٰ اُنکا یہ ہے کہ لڑائی کے قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کا کوئی حکم قرآن مجید کی کسی آیت میں یا کسی حدیث صحیح میں نہیں ہے۔ اسکے بعد جن آیتوں یا حدیثوں سے علمائے استرقاق کا حکم استنباط کیا ہے اُنکو نقل کر کے ثابت کیا ہے کہ اسے استرقاق کا حکم مستنبط نہیں ہوتا

عیسائیوں کے مقابلہ میں کچھ اور لکھنے کی ضرورت باقی نہ تھی مگر چونکہ اس میں ایک عوسے فقہاء اسلام کے خلاف تھا اور جب تک اصول شرع کے موافق اُس پر استدلال نہ کیا جائے وہ مسلمانوں کے سامنے پیش کر نیکی قابل نہ تھا اسلئے انھوں نے ۱۸۴۰ء میں ایک مستقل اور مبسوط رسالہ اسلام کی غلامی پر لکھ کر تہذیب الاخلاق میں چھپوایا۔ اس رسالہ میں اول بطور تمہید کے دلائل عقلیہ غلامی کی بُرائی پر نہایت عمدگی اور صفائی سے بیان کئے ہیں اور پھر لکھا ہے کہ اگر غلامی خدا کی مرضی کے موافق ہو تو اُس کے یہ معنی ہونگے کہ خدا بندوں کو اپنا شریک گردانتا پسند کرتا ہے؛ کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَكُلٌّ لِّسَانِكُمْ أَمَاءُ اللَّهِ** اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ۔ اگر غلام اچھی طرح رحم اور محبت کے ساتھ رکھے جائیں تو کوئی بُرائی نہیں۔ اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ غلامی فی نفسہ ایک قدرتی گناہ ہے اور اُن کو بد سلوکی سے رکھنا دوسرا گناہ ہے اور کوئی چیز قدرتی گناہ سے زیادہ خوفناک نہیں ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ ”یہودی مذہب نے غلامی کے قانون کو جائز سمجھا اور عیسیٰ مسیح نے اُس کی نسبت کچھ نہیں کہا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اُس کی نسبت کہا اُس کو کسی نے نہیں سمجھا“ پھر جس جس طریقہ سے زمانہ جاہلیت میں غلام بنائی جاتے تھے اُس کی تفصیل لکھی ہے اور دکھایا ہے کہ غلامی کی رسم جو اس وقت عرب میں تمام دنیا کی قوموں کی طرح جاری تھی اُس کا دفعہ موقوف کر دینا صرف مصالح ملکی کے برخلاف ہی تھا۔ بلکہ ایسا کرنا انواع و اقسام کے گناہوں کا مورث ہوتا۔ چنانچہ اب بارہ سو برس بعد بھی یورپ کے بڑے بڑے مدبر جنھوں نے غلامی کے معدوم کرنے میں بے انتہا کوششیں کیں وہ بھی اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکے کہ آئندہ کی غلامی کو بند کیا اور موجودہ غلاموں کے رفتہ رفتہ آزاد ہو جانے کی پیرین

۱۸ یعنی تم سب خدا کے غلام ہو اور تمھاری سب عورتیں خدا کی لونڈیاں ہیں ۱۲

غلام نہیں بنایا؛ یعنی جاہلیت میں جو اسیران جنگ کے ساتھ چار طرح کے برتاؤ کیے جاتے تھے انہیں سے قتل و استرقاق کو بالکل موقوف کر دیا اور صرف من و فدا میں اختیار دیدیا کہ چاہو بغیر کسی معاوضہ کے محض احساناً چھوڑ دو اور چاہو کچھ فدیہ لیکر چھوڑو۔

اس دوسرے دعوے کے متعلق انھوں نے بہت سی موافق اور مخالف روایتیں کتب احادیث سے نقل کر کے اس بات کے ثابت کرنے میں کوشش کی ہو کہ آیہ من و فدا کے نازل ہونیکے بعد رسول خدا صلعم کے عہد میں پھر کسی کو لونڈی غلام نہیں بنایا گیا۔ اور بعد آنحضرت کے صحابہ و تابعین و تبع تابعین کے زمانہ میں جو کچھ ہوا اسکی نسبت انکے بیان کا ماحصل یہ ہو کہ جب قرآن مجید یا کسی حدیث صحیح سے غلام بنانے کا کوئی صاف حکم نہیں نکلتا اور آیہ من و فدا سے صاف پایا جاتا ہو کہ جاہلیت کی رسم کے موافق جو ابتدا سے اسلام میں لونڈی غلام بنائے جاتے تھے اسکی صاف ممانعت ہو گئی اور اس کے بعد آنحضرت نے کسی قیدی کو لونڈی غلام نہیں بنایا اب ہلکے کچھ ضرورت اس بات کے دریافت کرنے کی نہیں ہو کہ آنحضرت کے بعد صحابہ یا تابعین وغیرہم نے اس باب میں کیا کیا؟

اس بیان کی تائید انھوں نے اس طرح سے کی ہو کہ شراب کی حرمت نازل ہونیکے بعد کوئی نہیں سمجھا تھا کہ شراب حرام ہو گئی یہاں تک کہ تین دفعہ اسکی حرمت نازل ہوئی۔ پھر بدعتیں بیع اہتمام اولاد کا ممنوع ہونا آنحضرت کے زمانہ میں تسلیم کیا جاتا ہوتا ہم حضرت عمرؓ کے عہد خلافت تک بیع ہوتی رہی۔ اسکے سوا متعدد حرمت سے عمر فاروق کی خلافت تک صحابہ ناواقف رہے۔ پس اسی طرح ممکن ہو کہ آنحضرت کے زمانہ میں آیہ من و فدا سے جو اصل مقصود تھا اسکو بھی صحابہ

اور جو الفاظ قرآن مجید یا احادیث صحیحہ میں ایسے آئے ہیں جن سے آنحضرت صلعم کے زمانہ میں لونڈی غلاموں کا ہونا معلوم ہوتا ہو جیسے ماملکت ایمانکم فک رقبة عابدہ امہ ، فکیات وغیرہ انکی نسبت وہ یہ کہتے ہیں کہ بیشک جب تک آیہ من وفدا نازل نہیں ہوئی اسوقت تک عرب کی قدیم رسم کے مطابق مختلف طریقوں سے (جنکی تفصیل انھوں نے لکھی ہے) برابر لونڈی غلام بنائے جاتے تھے ؛ اور نیز بعد اترنے آیہ مذکورہ کے گو آئندہ کے لیے استرقاق کی ممانعت ہو گئی مگر جبکہ پاس لونڈی غلام پہلے سے موجود تھے انکو آزاد کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا کیونکہ آیہ مذکورہ میں صرف آئندہ کے لیے یہ حکم تھا کہ لڑائی کے قیدیوں کو یا احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لیکر۔ پس قرآن و حدیث کے جن الفاظ سے رقیت کا وجود رسول خدا صلعم کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہو وہ انھیں لونڈی غلاموں سے متعلق ہیں جو آیہ مذکورہ کے نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کے پاس موجود تھے ۔

دوسرا دعویٰ انکا یہ ہے کہ سورہ محمد کی اس آیت سے جس میں یہ حکم ہے کہ آئندہ لڑائی کے قیدیوں کو یا احسان رکھ کر چھوڑ دیا کرو۔ یا فدیہ لیکر۔ اسلام نے رسم استرقاق کو جو مثل اور قوموں کے عرب میں بھی قدیم زمانہ سے چلی آتی تھی ہمیشہ کے لیے موقوف کر دیا ۔ وہ کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں لڑائی کے قیدیوں کو قتل کرنا ، لونڈی غلام بنانا ، فدیہ لیکر یا احسانا چھوڑ دینا ؛ یہ چاروں باتیں رائج تھیں اور اسلام میں بھی۔ جب تک کوئی حکم قیدیوں کی نسبت نہیں آیا ایسا ہی ہوتا رہا ۔ لیکن جب آیہ من وفدا نازل ہوئی پھر آنحضرت نے کسی غزوہ میں قیدیوں کو لونڈی

یعنی سورہ محمد کی یہ آیت ”فاذللیم الذین کفروا فاضربوا رقابہم انما یشکونہم فشدوا الوثاق فاما منابعدہ واما فذلہم“ ۱۲

ناسخ قرار دیا جائے اور اس بات کا تو انکار ہی نہیں ہو سکتا کہ آیہ مذکور نے اس سلوک کو جو
سیران جنگ کے ساتھ کرنا چاہیے صرف دو باتوں میں منحصر کر دیا ہے؛ یا احسان کھل کر چھوڑنا
یا کچھ چھڑائی لیکر چھوڑنا۔ ورنہ آیہ مذکور کے منسوخ ماننے کی کچھ ضرورت نہ تھی۔

اس تقدیر پر۔ اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو۔ مسئلہ متنازع فیہ کی صورت بعینہ ایسی ہو گئی
ہے جیسے عبد اللہ ابن عباس سے مسح رطلین اور غسل رطلین کے باب میں منقول ہے کہ ”لَا آجِدُ
فِي كِتَابِ اللَّهِ إِلَّا الْمَسْحَ وَلَكِنَّهُمْ أَبَوْا إِلَّا الْغَسْلَ“ (یعنی میں قرآن میں تو مسح کے سوا کچھ نہیں پاتا لیکن
صحابہ نے صرف غسل ہی کو اختیار کیا ہے)

اگرچہ عام طور پر تعامل اہل اسلام اور فقہاء و مفسرین کے اقوال سرسید کی رائے کے خلاف معلوم
ہوتے ہیں مگر بعض تاریخی شہادتیں ایسی ملی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی امیہ کے زمانہ میں آیہ
مسح و فدا سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ سیران جنگ کے ساتھ مسح و فدا کے سوا اور کوئی
سلوک نہیں کیا جاسکتا؛ یعنی ایک دفعہ جیسا کہ کتاب عقد الفرید میں مذکور ہے۔ حجاج کے
روبرو کچھ سیر لائے گئے۔ حجاج نے اُنکے قتل کیے جانے کا حکم دیدیا۔ ایک قیدی نے جب کہ
اسکو قتل کرنے لگے۔ حجاج کو بدعادی اور کہا کہ خدا تعالیٰ تو اپنی کتاب میں یہ کہتا ہے کہ ”فَإِذَا الْقِيَمَ
الَّذِينَ كَفَرُوا فَضْرًا بِرِقَابِهِمْ ذَا الشُّحْنَةِ وَهُمْ فُشِدُوا وَالْوَثَاقُ فَأَمَّا مَا بَعْدُ وَمَا قَدَاءُ“ اور

تمہارا شاعر اپنی قوم کے مکارم اخلاق اس طرح بیان کرتا ہے

”وَمَا نَقْتُلُ الْأَسْرَىٰ لَكِنْ نَقْتُلُهُمْ
إِذَا ثَقُلَ الْأَعْنَاقُ حَمْلُ الْقَلَائِدِ“

(یعنی ہم قیدیوں کو قتل نہیں کرتے بلکہ انکو جب کہ انکی گردنیں طوقوں کے بوجھ میں دہی جاتی ہیں۔ چھوڑ دیتے ہیں)

نہ سمجھے ہوں خصوصاً اسوجہ سے کہ پہلے بھی قیدیوں کو احساناً یا فدیہ لیکر چھوڑنے کا دستور برابر جاری تھا، پس اس آیت کے اترنے کے بعد جو تمام قیدی کسی نہ کسی طرح چھوڑ دیے گئے اور قتل یا استرقاق واقع نہیں ہوا اسکو سب نے ایک اتفاقی بات سمجھا ہو اور بعد آنحضرت کے خلافت راشدہ میں اس مسئلہ پر بحث کا موقع ایسے نہ ملا ہو کہ پہلی خلافت مرتدین کے مطیع کر نہیں ختم ہو گئی دوسری اور تیسری خلافت میں دار الخلافہ سے دور دور کے فاصلہ پر لڑائیاں ہوئیں اور چوتھی خلافت کا آپس کے جھگڑوں میں خاتمہ ہو گیا اور اسلئے چاروں خلافتوں میں اس مسئلہ کے تصفیہ کرنے کی مہلت نہیں ملی۔

اگرچہ یہ امید نہیں ہے کہ علما ہی اسلام اور خاصکر ہندوستان کے علما موجودہ حالت میں ایک ایسی رائے کے ساتھ اتفاق کریں گے جو اسلام کی غلامی کے متعلق انھوں نے برخلاف جمہور فقہاء و علما اسلام کے قائم کی ہے، چنانچہ ایک مبسوط رسالہ جوازا استرقاق پر سرسید کے برخلاف انھیں دنیارہین جب کہ پہلی ہی بار ابطال غلامی کا رسالہ تہذیب الاخلاق میں شائع ہوا تھا۔ لکھا جا چکا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ جس طرح سرسید کی رائے فقہاء اور مفسرین اور تعال اہل اسلام کے برخلاف ہے اسی طرح تعال اہل اسلام اور فقہاء و مفسرین کے اقوال ظاہر قرآن کے برخلاف معلوم ہوتے ہیں۔ بے شک نہ قرآن میں کوئی ایسی نص صریح موجود ہے جس میں غلام بنانے کا حکم دیا گیا ہو اور نہ آیہ من و فدا کے حصر کی کوئی ایسی معقول تاویل ہو سکتی ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ لڑائی کے قیدیوں کے ساتھ سوای من و فدا کے تیسرا سلوک کیا جاسکتا ہے اور نہ ان لوگوں کے پاس جو نسخ کے قائل ہوئے ہیں کوئی ایسی صاف اور صریح نص قرآنی موجود ہے جسکو آیہ مذکور کا

نا جائز طور پر پکڑے جاتے ہیں وہ عام اس سے کہ مسلم ہوں یا غیر مسلم اصول اسلام کے موافق لونڈی غلام نہیں ٹھہر سکتے ۔

اس بیان میں اور سرسید کے بیان میں ۔ جیسا کہ ظاہر ہے ۔ اس سے زیادہ کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا کہ سرسید کے نزدیک جس طرح چوری سے پکڑے ہوئے یا چھینے ہوئے حبشی لونڈی غلام نہیں بن سکتے اسی طرح اسیران جنگ بھی لونڈی غلام نہیں بنائے جاسکتے بلکہ اُنکے قید ہونیکے بعد مسلمانوں کو اسکے سوا کچھ چارہ نہیں کہ اُنکو احساناً چھوڑ دیں یا فدیہ لیکر چھوڑ دیں ۔ اور احمد شفیق بک کے نزدیک وہ قید ہونے کے بعد لونڈی غلام تو بن جاتے ہیں مگر اسکے بعد اگر مسلمان اُنکو احساناً چھوڑ دیں تو وہ فدیہ دیکر چھوٹ سکتے ہیں ۔ اس تقدیر پر ظاہر ائمہ اختلاف صرف یہ نکلیگا کہ احمد شفیق بک کے نزدیک اگر مسلمان اُنکو احساناً چھوڑ دیں تو جب تک وہ فدیہ ادا نہ کریں گے بدستور لونڈی غلام رہیں گے اور سرسید کے نزدیک اگر وہ فدیہ ادا نہ کر سکیں تو مسلمانوں کو چار ناچار اُنھیں احساناً چھوڑنا پڑیگا کیونکہ اُنکے نزدیک درحقیقت رقیّت طاری نہیں ہوئی ۔

بہر حال سب سے پہلے سرسید نے اور اُنکے بعد مصر کے اس روشن ضمیر فاضل نے بخوبی ثابت کیا کہ جو سلوک اور احسان لونڈی غلاموں پر اسلام نے کیا ہے وہ کسی مذہب سے بن نہیں آیا اور گونصف صدی سے بلحاظ حسن معاشرت کے عیسائیوں نے اور خاص کر انگلش قوم نے اس باب میں تمام دنیا کی قوموں پر فضیلت حاصل کی ہے مگر مذہب کی رو سے وہ غلاموں کے حق میں اس سے زیادہ کوئی شہادت پیش نہیں کر سکے کہ انجیل تمام بنی آدم کو ایک دوسرے کا بھائی ٹھہراتی ہے

یہ سکر حجاج نے (گویا مقتول قیدیوں کی طرف مخاطب ہو کر) کہا ”تمہارا بڑا بہو کیا تم نہ کہہ سکتے تھے جو بات اس منافق نے مجھ کو بتائی“ اور یہ کہہ کر باقی قیدیوں کو چھوڑ دیا ۔

حجاج ہی کا ایک ورق قصہ امام ابو یوسف کی کتاب اخراج میں درج ہے، یعنی حجاج کے سامنے ایک سیر لایا گیا ۔ حجاج نے عبداللہ بن عمر سے ۔ جو اس وقت وہاں موجود تھے ۔ کہا کہ اٹھو اور اس کو قتل کر ڈالو ۔ ابن عمر نے فرمایا ”ہم کو یہ حکم نہیں ہے ؛ خدا تعالیٰ فرماتا ہے“ حتی اذا اتخذتموه فشدوا الوثاق فاما منابعد واما فداء“ ۔

اگرچہ احمد شفیق بک نے آیہ من وفدا پر زیادہ زور نہیں دیا مگر نتیجہ کے لحاظ سے اُنکے اور سرسید کے استدلال میں چند ان فرق نہیں معلوم ہوتا ۔ احمد شفیق کی تمام تقریر کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ عرب پشت ہاپشت سے لونڈی غلام بنانے کے عادی تھے اور یہ عادت اُنکی طبیعت ثانی ہو گئی تھی اور اسلام کا سب سے بڑا اور متم بالشان مقصد توحید کا پھیلانا اور شرک و جہالت کا استیصال کرنا تھا اسلئے غلامی کا دفعہ موقوف کر دینا ضرور اسلام کے اعلیٰ اور اشرف مقاصد میں خلل نڈاز ہوتا ۔ لیکن جو نصیحتیں بانی اسلام نے غلاموں کے حق میں مسلمانوں کو فرمائیں اور جو بے شمار حقوق اُنکو عنایت کیے اور سطحِ انہیں اور اُنکے مالکوں میں ہر طرح سے مساوات کا درجہ قائم کیا اُس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام نے غلامی کی سوتیلے بالکل بند کر دیں ۔ اسکے سوا اسلام صرف اُن غیر مسلمین کے استرقاق کی اجازت دیتا ہے جو شرعی جہاد میں اسیر ہوں اور پھر بھی اُنکو ہمیشہ کے لیے ملکِ ہمنے پر مجبور نہیں کرتا بلکہ ہر طرح بادشاہ اسلام اُن کو احساناً چھوڑ سکتا ہے اسی طرح وہ خود فدیہ دیکر چھوٹ سکتے ہیں ۔ پس جو جہشی وسطا فریقہ سے

سب سے پہلے اُنکو۔ اس بنا پر کہ تفسیر بالاسے کی نسبت حدیث میں وعید وارد ہوئی تھی۔ اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جب قدر اخبار و آثار تفسیر القرآن کے متعلق کتب احادیث میں روایت کئے گئے، مین اُن سب کو تفسیرون میں اپنے اپنے موقع پر بیان کیا جائے؛ تاکہ کوئی ضروری بات جو قرآن کی تفسیر کے متعلق رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہو وہ امت تک پہنچنے سے رہ نہ جائے۔ مگر افسوس ہو کہ قدما کی اس کوشش سے جو محض نیک نیتی سے کی گئی تھی بے شمار روایتیں تفاسیر قدیمہ میں ایسی درج ہو گئیں جنکے لحاظ سے علمای محققین کو یہ کہنا پڑا کہ ”کتب التفسیر مشحونۃ بالاحادیث الموضوعة“ اور اس سے بھی زیادہ فسوس ہو کہ کچھ لوگوں نے قدما کی تفسیرن میں جو رطب و یابس وایتیں پائیں بغیر اسکے کہ اصول علم حدیث کے مطابق اُنکی تنقید کریں اُن تمام رطب و یابس روایتوں سے اپنی تفسیرن کو بھردیا اور مخالفون کے لیے اعتراض کا دروازہ کھول دیا۔

پھر جب اسلام دور و دراز ملکوں میں اور غیر قوموں میں۔ جنکی مادری زبان عربی نہ تھی اور جو قرآن کی فصاحت و بلاغت کا مثل اہل زبان کے اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ پھیلنے لگا تو اس بات کی ضرورت معلوم ہوئی کہ قرآن کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ پر موجب قواعد صرف و نحو و معانی و بیان کے بحث کی جائے اور وجوہ اعجاز قرآن نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کی جائیں۔ اس ضرورت کو بھی ہمارے علمائے اُس زمانہ کی حالت کے موافق نہایت خوبی اور لیاقت کے ساتھ پورا کیا۔

جب یونانی فلسفہ اور منطق اہل اسلام میں شائع ہوئی اور مسلمانوں میں نئے نئے فرقے

اور سب کو ایک دوسرے سے محبت کرنے کی تاکید کرتی ہو؛ تمام عہد جدید میں کوئی صریح نص غلامی کے برخلاف نہیں پائی جاتی؛ بلکہ سینٹ پال کے تمام خطوں میں۔ جو دین عیسوی کی اشاعت کی غرض سے اطراف و جوانب میں بھیجے گئے۔ کوئی حکم غلاموں کی نسبت اسکے سوا نہیں پایا جاتا کہ وہ اپنے آقاؤں کے آگے سر جھکائیں، انکی اطاعت کریں، اُنسے ڈریں، انکی ایسی فرمانبرداری کریں جیسی عیسیٰ مسیح کی کرتے ہیں، انکو ہر تعظیم و تکریم کے لائق سمجھیں اور اگر اُنکے آقا عیسائی ہوں تو انکی خدمت گزاری میں اور بھی زیادہ مبالغہ کریں۔ برخلاف اسکے بانی اسلام نے کہیں غلاموں کو اپنے مالکوں کی اطاعت یا تعظیم و تکریم کا حکم نہیں دیا بلکہ جہان نصیحت کی ہو وہاں مالکوں کو غلاموں کے ساتھ مہربانی اور شفقت اور ہر ایک بات میں اپنے برابر سمجھنے کی کی ہو اور طرح طرح سے اُنکے آزاد کرنے کی ترغیبیں دی ہیں اور مالک مملوک میں ایک محض اعتباری فرق کے سوا کوئی فرق نہیں رکھا اور اگر قرآن کے موافق دیکھا جائے تو غلامی کو ہمیشہ کے لیے باطل و قوت کر دیا ہو۔

سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر جن اصول پر اور جس ضرورت اور غرض سے لکھی ہو اسکا مختصر ذکر پہلے حصہ میں آچکا ہو؛ یہاں ہم اسکی وہ خصوصیتیں بیان کرنی چاہتے ہیں جو اُس میں اور دیگر تفاسیر میں مابہ الامتیاز ہیں اور جسے سرسید کی اور اُس ضرورت کا جسے اس تفسیر کے لکھنے پر انکو مجبور کیا۔ کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہو۔

ہمارے قدیم مفسرین نے بلاشبہ اُن تمام ضرورتوں کو جو اُنکے زمانہ میں وقتاً فوقتاً پیش آتی گئیں۔ بخوبی پورا کیا اور اپنی آسمانی کتاب کی خدمت کا حق بحسب ضرورت ادا کرتے رہے

سلطنت کے ساتھ دعوت دین بھی شامل ہو اور کروڑوں روپیہ حکمران قوم کے مذہب کی اشاعت میں صرف کیا جاتا ہو اور سلطنت بھی ایک ایسی قوم کی ہو جو عقل و دانش و رشک و شہرت و تمدن میں دنیا بھر کی قوموں میں ممتاز ہو اور طرح طرح کی ترغیبیں تبدیل مذہب کی موجود ہوں تو دیکھنا چاہیے کہ وہ کشش کس حد تک پہنچ جائیگی۔ اگرچہ ہندوستان میں ابھی تک مشنریوں کا منتر مسلمانوں پر ویسا کارگر نہیں ہوا جیسا کہ اور قوموں پر ہوا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مسلمان ہمیشہ اسی طرح مشن کی زد سے بچے رہینگے؛ مسلمانوں کے پوشکل بڑا دل کو ابھی کچھ یادہ عرصہ نہیں گزرا اور اسیلئے اسلام کی حقیقت کا سکھ ابھی اُنکے دل پر بیٹھا ہوا ہے، آبا و اجداد کی مذہبی عظمت اُنکو فراموش نہیں ہوئی، آزادی نے ابھی اُنکو بالکل مطلق العنان نہیں کیا، قومی سوسائٹی کا دباؤ ابھی اُنکی طبیعتوں پر کم و بیش باقی ہے، تبدیل مذہب سے جو ذلت قوم اور خاندان زمین ہوتی ہے ابھی تک وہ اُسکو گوارا نہیں کر سکتے؛ لیکن جب قدر زمانہ گزرتا جائیگا اس وقت یہ رکاوٹیں کم ہوتی جائیں گی اور نہایت اندیشہ ہے کہ مبادا آخر کار مسلمان بھی اپنے اسلاف کے مذہب سے ویسے ہی بے تعلق ہو جائیں جیسے ہندوستان کی اور قومیں۔ جو ہزار برس سے غیر قوموں کی محکوم چلی آتی ہیں اور مذہب کو بزرگوں کی ریت اور رسم سے زیادہ کوئی چیز نہیں سمجھتیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آہستہ آہستہ اُردو مذہبوں کی طرح اسلام کی سرحد میں بھی مشن اپنا قدم بڑھاتا جاتا ہے۔ انھیں دنوں میں پنجاب کے ایک دیسی مشنری کی تحریر ہماری نظر سے گزری جس میں لکھا ہے کہ چالیس برس کے عرصہ میں صرف امرتسر کے گرجا میں ۱۵۲۔۱۵۳ء میں ۲۸ مسلمانوں نے صلیب پر چڑھ کر اپنا مذہب تبدیل کیا ہے اور دہلی کے صرف باپسٹ مشن میں ۲۸ مسلمانوں نے صلیب پر چڑھ کر اپنا مذہب تبدیل کیا ہے۔

پیدا ہونے لگے اور ہر فرقہ آیات قرآنی کی تفسیر اپنے اپنے عقائد اور اصول کے موافق منطوق اور فلسفہ کی رو سے کرنے لگا تو علما ہی تکلمین نے اسلام کی حمایت اس بات میں منحصر سمجھی کہ تفسیر قرآن میں فلسفہ اور حکمت کو دخل دیا جائے اور تفسیر میں مذہب حق کی تائید دلائل عقلیہ سے کی جائے۔ بعض مفسرین نے اپنی تفسیر کی بنیاد جزئیات فقہیہ کے استنباط اور اختلافی مسائل میں اپنے اپنے مذہب کی نصرت اور حمایت پر رکھی۔ غرض کہ جو ضرورت ہمارے قدیم مفسرین کو پیش آئی اُسکو جہن و جہ پورا کیا گیا۔ لیکن جو ضرورتیں اس وقت نہ صرف ہندوستان کے بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو۔ اُنکے مذہب کے متعلق درپیش ہیں ویسی ضرورتیں اگلے زمانہ میں کبھی پیش نہیں آئیں اور اسلئے ہمارے علما کو تفسیر میں اُنکے پورا کرنا کبھی خیال نہیں آیا۔ اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ موجودہ صدی میں کرۂ زمین کا کوئی پہلو اور کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہا جہاں عیسائی قوموں کی حکومت یا انکار عرب و اب قائم نہ ہو اور اگر دنیا عالم اسباب ہے تو ضرور انکار عرب و اب روز بروز برہتا جائیگا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جہاں کسی عیسائی قوم کا عرب و اب قائم ہوا اور فوراً انکاشن اور انکی تجارت سایہ کی طرح اُسکے ساتھ ساتھ وہاں پہنچی۔ اگرچہ عیسائی حکومتوں میں عسوا اور انگریزی حکومت میں خصوصاً جس قدر رعایا کو مذہبی آزادی حاصل ہے شاید دنیا کی کسی حکومت میں کبھی اس سے زیادہ آزادی حاصل نہیں ہوئی ہوگی؛ لیکن رعیت کو کیسی ہی مذہبی آزادی دیجائے سلطنت کی مقناہی کشش اپنا کر شمع دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ حکمران قوم کی رسوم و عادات و اوضاع و اطوار و اخلاق یہاں تک کہ اُنکے دین و مذہب کی طرف محکوم قوم کا دل خود بخود کھینچتا ہے؛ اور جب کہ

نسبت انہیں باقی رہ سکتا " اسکے بعد مصنف مدوح اپنے ہموطن مسلمانوں کو اُس آفت اور بلائی عظیم سے آگاہ کرتا ہے جو انکی اولاد میں پھیلتی جاتی ہے اور انکو ہوشیار کرتا ہے کہ پہلے اس کہ یہ مصیبت لاعلاج ہو جائے اُسکا تدارک کریں ۔

ظاہر ہے کہ علوم جدیدہ کی تعلیم جبکہ ممالک اسلامیہ میں یہ نتائج پیدا کر رہی ہے تو ہندوستان میں اسلام کیونکر اسکی طرف سے مطمئن رہ سکتا ہے ۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ مسلمان اُن نتائج سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کی تعلیم سے دست بردار ہو جائیں وہ پہلے ہی اپنی اُس غفلت اور فروگزاشت پر کف افسوس مل ہے ہیں جو زمانہ گذشتہ میں انگریزی تعلیم کی نسبت اُن سے ظہور میں آئی اور وہ کیونکر اُس تعلیم سے دست بردار ہو سکتے ہیں جس سے ترکی اور شام اور مصر کے مسلمانوں کو بھی کسی طرح منفہم نہیں ۔ اسکے سوا مسلمانوں کا اولاد کو صرف اس اندیشہ سے مغربی تعلیم نہ دلوانا کہ وہ دین اسلام سے بد اعتقاد نہ ہو جائیں ۔ گویا اس بات کو تسلیم کر لینا ہے کہ اسلام فلسفہ جدیدہ کے مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتا اور اسلام کا اعتقاد سائنس کے یقین کے آگے نہیں ٹھیر سکتا جو ضرورتیں ہمنے اوپر بیان کیں بے شک اُن راسخ الاعتقاد مسلمانوں کو محسوس نہیں ہو سکتیں جنکے دل ہر قسم کے وساوس و شبہات سے بالکل پاک ہیں یا جو بقای دین اسلام کے سمجھتے کہ صرف اُنکے خاندان کا محدود حلقہ کا دیا ارتداد کے ہمدرد سے محفوظ رہے گو کہ ساری دنیا متحد و ہمدرد ہے ۔

مگر جو لوگ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات کو واقف ہیں اور ہر مسلمان کے تبدیل مذہب سے انکو دینی صدمہ پہنچے گا ۔ کسی عزیز یا دوست کے ارتداد سے پہنچنا چاہیے انکو یہ ضرورتیں روز روشن کی طرح نظر آرہی ہیں اور انکو وہ زمانہ

نظارہ ہو کہ اہل اسلام کو ایسی حالت بارہ سو برس تک کبھی پیش نہیں آئی ؛ وہ جہان گئے اور جہان جا کر رہے اسلام کا رعب داب اُنکے ساتھ ساتھ رہا ؛ وہ اس عرصہ میں کبھی کسی غیر قوم کے۔ جو اپنے دین کی اشاعت میں مثل عیسائیوں کے سرگرم ہو۔ محکوم ہو کر نہیں بیٹھے ؛ اور اسیلے ہمارے قدیم علما کو وہ ضرورتیں جو آج کل اسلام کے خیر اندیشوں کو نظر آتی ہیں کبھی محسوس نہیں ہوئیں ۔

دوسری ضرورت۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اسلام کو سائنس کے حملہ سے بچانی کی ہر
علوم جدیدہ کا رواج جیسا عیسائی ملکوں میں ہے ویسا ہی تمام دنیا میں روز افزون ترقی کرتا جاتا
اور جو صدہ کہ اُسے یورپ میں عیسائی مذہب کو پہنچایا ہے وہی صدہ دنیا کے تمام مذاہب
کو اُس سے پہنچتا معلوم ہوتا ہے۔ شام و مصر و ترکی میں علوم جدیدہ کی اشاعت کو غالباً
پچاس برس سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا؛ اس قلیل عرصہ میں اُس سے جو نتائج ممالک

میں باوجود اسلامی سلطنت ہونیکے پیدا ہوئے ہیں انکو طرابلس کے ایک مشہور عالم شیخ حسین افندی نے اپنی کتاب حمیدیہ میں ایک موقع پر اس طرح ظاہر کیا ہے کہ ”جو مسلمان نوجوان جو مدارس میں علوم جدیدہ اور خاصکر فن طبیعیات کی تعلیم پاتے ہیں وہ اسلام کی قید سے ایسے نکل جاتے ہیں کہ انکو اس کچھ لگا و باقی نہیں رہتا وہ اس بات کے معتقد نہیں رہتے کہ کوئی عالم کا پیدا کر نوالا موجود ہے بلکہ تمام کائنات اور آثار موجودات کو مادہ اور اس کے اجزاء کی حرکت اور قوانین طبیعی کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ اور جب کہ انکا الوہیت کے اعتقاد میں ۔ جو اصل اصول اسلام ہی ایسا ہو تو پھر کونسا اعتقاد دین اسلام کی

۱۲
اسی کتاب کا نسخہ ہمیں ان شکوٹ بھاب کے رفع کرنیکی غرض سے جو علوم جدیدہ کی تعلیم سے مسلمان نوجوانوں کے ذمے اصول اسلام کی نسبت پیدا ہوتے ہیں ملک شام میں بھی گئی اور جسکا نام مصنف نے سلطان عبدالحمید خان بالقاب کے نام نامی پر حمیدیہ رکھا ہے۔

اور موجب ضلالت و گمراہی خیال کی گئی ہیں۔ ہم مرزا صاحب کے گلے میں بطور حرز جان کٹکتی دیکھتے ہیں۔
یہ اگرچہ ایک نوجوان طالب علم کی شہادت ہے۔ جسکی شاید لوگوں کی نظر میں کچھ زیادہ وقعت نہ ہو۔ مگر اس قول کے موافق کہ ”اہل البیت اُردی بما فی البیت“ انگریزی خوان طلبہ کے نزدیک اس نوجوان طالب علم کی شہادت بڑے بڑے مشائخ کبار کی شہادت سے زیادہ اعتبار کے لائق ہے اور اسکا ثبوت بارہا ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔
ایک دفعہ ہمارے سامنے یہ واقعہ گذرا کہ عید الفطر سے پہلے ایک عالم نے وعظ میں یہ روایت بیان کی کہ ”عید کے روز روی زمین پر ہر شہر میں خدا تعالیٰ علی الصبح اپنے فرشتوں کو بھیجتا ہے اور وہ زمین پر اتر کر ہر ایک بستی کے گلی کوچوں میں منادی کرتے ہیں۔ جسکو تمام مخلوقات سوائے جن انسان کے سنتی ہے۔ اور بلند آواز سے کہتے ہیں کہ اے امت محمدیہ اُس خدا کی طرف چلو جو بڑا بخشش والا اور بڑے بڑے گناہ معاف کرنے والا ہے“ اسوقت اتفاق سے کچھ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان بھی وہاں موجود تھے؛ جب وعظ ہو چکا تو مسجد سے باہر نکل کر انہیں سے اکثر طلبہ اس روایت پر ہنستے تھے اور ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ عجب تماشا ہے جنکو عید گاہ میں بھیجنا منظور ہے وہ تو سن نہیں سکتے اور تمام نباتات و جمادات و حیوانات سنتے ہیں پھر اگر ہم لوگ عید گاہ میں نہ جائیں تو ہمارا کیا قصور ہے۔

اسی طرح کے صد ہا واقعات ہر روز دیکھنے اور سنتے میں آتے ہیں اور زیادہ تر یہ خرابیاں ہمارے واعظوں کی سادہ لوحی اور نا عاقبت اندیشی سے پیدا ہوتی ہیں جو اس قسم کی ضعیف و مضعوف روایتیں بیان کر کے لوگوں کو دین پر ہنسواتے ہیں اور بچانے اسکے کہ ہر گروہ کے ساتھ

یہ فروگزاشت بلاشبہ تفسیر قرآن میں ایک بہت بڑی کمی کا باعث تھی۔ اگرچہ قرآن مجید میں اہم سابقہ کے قصے ایسی تفصیل کے ساتھ جتنی کہ بائبل میں درج ہے۔ بیان نہیں ہوئے بلکہ اکثر ان قصوں کی طرف ترہیب یا ترغیب کی غرض سے اجمالی اشارے کیے گئے ہیں لیکن جب کہ اکثر وہی قصے کتب سابقہ میں مفصل مذکور ہیں اور قرآن میں ان کتابوں کی جا بجا تصدیق کی گئی ہے اسلئے ضرور تھا کہ ہمارے مفسرین جہاں تک ممکن ہو تا قرآن مجید کے ان اجمالی قصوں کی تفصیل کتب سابقہ کے موافق بیان کرتے اور دونوں میانوں میں تطبیق کرتے یا عدم مطابقت کی وجہ بیان کرتے۔ اگرچہ یہ بات علمای سبھی کے اقرار سے بخوبی ثابت ہے کہ بہت سی مقدس کتابیں جن کا ذکر بائبل کی موجودہ کتابوں میں آیا ہے اب ناپید ہو گئی ہیں اور اسلئے یہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ ہر قصہ جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے وہ موجودہ مجموعہ بائبل میں بھی پایا جائے لیکن جو قصے قرآن مجید میں اجمالاً یا تفصیلاً ایسے مذکور ہوئے ہیں جو بائبل میں بھی اسی طرح یا کس قدر جزوی اختلاف کے ساتھ مندرج ہیں ان کی تطبیق کرنی یا عدم مطابقت کی وجہ بیان کرنی خاص کر اس زمانہ میں ایک ایسی بات تھی جس کی ضرورت کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا۔

سر سید نے سب سے پہلے اس کمی کو پورا کیا ہے۔ انھوں نے ہر ایسے قصہ یا واقعہ کا۔ جو قرآن میں مذکور ہوا ہے۔ تا بمقدور بائبل میں سراغ لگایا ہے اور قرآن اور بائبل کی تطبیق کی ہے یا عدم مطابقت کی وجہ بیان کی ہے اور جس قصہ کا پتا موجودہ بائبل میں نہیں لگتا تا بمقدور اس کا ثبوت اور ذریعہ سے دیا ہے۔ مثلاً طالوت اور جالوت کی لڑائی کا قصہ۔ جو سورہ بقرہ میں مذکور ہے۔ یہی قصہ شمویل نبی کی کتاب میں بھی بیان ہوا ہے مگر اس میں وہ مضمون نہیں ہے جس کا قرآن کی

اسکی عقل اور سمجھ کے موافق گفتگو کرنی چاہیے۔ سب کو اسی قدیم دستور کے موافق ایک لاکھی ہانکتے چلے جاتے ہیں۔

سر سید نے انھیں خرابیوں کے تدارک کے لیے قرآن مجید کی تفسیر لکھنی شروع کی تھی جسکی پہلی جلد ۱۲۹۰ ہجری میں چھپکر شائع ہوئی اور اُس کے بعد وقتاً فوقتاً اُس کی جلدیں شائع ہوتی رہیں۔ مگر افسوس ہے کہ وہ نصف قرآن سے کچھ ہی زیادہ کی تفسیر لکھنے پائے تھے کہ پیغام اجل آپہنچا اور چھ جلدیں چھپی ہوئی آخر سورہ بنی اسرائیل تک اور ایک جلد بن جھپی سورہ انبیاء تک اور چند چھوٹے چھوٹے رسالے۔ مثل تفسیر السموات، ابطال غلامی، ازالۃ لغین فی قصۃ ذی القرنین، ترقیم فی قصۃ اصحاب الکھف والرقیم وغیرہ وغیرہ کے جنکو تفسیر کے اجزا سمجھنا چاہیے۔ سر سید سے یادگار رہ گئے۔

سر سید نے اس تفسیر میں اُن مضامین سے بہت ہی کم تعرض کیا ہے جن کو قدیم مفسرین نہایت بسط اور تفصیل کے ساتھ اپنی اپنی تفسیر میں بیان کر چکے تھے، یا جسکے بیان کرنے کی اس زمانہ میں کچھ ضرورت نہ تھی؛ بلکہ انھوں نے زیادہ تر انھیں باتوں کے بیان کرنے پر اکتفا کیا، جو جنکو وہ اس زمانہ میں اسلام کی حمایت کے لیے نہایت ضروری سمجھتے تھے اور جسے اگلی تفسیر میں بالکل خالی نظر آتی تھیں۔

مثلاً ہمارے قدیم مفسرین نے اخبار ماضیہ کی تنقیح پر۔ جو کہ قرآن مجید میں اجالا یا تفصیلاً بیان ہوئے ہیں۔ بہت ہی کم توجہ کی تھی۔ اسکا سبب خواہ یہ سمجھو کہ اُنکو ایسی ضرورت پیش نہیں آئی اور خواہ یہ قرار دو کہ اُس زمانہ میں اُطلاع کے ذریعے محدود تھے۔ دو نو صورتوں میں

اُسکو ایک غلط واقعہ بیان کرتے ہیں۔ مگر سرسید نے اپنی تفسیر میں ثابت کیا ہے کہ گویہ واقعہ موجودہ عہد جدید میں نہیں ہے، لیکن دو انجیلین۔ جو اناجیل طفولیت کے نام سے اب تک موجود ہیں اور جنکو ایک زمانہ میں اکثر مشہور عیسائی عالم تسلیم کرتے تھے اور مدتوں ایشیا اور افریقہ کے گرجاؤں میں پڑھی جاتی تھیں۔ انہیں یہ واقعہ۔ جسکا قرآن میں اجمالی ذکر ہوا ہے۔ بہت تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اور ان انجیلوں کا تمام بیان جو اس واقعہ سے متعلق ہے تفسیر میں نقل کیا ہے جس سے عیسائیوں کو اب یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہی کہ خلق طیر کا ذکر جو قرآن میں آیا ہے اسکی کچھ اصل نہیں ہے۔

یاشعاعیسائی قرآن کی اُن آیتوں کے مضمون پر اعتراض کرتے ہیں جسے قوم عاد کا قوم نوح کے بعد اُنکا جانشین ہونا اور حضرت ہود کا قوم عاد کی ہدایت کے لیے مبعوث ہونا پایا جاتا ہے کیونکہ بائبل میں اُسکا کچھ ثبوت موجود نہیں ہے، مگر سرسید نے سورہ اعراف کی تفسیر میں اُن کتبوں کے بموجب۔ جو اول معاویہ بن ابی سفیان کے عہد میں عبدالرحمن حاکم بن کوٹے تھے اور اب ۳۳۴ھ میں انگریزوں کو یمن کی پیمائش کرتے ہوئے وہاں کے کھنڈرات میں دستیاب ہوئے ہیں۔ عیسائیوں کے دونو اعتراضوں کو رد کیا ہے اور ریورنڈ فاسٹرنے جو غلط نتیجے اُن کتبوں سے نکالے ہیں اُنکی غلطی ثابت کی ہے۔

غرض کہ تاریخی اور جغرافیہ تحقیقات جو قرآن مجید کے قصوں سے متعلق ہیں اسکی طرف سرسید سے پہلے ہماری مفسرین نے بہت ہی کم التفات کیا تھا۔ شاید اگلے زمانہ میں اسکی ضرورت نہو اور ہر مسلمان کے یقین کے لئے کسی قصہ یا واقعہ کا قرآن میں مذکور ہونا ہی کافی ہو لیکن اس زمانہ میں

اس آیت میں ذکر ہے کہ ”إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهْيِهِمْ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ“ لیکن یہی مضمون کتاب قضاۃ کے ساتویں باب میں جہانِ جدعون کی مدانیوں پر لشکر کشی کا ذکر ہے مندرج ہے ۔ اسلئے عیسائی مورخوں نے قرآن کے بیان پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اُسین غلطی سے جدعون کے لشکر کے واقعہ کو طاہوت کے لشکر کے واقعہ سے ملا دیا ہے حالانکہ دونوں واقعے بالکل جدا جدا ہیں اور مختلف قانون میں مختلف مقامات پر واقع ہوئے ہیں ۔

مگر سرسید نے اپنی تفسیر میں علامی مسیحی کے اقرار اور شہادت سے یہ ثابت کیا ہے کہ کتاب سموئیل کے بعض ابواب کے متعدد ورس صحیح نہیں ہیں اور جان کیٹوکا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”یہ کافی نہیں ہے کہ جس مقام کو ہم غلط سمجھیں اُسے الحاقی سمجھ کر خارج کر دیں اور باقی کو بلا کم و کاست صحیح جانیں کیونکہ ممکن ہے کہ جنہوں نے الحاق کیا تھا انہوں نے باقی حصوں میں بھی تصرف کیا ہو“ اسلئے سوائیہودی اور عیسائی عالموں کی شہادت سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ سموئیل نبی کی کتابیں لکھے جانے کے زمانہ اور اُنکے لکھنے والوں کے ناموں میں بڑے بڑے یہودی اور عیسائی عالموں میں اختلاف ہے ؛ بعض تین نبیوں کی اور بعض پرمیہا نبی کی لکھی ہوئی بتاتے ہیں اور بعض کی رائے ہے کہ سموئیل نبی کے بہت مدت بعد لکھی گئی ہیں اور اُس سے آسانی خیال میں آسکتا ہے کہ بعض واقعات الٹ پلٹ ہو گئے ہوں یا بعض تحریر میں نہ آئے ہوں ۔

یامثلاً قرآن مجید میں جو عیسیٰ علیہ السلام کے بچپن کے حالات کے ضمن میں خلقِ طیر کے واقعہ کی طرف اشارہ ہوا ہے وہ موجودہ عہد جدید کی کتابوں میں مذکور نہیں ہے اسلئے عیسائی

بیان ہوئے ہیں انہیں کوئی قصہ ایسا نہیں ہے۔ جو عرب یا اُس کے قرب و جوار میں مشہور و مسلم نہ ہو۔ پس کسی طرح قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ ایک ایسی اجنبی قوم اور اجنبی ملک کے بادشاہ کا قصہ۔ جس کے حالات سے نہ صرف عرب بلکہ دنیا کی اکثر قومیں خاصہ نزول قرآن کے زمانہ میں اکل بے خبر تھیں۔ اُس کتاب میں بیان کیا جائے جو عرب کے اُمیوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوئی ہو۔ اکثر مفسرین نے سکندریہ رومی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے اور ابوریحان بیرونی نے بنی تمیز کے بادشاہوں میں سے ابوکرب شمس بن عئیر بن افریقس کو اُسکا مصداق ٹھیرایا ہے۔ مگر یہ دونوں قول سرسید کے قول سے بھی زیادہ مخدوش ہیں۔ حق یہ ہے کہ اس قصہ کی کوئی تفسیر ایسی نہیں کی گئی جس میں اُس کے تمام جزئیات کو تاریخی اور جغرافیہ تحقیقات پر منطبق کیا گیا ہو۔ اور باوجود اس کے قرآن کے وظیفہ مستمرہ کے بھی خلاف نہ ہو۔

دوسری خصوصیت اس تفسیر کی یہ ہے کہ جو اعتراضات زمانہ حال کے نکتہ چین مسلمانوں کے ان مسائل و مقدمات پر وارد کرتے ہیں۔ جو اسلام کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے جہاد، حج، صوم رمضان، طلاق، حیت ربا، معراج، بہشت و دوزخ وغیرہ وغیرہ۔ ان اعتراضوں اور ان مسائل و مقدمات پر جس صفائی کے ساتھ اس تفسیر میں بحث کی گئی ہے اور جن مناسب طریقوں سے مقتضای وقت کے موافق انکو دفع کیا گیا ہے اُسکی نظیر قریب تفسیر میں کمین نہیں پائی جاتی۔ یہاں ہم انہیں سے صرف دو مثالیں نہایت اختصار کے ساتھ بطور نمونہ کے ناظرین کی اطلاع کے لیے بیان کرتے ہیں۔

سب سے بڑا معرکہ الآرا جہاد کا مسئلہ ہے جس پر سرسید اپنی متعدد تصنیفات میں تفسیر لکھ کر پہلے

اسکی نہایت ضرورت تھی۔ قطع نظر مخالفین کے اعتراضات کے۔ جنکو ہر طرح کی نکتہ چینی کرنے کی آزادی ہو۔ خود تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تشفی کے لیے ہر قصہ اور ہر واقعہ اور ہر نام اور ہر مقام کو۔ جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں۔ زمانہ حال کی تاریخی اور جغرافیائی تحقیقات پر منطبق کرنا اور در صورت عدم تطبیق کے تاریخی و جغرافیائی تحقیقات کو غلط ثابت کرنا ضرور ہو۔

اگرچہ ہمارے قدیم مفسرون نے بھی اپنی تفسیرون میں ائمہ سابقہ کے حالات کثرت سے قلمبند کیے ہیں لیکن اول تو انکا فائدہ زیادہ تر وہ ضعیف روایتیں ہیں جو محدثین کے نزدیک اعتبار کے قابل نہیں اور اگر بالفرض ان روایتوں کو اصول حدیث کے موافق صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو یہ صرف ان راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لیے کافی ہو سکتی ہیں جنکے دل شکوک و شبہات سے بالکل پاک ہیں نہ کہ عیسائیوں کے لیے جو قرآن مجید کے قصوں پر مورخانہ نکتہ چینی کر رہے ہیں اور نہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے جو یورپین مصنفوں کے اعمہ اضافات انکی کتابوں میں دیکھتے ہیں۔

قرآن مجید میں بعض ایسے قصے جی بیان ہوئے ہیں جو بائبل میں مذکور نہیں ہیں، جیسے ذوالقرنین کا قصہ، یا اصحاب کہف کا قصہ۔ سرسید نے ان قصوں کی تحقیقات میں بھی کامیابی کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان دونوں قصوں کے متعلق انھوں نے دو علیحدہ رسالے لکھے ہیں اور دونوں کا حقد بیان قرآن مجید میں ہوا ہے اسکے تمام جزئیات کو تاریخ مسلمہ پر منطبق کرنے میں کوشش کی ہے۔ لیکن ذوالقرنین کے قصہ میں جو انھوں نے چھی وانگلی نفخہ پھونکا ہے کو ذوالقرنین کا مصداق ٹھہرایا ہے اس پر بلاشبہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قرآن میں جس قدر قصے اجمالاً یا تفصیلاً

اور یہی اصول اعلیٰ درجہ کی نیکی کے ہیں؛ مگر حقیقت وہ ہوا کی آواز سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتے اور جو کہ وہ اصول فطرت انسانی بلکہ قانون قدرت کے برخلاف ہوتے ہیں کبھی ان پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا۔

”کوئی کتابِ نیامین انجیل سے زیادہ انسان کو نرم مزاج اور بردبار و متحمل کرنے والی اور اخلاق کو ایسی چمک سے دکھانے والی۔ جس سے آنکھوں میں چکا چوند آ جاوے۔ نہیں ہے۔ مگر ہمو دیکھنا چاہیے کہ انکا لوگوں میں کیا اثر ہوا تھا؟ انجیل میں لکھا ہے کہ اگر کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اُسکے سامنے کر دے۔“ بلاشبہ یہ مسئلہ اخلاق کے خیال سے تو بڑا عمدہ معلوم ہوتا ہے مگر کسی زمانہ کے لوگوں نے اُس پر عمل کیا ہے؟ اگر دنیا اس پر عمل کرے تو دنیا کا کیا حال ہو؟ اسی طرح آباد رہے؟ اور اس طرح لوگوں کی جان اور مال میں امن رہے؟ نہایت دھچپ جواب دیا جاتا ہے کہ ”جب سب ایسے ہی ہو جاویں تو دنیا سے سُراٹھ جائے مگر پوچھا جاتا ہے کہ کبھی ایسا ہوا ہے؟ یا کبھی ایسا ہوگا؟ یہ سب ناشدنی باتیں ہیں خیال میں شدنی قرار دیکر انسان خیالی اور جھوٹی خوشی حاصل کرتا ہے۔“

”عیسائی مذہب جسکی جڑ ایسی نیکی اور نرمی اور اخلاق میں لگائی گئی تھی وہ پھولا اور پھلا اور سرسبز و شاداب ہوا۔ اسکو چھوڑ دو کہ وہ کس سبب بڑھا اور سرسبز ہوا، مگر دیکھو کہ اُس نے کیا پھل پیدا کیا؟ ایک بھی نصیحت اُسکی کام نہ آئی۔ اور خود مذہب نے جو خوریزی اور بے رحمی اور نا انصافی اور درندوں سے بھی زیادہ بدتر خصلت دکھائی وہ شاید دنیا میں بے مثل ہوگی اور جس نیکی میں اسکی جڑ لگائی گئی تھی اُس نے کچھ پھل نہیں دیا؛ کیونکہ وہ قانونِ قدرت کے برخلاف لگائی گئی تھی۔ جو خوبی۔ کیا روحانی اور کیا اخلاقی اور کیا تمدنی۔ اب ہم بعض عیسائی ملکوں میں دیکھتے ہیں کیا یہ پھل اُسی درخت کا ہے جسکی جڑ ایسی نیکی میں لگائی گئی تھی جو خلافِ قانون قدرت تھی؟ حاشا وکلا، بلکہ یہ اُسکا پھل ہے کہ اُس درخت کو وہاں سے اُکھاڑ کر دوسری زمین پر

کافی بحث کر چکے تھے مگر تفسیر میں مسئلہ مذکور کے متعلق اُن تمام اعتراضات کی جڑ کاٹ دی گئی ہے جو جنکو تیرا سو برس سے عیسائی قوموں نے اسلام کے مطعون کرنے کا ایک بردست آلہ بنا رکھا تھا اور جنکی بدولت واقعہ شہ کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی پولٹکل حالت کو نہایت سخت صدمہ پہنچا تھا۔ انھوں نے اول سورہ بقرہ کی اُن آیتوں کی تفسیر میں جنہیں مشرکین مکہ سے قتال کرنے کا حکم ہے۔ اجمالی طور پر جہاد کے متعلق ایک لطیف تقریر لکھی ہے جسکو کسی قدر اختصار کے ساتھ ہم اس مقام پر لکھتے ہیں ”اکثر لوگ اسلام پر یہ طعن کرتے ہیں کہ اُس میں تحمل و بردباری اور مذہب کے سبب جو تکلیفیں کافروں سے پہنچیں اُنکی صبر کے ساتھ برداشت نہیں ہے اور یہ باتیں مذہب کی سچائی اور نیکی اور اخلاق کے برخلاف ہیں۔ مگر یہ ایک بڑی غلطی اور نا سمجھی ہے۔ بے شک قرآن مجید میں جو لڑائی کے احکام نہایت نیکی اور انصاف پر مبنی تھے اُنکو مسلمان بادشاہوں نے دینداری کے بہانے سے اپنی خواہش نفسانی کے پورا کرنے اور ملک گیری کے لیے نہایت بداخلاقی اور نا انصافی سے برتا اور وحشی درندوں سے بھی بدتر کام کیے اور علما و اسلام نے اُنکی تائید کے لئے ایسے مسئلے بیان کیے جو اسلام کی روحانی نیکی کے برخلاف تھے : مگر اُنکے ایسا کرنے سے جو بُرائی قرار دی جاوے وہ انھیں پر محدود ہے۔ جنھوں نے ایسا کیا۔ نہ اسلام پر “

”اسلام میں اگرچہ جا بجا عفو و صبر و تحمل کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں اور اُنپر رغبت دلائی گئی ہے مگر اسی کے ساتھ بدلہ لینے کی بھی بغیر زبادت کی اجازت دی ہے۔ کیا یہ قانون دنیا کے پیدا کرنے والے کے قانون قدرت کے مناسب نہیں ہے ؟ اور کیا اس قانون سے زیادہ عمدہ اور سچا کوئی قانون ہو سکتا ہے ؟

انسان جب خلاق کی باتوں پر گفتگو کرتا ہے تو بہت سی ایسی باتیں ادا ایسے اصول بیان کرتا ہے جو کان کو اور دل کو نہایت بھلے علوم ہوتے ہیں اور سننے اور پڑھنے والے خیال کرتے ہیں کہ یہی اصول اخلاق کے

صرف دو صورتوں میں اُس نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے : ایک اُس حالت میں جب کہ کافر اسلام کی عداوت سے اور اسلام کو معدوم کرنے کی غرض سے ۔ نہ کسی ملکی اغراض سے ۔ مسلمانوں پر حملہ آور ہوں ، کیونکہ ملکی اغراض سے جو لڑائیاں واقع ہوں ۔ خواہ مسلمان مسلمانوں میں اور خواہ مسلمان و کافروں میں ۔ وہ دنیاوی بات ہے ۔ سکون مذہب سے کچھ تعلق نہیں ہے ۔ دوسرے جبکہ اُس ملک یا قوم میں مسلمانوں کو ۔ اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں ۔ انکی جان و مال کو امن نہ ملے اور فرائض نہ بھی ملے ، اور اُن کی اجازت نہ ہو ۔ مگر اس حالت میں بھی بتایا ہو کہ جو لوگ اُس ملک میں بطور رعیت کے رہتے ہیں ۔ گو صرف بوجہ اسلام کے اُن پر ظلم ہوتا ہو ۔ تو بھی اُنکو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی : یا اُس ظالم کو حسین یا ہجرت کرین یعنی اُس ملک چھوڑ کر چلے جاوین ۔ ان جو لوگ خود مختار ہیں اور اُس ملک میں امن نہ ہوے یا بطور رعیت کے نہیں ہیں بلکہ دوسرے ملک کے باشندے ہیں ۔ اُنکو ان مظلوم مسلمانوں کے بچانے کو ۔ جبہ صرف اسلام کی وجہ سے ظلم ہوتا ہو ۔ یا اُن کے ملے امن اور مذہبی آزادی حاصل کرنے کو تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے ۔ لیکن جسوقت کوئی ملکی یا دنیوی غرض اس لڑائی کا باعث ہو اُسکو مذہب کی طرف نسبت کرنے کی کسی طرح اسلام اجازت نہیں دیتا ۔

”یہی بات ہے جس پر اسلام نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے“ یہی لڑائی ہے جسکا نام جہاد رکھا ہے ، یہی لڑائی ہے جسے مقتولوں کو روحانی ثواب کا وعدہ دیا ہے ، یہی لڑائی ہے جسکے لڑنے والوں کی فضیلتیں بیان ہوئی ہیں ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کی لڑائی نا انصافی اور زیادتی ہے ؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی اخلاق کے برخلاف ہے ؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی قانون قدرت اور انسان کی فطرت کے مخالف ہے ؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اس لڑائی کا حکم خدا کی مرضی کے برخلاف ہے ؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اس حالت میں بھی لڑائی کا حکم نہوتا بلکہ دوسرا گال پھیر دینا خدا کی مرضی کے مطابق ہوگا ؟

لگایا ہو جو قانون قدرت کی زمین ہو اور جس قدر کہ پہلی زمین کی مٹی اُسکی جڑ میں لگی ہوئی ہو اسی قدر اُس میں نقصان ہو۔“

”اس سے بھی زیادہ رحیم مذہب کا حال سنو جس نے ایک چھوٹے سے چھوٹے جانور کی جان کو بھی مارنا سخت گناہ قرار دیا ہو؛ خون کا بہانا۔ آدمی کا ہو یا درندے کا یا ایک پشہ کا۔ خدا کی صنعت کو صنایع کرنا سمجھا ہو۔ مگر تاریخ اور زمانہ موجود ہو؛ اس اصول نے جو قانون قدرت کے مخالف تھا کیا نتیجہ دیا؟
قتل و خونریزی ویسی ہی رہی اور ویسی ہی ہو جیسی کہ قانون قدرت سے ہونی چاہیے؛ وہی۔ جو ایک پشہ کا مازگناہ عظیم سمجھتے تھے۔ ہزاروں آدمیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرتے تھے اور قتل کرتے ہیں۔ پس کوئی قانون گو وہ ظاہر میں کیسا ہی چکیلا اور خوش آئند ہو جبکہ وہ قانون قدرت کے برخلاف ہو مھض نکمٹا اور بے اثر ہو۔“
”اسلام میں جو خوبی ہو وہ یہی ہو کہ اُسکے تمام قانون قانون قدرت کے مطابق اور عمل درآمد کے لائق ہیں۔
رحم کی جگہ۔ جہاننگ کہ قانون قدرت اجازت دیتا ہو۔ رحم ہو، معافی کی جگہ معافی ہو، بدلے کی جگہ بدلہ ہو۔
لڑائی کی جگہ لڑائی ہو، ملاپ کی جگہ ملاپ ہو، اور یہی بڑی دیل اُسکی سچائی کی اور قانون قدرت کے بنانے والے کی طرف سے ہونے کی ہو۔“

”اسلام فساد اور دغا اور غدرو بغاوت کی اجازت نہیں دیتا، جس نے اُنکو (یعنی مسلمانوں کو) امن دیا ہو۔ مسلمان ہو یا کافر۔ اُسکی اطاعت اور احسان مندی کی ہدایت کرتا ہو، کافروں کے ساتھ جو عہد اقرار ہو ہوں اُنکو نہایت ایمانداری کے ساتھ پورا کرنے کی تاکید کرتا ہو، خود کسی پر ملک گیری اور فتوحات حاصل کرنے کو فوج کشی اور خونریزی کی اجازت نہیں دیتا، کسی قوم یا ملک کو اس غرض سے۔ کہ اُس میں باجبر اسلام پھیلا جاوے۔ حملہ کر کے مغلوب و مجبور کرنا پسند نہیں کرتا؛ یہاں تک کہ کسی ایک شخص کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا نہیں چاہتا۔“

مسلمانوں نے حبشہ میں جا کر پناہ لی اور آخر کار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے آئے ؛ پھر انھوں نے وہاں بھی تعاقب کرنا چاہا اور مکہ میں حج کے آنے سے روکا ، لڑائی پر آمادہ ہوئے ؛ تب اسلام نے اُن سے لڑنے کا حکم دیا ۔ پس جب قدر احکام قتل مشرکین کے ہیں وہ سب انھیں لڑنے والوں سے متعلق ہیں ؛ وہ بھی اُسی وقت تک کہ فتنہ و فساد رفع ہو جائے ؛ جیسے کہ خود خدا نے فرمایا ہے ”وقاتلوہم حتی لا یبقوا فتنۃً ویکون الدین للہ“ امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ ”مشرکین کا فتنہ یہ تھا کہ وہ مکہ میں مسلمانوں کو مارتے تھے اور ایذا دیتے تھے ؛ یہاں تک کہ تنگ ہو کر مسلمان حبشہ کو چلے گئے پھر بھی وہ برابر ایذا اور تکلیف دیتے رہے ؛ یہاں تک کہ مسلمان مدینہ میں ہجرت کر گئے اور مشرکین کی غرض ایذاؤں اور تکلیفوں سے یہ تھی کہ مسلمان اپنا اسلام چھوڑ کر پھر کافر ہو جائیں ۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اُس کے معنی یہ ہیں کہ کافروں سے لڑو جب تک کہ اُن پر غالب ہو جاؤ ؛ تاکہ وہ تمکو تمھارے دین سے پھیرنے کیلئے ایذا نہ دے سکیں اور تم شرک میں نہ پڑو“ یکون الدین للہ کا فقرہ بھی انھیں آیتوں کے ساتھ ہے جو مشرکین عرب کے حملہ کے دفع کرنے کو لڑنے کی بابت نازل ہوئی تھیں ۔ اس کے یہ معنی سمجھئے ۔ کہ اتنا لڑنا چاہیے کہ اسلام کے سوا کوئی دین نہ رہے ۔ یہ تو محض نادانی کی بات ہے جو سلف سے آج تک نہ کبھی ہوئی اور نہ ہونے کی توقع ہو سکتی ہے ۔ اس کے معنی صاف صاف یہ ہیں کہ اس قدر لڑنا چاہیے کہ اللہ کے دین بجالانے میں جو کافر ہرج ڈالتے ہیں وہ نہ رہے اور اللہ کے لیے دین ہو جائے کہ مسلمان خدا کے لیے اُسکو بے ایذا کے بجالا سکیں“

سر سید نے سورہ بقرہ کی تفسیر میں مسئلہ جہاد کے متعلق صرف اسی اجمالی بیان پر اکتفا کیا ہے ۔ مگر سورہ انفال و سورہ توبہ کی تفسیر میں اس بحث کو نئے سرے سے بہت بڑا ہے

” لڑائی شروع ہونے کے بعد تلوار ہر ایک کی دوست ہوتی ہے؛ اس میں بجز اسکے کہ دشمنوں کو قتل کرو، لڑائی میں بہادری کرو، دل کو مضبوط رکھو، میدان میں ثابت قدم رہو، فتح کرو یا مارے جاؤ۔ اور کچھ نہیں کہا جاتا؛ وہی قرآن نے بھی کہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص اس موقع اور محل کو جس کی نسبت قرآن میں لڑنے والوں کے دلوں کے مضبوط کرنے کی آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ چھوڑ کر ان آیتوں کو عموماً خونخواری اور خونریزی پر منسوب کرے۔ جیسا کہ اکثر نادان عیسائیوں نے کیا ہے۔ تو یہ خود اسکا قصہ ہو گا نہ اسلام کا۔“

” لڑائی میں بھی جو رحم قانون قدرت کے موافق ضرور ہے اسلام نے اس میں بھی فرو گذاشت نہیں کیا؛ عورتوں کو، بچوں کو، بوڑھوں کو اور جو لڑائی میں شریک نہ ہوئے ہوں انکو قتل کرنے کی ممانعت کی؛ عین لڑائی میں اور صف جنگ میں جو مغلوب ہو جاوے اسکے قتل کی اجازت نہیں دی؛ صلح کو، عیادہ امن کو قبول کرنے کی رغبت دلائی؛ باغ کو، کھیتوں کو جلانے کی ممانعت کی؛ قیدیوں کو احسان، لکھ کر یا فدیہ نیکر چھوڑ دینے کا حکم دیا؛ نہایت ظالمانہ طریقہ جو لڑائی کے قیدیوں کو عورت ہوں یا مرد۔ غلام اور لونڈی بنالینے کا تھا اسکو معدوم کیا۔ اس سے زیادہ لڑائی کی حالت میں انصاف اور رحم کیا ہو سکتا ہے؟ ہاں یہ سچ ہے کہ مسلمانوں نے ایمن سے کسی کی بھی پوری تعمیل نہیں کی؛ بلکہ برخلاف اسکے بے انتہا ظلم و ستم کیے۔ مگر جبکہ وہ اسلام کے حکم کے برخلاف تھے تو اسلام کو اس سے داغ نہیں لگ سکتا۔ وہ بھی تو مسلمانوں ہی میں سے تھے منھوں نے عمر کو، عثمان کو، علی کو، حسین کو ذبح کر ڈالا تھا، کعبہ کو جلادیا تھا۔ پس اُنکے کردار سے اسلام کو کیا تعلق ہے؟“

” مشرکین مکہ نے اُن لوگوں پر جو مسلمان ہو گئے تھے۔ صرف اسلام کی عداوت سے اور خود رسول خدا صلعم پر بہت سے ظلم کیے تھے اور تکلیفیں پہنچائی تھیں، قتل کے درپے تھے، یہاں تک کہ ایک دفعہ

ہو گیا تو دین اسلام کے معدوم کرنے یعنی رسول خدا صلیم کے قتل کا نہایت نچیتہ طور سے منصوبہ باندھا گیا ۔
 درود فوجا ٹھین سختیوں اور ظلم و ستم سے تنگ آ کر بہت سے مسلمان مرد اور عورتیں ہجرت کر کے حبشہ کو چلے گئے
 اور آخر کار آنحضرت کو اور تمام مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے وطن مالوف چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی ۔
 قریش نے ہجرت کے بعد بھی مسلمانوں کے آزار پہنچانے میں کمی نہیں کی ۔ حبشہ کے مہاجرین کا
 تعاقب انہوں نے سمندر کے کنارہ تک کیا اور جب وہ ہاتھ نہ آئے تو نجاشی کے پاس بہت سی تحفے
 اور ہدیے بھیج کر مسلمان کو اُس سے مانگا مگر نجاشی نے اُنکے دینے سے انکار کیا ۔ اہل مدینہ کے ساتھ بھی
 جنہوں نے آنحضرت کی نصرت کا وعدہ کیا تھا یا جو مکہ سے ہجرت کر کے وہاں آئے تھے ۔ قریش نے بُرائی
 کرنے میں کچھ کمی نہیں کی اور مدینہ پر بھی قریش کے حملہ کرنے کا برابر خطہ لگا رہا ۔

جب کہ اسلام اور اہل اسلام کی یہ حالت تھی تو سرسید لکھتے ہیں کہ ”ایسی حالت میں آنحضرت صلیم
 کو اور مہاجرین و انصار کو اپنے اور مدینہ کی حفاظت اور امن قائم رہنے کے لیے ++ چار امر لازمی تھے کہ بغیر انکے کبھی
 امن اور مطلوبہ حفاظت کسی طرح قائم نہیں رہ سکتی تھی ۔ (۱) اس بات کی خبر رکھنی کہ قریش مکہ کیا کرتے ہیں اور
 کس منصوبہ میں ہیں (۲) جو قویں کہ مدینہ یا نولوح مدینہ میں رہتی نہیں اُن سے امن کا اور قریش کی مدد نہ کرنا
 معاہدہ کرنا ؛ لیکن عہد شکنی کی حالت میں اُن سے مقابلہ کرنا اُس منصوبہ کے لیے ایسا ہی ضروری تھا جیسا کہ امن کا
 معاہدہ کرنا ؛ کیونکہ اگر عہد شکنی کی مکافات قائم نہ کی جائے تو کوئی معاہدہ اپنے عہد پر قائم نہیں رہ سکتا اور امن
 مطلوبہ حاصل نہیں ہو سکتا (۳) جو مسلمان کہ مکہ میں مجبوری نہ لگے تھے اور موقع پا کر وہاں سے بھاگ آنا چاہتے تھے
 اُنکے بھاگ آنے پر جہاد ہو سکے اُنکی اعانت کرنا ۔ (چنانچہ جو قافلہ مکہ سے نکلتا تھا ہمیشہ احتمال ہوتا تھا کہ شاید اُسکے
 ساتھ بہانہ کر کے کوئی مسلمان مدینہ کی طرف بھاگنے کے ارادہ سے نہ نکلا ہو ۔ (۴) جو گروہ قریش کا مکہ سے مدینہ پر

اہتمام کے ساتھ اٹھایا ہو اور اپنی تفسیر کی چوتھی جلد قریب نصف کے اسی مسئلہ کی تحقیقات پر لکھی ہو۔

انھوں نے سورہ توبہ کی تفسیر میں اول بطور الزامی حجت کے آنحضرتؐ کی لڑائیوں کا مقابلہ حضرت موسیٰ کے قتل و غارت سے۔ جو کہ توریت میں مذکور ہو کیا ہو اور لکھا ہو کہ آنحضرتؐ کی لڑائیاں اُسکے مقابلہ میں بالکل رحمت تھیں اور جو لوگ توریت کو اور حضرت موسیٰ کو مانتے ہیں اُنکے لیے حضرت مسیح کا یہ قول کافی ہو کہ ”تو اُس سنگے کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہو کیوں دیکھتا ہو اور جو شہتیر تیری آنکھ میں ہو اُسے دریافت نہیں کرتا“ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں ”مگر ہمارا یہ طریقہ نہیں ہو کہ ہم صرف محبت الزامی پر اکتفا کریں بلکہ ہمارا مقصود ہمارے تحقیق کرنا اور اُسکی صلیت کو ظاہر کرنا ہو اسلئے ہم اس امر کو بخوبی تحقیق کرنا چاہتے ہیں“

اس کے بعد انھوں نے اُن تمام اعتراضات کا۔ جو قدیم سے عیسائی اسلام کے مسئلہ بہادری کرتے چلے آئے ہیں۔ کتب لباب بیان کر کے اس بات کا دعوے کیا ہو کہ تمام لڑائیاں جو آنحضرتؐ صلعم کے زمانہ میں مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ہوئیں اُنسے صرف امن قائم رکھنا اور کفار کے شر سے اسلام اور اہل اسلام کو بچانا مقصود تھا نہ کہ زبردستی ہتھیاروں کے زور سے۔ جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں۔ اسلام منواتا۔ اور اُسکے ثبوت میں اول اُن تمام واقعات کی تفصیل بیان کی ہو جنسے معلوم ہوتا ہو کہ تیرہ برس تک برابر آنحضرتؐ صلعم اور مسلمانوں نے مکہ معظمہ میں قریش کے ہاتھوں سے کسی کیسی سختیاں اور ظلم و ستم برداشت کیے اور کیا مصیبتیں جھیلیں اور کس بیم و ہراس کی سمات میں یہ زمانہ اسلام اور بانی اسلام پر گزرا یہاں تک کہ جب آنحضرتؐ کے شفیع چچا ابوطالب انتقال

واقع ہوئیں ++ اس کے بعد ایک املہ اور بحث طلب باقی رہ جائیگا (یعنی یہ) کہ ایک پیغمبر کو اس قسم کی لڑائیوں
لڑنا بھی زیبا ہے یا خاموشی سے گردن کٹوا کر اور سر کو ملشت میں رکھوا کر دشمن کے سامنے جانے دینا؟ یا کافروں کے
ہاتھوں میں اپنے تئیں ڈلو کر صلیب پر چڑھنا اور جان دینا؟ سو ہم سپر بھی اخیر کو بحث کریں گے۔

اس کے بعد انھوں نے نہایت شد و مد سے دعوے کیا ہیں کہ قرآن کی کسی آیت میں جبراً مسلمان
کرنے کا حکم نہیں ہے بلکہ مسلمان کرنے کے لئے صرف عطا اور نصیحت کرنے کی ہدایت ہے۔ پھر وہ آیتیں
نقل کی ہیں جنہیں مذہب کی آزادی کا حکم ہے مثلاً سورہ نحل میں آنحضرت کو حکم ہے کہ ”دعوت اسلام کو
حکمت اور مواعظِ حسنہ کے ساتھ اور اُن سے بحث کر پسندیدہ طریقہ کے ساتھ“ یا سورہ نور میں حکم ہے کہ ”خدا اور رسول
کی فرمانبرداری کرو اور اگر تم پھر جاؤ گے تو ہمارے رسول کے ذمہ صرف حکم کا پہنچا دینا ہے“ یا سورہ قاف میں
فرمایا کہ ”ای پیغمبر تو اپنے جبر کرنے والا نہیں ہے“ اور سورہ غاشیہ میں فرمایا کہ ”ای پیغمبر تو صرف نصیحت کرنا ہے
کچھ انپر کڑوا نہیں ہے“ اور سورہ یونس میں فرمایا کہ ”ای پیغمبر کیا تو انکو مجبور کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں“
اور سورہ بقرہ میں صاف صاف فرمادیا کہ ”دین میں کچھ جبر و اکراہ نہیں ہے“

اس کے بعد مخالفین کے اس اعتراض کا ذکر کیا ہے کہ قرآن کی یہ نصیحتیں اُسی وقت تک تھیں
جب تک کہ آنحضرت مکہ میں تھے مگر جب مدینہ میں چلے گئے اور مجاہدین و انصار ایک جگہ جمع ہو گئے
اور اسلام کو قوت حاصل ہو گئی اُس وقت یہ نصیحتیں بدل دی گئیں اور تلوار کے زور سے مسلمان کرنے کا
حکم دیا گیا۔ پھر اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ اول تو سورہ نور اور سورہ بقرہ ہجرت کے بعد مدینہ میں
نازل ہوئی ہیں جب کہ اسلام کو بخوبی قوت ہو گئی تھی؛ حالانکہ انھیں سورتوں میں۔ جیسا کہ اوپر ذکر
کیا گیا۔ یہ حکم ہے کہ رسول کا کام صرف حکم کو پہنچا دینا ہے اور دین میں کچھ جبر و اکراہ نہیں ہے۔

عملہ کرنے کو نکلے یا کسی طرح پر احتمال ہو کہ وہ دینہ پر آنے والا ہو اسکا ہتھیاروں سے مقابلہ کرنا؛ کیونکہ ایسا کرنا اسی امن کے قائم رکھنے کے لیے لازمی اور مفید ہے۔

اسکے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”انکے سواہ و امر اور ہیں جو ہتھیاروں کے اٹھانے کا باعث ہوتے ہیں

(۱) یہ کہ کفار اُن مسلمانوں کو جو اُنکے قبضہ میں ہوں۔ تکلیف اور ایذا دیتے ہوں اور اُنکی مخلصی کے لئے ++

لڑائی کیجاوے ++ کو ن شخص ہے جو اس لڑائی کو انسانی اخلاق اور انسانی نیکی کے برخلاف کہہ سکتا ہے ++ اور یہ اتہام

کر سکتا ہے کہ وہ زبردستی اور ہتھیاروں کے زور سے مذہب قبولانے کے لئے ہے (۲) یہ کہ کفار مسلمانوں کو اُنکے

احکام مذہبی ادا کرنے کے لئے مانع ہوں۔ بشرطیکہ وہ اُنکی علمداری میں رہتے نہ ہوں۔ کیونکہ اس صورت میں اُنکو

وہاں سے ہجرت کرنی لازم ہے نہ لڑائی۔ اگرچہ اس لڑائی کی بنیاد ایک مذہبی امر ہے لیکن اسکا مقصد اپنی مذہبی

آزادی حاصل کرنا ہے نہ کہ دوسروں کو ++ ہتھیاروں کے زور سے مذہب کا منوانا “

پھر لکھتے ہیں کہ ”ایک اور امر ہے جو انھیں قسموں کی لڑائیوں کا ضمیمہ ہے؛ یعنی جس ملک یا قوم سے

انھیں امور (یعنی مذہبی امور) کے سبب مخالفت ہے اور لڑائی مشترکہ ہو چکی ہے اُس ملک یا قوم پر چھاپا پڑنا یا اُنکا

اسباب اور اُنکی رسد اور اُنکے ہتھیاروں کو لوٹ لینا۔ اس زمانہ تہذیب میں بھی کونسی تہذیب سی جہ مذہب

قوم ہے جو اس فعل کو نامذہب ناجائز قرار دے سکتی ہے؟ اور کون ہے جو اُسکو ہتھیاروں کے زور سے مذہب کا

قبلہ نام قرار دے سکتا ہے؟ تمام لڑائیاں جو آنحضرت صلعم کے زمانہ میں ہوئیں وہ انھیں امور پر مبنی تھیں۔ ایک

لڑائی بھی اس غرض سے نہیں ہوئی کہ مخالفوں کو زبردستی اور ہتھیاروں کے زور سے اسلام منوایا جائے “

اسکے بعد لکھتے ہیں کہ ”اس دعوے کا ثبوت دو طرح پر ہو سکتا ہے؛ اول اُن احکام جو قرآن مجید

میں لڑائیوں کی نسبت وارد ہیں اور جسے ظاہر ہو گا کہ لڑائی کا حکم صرف امن قائم کرنے کے لئے تھا نہ زبردستی

سے اسلام قبولانے کے لئے۔ دوسرے اُن لڑائیوں کے واقعات پر غور کرنے سے جو آنحضرت صلعم کے زمانہ میں

بلکہ یہ تمام لڑائیاں اور مقابلے یا تو دشمنوں کی ممانعت اور انکا حملہ روکنے کے لئے ہوئے تھے، یا انکا ارادہ فاسد معلوم ہونیکے بعد انکو منتشر کرنے کو، یا انکی عمد شکنی اور دغا بازی ظاہر ہونے کے بعد، اور یا ان لوگوں کی مدد کے لیے جو خبر سانی کی غرض سے بھیجے گئے تھے اور دشمنوں سے انکا مقابلہ ہو گیا۔ اسکے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے کہ جس نے ملک کا انتظام ہاتھ میں لیا ہو اور اسکو اس قسم کی لڑائیاں نہ پیش آئی ہوں۔ پھر ان لڑائیوں کی نسبت یہ کہنا کہ دبر دستی ہتھیاروں کے زور سے مسلمان کرنے کے لئے تھیں ایک ایسا غلط قول ہے جسکو کوئی ذی عقل بجز اس کے جسکے دل میں تعصب بھرا ہو تسلیم نہیں کر سکتا“

پھر لکھتے ہیں کہ ”جس قوم کی کسی ملک میں حکومت ہو جاتی ہے قدرتی طور پر اس قوم کے نصیب مذہب کو بلکہ رسم و رواج و عادات و اطوار کو ترقی ہوتی ہے اور لوگ انکی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں اور یہ مقولہ کہ ”الْمَلَائِكَةُ وَالَّذِينَ تَوَاصَوْا“ ہر ایک قوم اور ہر ایک مذہب پر صادق آتا ہے۔ اسی طرح اسلامی حکومت کے سبب اسی قدرتی قاعدہ سے اسلام کی ترقی کو بھی مدد پہنچی ++++ بلکہ اسلام کی تاریخ میں ایک ایسا عجیب واقعہ پایا جاتا ہے جو اور کسی مذہب کی تاریخ میں نہیں ہے کہ فاتح قوم نے فتح کامل حاصل کرنے اور استقلال کامل پانے کے بعد اپنی مفتوح قوم (یعنی مسلمانوں) کا دفعۃً مذہب اختیار کر لیا“

اسکے بعد آنحضرت کی بت شکنی میں (جسکو مخالفین اسلام مثل سلاطین اسلام کی بت شکنی کے

لے بہانہ فاتح قوم سے مراد خواریں تاتاریں جنہیں سب سے زیادہ نامور چنگیز خان اور ہلاکو خان کہتے ہیں جو مسلمانوں کے سخت دشمن تھے چنانچہ چنگیز خان کا قول تھا کہ ”خدا تعالیٰ نے مجھے مسلمانوں کے قلع و قمع کے واسطے بھیجا ہے“ انکی حکومت تمام ایران توہان خودزم دشت قباقر اور روس و خوارزم پھیلی ہوئی تھی۔ اسی سلطنت اور حکومت کے زمانہ میں اول برک خان چنگیز خان کا پوتا مسلمان ہوا تھا اور پھر سلطان احمد جسکا نام اسلام سے پہلے نکودار تھا اسلام لایا اور پھر رفتہ رفتہ تمام تاتاریوں میں اسلام پھیل گیا ۱۲

دوسرے خدا کے احکام جو بطور اصل اصول کے نازل ہوئے ہیں وہ جگہ کے بدلنے یا قوت و ضعف کے تفاوت سے تبدیل نہیں ہو سکتے۔ پس جب کہ آپ مکہ میں تھے جب بھی اور جب مدینہ میں چلے گئے جب بھی یہی حکم تھا کہ کوئی شخص زبردستی سے مسلمان نہ کیا جائے۔ ہاں جب آپ مدینہ میں تشریف لے گئے تو بے شک لڑائی کا حکم ہوا مگر نہ اسلئے کہ لوگوں کو جبراً مسلمان کیا جائے بلکہ محض امن قائم کرنے کے لیے جیسا کہ آئندہ تفصیل بیان کیا جائیگا۔

اسکے بعد صلح اور معاہدہ کی حالت میں جو مذہبی آزادی قرآن میں غیر مسلمین کو دی گئی ہے اسکا مفصل ذکر کیا ہے اور قرآن کی وہ تمام آیتیں نقل کی ہیں جن میں صلح و معاہدہ کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ پھر قرآن مجید کی وہ تمام آیتیں جن میں کفار سے لڑنے کا حکم ہے ایک ایک کر کے ذکر کی ہیں اور نہایت وضاحت اور صفائی کے ساتھ اُن سے ثابت کیا ہے کہ قرآن میں صرف تین قسم کے لوگوں سے لڑائی کا حکم ہوا ہے (۱) اُن لوگوں سے جو خود مسلمانوں سے لڑائی شروع کریں (۲) اُن لوگوں سے جنہوں نے دغا بازی کی ہو اور معاہدوں کو توڑ دیا ہو (۳) اُن لوگوں سے جنہوں نے مسلمانوں کو یا اُن کے بچوں اور عورتوں کو عذاب اور تکلیف میں ڈال رکھا تھا۔ ان تین صورتوں کے سوا کہیں قرآن میں لڑائی کا حکم نہیں دیا گیا۔ پھر انھوں نے آنحضرت صلعم کے زمانہ کی تمام لڑائیاں جو غزوہ اور سریہ کے نام سے مشہور ہیں بالاستیعاب بیان کی ہیں اور سلسلہ سے ۳۱ غزوات اور ۵۲ سریا کا مفصل حال حدیث اور سیر اور جغرافیہ کی سولہ معتبر کتابوں سے لکھا ہے اور کمال خوبی اور صفائی کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ ان ۸۳ واقعات میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس غرض سے کیا گیا ہو کہ لوگوں کو بھروسہ و رستہ شیر مسلمان کیا جائے

اور نہ عیسائی مذہب کا نام باقی رہتا اگر بعد حضرت مسیح کے اُسکے لیے ایسا زمانہ نہ آتا جس میں اُسکے پیروں کی مخالفت سے حفاظت کی گئی اور بڑی حکومت اُسکو ترقی دی گئی۔ قرآن میں نہایت عمدہ اور بالکل سچ بات خدا تعالیٰ نے فرمائی ہے کہ ”وَلَوْ كَادَ فَعَّ اللَّهُ النَّاسَ بَعْضُهُمْ بِبَعْضٍ لَهْذَ مَتَّ صَوَائِعُ وَبَيْعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا“ (یعنی اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا تو ڈھادی جاتیں عیسائیوں اور رد ویشوں کی خانقاہیں اور یہودیوں کے معبود اور مسلمانوں کی مسجدیں جنہیں بہت زیادہ خدا کا ذکر کیا جاتا ہے) پس یہ کہنا کہ ابنیا کو ایسی لڑائیاں نازیبا ہیں ایک ایسا قول ہے جسکو قانون قدرت مہود ٹھیراتا ہے۔ لوگ حضرت موسیٰ کے کاموں کو تو بھول جاتے ہیں اور غریبی اور مسکینی اور مظلومی کی مثال میں حضرت مسیح کو پیش کرتے ہیں؛ مگر حضرت مسیح نے جب اپنے تئیں خلقت کے سامنے پیش کیا اُسوقت اُنکی وفات تک نہایت قلیل زمانہ قریب تین برس کے گزرا تھا اور صرون ستر آدمیوں کے قریب (اس عرصہ میں) اُنپر ایمان لائے تھے؛ اُنکو مطلق ایسی قوت جس سے وہ اپنے دشمنوں کو دفع کر سکیں حاصل نہیں ہوئی تھی اور اسی سبب سے کالوری کے پہاڑ پر وہ افسوسناک واقعہ (یعنی مصلوب ہونا) واقع ہوا۔ اُسکے بعد اگر اُسکے (یعنی دین مسیحی کے) ایسے حامی نہ پیدا ہو جاتے جو دشمنوں کو دفع کر سکے تو آج دنیا میں ایک بھی گرجا اور ایک بھی خانقاہ نہ دکھائی دیتی۔ اس کے علاوہ آنحضرتؐ کو روحانی بادشاہی کے سوا ایسا کوئی سلطنت کے انتظام میں داخل ہونے میں بہت بڑی مجبوری تھی؛ عرب میں بادشاہت کا وجود نہ تھا۔ ہر ایک قبیلہ کا سردار اُنکا حاکم ہوتا تھا اور جسکو سب لوگ بڑا سمجھتے تھے اُسکو مجبوری افسر بننا اور تمام ملکی انتظام کرنا لازم تھا؛ جبکہ تمام قبائل رفتہ رفتہ مسلمان ہو گئے تو امکان سے خارج تھا کہ وہ لوگ سوائے آنحضرتؐ کے اور کسی کو اپنا سردار تسلیم کرتے اور تمام معاملات ملکی بجز آنحضرتؐ کے حکم کے اور کسی کے حکم سے تعمیل پاتے۔ پس ہر بات پر انصاف سے غور کرنا چاہیے نہ تعصب سے۔“

قابل الزام سمجھتے ہیں) اور محمود و عالمگیر وغیرہ کی بت شکنی میں فرق بیان کیا ہو اور لکھا ہے کہ ”کعبہ ایک مسجد تھی حضرت ابراہیم کی بنائی ہوئی خدائے واحد کی عبادت کے لیے؛ اُسکے بعد جب عرب بت پرست ہو گئے تو اُس مسجد میں انھوں نے بت رکھ دیے جنکا برباد کرنا اور دین ابراہیم کا اُس (مسجد) میں جاری کرنا ابراہیم کے پہلوئے بیٹے کے فرزند کو لازم تھا۔ قوم عرب۔ جسکا غالب حصہ ابراہیم کی نسل سے تھا اور جس نسل میں خود آنحضرتؐ بھی تھے۔ اُس قوم کو بتوں کی پرستش سے چھڑانا اور ابراہیم کے خدا کی پرستش سکھانا ضرور تھا۔ پس آنحضرتؐ نے خود اپنی قوم کے بت توڑے تھے اُس سے دیگر اقوام کے مذہب کی آزادی کو ضائع کرنا لازم نہیں آتا“

اسکے بعد لکھتے ہیں کہ ”مسلمانوں کی تاریخ میں جہاں بت شکنی اور غیر مذہب کے معبودوں کے برباد کرنے کی مثالیں ملتی ہیں اسی طرح ہزاروں مثالیں اسکے برخلاف بھی موجود ہیں۔ مسلمانوں کی سلطنت دنیا کے بہت بڑے حصہ میں پھیلی ہوئی تھی، اُس میں مختلف مذہب کی قومیں ہوتی تھیں، تمام سینگاگ اور تمام گرجے۔ جو زیادہ تر رومن کیتھولک مذہب کے تھے۔ بدستور قرنائی اور گھنٹے بجاتے تھے، تمام ملک میں ناقوس کی آواز گونجتی تھی، مندروں میں بت موجود تھے، ہر ایک قوم اپنے مذہب میں آزاد تھی، پس ان تمام حالات کو۔ جو نہایت کثرت سے تھے۔ بھول جانا اور چند واقعات کو۔ جو اسکے برخلاف شخصی طبیعت سے واقع ہوئے تھے۔ پیش کرنا اور کہنا کہ اسلام نے مذہبی آزادی کو مٹایا تھا محض ناانصافی ہے“ اسکے بعد آنحضرتؐ کے غزوات کی نسبت لکھتے ہیں کہ ”تمام انبیاء جب کہ قوم کی اصلاح اور انکی درستی کو کھڑے ہوتے ہیں تو ابتدا میں عموماً اُنکے دشمن چاروں طرف ہوتے ہیں؛ اگر وہ مخالفین محفوظ رہنے کی کوشش نہ کرتے تو دنیا میں نتائج یہودی مذہب کا وجود ہوتا اور نہ اور کسی مذہب کا؛

پر یچنگ اوف اسلام پر کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا اور اُس مین کامیابی کی امید بند ہو اُن مین ایک بڑا محرک سرسید کی تحریرات کا مطالعہ تھا۔

مثلاً

معراج کے مسئلہ پر بھی سرسید نے تفسیر مین نہایت مفصل بحث کی ہے جو اُن سے پہلے کسی مفسر نے نہیں کی۔ معراج جسمانی پر جو عیسائی یہ اعتراض کرتے تھے کہ یہ عقل کے بالکل خلاف ہے اُس کے الزامی جواب ازالۃ الاولیاء وغیرہ مین عمدہ عتیق و عمدہ جدید کے حوالوں سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے مین ؛ مگر یہ جوابات اُن لوگوں کے لئے کافی نہ تھے جو توریت و انجیل کو نہیں مانتے یا بالکل قید مذہب سے آزاد ہیں اس لئے ضرور تھا کہ معراج کے سوال پر محققانہ بحث کی جائے اور معراج کی حقیقت جو قرآن و حدیث سے پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے اُس کو ظاہر کیا جائے۔ سرسید نے اس مسئلہ پر اپنی تفسیر کے ۱۷۰ صفحہ مین نہایت بسط کے ساتھ بحث کی ہے مگر ہم اس موقع پر صرف اُس کا اَلْبَاب بیان کرینگے جنکو تفصیل دیکھنی منظور ہو وہ اصل تفسیر کو ملاحظہ کریں۔

انھوں نے اُن تمام روایتوں مین سے جو معراج کے متعلق حدیث اور سیر کی کتابوں مین قلمبند کی گئی ہیں۔ غالباً کوئی روایت باقی نہیں چھوڑی اور چونکہ ان روایتوں مین اس قدر اختلاف ہے کہ شاید ہی کسی اور مضمون کی روایات مین ایسا اختلاف ہوگا۔ اس لئے معراج کے تمام جزئیات کے متعلق جس قدر اختلافات ہیں اُن سب کو اول جدا جدا بیان کیا ہے مثلاً اس بات مین اختلاف کہ معراج کب ہوئی؟ یا یہ کہ معراج اور انسداد (جس کا ذکر قرآن مجید مین ہوا ہے) ایک واقعہ تھا یا دو جدا گانہ واقعات تھے؟ یا معراج ایک دفعہ ہوئی یا دو دفعہ؟ یا معراج جسد کے ساتھ بیداری مین ہوئی یا روح کے ساتھ رؤیا مین؟ غرض سی قسم کے بڑے بڑے اختلافات

سرسید کی ان تمام تحریروں کا۔ جو کہ انھوں نے جہاد کے متعلق ۱۸۵۷ء سے لکھنی شروع کی تھیں اور جن کا تفسیر القرآن پر خاتمہ ہو گیا۔ یہ نتیجہ ہوا ہے کہ بہت سے منصف مزاج انگریزوں نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ دین اسلام میں جبراً مسلمان کرنے اور کفار سے عموماً جہاد کرنے کا حکم نہیں ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے اواخر ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے ایک بہت بڑے عربی دان حاکم نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ”جہاد (ازروی اصول اسلام) اُن لوگوں کے مقابلہ میں ہونا چاہیے جو صرف کافر ہی نہیں بلکہ تعمیل شرائط اسلام میں مزاحمت بھی کرتے ہوں الذین کفروا و صلا و اعن سبیل اللہ +++“ جہاد کی شرط ضروری یہ ہے کہ حاکم کی طرف سے احکام اسلام کی تعمیل میں مسلمانوں پر جبر و تعدی یا مزاحمت ہوتی ہو +++ اور جبر و تعدی و مزاحمت جو وجوب جہاد کے لیے شرط ہے وہ بھی معاملات باہمی میں معتبر نہیں بلکہ معاملات مذہبی میں ہونی ضروری ہے +++ مسلمان جو انگریزی عملداری کے ظل حمایت میں رہتے ہیں جہاد کے باب میں اُنکو شریعت نے ایسی سخت قیود کے ساتھ جکڑ رکھا ہے کہ جب تک وہ تمام شرائط نہ پائے جائیں جہاد پر اقام نہیں کر سکتے حالانکہ انگریزی عملداری میں انہیں سے کوئی شرط بھی پائی نہیں جاتی بلکہ فی زمانہ مسلمانوں کو وہ امن حاصل ہے جو پیغمبر صاحب اور اُنکے ہمراہیوں کو نجاشی نصرانی فرمانروای ابیسینیہ کی حمایت میں حاصل تھا۔ پس جب تک اس طرح کا امن باقی ہے بغاوت ایک شرعی گناہ سمجھا جائیگا۔“

مسٹر ٹی ڈبلیو آرنلڈ جو ایک نہایت سچے اور منصف مزاج عیسائی ہیں انھوں نے تو اپنی کتاب پر یچنگ اوف اسلام میں (جو ابھی شائع ہوئی ہے) اس بحث کا بالکل خاتمہ کر دیا ہے کہ قرآن کی رو سے غیر مذہب والوں کو بزور شمشیر مسلمان کرنے کا حکم ہے یا بذریعہ وعظ و نصیحت کے ؟ اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو اس میں کچھ شک نہیں معلوم ہوتا کہ جن اسباب سے پروفیسر مروج کے دل میں

یہ لکھی ہو کہ جب عقل اور نقل میں بظاہر اختلاف پایا جائے تو نقل کے معنی اسطرح بیان کرنے چاہئیں جو عقل کے مطابق ہوں اور بڑے بڑے علما مثل امام سخاوی، ابن جوزی، ابوبکر بن الطیب وغیرہم کے اقوال اس باب میں نقل کیے ہیں کہ حدیث کے موضوع ہونے کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہو کہ اُسکا مضمون عقل یا حسن اور مشاہدہ کے خلاف ہو اس دلیل کے ذیل میں ایک لطیف بحث اس مضمون پر کی ہو کہ حدیث میں جو کتب احادیث میں جمع کی گئی ہیں اُنکے الفاظ بعینہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ راویوں کے الفاظ ہیں جو انھوں نے اپنی سمجھ کے موافق بیان کیے ہیں اور اسکے ثبوت میں تابعین و تبع تابعین کے اقوال نقل کیے ہیں جنہیں سے حسن اور سفیان ثوری کا یہ قول ہو کہ اگر ہم حدیث اُسی طرح بیان کرنی چاہیں جس طرح سنی ہو تو ایک حرف بھی نہ بیان کر سکیں۔ غرض کہ اس مطلب کو نہایت خوبی سے ثابت کیا ہو اور اُس سے یہ نتیجہ نکالا ہو کہ معراج کی حدیثوں میں جس قدر واقعات عقل کے خلاف پائے جاتے ہیں ضرور ہو کہ اُنکی تاویل عقل کے مطابق کی جائے نہ یہ کہ جن روایتوں سے معراج کا خواب میں ہونا پایا جاتا ہو اُنکو تاویلات بعیدہ اور رکیکہ اور دلائل فرضیہ و رازکار سے ایسا واقعہ بنا دیا جائے جو حقیقت اور عقل دونوں کے خلاف ہو۔

تیسری خصوصیت اس تفسیر کی یہ ہو کہ اُس میں برخلاف قدیم تفسیرین کے روایات کی طرف بغیر سخت ضرورت کے بہت ہی کم رجوع کیا گیا ہو۔ اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہو کہ ہماری قدیم تفسیرین باتفاق تمام محققین اہل اسلام کے عموماً بے سند اور موضوع و ضعیف حدیثوں اور یہودیوں کے قصوں سے بھری ہوئی ہیں اور اسکا ایک بدیہی ثبوت یہ ہو کہ جس قدر روایتیں

جو روایات متعلقہ واقعہ معراج میں پائے جاتے ہیں اُن سب کو مع ہر ایک روایت کے بیان کیا ہے۔ پھر ان اختلافات کے اسباب اور وجوہ جو قرین قیاس تھے بیان کیے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ معراج اور انسراء درحقیقت ایک ہی واقعہ تھا اور وہ ابتداء سے اخیر تک روح کے ساتھ اور خواب کی حالت میں واقع ہوا تھا اور اس دعوے پر پانچ دلیلین لکھی ہیں جنہیں سے پہلی دلیل گویا اس شبہ کا جواب ہے کہ سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت - جس میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جانا بیان ہوا ہے - اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو خواب میں جانے پر دلالت کرتا ہو۔ سو اس کے جواب میں انھوں نے سورہ یوسف کی یہ آیت کہ ”إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كُوكَبًا“ اور صحیح مسلم کی چند حدیثیں پیش کی ہیں جنہیں کوئی لفظ خواب پر صراحتہ دلالت نہیں کرتا حالانکہ سب نزدیک انہیں خواب کا بیان ہے۔ دوسری دلیل میں سورہ بنی اسرائیل کی یہ آیت پیش کی ہے ”وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فَنَنَّا لِلنَّاسِ“ (یعنی ہم نے نہیں گردانا اُس خواب کو جو تجھے دکھایا مگر ایک امتحان لوگوں کے لئے) قطع نظر اس کے کہ یہ آیت اُسی سورہ بنی اسرائیل میں واقع ہوئی ہے جس میں انسراء کا ذکر ہوا ہے۔ صحیح بخاری سے دو حدیثیں عبد اللہ بن عباس کی نقل کی ہیں جنہیں صاف صاف اس بات کی تصریح ہے کہ جس رؤیا کا اس آیت میں ذکر ہے وہی رؤیا ہے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ الاسراء میں دکھایا گیا۔ تیسری دلیل میں بخاری اور مسلم سے مالک بن صعصعہ اور انس ابن مالک کی روایتیں نقل کی ہیں جن سے صاف پایا جاتا ہے کہ معراج کے وقت آپ سوتے تھے۔ چوتھی دلیل یہ تھی کہ منجملہ صحابہ کے معاویہ، حسن، حذیفہ بن الیمان اور حضرت عائشہ کا یہ مذہب تھا کہ معراج خواب میں واقع ہوئی ہے نہ بیداری میں۔ پانچویں دلیل موافق اصول علم حدیث کے

دیکھ کر طرح طرح کے شکوک و شبہات میں پڑ جائیں۔ پس اس وقت زمانہ کا اقتضا ہرگز یہ نہیں کہ آیات قرآنی کی تفسیر میں متعدد اقوال اور مختلف بایں بیان کر کے اُنکو اس طرح غیر منفصل چھوڑ دیا جائے اور قرآن کے معنی معین نہ کیے جائیں۔

پانچویں وجہ بڑی اور معرکہ الآرا خصوصیت اس تفسیر کی۔ جیسا کہ پہلے حصہ میں مذکور ہو چکا ہے۔

یہ ہے کہ اسلام میں۔ جہاں تک کہ معلوم ہے۔ سب سے پہلی کوشش اُن شبہات کے رفع کرنے کے لیے جو علوم جدیدہ کی تعلیم سے قرآن مجید کے بعض مضامین کی نسبت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو سکتے تھے اس تفسیر میں کی گئی ہے۔ اس باب میں جو کوشش بلیغ سرسید نے کی ہے اُسکا پورا پورا اندازہ۔ بغیر اسکے کہ اُنکی تفسیر کو اول سے آخر تک لکھا جائے۔ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ مگر چونکہ اُس میں بمقابلہ علوم جدیدہ کے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی گئی ہے اور صد ہا مقامات میں جمہور مفسرین سے اختلاف کیا گیا ہے اور ہر ایک آیت کے معنی ایک خاص اصول کے موافق بیان کئے گئے ہیں اس لیے ممکن نہیں کہ مفسر کے بیان میں کچھ لغزشیں نہ ہوئی ہوں لیکن ایسے مستثنیات سے تمام تفسیر کی خوبی زائل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ انصاف کا مقتضایہ ہے کہ اگر تمام تفسیر میں ایک آیت کے معنی بھی اسلوب قرآن اور اصول عربیت کے موافق ایسے بیان کئے گئے ہوں جنکی رو سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیرین پر وارد ہوتا ہے۔ یقیناً رفع ہو۔ تو گو وہ معنی تیرہ سو برس میں کسی مفسر نے نہ لکھے ہوں۔ بلاشبہ تسلیم کرنیکے قابل ہیں۔

اگرچہ ہمارا ارادہ۔ جیسا کہ دیا چر میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس تفسیر کی مذکورہ بالا خصوصیت پر مفصل بحث کرنے کا تھا لیکن چونکہ یہ بحث بہت طولانی ہے جسکی ایک بانیوگرافی متحمل نہیں ہو سکتی اسکے سوا عام ناظرین کو اس مضمون سے چندان دلچسپی بھی نہیں معلوم ہوتی اس لیے جو کچھ اسکے متعلق ہمنے لکھا ہے یا آئندہ لکھینگے اُسکو کسی با وقعت میگزین کے متعدد نمبروں میں فوقتاً فوقتاً شائع کیا جائیگا۔

تفسیر القرآن کے متعلق صحاح میں وارد ہوئی ہیں اگر ان سب کو بعد حذف اسناد کے ایک جگہ جمع کیا جائے تو تمام مجموعہ معدود صفحات سے زیادہ نہ ہو گا حالانکہ کتب تفسیر کی تمام روایتوں اور قصوں کو اگر جمع کیا جائے تو کم سے کم ایک ضخیم جلد مرتب ہو سکتی ہے۔

اگرچہ روایات کے باب میں مفسرین کی بے احتیاطی اور عدم مبالغہات قدیم زمانہ میں بھی قابل الزام تھی لیکن اس زمانہ میں جبکہ ہر مذہب پر اعتراض اور نکتہ چینی کرنے کی ہر شخص کو آزادی ہے اور اکاد و دہریت کا ہر طرف زور شور ہے۔ ایسی روایتوں اور قصوں اور سو پر نیچرل افسانوں کو تفسیر میں درج کرنا صرف یہی نہیں کہ اسلام کو مخالفین کے اعتراضات کا نشانہ بنانا ہے بلکہ خود مسلمان نوجوانوں کو جو اس مانہ کے علوم کی تعلیم پاتے ہیں اسلام بدگمان بدتمیز کرنا ہے۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس تفسیر میں برخلاف اکثر قدیم تفسیرین کے ہر ایک آیت کی

اعلیٰ خصوصیت

تفسیر کے متعلق تمام اقوال مختلفہ نقل کر کے ناظرین کے ذہن کو پریشان نہیں کیا گیا بلکہ جو قول راجح معلوم ہوا صرف اُسکو ذکر کیا گیا ہے اور باقی مروج اقوال کو یا تو بالکل ذکر نہیں کیا اور یا بشرط ضرورت ہر ایک قول میں جو کمزوری یا ضعف دیکھا اُسکو بھی بیان کر دیا ہے۔ آج کل ایسی تفسیریں جنہیں قرآن کے معنی معین نہیں کئے جاتے اور ایک ایک آیت یا ایک ایک لفظ کی شرح میں متعدد احتمالات اور مختلف اقوال نقل کیے جاتے ہیں۔ اُن لوگوں کے دل میں جو مذہب کو موروثی چیز نہیں سمجھتے اور تقلید کی قید سے آزاد ہیں۔ بجائے اس کے کہ مفسر کے تبحر اور احاطہ علمی کا نقش جامیں ممکن ہے کہ دوسری قسم کے خیالات پیدا کریں اور جس کتاب کی نسبت خدا نے فرمایا تھا کہ ”وکان من عند اللہ لوجہ وافیہ اخلافا کثیرا“ اُس میں شمار اُختلافات

جسکا صدر اسلام میں کہیں پتہ نہ تھا مگر اب وہی علم جس میں ان مسائل پر بحث کی جاتی ہے، منجملہ علوم دینیہ کے ایک نہایت مہتمم بالشان علم۔ موسوم بہ علم کلام۔ سمجھا جاتا ہے، یا مثلاً فروع میں بے شمار جزئیات۔ جنکی بنیاد محض قیاس پر ہے۔ مثل نصوص کتاب سنت کے واجب التسلیم سمجھی جاتی ہیں، مفسرین کی رائیں اور انکے اقوال۔ جو انھوں نے آیات قرآنی کی تفسیر میں بیان کیے ہیں۔ وہ بھی مثل آیات قرآنی کے واجب الاذعان مانے جاتے ہیں، اصول فقہ۔ جو بڑھتے بڑھتے ایک وسیع علم بن گیا ہے۔ وہ بھی دینیات میں ایک نہایت ضروری علم شمار ہوتا ہے، جس قدر طب و یاس روایتیں اور بے سرو پا قہقہے کتب تفسیر سلوک و سیر میں درج کیے گئے ہیں وہ سب بغیر اسکے کہ انکو اصول تنقید کے موافق جانچا جائے رسول خدا صلعم کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، صلاح میں جو حدیثیں امت کی اصلاح معاش سے علاقہ رکھتی ہیں اور جنکی نسبت آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ ”اتم اعلم بما ورد دنیا کو“ وہ بھی ان حدیثوں کی طرح۔ جو تبلیغ رسالت سے متعلق ہیں۔ تعلیم دین میں شمار کی جاتی ہیں۔ اسکے سوا جب متعدد فرقے اسلام میں پیدا ہو گئے تو بہت سے خیالات و راز کار اپنے اپنے مذہب کی طرف داری اور تعصب کی وجہ سے ہر مذہب کے اجزائے غیر منفک بن گئے، پھر جہان اسلام پہنچا ان ملکوں کی اکثر رسمیں اور رواجات اور اوہام شدہ مذہب کے رنگ میں رنگے گئے اور اس طرح اسلام جسکی نسبت کہا گیا تھا کہ ”الدین یسر“ ایک دفتر بے پایاں کا نام۔ جو دائرہ حصر و احصاء سے خارج ہے۔ قرار پا گیا اور ان تمام حشوز و زوائد کا اصل دین سے جدا کرنا ایسا ہی مشکل ہو گیا جیسا گوشت کا ناخن سے جدا کرنا۔ اگرچہ علم کلام، علم فقہ، اصول فقہ اور تفسیر مسلمانوں کے لیے سرمایہ افتخار اور قوم کی اعلیٰ درجہ کی دماغی اور ذہنی قابلیت کے

فارمیشن اور اسکا منشا

ظاہر ہے کہ سرسید نے اپنی تصنیفات اور عام تحریریں اور پبلک سپیچوں کے ذریعے اور نیز خود مثال بنکر قوم کے پولٹیکل اور سوشل خیالات اور خاص کر اردو لٹریچر میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے اور اس لیے اُنکو قوم کا پولٹیکل سوشل اور لٹریری رفارمر کہا جاسکتا ہے؛ لیکن اس مقام پر فارمیشن سے ہماری مراد قوم کے مذہبی خیالات کی اصلاح ہے جو فی الواقع ایک نہایت سخت دشوار کام تھا اور جسکی وجہ سے اُس قوم کے فدائی کو کافر دجال ملی اور مرتد سب کچھ کھا گیا۔

اگرچہ سرسید کا اہل مقصد مسلمانوں کے پولٹیکل اور سوشل حالت کا درست کرنا تھا لیکن چونکہ مسلمان اپنے مذہب کو ہمیشہ سے دین اور دنیا دونوں کا رہبر سمجھتے رہے ہیں اور کسی بات کو خواہ دینی ہو خواہ دنیوی۔ جب تک اُسکا ثبوت مذہب کی رو سے نہ دیا جائے۔ تسلیم نہیں کرتے اور نیز مسلمانوں کی پولٹیکل حالت کو بہت کچھ تعلق اُنکے مذہب کے ساتھ تھا۔ اس لیے سرسید کو ۱۸۵۷ء کے بعد سے اخیر دم تک برابر مذہبی مباحث میں مشغول رہنا پڑا۔

اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس طرح ہر مذہب میں۔ جس قدر کہ باطنی مذہب کا زمانہ بعید ہوتا جاتا ہے۔ اُسی قدر بہت سی باتیں۔ جنکو اہل مذہب میں چندان خل نہیں ہوتا۔ داخل ہوتی جاتی ہیں اسی طرح دین اسلام میں رفتہ رفتہ بہت سے امور ایسے شامل ہو گئے جو درحقیقت دین کی ذاتیات سے خارج تھے؛ مثلاً اصول عقائد میں صد ہا مسائل الہی داخل کر دی گئے۔

بلکہ حصہ و احصا سے خارج ہو گئی تھی بیس سے بھی کم میں محدود کیا، کسی نے متکلمین کے منطقیانہ استدلالات و توجہات کو جو کہ وہ اپنے اپنے مذہب کی نصرت اور حمایت کے لیے آیات قرآنی کی تفسیر میں کرتے تھے مقصد شارع کے خلاف ثابت کیا، کسی نے تعمق و تشدد پر رد و قبح کی کسی نے شرک و بدعت کے استیصال پر کمر باندھی اس طرح مختلف زمانوں میں خاص خاص خرابیوں کی اصلاح ہوتی رہی مگر عام طور پر کسی کو اس بات کے کہنے کی جرأت نہوئی کہ خالص اسلام کی تعلیم قرآن مجید اور حدیث صحیح میں منحصر رہے باقی جو کچھ ہو وہ اسلام کی حقیقت سے خارج ہے نہ اسلام اسکا جوابدہ ہے اور نہ مسلمان اس پر اعتقاد رکھنے کے مکلف ہیں۔

سر سید نے۔ اگر غور کر کے دیکھا جائے۔ تو شاید اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ جو صد قہن اہل اسلام کی تصنیفات میں فردا فردا صرف ضبط تحریر میں آئی تھیں اور اکابر علمائے سوائس کسی کو اطلاع نہ تھی۔ سر سید نے اُن سب کو ایک ہی بار خاص و عام پر علی الاعلان ظاہر کر دیا کیونکہ جو ضرورتیں اس وقت خاص کر ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش تھیں وہ کسی خاص خرابی کی اصلاح سے رفع نہیں ہو سکتی تھیں۔
 نوں کی سلطنت ہندوستان سے جا چکی تھی اور قومی تعصبات۔ جو بعد سلب حکومت کے مفتوح قوم کو فاتح قوم کے ساتھ ایک مدت تک ضرور باقی رہتے ہیں مذہبی تعصبات کے لباس میں ظہور کر رہے تھے جس سے حکمران قوم کی نظر میں مسلمانوں کا اعتبار روز بروز کم ہوتا جاتا تھا اور انکا مذہب سلطنت کے حق میں خطرناک خیال کیا جاتا تھا، مسلمانوں سے جو بُری بات سرزد ہوتی تھی وہ اُنکے مذہب کی طرف منسوب کی جاتی تھی، فقہاء کے فتوے جو مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے مانع تھے۔ اکثر انھیں قومی تعصبات پر مبنی ہوتے تھے

نہایت روشن ثبوت ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ دین اسلام کو اُن سے بے انتہام دہشتی ہو مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دینیات میں اُن کو کتابِ سنت کے برابر درجہ دیا جائی ورنہ ضرور ہر کہ عربی صرف و نحو و معانی و بیان و لغت کو بھی دینیات میں وہی درجہ دیا جائے جو علوم مذکورہ بالا کو دیا گیا ہے کیونکہ اسلام کو ان علوم سے بھی کچھ کم و نہین دہشتی ہے۔

اگرچہ اسلام کے ہر طبقہ اور ہر دورہ میں ایسے آزاد طبع اور روشن ضمیر لوگ ہمیشہ اُٹھتے رہے ہیں جنہوں نے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر میدانِ تحقیق میں قدم رکھا ہے اور بڑے بڑے مہتمم بالشان مسائل کے متعلق مذہبِ جمہور کی غلطیاں ظاہر کی ہیں لیکن چونکہ وہ زمانہ اسلام کی حکومت اور مسلمانوں کے عروج اور ترقی کا تھا اور معتزین اسلام کی زبانیں آج کل کی طرح کھلی ہوئی نہ تھیں لہذا جو ضرورتیں اسلام کو موجودہ زمانہ میں پیش آئیں اُن سے وہ بزرگ لکل بے خبر تھے؛ اسکے سوا مالکِ اسلامیہ میں علماِ اسلام کو یہ آزادی نہ تھی کہ بادشاہِ وقت کے مذہب کے خلاف کوئی بات میا کا نہ زبان سے نکال سکیں ایسے علماِ سلف میں سے کسی ایک شخص نے عام صلاح کا کبھی ارادہ نہیں کیا؛ کسی نے احادیث کی تنقید کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور اُن کے جاچنے کے قواعد مقرر کیے، کسی نے شرایع اور مصالح میں تفرقہ کیا اور جو حدیثیں شرایع سے متعلق تھیں اُن کے لیے الگ اور جو مصالح سے متعلق تھیں اُن کے لیے الگ درجہ قرار دیا، کسی نے تقلید کی بندشوں کو توڑا، کسی نے اجماع اور قیاس کے حجت ہونے سے انکار کیا، کسی نے آیاتِ مشابہات میں تاویل کرنے کی راہ کھولی، کسی نے مفسرین و واعظین کے بے سرو پا قصوں اور بے سند روایتوں کی بے اعتباری ظاہر کی، کسی نے آیاتِ منسوخہ کو جنکی تعداد یا نسوکت پہنچائی تھی

اور بعد تسلیم کر نیے اُس اعتراض کا جواب دوسری طرح پر دیا جائے بلکہ اُس اعتراض کی جواب میں صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ خبر واحد مفید یقین نہیں اور اس لیے جو اعتراض اُسکی رو سے وارد ہوتا ہے اسلام اُسکا جواب دہ نہیں ہے۔ یہ راہی صرف سرسید ہی کی نہیں بلکہ اُن سے پہلے بھی علمای اسلام نے اس اصول کو تسلیم کیا ہے۔ امام رازی سے فرقہ حشوتیہ کے ایک شخص فی الخضر صلم سے یہ روایت کی کہ ”ما کذب ابواہیما الا ثلث کذبات“ (یعنی ابراہیم نے صرف تین جگہ جھوٹ بولا ہے) امام نے کہا ”بہتر یہ ہے کہ ایسی روایتیں قبول نہ کیا جائیں“ اُس نے بطور تعجب کے کہا ”اگر ہم اس روایت کو قبول نہ کریں تو راویوں کی تکذیب لازم آئیگی“ امام نے کہا ”اے مسکین اگر ہم قبول کر لیں تو ہم کو ابراہیم کی طرف جھوٹ کی نسبت کرنی پڑتی ہے اور اگر اُسکو نہ مانیں تو راویوں کی طرف جھوٹ کو منسوب کرنا ہوگا“ اور کچھ شک نہیں کہ ابراہیم کو جھوٹ کی نسبت سے بچانا بہتر ہے یہ نسبت اس کے کہ چند مجاہدین کو جھوٹ سے بچا یا جائے“

یامثلًا اول اول سلف صالح آیات مشابہات کی تاویل بالکل جائز نہیں سمجھتے تھے پھر جب یونانی فلسفہ کا اسلام میں رواج ہوا اور آیات مشابہات کے ظاہری معنوں پر جو کہ علمای اسلام بیان کرتے تھے۔ ملاحظہ اور مخالفین اسلام نکتہ چینی کرنے لگے تو علما کو مشابہات کی تاویل کرنی پڑی۔ مگر نہایت محدود آیتیں تھیں جن کے حقیقی معنوں پر اُس زمانہ کے لوگ اعتراض کرتے تھے اس لیے صرف وہی آیتیں مجازی معنوں پر محمول کی گئیں۔ اب چونکہ زمانہ علم و حکمت کی ترقی کا ہے اس لیے سرسید نے تاویل کو انھیں آیتوں میں محدود نہیں رکھا بلکہ اور بہت سی آیتوں کو۔ جیسا کہ دوسری جگہ ہم نے مفصل بیان کیا ہے مجاز و استعارہ و تشیل پر محمول کیا ہے۔

اور مسلمان اُنکو وحی منزل کی طرح دل جان سے قبول کرتے تھے، عیسائی مشنری مسلمانوں کی سیر اور تاریخ کی کتابیں اور اُنکی تفسیر میں دیکھ دیکھ کر اسلام اور بانی اسلام پر اعتراض کرتے تھے اور اسلام کو اُنکا جوابدہ سمجھ کر مسلمانوں سے جواب طلب کرتے تھے، تعلیم یافتہ مسلمان بہت سی باتیں مروجہ اسلام میں سائنس کے خلاف دیکھ کر اسلام کی خالص تعلیم سے۔ جو کتاب و سنت میں منحصر ہی بد اعتقاد ہونے لگے تھے؛ اور یہ تمام حالات اس بات کے مقتضی تھے کہ خالص اسلام میں اور اُن چیزوں میں جو اسلام میں مل چکے اسکی ذات میں داخل ہو گئی ہیں امتیاز قائم کیا جائے اور جو مشکلات اس اختلاط اور امتزاج سے پیدا ہوئی ہیں اُنکو رفع کیا جائے۔

اگرچہ سرسید نے اپنی رفاہی مشن میں اُن اصول سے جن پر قدیم محققین کی اصلاحیں مبنی تھیں بہت ہی کم تجاوز کیا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ زمانہ حال کی ضرورتوں کے اقتضا سے قدیم اصلا حوں میں خود بخود ایک قسم کی وسعت پیدا ہو گئی ہو مثلاً تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ خبر متواتر اور خبر مشہور کے سوا۔ جنکی تعداد کتب احادیث میں نہایت قلیل ہے۔ جو حدیثیں خبر احاد کہلاتی ہیں اور جن سے صحاح ستہ اور تمام حدیث کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ مفید نہیں ہیں بلکہ ان میں احتمال صدق اور کذب کا باقی ہے۔ اور اس اصول سے اُنھوں نے نتیجہ نکالا تھا کہ خبر واحد۔ بشرطیکہ صحت کے درجہ کو پہنچ جائے۔ اُس پر صرف عمل کرنا واجب ہے مگر اس پر عمل

رکھنا ضرور نہیں اور بعض کے نزدیک عمل اور اعتقاد دونوں ضرور نہیں۔ سرسید اس نتیجہ کو زیادہ وسیع کر دیا ہے؛ اُنکی یہ رائی ہے کہ جب خبر واحد میں صدق و کذب کا احتمال باقی ہے تو کیا وجہ ہے کہ جس خبر واحد کی رو سے اسلام پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہو خواہی بخواہی اُس خبر کو تسلیم کر لیا جائے

اور اُنکے خلاف کرنے کو۔ گو کہ وہ ذرا سی چیز ہی ہیں کیونکہ نہ۔ مگر ابھی جانتے ہیں ” مگر چونکہ امام غزالی کے وقت میں سلطنت کی طرف سے علما کو پوری مذہبی آزادی نہ تھی اسلئے اُنھوں نے چند جزوی باتوں کے سوا اشاعرہ کے اصول سے اختلاف نہیں کیا۔ لیکن سرسید بلا قید جس مسئلہ میں اختلاف کی ضرورت سمجھتے ہیں اشاعرہ کے اصول سے اختلاف کرتے ہیں۔

الغرض سرسید کی اصلاحات کو جہاں تک دیکھا جاتا ہے ان میں بہت سی کم اصلاحیں ایسی ہونگی جنکی اصل محققین اہل اسلام کی تصنیفات میں موجود نہ ہو۔ البتہ اگلے محققین کی اصلاحیں اُسی حد تک محدود رہیں جہاں تک کہ اُس زمانہ کی حالت اور ضرورت تقضی تھی اور سرسید کی اصلاحات میں موجودہ زمانہ کی حالت اور ضرورت کے موافق زیادہ وسعت پیدا ہو گئی ہو۔

سرسید کی رفاہیشن کا منشا۔ جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ یہ ہرگز نہ تھا کہ وہ اسلام میں ایک نیا فرقہ قائم کریں اور خود اُس فرقہ کے سرگروہ بنیں۔ وہ جس طرح نبی کے سوا کسی امام یا مجتہد یا اور کسی امتی کے مقتدا بنانے کو شرک فی النبوة کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے اسی طرح خود کسی فرقہ کا مذہبی پیشوا بننے کو اشتراک فی النبوة سمجھتے تھے چنانچہ لاہور میں جو اُنھوں نے اسلام پر لکچر دیا تھا اُس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا ” میری یہ خواہش نہیں ہے کہ کوئی شخص۔ گو وہ میرا کسی ہی دوست سے دوست ہو۔ میرے خیالات کی پیروی کرے۔ میں رسولوں کے سوا کسی شخص کا ایسا منصب نہیں سمجھتا کہ اُن باتوں میں۔ جو خدا اور بندوں کے درمیان دلی اور روحانی امور سے متعلق ہیں اور جسکو مذہب کہتے ہیں۔ وہ یہ خواہش کرے کہ لوگ اُسکی پیروی کریں۔ یہ منصب رسولوں کا تھا اور آخر کو جناب رسول خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ جنکا ازلی مذہب خدا برآباد تک قائم رکھے (اور ضرور قائم رکھیکا۔ کیونکہ جیسا وہ ازلی ہے وہی بھی رہی)

یامثلہ آیات منسوخہ کی تعداد پہلے پانسو سے بھی زیادہ مانی جاتی تھی پھر جیسا شاہ ولی اللہ صاحب نے فوز الکبیر میں لکھا ہے۔ سیوطی وغیرہ نے اُنکو بیس میں محصور کیا۔ پھر شاہ ولی اللہ نے نسخ کو صرف پانچ آیتوں میں محدود کر دیا۔ سرسید نے جب دیکھا کہ آیات منسوخہ کی تعداد پانسو سے گھٹنے لگھٹے پانچ تک پہنچ گئی تو اُنکو یقین ہو گیا کہ قرآن مجید میں نسخ حقیقی بالکل واقع نہیں ہوا اور قرآن کی جس آیت سے مفسرین کو یہ شبہ ہوا ہے کہ قرآن کی آیتیں ایک دوسرے کی نسخ و نسخ ہیں اُس آیت کا سیاق و سباق۔ جیسا کہ خطبات احمدیہ میں مفصل مذکور ہے صاف دلالت کرتا ہے کہ وہاں نسخ سے مراد شرائع سابقہ کا قرآن سے منسوخ کرنا ہے نہ کہ قرآن کی ایک آیت کا دوسری آیت کو منسوخ کرنا۔ پس عیسائیوں کا اعتراض۔ جو کہ وہ مسلمانوں کے مسئلہ نسخ پر کرتے ہیں۔ قرآن مجید پر وارد نہیں ہوتا۔

یامثلہ اگلے محققین نے فروع میں تقلید شخصی کو اس بنا پر ضروری نہیں سمجھا کہ حق چارون مذہبوں میں دائر ہے مگر سرسید حسبِ تقلید کو فروع میں ضروری نہیں سمجھتے اسی طرح اصول میں بھی نہیں سمجھتے کیونکہ جس بنا پر حق چارون مذہبوں میں دائر سمجھا گیا ہے اُسی بنا پر اُسکو شاعرہ اور معتزلہ اور دیگر فرق اسلامیہ میں بھی دائر سمجھنا ضرور ہے اور اسی وجہ سے انھوں نے اکثر اصولی مسائل میں معتزلہ کی پیروی کی ہے۔ اس رے میں بھی سرسید متفرد نہیں بلکہ اگلے محققین اہل سنت فی بھی اکثر مسائل میں اشاعرہ کے اصول سے اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ اسی اختلاف کے سبب جب امام غزالی پر لے دے ہوئی تو انھوں نے ایک سالہ موسوم بہ ”تفرقہ بین الاسلام والزندقہ“ لکھا جس میں اپنے مخالفوں کی نسبت لکھتے ہیں کہ ”وہ مذہب اشاعرہ سے الگ ہونے کو۔ گو کہ وہ بالشت بھر ہی کیوں نہ۔“

ہو سکتے ہیں ؟ تو اسکا جواب دینا نہایت مشکل تھا ۔ سرسید نے یہی مشکل کام اپنے ذمہ لیا تھا اور جو مشکلات اُنکو اس کام میں پیش آئیں وہ عنقریب کسی قدر اختصار کے ساتھ بیان کیجا ئیگی ۔

سرسید کی نسبت یہ اعتراض اکثر سنا گیا ہے کہ مصلح یا مجدد مذہب ایسا شخص کیونکر ہو سکتا ہے جو علوم مروجہ اسلام میں متوسط درجہ سے بھی کم درجہ رکھتا ہو ۔ لیکن یہ اعتراض اُس شخص کی نسبت زیادہ موزون ہو سکتا ہے جو علوم مروجہ اہل اسلام میں کمال حاصل کر نیکے بعد مصلح یا مجدد مذہب بننے کا دعویٰ کرے ۔ انسان جس مذہب کی سوسائٹی میں ہوش سنبھالتا ہے اُس مذہب کے ساتھ اُسکو قدرتی لگاؤ ہوتا ہے ؛ پھر جب اُسی مذہب کی تعلیم پاتا ہے تو وہ لگاؤ روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے ؛ یہاں تک کہ جب وہ تعلیم کمال کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے تو اُس مذہب کی تقلید اور اُسکا تعصب سکی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اور کسی بات میں خود غور اور تحقیق کرنے کی مطلق قابلیت باقی نہیں رہتی ۔ اگر مثلاً حنفی مذہب کی تعلیم اُسکو ہوئی ہے تو اُسکے دل میں کبھی بھولکر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ اس مذہب میں کوئی غلطی ہوگی ۔ یہ اصول بھی ۔ کہ حق چاروں مذہب میں دائر ہے ۔ محض تقلید امانتا ہے ؛ کیونکہ عملاً حنفی مذہب کے ایک مسئلہ میں بھی غلطی کا ہونا اُسکے نزدیک محال معلوم ہوتا ہے ۔ باوجودیکہ بخاری کو اصرح الکتاب بعد کلام اللہ جانتا ہے مگر مسیون عیشین جو اُسین صریح حنفی مذہب کے خلاف ہیں اُنکو قابل عمل نہیں سمجھتا ۔ ایسا شخص بلاشبہ کسی مذہب کا مصلح یا مجدد نہیں ہو سکتا بلکہ یہ منصب اُس شخص کا ہے جو حق و باطل اور خطا و صواب میں تمیز کر سکتا ہے ؛ ہر ایک امر پر غور کرتا ہے اور جو بات صحیح معلوم ہوتی ہے اُسے اخذ کرتا ہے اور جو غلط معلوم ہوتی ہے اُسے چھوڑتا ہے ؛ اول ایک بات کو صحیح جانتا ہے پھر جب اُس میں غلطی معلوم ہوتی ہے تو اسی بات کو غلط قرار دیتا ہے ۔

ختم ہو گیا۔“ پس اُنکا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ لوگ اُنکی پیروی کریں اور اُنکو اپنا مذہب ہی پیشوا جائیں بلکہ اُنکی رفتار میں کمال حاصل مقصد صرف مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے موافق کو در کرنا اور عیسائی قوموں کے اس اعتراض کو دفع کرنا تھا کہ ”اسلام ترقی اور شایستگی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا“ اور چونکہ اس زمانہ میں مغربی تعلیم کے سوا کوئی ذریعہ دنیوی ترقی کا نہیں ہی اس لیے جو شبہات مغربی تعلیم سے اسلام کی نسبت پیدا ہونے ممکن تھے اُنکا رفع کرنا بھی ضرور تھا۔ پس یہی دو مقصد تھے جنکے لیے سرسید کو مذہبی مباحث میں پڑنا اور بہت سی باتوں میں جمہور سے اختلاف کرنا پڑا۔

سلطان عبدالعزیز خان مرحوم نے ایک کونسل علماء اور عقلا کی اس امر کی تحقیقات کے لیے منعقد کی تھی کہ دین اسلام دنیوی ترقی کا مانع ہی یا نہیں؟ کونسل نے اپنی تحقیقات کے بعد جو رپورٹ لکھی اُسکا ماحصل یہ تھا کہ ”اسلام میں کوئی بات ایسی نہیں جو دنیوی ترقی کی مانع ہو؛ مگر مسلمانوں کو اپنی بہت سی رسوم و عادات کو جو اگلے زمانہ میں مفید تھیں مگر حال کے زمانہ میں نہایت مضر ہو گئیں چھوڑنا ضرور ہے“ ظاہر ہے کہ کونسل نے جو کچھ اسلام کی نسبت لکھا وہ بالکل قرآن اور حدیث کے مطابق تھا بلکہ ہمارے نزدیک صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے کہ باوجود اُسکی سخت پابندی کے انسان دنیوی ترقی اور شایستگی کو کمال کے درجہ تک پہنچا سکتا ہے بخلاف دیگر مذاہب کے جنسے دست بردار ہوسے بغیر ترقی کے میدان میں ایک قدم نہیں رکھا جاسکتا؛ لیکن اگر کونسل سے پوچھا جاتا کہ وہ کونسی رسوم و عادات ہیں جنکے چھوڑنے کے بعد مسلمان اپنے موجودہ مذہب کے موافق ترقی کی دوڑ میں شریک

سے خدا تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے ”یُرِیدُ اللہُ بکُمُ الدِّینَ وَلَا یُرِیدُ بکُمُ الْعُسْرَ“ اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اِنَّمَا بُعِثْتُ مَلِیْسًا رَیْتُمْ“ اور فرمایا ”لَا یُرِیْتُ“ اور ابو موسیٰ اور حاذب بن جبل کو جب بنی مین بھیجا تو یہ نصیحت کی ”یَسِّرُوا وَلَا تُعْصِرُوا“

وَاتَّاعَلَىٰ أَثَارِهِمْ مُتَقَدِّدُونَ“ اُنکو کچھ دشواری نہیں ہی اُنھوں نے جس لیک پر انگلیوں کو چلتے دیکھا ہی اُسی پر آنکھیں بند کیے چلے جاتے ہیں ۔

بہر حال اگر سرسید مشرقی تعلیم کی اُس حد سے آگے بڑھ جاتے جس پر اُنکی تعلیم اگر ٹھیکر لئی تو تقلید کے پھندے سے نازیت اُنکا چھٹکارا ہونا دشوار تھا ۔ پس علوم مروجہ کی تکمیل بجائے اسکے کہ اُنکے کام میں کچھ مدد دیتی ۔ وہ تمام قدرتی قابلیتیں جو اُنکی طبیعت میں رکھی گئی تھیں بالکل فنا کر دیتی ۔ اور جس ولیری اور آزادی سے اُنھوں نے رفاہی مشن کا کام انجام دیا اُسکا حوصلہ اُنہیں مطلقاً باقی نہ رہتا ۔

وہ ایک خط میں جو اُنھوں نے ۱۸۶۹ء میں سید محمد علی خان کو لکھا تھا ۔ لکھتے ہیں ”میرے پیارے محمدی ! میں ہمیشہ آپ کو کہا کرتا ہوں کہ جو خراب اثر مشرقی طریقہ تعلیم کا انسان کے دل و طبیعت پر ہوتا ہو ۔ اُس سے آپ کبھی امین نہ رہیں ۔ آپ سمجھتے ہیں کہ نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اُمتی محض رکھنے میں کیا حکمت تھی ؟ یہی حکمت تھی کہ نیچر فیض ہذا اندر داخل نہ ہو ۔ اُسکو کوئی بیرونی چیز نہ ملے اور جو کچھ باہر نکلے خالص بے میل ہو ۔ پس ۔ ۔ ۔ جاری رکھنے پر متوجہ رہا کریں اور جس علم کی نسبت کہا گیا ہو کہ ”العلم حجاب الکبر“ اسکے پیرو ہرگز نہ ہووین “

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو شخص مذہبی خیالات کی اصلاح کا دعویٰ کرے اُس میں مذہبی تقدس جو علمای دین کا شعار ہے ۔ ضرور ہونا چاہیے ۔ پس سرسید جیسا دنیا دار آدمی ۔ جو ناز و ذرہ تک کا پابند نہ ہو ۔ اس منصب جلیل کے کیونکر لائق ہو سکتا ہے ؟ سو اس اعتراض کے جواب میں اسکے سوا اور کیا کہا جاسکے کہ مذہبی تقدس ۔ جو ہمارے علمای دین کا شعار ہے ۔ اگر سرسید کو یہ درجہ عالی

یہ ممکن ہو کہ وہ غلط بات کو صحیح اور صحیح بات کو غلط سمجھ جائے مگر یہ ممکن نہیں کہ جس بات کو دل میں غلط جانتے اُسکو دنیا کی شرم یا اعتراض کے خوف سے صحیح کیے جائے۔ مصلح یا مجتہد کو علوم مروجہ کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی اس بات کی ضرورت ہو کہ حق بات کے کہنے میں لومۃ لائم سے نہ ڈرے کیونکہ وہ کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ جو صدائیں محققین کی تحقیقات میں موجود ہیں اور تقلید نے اُنکی طرف سے آنکھوں پر پردے ڈال رکھے ہیں اُنکو طے الاعلان ظاہر کرتا ہے۔

سرسید میں ابتدا سے وہ تمام خاصیتیں۔ جو ایک مصلح یا مجتہد یا فارم میں ہونی ضرور ہیں موجود تھیں۔ اُنکی عمر کا بہت بڑا حصہ حق کی تلاش میں گزرا، کبھی صوفیت کا رنگ چڑھا، کبھی وہابیت کا زور شور رہا، کبھی غیر مقلدی کی لے بڑھی اور آخر کو تمام جستجو اور تلاش اس نتیجہ پر ختم ہوئی کہ الاسلام هو الفطرۃ والفقرة هو الاسلام۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ سرسید کے مذہبی خیالات میں اس قدر تبدیلیوں کا ہونا اُنکے متلون مزاج ہونے کی دلیل ہو مگر یہ اُنکی نادانی ہے؛ حق بات تک ہمیشہ سید سید رج رسانی ہوتی ہے؛ ابراہیم خلیل اللہ نے پہلے ستارہ کو پھر چاند کو اور پھر سورج کو اپنا رب سمجھا تب اس نتیجہ تک پہنچے کہ ”انی وھمت وھمی للذی فطر السموات والارض خلیفا وما انا من المشرکین“ محمد مصطفیٰ صلعم کو اوروہ مقربات پیش نہ آتے جتن کس پہنچنے سے پہلے پیش آتے ہیں تو قرآن میں آپ کی نسبت یہ ارشاد نہ ہوتا کہ ”وَجَدَکَ صَنَآءَ فُھدی“ جب انبیا علیہم السلام کا یہ حال ہو تو اور لوگ۔ جو طالب حق ہیں۔ جب تک کچھ دنوں ادھر ادھر ڈانواں ٹول نہ پھریں کیونکہ ایک ہی جست میں منزلی مقصود تک پہنچ سکتے ہیں؟ ہاں جو لوگ تقلید کے دائرہ سے قدم باہر رکھنا نہیں چاہتے اور جن کا یہ قول ہو کہ ”اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا عَلٰی اَمٍّ

آزمائش میں نہ گزارنے اور حاکم و محکوم دونوں کے خیالات سے واقف نہ ہو وہ کیونکر اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتا ہے ؟

یہی سبب ہے کہ ہمارے مقدس علما۔ جو دنیا سے الگ تھلک رہنے کے سبب دنیا کے حالات کے بے خبر ہیں۔ انکی تحریزیں۔ جو اس آزادی اور نکتہ چینی کے زمانہ میں انھوں نے مذہب کے متعلق لکھی ہیں یا لکھتے ہیں۔ وہ بجائے اسکے کہ غیر قوموں کے دل میں اسلام کی نسبت حسن ظن پیدا کریں اُنٹی دین کے مضحکہ کا باعث ہوتی ہیں ۔ پس اس زمانہ میں مذہبی مصلح۔ جسکا مقصد مسلمانوں کی اصلاح معاش اور اسلام کی حقیقت دنیا پر ظاہر کرنا ہو۔ اُس شخص کو سوا جو دنیا داری کے لباس میں زندگی بسر کرے اور دنیا کے حالات سے باخبر ہو۔ دوسرا شخص نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ ایک مصلح مذہب میں اس مشہور مقولہ کے موافق کہ ”اَنْظُرْ اِلٰی مَا قَالُوا وَلَا تَنْظُرْ اِلٰی مَنْ قَالَ“ مقتضای عقل یہ ہے کہ بجائے افعال کے زیادہ تر اُسکے اقوال کو دیکھا جائے مع ذلک ہم سرسید کے افعال اور اخلاق و عادات میں وہ خوبیاں پاتے ہیں جو بڑے بڑے مشائخ و اہل شد میں نہیں دیکھی گئیں اور جنکو ہم ۔ ۔ ۔ تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے ۔

بلاشبہ وہ آخر عمر میں بسبب فرہی مفرط اور کبر سن کے نماز روزے کے پابند نہ رہے تھے لیکن اپنے قصور کا اعتراف کرتے تھے جسکی نسبت کہا گیا ہے ”الاعتزاز بحدہم لا اقتراف“ حج اور زکوٰۃ کی انہیں کبھی استطاعت نہیں ہوئی اور قرض روپیہ لیکر۔ جس طرح کہ انھوں نے لندن کا سفر کیا اس طرح۔ سفر حج کرنے کو وہ ناجائز سمجھتے تھے ۔ بیسیوں عیب۔ جو بڑے بڑے دینداروں اور پرہیزگاروں میں دیکھے گئے ہیں۔ اُنسے یہ شخص بالکل پاک تھا اور امت کی خیر خواہی

اور ہر ایک اختلاف میں اُنھیں کی رائی صائب ہے لیکن چونکہ اُنھوں نے موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے موافق ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی ہے اسلئے جو لوگ دین اسلام کے دوست ہیں اور اُسکو ہر قسم کے اعتراضات اور شکوک و شبہات سے پاک جانتے ہیں اُنسے امید ہے کہ سرسید کے مندرجہ ذیل اختلافات کو صرف اس نظر سے کہ وہ جمہور علمائے اہل سنت کے خلاف ہیں ناقابل لتفات نہ سمجھیں گے بلکہ ہر ایک اختلاف پر جو دلائل سرسید نے قائم کئے ہیں اُنپر نہایت بے تعصبی و انصاف کے ساتھ غور کریں گے۔ اُنکا فرض ہے کہ ہر ایک مسئلہ مختلف فیہ کے متعلق اول اس بات پر غور کریں کہ جس اعتراض یا شبہہ کے رفع کرنے کی غرض سے اُنھوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے وہ فی الواقع اس قابل ہے یا نہیں کہ اُسکو رفع کیا جائے، دوسرے یہ کہ جمہور سے اختلاف کئے بغیر وہ اعتراض یا شبہہ رفع ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تیسرے جس طریقہ سے سرسید نے اُسکو رفع کرنا چاہا ہے اُس طریقہ سے اُسکا رفع ہونا ممکن ہے یا نہیں؟ امید ہے کہ اگر ان تینوں باتوں پر ٹھہرے دل سے غور کیا جائیگا تو اسلام کے حق میں بہت عمدہ نتائج پیدا ہوں گے۔

اسوقت تمام علمی دنیا میں مذہب کی صداقت کا معیار یہ امر قرار پایا ہے کہ جو مذہب حقائق موجودات اور اصول تمدن کے برخلاف ہو وہ مذہب سچا نہیں ہو سکتا۔ اس معیار نے نہ نتائج مذاہب کے حق میں پیدا کیے ہیں وہ یہ ہیں کہ تمام قومیں جو علمی اور تمدنی ترقی کی طرف متوجہ ہوئی ہیں وہ سب رفتہ رفتہ مذہب سے دست بردار ہوتی جاتی ہیں۔ عیسائیوں نے بائبل کو اٹھا کر بالائی طاق رکھ دیا ہے اور فی الواقع اگر وہ بائبل کے احکام یا نصیحتوں پر کاربند ہوتے تو ترقی کے میدان میں اُنکا قدم رکھنا نامکن تھا؛ یہ ہم سماج والوں نے میدان میں

جسین مخبر صادق نے تمام دین کو حصر کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ ”الَّذِينَ النَّصِيحَةُ“ اُسین تمام قوم سے سبقت لیگیا تھا۔ اُسے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اسکے لیے زہد و تقدس کی نہیں بلکہ عقل اور راستبازی کی ضرورت تھی جسکی نسبت عمر فاروقؓ نے فرمایا ہے کہ ”لَا تَنْظُرُوا إِلَى صَلَوةٍ أَمْرَةٍ وَلَا صِيَامِهِ وَلَكِنْ انْظُرُوا إِلَى عَقْلِهِ وَصِدْقِهِ“ (یعنی کسی کے نماز روزہ پر نظر نہ کرو بلکہ اُسکی عقل اور سچائی کو دیکھو)

مذہبی مسائل میں علمائے سلف سے اختلاف

سر سید نے جن مسائل میں علمائے سلف سے اختلاف کیا ہے وہ دو قسم کے مسائل ہیں ایک وہ جنہیں جمہور علمائے اہل سنت اُنکے خلاف ہیں مگر محققین اہل اسلام میں سے اور لوگ بھی اُس طرف گئے ہیں دوسرے وہ جنہیں سر سید بظاہر متفق و معلوم ہوتے ہیں اور یہ دوسری قسم کے اختلافات زیادہ تر قرآن کی تفسیر کے ساتھ مخصوص ہیں۔

دونوں قسم کے مذکور بالا اختلافات کا منشا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یہ ہرگز نہ تھا کہ سر سید کوئی نیا فرقہ قائم کرنا اور خود یہ بنا چاہتے تھے بلکہ یہ تمام اختلافات محض اس بات پر مبنی تھے کہ آجکل جو اعتراضات اسلام پر مخالفین اسلام کی طرف سے وارد کئے جاتے ہیں، یا جو شکوک و شبہات تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے دل میں اسلام کی نسبت پیدا ہوتے ہیں اُنکو رفع کیا جائے۔ اسی لیے ہم اُن تمام اختلافات کو اس عنوان کے ذیل میں درج کرنا چاہتے ہیں مگر جن دلائل پر یہ اختلافات مبنی ہیں اُنکو سر سید کی تصنیفات میں دیکھنا چاہئے۔

اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہر مسئلہ مختلف فیہ کی نسبت جو کچھ سر سید لکھا ہے وہی صحیح ہے

قرآن کا توارد ہونا پایا جاتا ہے وہ سب موضوع و منقربے ہیں (۶) صحاح ستہ بلکہ صحیحین کی بھی تمام حدیثوں کو جب تک کہ اصول علم حدیث کے موافق انکی جانچ نہ کی جائے۔ قابل وثوق نہیں سمجھنا چاہیے (۷) شیطان یا ابلیس کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے اس سے کوئی وجود خارج عن الانسان مراد نہیں ہے بلکہ خود انسان میں جو نفسِ تارہ یا قوتِ بہیمیہ ہے وہ مراد ہے (۸) طیور منخفہ جنکو نصارے نے گلا گھونٹ کر بارڈالا ہے مسلمانوں کو انکا کھانا حلال ہے (۹) چونکہ خبر واحد میں احتمال صدق و کذب باقی رہتا ہے اسلیے جو اعتراض اخبارِ آحاد کی بنا پر اسلام کی نسبت کئے جاتے ہیں اسلام انکا جوابدہ نہیں ہے (۱۰) سوائے کفار و مشرکین کے جنکا قرآن کی اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے یا جو اس آیت کے مصداق ہوں کہ ”انما ینہا کلام اللہ عن الذین قالو کفر فی الدین و اخرجو کمر من ديارکم و ظاہر اعلیٰ اخرجکم ان تو لوھم“ تمام کفار و مشرکین سے دوستی و موالات کرنا جائز ہے (۱۱) عمدتہ عتیق اور عمدہ جدید کی کتابوں میں تحریف لفظی واقع نہیں ہوئی بلکہ صرف تحریف معنوی ہوئی ہے مگر اسی کے ساتھ انکا اول سے آخر تک لفظی ہونا اور غلطی سے پاک ہونا غیر مسلم ہے (۱۲) ہر شخص ان مسائل میں جو قرآن یا حدیث صحیح میں مخصوص نہیں ہیں آپ اپنا مجتہد ہے (۱۳) حضرت باجر جو اسمعیلؑ کی ماں ہیں وہ جیسا کہ بعض روایتوں میں مذکور ہے۔ درحقیقت لونڈی نہ تھیں بلکہ رفیقہ بادشاہ مصر کی بیٹی تھیں اور رفیقہ نے انکو صرف تربیت کے لیے حضرت سارا کے ساتھ کر دیا تھا۔ (۱۴) وضع و لباس وغیرہ میں

۱۵ یعنی خدا مگو منع نہیں کرتا مگر ان لوگوں کی دوستی سے جو نئے دین کی بابت لڑے اور جنہوں نے تلو تھارے گھروں سے

نکال دیا اور تھارے کانٹے پر اُڑوں کی مدد کی ۱۲

فقط ڈھائی انچھریم کے لیے ہیں اور باقی کو بالکل خیر باد کہہ دیا ہے؛ آری سماج والے ویدوں کا جو مطلب بیان کرتے ہیں اُسکو نہ سناتن دھرم کے ہندو تسلیم کرتے ہیں اور نہ یورپ کے بڑے بڑے سنسکرت دان اور وید کے محقق صحیح جانتے ہیں، پس درحقیقت انھوں نے بھی وید سے اپنے تئیں آزاد کر لیا ہے۔ سرسید کا یہ دعوے ہے کہ دنیا میں جتنی کتابیں آج الہامی مانی جاتی ہیں ان میں صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس میں نہ کوئی چیز حقائق موجودات کے خلاف ہے اور نہ تمدن اور حسن معاشرت کی مانع۔ پس مسلمان عالموں کا اس بات پر غور کرنا کہ جو کچھ سرسید نے اسلام کی حمایت کی غرض سے لکھا ہے اُسکی اس زمانہ میں فی الواقع ضرورت تھی یا نہیں اور اگر تھی تو یہ کیا تحریکات سے وہ ضرورت رفع ہوتی ہے یا نہیں؟ کچھ کم ضروری نہیں ہے۔

اب ہم ان اختلافات کا خلاصہ لکھتے ہیں جنہیں دیگر محققین اہل اسلام بھی سرسید کے ساتھ شریک ہیں۔

- (۱) اجماع حجت شرعی نہیں ہے (۲) قیاس حجت شرعی نہیں ہے (۳) تقلید واجب نہیں ہے
- (۴) قرآن کا کوئی حکم جو ایک آیت میں بیان ہوا تھا کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوا اور نہ قرآن کی کسی آیت کی تلاوت منسوخ ہوئی اور سورہ بقرہ کی اس آیت سے کہ مَا نُنسِخْ مِنْ آيَةٍ وَنُكَلِّهَا
- قرآن کی کسی آیت کا نسخہ اور کسی کا منسوخ ہونا مراد نہیں ہے بلکہ اُسکی بعض آیتوں سے شرایع کے بعض احکام کا منسوخ ہونا مراد ہے (۵) قرآن میں کسی طرح کی زیادتی یا کمی یا تغیر و تبدل واقع نہیں ہوا، وہ جس طرح اور جس قدر نازل ہوا تھا اُسی طرح اور اُسی قدر زائد نزول سے آج تک محفوظ ہے اور جن روایتوں سے زیادتی یا کمی یا تغیر و تبدل کا ہونا یا بعض صحابہ کے اقوال سے

نہیں ہوتی بلکہ جیسا ابن عباس؛ قتادہ؛ ربیع اور ابن زید سے منقول ہے تھوہلی قبلہ کے معاملہ کی طرف پھرتی ہے جس کا ذکر اس آیت سے پہلے اور اُس کے بعد کیا گیا ہے (۲۲) آیہ میراث سے وصیت کا حکم۔ جو آیہ وصیت میں والدین اور دیگر ورثہ کے لئے تھا۔ منسوخ نہیں ہوا؛ پس جو وصیت وارث کے حق میں کی جائے وہ نافذ ہے (۲۳) جو لوگ مشکل سے روزہ رکھتے ہیں وہ آیہ ”وعلی الذین یطیعونہ فدیۃ طعام مسکین“ کے بموجب روزوں کے بدلے فدیہ دے سکتے ہیں۔ بعض دیگر علما فدیہ کی اجازت کو خاص کر مکرّم لوگوں کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں؛ مگر سید کے نزدیک یہ حکم عموماً اُن سب لوگوں کے لئے ہے جن کو روزہ رکھنا شاق ہو، خواہ بڑھے ہوں اور خواہ جوان۔ لیکن بہ نسبت فدیہ دینے کے اُن کو روزہ رکھنا بہتر ہے (۲۴) جس رباً یعنی سود کی حرمت قرآن میں بیان ہوئی ہے اُس سے اُسی قسم کا رباً مراد ہے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں عرب میں جاری تھا اور جس کی مثال ہمارے ملک کے سود خواروں اور رہیوں میں۔ جن کا پیشہ سود خواری ہے پائی جاتی ہے۔ مگر اُس سے اُس منافع کی حرمت۔ جو پرامیسی نوٹوں پر لیا جاتا ہے۔ ثابت نہیں ہوتی؛ اس کے سوا کسی گورنمنٹ یا کمپنی کو جو ملک کی ترقی کے لئے روپیہ قرض لے اُس کو سود پر روپیہ دینا یا کسی جماعت کا۔ جو کسی رفاہ عام کے کام کے لئے چندہ جمع کرے۔ اُس روپیہ کا سونپ لگانا اور اُس کے منافع سے رفاہ عام کا کام کرنا یہ بھی رباً میں داخل نہیں ہے (۲۵) قرآن میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے حضرت عیسیٰ کا زندہ آسمان پر اُٹھایا جانا ثابت ہو (۲۶) شہدائی نسبت جو قرآن میں آیا ہے۔ کہ اُن کو مردہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اس سے اُن کا علو درجات اور روحانی خوشی اور دنیا میں مثال قابل تقلید چھوڑنا مراد ہے؛ نہ یہ کہ وہ درحقیقت زندہ ہیں اور اُن کے زندوں کے

کفار کے ساتھ تشبیہ شرعاً ممنوع نہیں ہے (۱۵) قرآن کی کسی آیت سے جبر پر اور کسی سے قدر پر استدلال کرنا۔ جیسا کہ متکلمین نے اپنے اپنے مذہب کی تائید کے لیے کیا ہے۔ مقصد شارع کے برخلاف ہے۔ کیونکہ جن آیتوں سے اس مسئلہ کو استنباط کیا جاتا ہے ان آیتوں سے بندوں کے مجبور یا مختار ہونے کا تصفیہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بحث کرنا واللہ اعلم بالصواب ہو کر یہ نہ فرماتے کہ ”ابھذا افرئتم اوبھذا ارسیلتم“ (۱۶) معراج اور شق صدر و نور و یاقین واقع ہوئے ہیں نہ کہ بیداری میں کیا مسجد احرام سے مسجد اقصیٰ تک در کیا مسجد اقصیٰ سے آسمانوں تک (۱۷) اگرچہ ممکن ہو کہ حسب طبع انسان سے فروتر مخلوقات موجود ہیں اسی طرح اس سے بالاتر مخلوقات جس کا ہر علم نہیں۔ موجود ہو لیکن ملائکہ یا ملائکہ کے الفاظ جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں اُن سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ کوئی جدا مخلوق انسان سے بالاتر ہے بلکہ خدا تعالیٰ نے جو مختلف قوتیں اپنی قدرت کاملہ سے مادہ میں ودیعت کئے ہیں۔ جیسے پہاڑوں کی صلابت، پانی کا سیلان، درختوں کا نمو، برق کی قوت جذب و دفع و امثال ذلک۔ انہیں کو ملائکہ یا ملائکہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۸) آدم اور ملائکہ اور ابلیس کا قصہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے یہ کسی واقعہ کی خبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک تمثیل ہے جس کے پیرایہ میں انسان کی فطرت اور اس کے جذبات اور قوت بہیمیہ جو انہیں ودیعت کی گئی ہے اسکی بُرائی یا دشمنی کو بیان کیا گیا ہے۔ اور اس قسم کی اور بھی متعدد تمثیلیں قرآن میں موجود ہیں (۱۹) معجزہ دلیل نبوت نہیں ہو سکتا (۲۰) قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی معجزہ کے صادر ہونے کا ذکر نہیں ہے (۲۱) آیہ ”الذین اتیناھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم“ میں جو ضمیر مفعول لفظ ”یَعْرِفُونہ“ میں ہے وہ۔ جیسا کہ عام مفسرین لکھتے ہیں آنحضرت کی طرف عائد

بلکہ ابتدائی آفرینش سے یہ خیال تمام قوموں میں چلا آتا تھا کہ جو ہولناک حادثے دنیا میں واقع ہوتے ہیں وہ انسان کے گناہوں کی کثرت کے سبب واقع ہوتے ہیں اور انبیاء کا کام یہ ہے کہ جن خیالات پر لوگ مجبول ہوئے ہیں اگر وہ خیالات مقاصد نبوت کے منافی نہیں ہیں بلکہ انکی تائید کرنے والے ہیں تو وہ ان خیالات کی صحت یا غلطی سے کچھ تعرض نہیں کرتے بلکہ انہیں خیالات کے موافق اُن سے خطاب کرتے ہیں (۳۱) خدا کا ویدار کیا دنیا میں اور کیا عقیقے میں نہ ان ظاہری آنکھوں سے ممکن ہے اور نہ دل کی آنکھوں سے (۳۲) قرآن مجید میں جو جنگ و خونین کے بیان میں فرشتوں کی مدد کا ذکر کیا گیا ہے اُس سے ان لڑائیوں میں فرشتوں کا آنا ثابت نہیں ہوتا (۳۳) صفات باری تعالیٰ عین ذات ہیں، نہ غیر ذات، اور نہ لایعین و لا غیر جیسا کہ اشاعرہ کا مذہب ہے (۳۴) حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا قرآن کی کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا (۳۵) کوئی امر عادت الہی یا قانون طبیعی کے خلاف کبھی وقوع میں نہیں آتا (۳۶) قرآن میں جو کفار سے بطور معارضہ کے کہا گیا ہے کہ اگر تم کو اس کتاب کے من عند اللہ ہونے میں شک ہو تو اسکی مثل کوئی سورت یا چند آیتیں تم بنا لاؤ۔ اس سے جیسا کہ اکثر اہل اسلام خیال کرتے ہیں یہ مراد نہیں ہے کہ ایسا فصیح کلام تم نہیں بنا سکتے بلکہ یہ مراد ہے کہ ایسا کلام جو عالم اور فلسفی اور حکیم و لیکر جاہلون، صحرائین، بدؤن اور اونٹ چرنے والوں تک سب کی ہدایت کے لیے یکساں مفید اور سب کی سمجھ اور علم کے موافق ہو۔ بنا لینا تمہاری طاقت اور قدرت سے باہر ہے (۳۷) نبوت کا ملکہ نبی کی اصل فطرت میں ودیعت ہوتا ہے اور جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ ”النبی نبی و لو کان فی بطن اُمّہ“ وہ مان کے پیٹ سے نبی پیدا ہوتا ہے اور جسطرح تمام ملکات اور قواں فطری تدریج

کھاتے پیتے ہیں (۲۷) صُور کا لفظ جو قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے اُس سے فی الواقع کوئی آلہ مثل نرسنگے یا سنگہ یا تڑئی وقتنا کے مراد نہیں ہے بلکہ یہ محض استعارہ ہے کہ جس طرح تڑئی کی آواز پر شکر جمع ہو جاتے ہیں اسی طرح خدا کی مشیت اور ارادہ سے بعث و حشر واقع ہوگا (۲۸) خدا تعالیٰ کی ذات و صفات اور اسماء و افعال کے متعلق جو کچھ قرآن یا حدیثوں میں بیان ہوا ہے وہ سب بطریق مجاز و استعارہ و تشبیل کے بیان ہوا ہے اور اسی طرح معاد کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے۔ جیسے بعث و نشر، حساب و کتاب، میزان، صراط، جنت، دوزخ وغیرہ وغیرہ۔ وہ بھی سب مجاز پر محمول ہے نہ حقیقت پر (۲۹) قرآن میں جو خدا کا زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے۔ اس سے کسی واقعہ کی خبر دینی مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہودیوں کے اسل عقاد کی تردید مقصود ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنے کے بعد ساتویں دن آرام لیا۔ اور اسی لیے جو کچھ انکا عقیدہ خلق زمین و آسمان کی نسبت تھا اُسکو قرآن میں اُسی طرح بیان کر کے فرمایا کہ ”وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ“ کیونکہ شارع کا مقصد حقائق اشیاء سے بحث کرنا یا جو باتیں حقائق کے برخلاف ہوں اُن پر رد و قبح کرنا نہیں ہے؛ بلکہ جو خیالات لوگوں کے دل میں خدا کی وحدانیت اور قدرت و عظمت کے خلاف تہ نشین ہوں اُنکا زائل کرنا ہے (۳۰) قرآن میں جو جا بجا قدیم قوموں میں بدیان اور بد اخلاقیان پھیل جانے کے بعد اُن پر طرح طرح کے عذاب کا نازل ہونا اور کسی قوم کو آندھی اور طوفان سے، کسی کو زلزلہ سے، کسی کو مڈیوں اور دیگر حشرات کے مسلط کرنے سے اور کسی کو کسی عذاب سے اور کسی کو کسی عذاب سے برباد کرنا بیان ہوا ہے اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ حقیقت اُنکے گناہ اور معاصی عذاب نازل ہونے کا باعث ہوئے تھے

شاہ ولی اللہ وغیرہ وغیرہ۔ اگر کسی کو ان سب بزرگواروں کے نام اور ان کے اقوال دیکھنے ہوں تو سرسید کی تصنیفات میں اور مولوی سید محمد علی خان کے مضامین میں جو زیادہ تر تہذیبِ اسلامی کی سب سے پہلی جلدوں میں اور کسی قدر اخیر زمانہ کی جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ دیکھ لے۔ انہیں وہ لوگ بھی ہیں جو معجزہ کو دلیلِ نبوت نہیں سمجھتے، خرقِ عادت کا واقع ہونا محال سمجھتے ہیں، قرآن میں آنحضرتؐ کے کسی معجزہ کا ذکر ہونا تسلیم نہیں کرتے، آیاتِ قرآنی جو بظاہر انبیای بنی اسرائیل کے معجزات پر دلالت کرتی ہیں انکو ماقول سمجھتے ہیں۔ عیسٰی کا بن بچہ پیدا ہونا تسلیم نہیں کرتے، ملائکہ سے قوایِ عالم اور شیطان سے انسان کی قوتِ بہیمیہ سبعیہ مروا لیتے ہیں، جن کے وجود سے۔ جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔ انکار کرتے ہیں، نبی پر متعارف فرشتوں کی وساطت سے وحی کا آنا تسلیم نہیں کرتے، قرآن کو محض باعتبار فصاحت و بلاغت کے معجز نہیں مانتے، شہداء کو درحقیقت زندہ اور کھاتے پیتے نہیں سمجھتے، مبادی و معاد کے متعلق جو کچھ قرآن میں بیان ہوا ہے اسکو مجازی معنوں پر محمول کرتے ہیں، طیور و منقہ اہل کتاب کا کھانا مسلمانوں کے لیے حلال جانتے ہیں، قرآن میں نسخ کے قائل نہیں ہیں۔ غرض کہ جس قدر سرسید کے اختلافات ہم نے اوپر بیان کیے ہیں انہیں کوئی ایسا اختلاف نہیں ہے جو جنہیں کچھ نہ کچھ لوگ محققینِ اہل اسلام میں سے سرسید کے ہمزبان نہوں۔ ہاں چند اختلاف سرسید نے علماء و سلف سے ایسے بھی کئے ہیں جنہیں ظاہر اوہ متفرد معلوم ہوتے ہیں لیکن یقیناً انہیں کہا جاسکتا کہ سلف میں سے کوئی اُس طرف نہیں گیا اور وہ اختلافات یہ ہیں۔

(۱) اسلام نے غلامی کو ہمیشہ کے لئے موقوف کر دیا ہے اور آئینہ من و قدا جو سورہ محمد میں ہے

ترقی کرتے ہیں اسی طرح ملکہ نبوت بتدریج ترقی پاتا ہے؛ یہاں تک کہ جب وہ کمال کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے تو اس سے وہ ظہور میں آتا ہے جو اس کا مقتضا ہوتا ہے اور جبکہ عرف عام میں بعثت سے تعبیر کرتے ہیں؛ اسی لیے جو وحی اُس پر نازل ہوتی ہے وہ کسی ایچی یا قاصد (یعنی فرشتہ) کی وساطت سے نازل نہیں ہوتی بلکہ خود بخود ایک چیز اُسی کے دل سے اُٹھتی ہے اور اُسی پر گرتی ہے (۳۸) قرآن سے جنات کا ایسا وجود۔ جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہوائی آگ کے شعلہ سے پیدا ہوئے ہیں اور انہیں مرد و عورت دونو ہوتے ہیں۔ جس شکل میں چاہتے ہیں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ آدمی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ثابت نہیں ہوتا (۳۹) انبیاء بنی اسرائیل اور قوم بنی اسرائیل کے قصے جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں انہیں حسیقدربائین بظاہر قانون فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہیں وہ سب درحقیقت اُس کے مطابق بیان کی گئی ہیں مگر مفسرین اہل اسلام نے یہودیوں کی پیروی سے اُن کے معنی ایسے بیان کیے ہیں جو قانون فطرت کے خلاف ہیں (۴۰) طوفان نوح جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے۔ عام نہ تھا بلکہ اُسی قوم اور اُسی ملک میں محدود تھا جس پر حضرت نوح مبعوث ہوئے تھے (۴۱) حضرت اسحاق کی ولادت کے وقت حضرت سارا کی عمر اُس حد کو نہیں پہنچی تھی جبکہ عادۃً اولاد کا ہونا غیر ممکن ہے۔

اگر سرسید کی تصنیفات کو بالاستیعاب اول سے آخر تک دیکھا جائے تو غالباً مذکورہ بالا مسائل کے سوا اور مسائل میں بھی بہت سے اختلافات نکلیں گے مگر یہ سب اختلافات ایسے ہیں جنہیں سرسید متفق نہیں ہیں بلکہ ہر ایک مسئلہ میں کم یا زیادہ لوگ اکابرِ علما میں سے سرسید کے ساتھ متفق الہے ہیں جیسے امام غزالی، امام رازی، امام اکبرین، قاضی ابن شد، شیخ اکبر

استعارہ ہی جسکی نسبت تاریخ سے ثابت ہو کہ پہلے پہل مرض چچیک عرب میں اُسی سال نمودار ہوا ہی جبکہ ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کی تھی (۹) حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور تمام انبیای سابقین کے قصوں میں جس قدر واقعات بظاہر خلاف قانون فطرت معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے ید بیضا، عصا کا اڑدیا بنجانا، فرعون اور اُس کے لشکر کا غرق ہونا، خدا کا موسیٰ سے کلام کرنا، پہاڑ پر تھلی کا ہونا، گوسالہ سامری کا بولنا، ابر کا سایہ کرنا، من و سلوے کا اُترنا، یا عیسیٰؑ کا گوارہ میں بولنا، خلق طیر، اندھون اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، ماندہ کا نزول وغیرہ وغیرہ۔ اُنکی تفسیر میں جو کچھ سرسید نے لکھا ہے وہ غالباً پہلے کسی مفسر نے نہیں لکھا (۱۰) قرآن مجید میں دو طرح کا کلام پایا جاتا ہے ایک مقصود اور دوسرا غیر مقصود؛ پس جو کلام غیر مقصود ہے اُس سے کسی بات کے اثبات یا نفی پر استدلال نہیں ہو سکتا مثلاً کفار کے رحمت الہی سے محروم ہونے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ”لا تقم لہم ابواب السماء“ چونکہ اصل مقصود اُنکے حرمان کا بیان ہے اور اُسکو اس پر ایہ میں بیان کیا گیا ہے اسلئے اس کلام کو غیر مقصود سمجھا جائیگا اور اس سے اس بات پر کہ آسمان میں فی الواقع دروازے موجود ہیں استدلال نہو سکیگا (۱۱) شریعت اسلامیہ میں تمام احکام دو قسم کے ہیں ایک اصلی اور دوسرے محافظ احکام اصلی؛ جن احکام پر اسلام کی بنیاد قائم ہے وہ صرف احکام اصلی ہیں جنہیں کوئی حکم ایسا نہیں جو قانون فطرت کے خلاف ہو؛ اور دوسری قسم کے احکام سے فقط احکام اصلی کی محافظت مقصود ہے نہ یہ کہ وہ خود مقصود بالذات ہیں؛ پس اُنکی نسبت یہ بحث بالکل بے محل ہے کہ وہ قانون فطرت کے مطابق ہیں یا نہیں

و نہایت صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے (۲) دعا ایک قسم کی عبادت ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے ”الدعاء هو العبادة“ پس دعا کے مستجاب ہونے سے اس مطلب کا جسکے لئے دعا کیجاتی ہے۔ حاصل ہونا مراد نہیں ہے بلکہ جو معنی عبادت کے قبول ہونے کے ہیں وہی معنی دعا کے مستجاب ہونے کے ہیں (۳) آیت یا آیات یا بینات کے الفاظ۔ جو قرآن مجید میں جا بجا آئے ہیں۔ اُن سے وہ احکام یا مواضع و نصائح مراد ہیں جو خدا تعالیٰ نے بذریعہ وحی کے انبیاء پر نازل فرمائے ہیں، نہ کہ معجزات جیسا کہ عموماً علمای اسلام نے بیان کیا ہے (۴) حضرت عیسیٰ کی نسبت جو یہودی کہتے تھے کہ ہم نے اُنکو سنگسار کر کے قتل کیا اور عیسائی کہتے تھے کہ یہودیوں نے اُنکو صلیب پر قتل کیا تھا یہ دو نواقول غلط ہیں؛ بلاشبہ وہ صلیب پر چڑھائے گئے مگر صلیب پر موت واقع نہیں ہوئی اور اسی لئے قرآن میں مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَّوْهُ کے الفاظ واقع ہوئے ہیں جس سے یہ مراد ہے کہ موت جو مصلوب کرنے سے مقصود تھی وہ واقع نہیں ہوئی (۵) اگر مرد کو یہ احتمال بھی ہو کہ وہ متعدد ازواج میں عدالت نہ کر سکیگا تو اُسکو ایک سے زیادہ جو رد کرنے کی اجازت نہیں ہے (۶) سارق کے لئے قطع ید کی سزا جو قرآن میں بیان ہوئی ہے لازمی نہیں ہے کیونکہ اگر لازمی ہوتی تو فقہاء اُسکو مال مسروقہ کی ایک خاص مقدار کے ساتھ مشروط نہ کرتے اور نیز صحابہ کو وقت میں متعدد موقعوں پر سارق کو صرف قید کی سزا نہ دیجاتی (۷) قرآن میں جن اور جہنم کے الفاظ سے چھپے ہوئے یا پہاڑی اور صحرائی لوگ مراد ہیں نہ کہ وہ وہی مخلوق جو دیو اور بھوت وغیرہ کے الفاظ سے مفہوم ہوتی ہے (۸) سورہ فیل (الم ترکیب) میں جن الفاظ سے اصحاب فیل پر ابابیل کا کنکریاں بھینکنا مراد لیا جاتا ہے وہ درحقیقت مرض چیچک سے

کچھ فرق نہیں کر سکتے؛ وہ جس رے سے اختلاف کرتے ہیں، اُنکی ہمیشہ ہی کوشش ہوتی ہے کہ یا اُسکو توڑ دیں یا خود ٹوٹ جائیں۔ مسلمانوں نے چونکہ انگریزی سلطنت میں آزادی کا نیا نیا سبق پڑھا ہے اس لیے جرات اُنکی رے یا عقیدہ کے خلاف یا اُنکی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے اُس سے ہمیشہ ایسا اختلاف کرتے ہیں جو آخر کو منجر بہ مخالفت ہو جاتا ہے۔

ایک اور عام سبب مخالفت کا خاصکر مسلمانوں میں قومی تنزل ہے جس کے سبب سے ہمیشہ گری ہوئی قوموں میں خود غرضی بغضِ حسدِ جمالت وغیرہ خود بخود بڑھ جاتے ہیں؛ لوگ عموماً لڑائی جھگڑے مول خریدنے لگتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر مخالفت پارٹیاں قائم ہو جاتی ہیں۔ یہی مخالفت ہے کہ اگر سرسید رفرمیشن کا کام اختیار نہ کرتے اور مذہبی امور میں ایک حرف بھی جمہور کے خلاف زبان سے نہ نکالتے بلکہ عام انگریزی اسکولوں کے نمونہ پر ایک مدرسہ قائم کر دیتے تو بھی مخالفت بے گز نہ بچ سکتے تھے۔ جب مذہب العلماء جو خاصکر دینی تعلیم اور دینی اغراض کے لیے اکثر علماء اسلام کے اتفاق سے قائم ہوئی ہے۔ مخالفت سے نہ بچی تو اور کسی کو اُس سے بچنے کی کیا امید ہو سکتی ہے اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو کوئی اسلامی انجمن کوئی اسلامی مدرسہ اور کوئی مسلمانوں کی عام بھلائی کا کام آج کل ایسا نہیں کیا جاتا جسکی مخالفت نہ ہوتی ہو۔ پس سرسید کو مخالفت سے کسی طرح معذور تھا۔ اگرچہ اُنکے مذہبی خیالات کی نسبت اُسی وقت سے بدگمانی شروع ہو گئی تھی جب کہ انھوں نے انگریزوں کے ساتھ کھانے سے پرہیز ترک کر دیا تھا؛ مگر جب کہ انھوں نے تبیین الکلام کی پہلی جلد شائع کی تو اُس بدگمانی کو زیادہ ترقی ہوئی۔ سید محمدی علی خان۔ جو آخر کو سرسید کی رفرمیشن کے سب سے بڑے حکمران و گارہوے۔ اُنکو تبیین الکلام کا دیا چہ دیکھ کر ایسا جوش آیا

لیکن چونکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اسلئے عملاً دونوں کا درجہ برابر ہے مثلاً نماز کے متعلق اصلی حکم صرف توجہ الی اللہ ہے باقی جس قدر احکام اُس سے متعلق ہیں مثل وضو اور قیام و قعود و کعبہ و سجود اور استقبال قبلہ وغیرہ یہ سب اُس کے محافظ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مرض یا عذر کی حالت میں سب ساقط ہو سکتے ہیں مگر توجہ الی اللہ کسی حالت میں ساقط نہیں ہوتی لیکن جب تک کوئی عذر مانع نہ ہو دونوں کا بجا لانا ضروری ہے۔

رفارمیشن کی مخالفت

اگرچہ مذہب کے متعلق رائے ظاہر کرنے کی موجودہ گورنمنٹ کی طرف سے آزادی تھی پھر بھی یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اول تو مذہبی خیالات ایسی چیز ہیں کہ جسطرح انکا یقین کسی دلیل سے پیدا نہیں ہوتا اسی طرح وہ کسی دلیل سے زائل بھی نہیں ہوتا؛ اسکے سوا اسلامی سلطنتوں میں اگرچہ غیر قوموں کے مذہب سے بہت ہی کم تعرض کیا گیا مگر خود مسلمانوں کو مذہبی آزادی۔ جیسی کہ چاہیے۔ کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ جس ملک میں جو فرقہ برسر حکومت ہوا اُس ملک میں ہمیشہ اُسی فرقہ کے مذہب نے رواج پایا۔ باقی تمام فرقے مضحل و متلاشی ہو گئے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں آزادی رائے بالکل معدوم ہو گئی اور تقلید کی بدترین غلامی تمام قوم کا شعار بن گئی۔ پس ایک ایسی آواز جس سے کبھی کسی کے کان آشنا نہ ہوئے تھے اُسکو مسلمان کیونکر بغیر نفرت اور کراہت کے سن سکتے تھے۔ دوسرے آزادی رائے ایک ایسی چیز ہے کہ جب دفعہ کسی غیر تربیت یافتہ قوم کو حاصل ہوتی ہے تو اختلاف آراء جو آزادی کو لازم ہے اُس قوم میں ہمیشہ مخالفت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے آزادی اُنکو اختلاف کرنا تو سکھا دیتی ہے مگر بسبب تربیت یافتہ نہ ہونے کے وہ اختلاف اور مخالفت میں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا ہونے کا حال بیان کیا تھا وہاں آپ کی نسبت (عیاذ باللہ) پیغمبر باطل کا لفظ لکھا تھا اردو میں بھی اُسکا اسی طرح ترجمہ بے کم و کاست کیا گیا۔ مگر سرسید نے جارج سیل کے ترجمہ قرآن اور اُسکے دیباچہ سے اور کرنل کینڈی کی کتاب سے اور نیز تاریخ طبری سے چند مقام جنسے مصنف کے قول کی تردید ہو سکتی تھی فٹ نوٹ میں نقل کر دیے تھے مگر ان نوٹوں سے مسلمانوں کی ناراضی کم نہیں ہوئی۔ جب یہ حصہ چھپ کر ممبروں کے پاس پہنچا تو مولوی سمیع اللہ خان نے اس امر پر کہ پیغمبر کے لفظ کے ساتھ باطل کیوں ترجمہ کیا گیا سخت مخالفت کی اور ایک تحریر حمیمین (بقول سرسید کے) اُنکے کفر و ارتداد پر اسی لفظ کے ترجمہ ہونے سے استدلال کیا گیا تھا۔ اخبار و نون میں شائع کرائی۔ اُس میں یہ بھی لکھا تھا کہ جو شخص سوسائٹی میں شریک ہو وہ کافر ہو چنانچہ اکثر مسلمان بزرگوں نے سوسائٹی کی ممبری سے استعفا دیدیا۔

اگرچہ ممکن تھا کہ ترجمہ میں باطل کا لفظ نہ لکھا جاتا مگر سرسید کا مقصد مسلمانوں کو اس بات سے آگاہ کرنا تھا کہ عیسائی اسلام اور بانی اسلام کی نسبت کیا خیالات رکھتے ہیں اور اب اپنے مذہب کے طعنوں سے کان بند کر لینے کا وقت نہیں ہو بلکہ اس بات کی ضرورت ہو کہ غیر قومیں جو کچھ اسلام کے برخلاف کہتی ہیں اُس سے اطلاع حاصل کی جائے اور اُنکی غلط فہمیوں کو رفع کیا جائے یا اُنکے تعصبات کی قلعی کھولی جائے۔ اخیر دم تک اُنکی یہی رے رہی کہ اب وہ زمانہ نہیں ہو کہ مسلمان مخالفوں کے اعتراضوں اور بدزبانوں سے بے خبر رہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں میں جو ایک نیٹو کرچن نے ایک سخت کتاب موسوم بہ اُقتات المؤمنین چھاپ کر مسلمانوں کو مفت تقسیم کی تھی اکثر ذی علم مسلمانوں نے ناگواری کے سبب اُسکو فوراً جلادیا؛ لیکن سرسید نے اُسکی

کہ باوجود جان پہچان نہ ہونے کے اسی جوش و خروش میں انھوں نے سرسید کے دیباچہ مذکور کے برخلاف ایک طول طول خط لکھ کر بھیجا۔ سرسید نے نہایت نرم الفاظ میں یہ جواب لکھا کہ ”اب تقلید کا زمانہ نہیں رہا بلکہ عقل و رموش سے کام لینے کا وقت ہے“ اس کے بعد جب سرسید کے پاس علی گڑھ جانا ہوا اور ان کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں دل میں خدشہ تو تھا ہی، یہ سمجھے کہ جہر سرسید نماز پڑھ رہے ہیں یہ قبلہ کا رخ نہیں ہے۔ جب وہ نماز پڑھ چکے تو اپنا شبہ ظاہر کیا۔ سرسید نے یہ آیت پڑھی ”اَیْمَا تُوْکُوْا فَاْتُمْ وَجْهَ اللّٰهِ“ جب اس پر خوب بحث ہو چکی تو سرسید کہا میں نے اس کو ٹھکی کو ٹھیک قبلہ رخ بنایا ہے۔ پھر کیا پس لگا کر ان کو اپنے کہنے کا یقین دلایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سرسید کی سچائی کا نقش ان کے دل میں بیٹھا۔

جب سرسید نے غازیپور میں مدرسہ قائم کیا اگرچہ وہاں مسلمانوں کی طرف سے کچھ مخالفت نہیں ہوئی مگر پادریوں نے سخت مزاحمت کی اور مسٹر پیٹن جج غازیپور اور کرنل گریہم ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کے سوا ضلع کے تمام افسر پادریوں کے طرفدار ہو گئے مگر آخر کار سرسید کامیاب ہوئے اور مدرسہ قائم ہو گیا۔

جب وہ غازیپور سے بد لکر علی گڑھ میں آئے اور سائنٹفک سوسائٹی اور اسکا پریس بھی جو اس وقت تک سرسید کا پراویٹ چھاپہ خانہ تھا ان کے ساتھ علی گڑھ میں منتقل ہو گیا اور سوسائٹی کا مکان بھی تیار ہو گیا اب سوسائٹی نے باقاعدہ اپنا کام شروع کیا۔ سب سے پہلی فیسٹن مہتری اوپنڈیا کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں ہونے لگا اور اس کے اجزا چھپ چھپ کر ممبروں کو تقسیم ہونے لگے۔ مصنف نے مسلمانوں کی سلطنت ہند کا حال شروع کرنے سے پہلے جہان اسلام کا آغاز اور عرب میں

اگر آبادین انکے ایک دوست کو یہ حال معلوم ہو گیا انھوں نے خط لکھ کر دریافت کیا کہ کیا یہ خبر سچ ہے ؟
 مولوی مہدی علی نے سارا حال مفصل لکھ بھیجا انھوں نے وہ خط بجنسہ ہمارے ایک نامہربان دوست کے پاس
 جو اٹاوہ میں رونق افروز تھے بھیج دیا انھوں نے تمام شہر میں ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ مہدی علی کرٹان ہو گئے
 مولوی صاحب کے گھر کے پاس ہی ایک پینٹھ لگا کرتی تھی ہمارے شفیق نامہربان نے اُس گنوارول میں جا کر
 خط کا مضمون ایک ایک آدمی کو سنایا اور تمام پینٹھ میں منادی کر دی کہ بھائیو! افسوس ہر مولوی مہدی علی
 کرٹان ہو گئے۔ جو سنتا تھا افسوس کرتا تھا اور کہتا تھا خدا سدا احمد خان پر لعنت کرے۔“

اس خبر کا مشہور ہونا تھا کہ مولوی صاحب کے گھر پر چلال خور نے کمانا، ستے نے پانی بھڑا،
 اور سب لگے بندھون نے آنا جانا چھوڑ دیا گھروالوں نے اُنکو لکھا کہ تمہاری بدولت ہم پر سخت تکلیف
 گذر رہی ہے تم جلدی آؤ اور اس تکلیف کو رفع کرو۔ انھوں نے ایک طول طویل خط انھیں بزرگ کو
 جنھوں نے یہ افواہ اڑائی تھی حلتِ طعام اہل کتاب کے باب میں لکھا اور پھر خود اٹاوہ میں آئے اور
 سب کو سمجھایا کہ میں کرٹان نہیں ہوں جیسا پہلے مسلمان تھا ویسا ہی اب ہوں۔ غرض بڑی مشکل
 سے لوگوں کا شبہ رفع کیا۔

جب سرسید لندن جانے لگے کسی نے یہ مشہور کیا کہ مکہ کے بدلے لندن کے حج کو جاتے ہیں اور کسی
 نے کہا کہ لندن جا کر ٹکسالی کرٹان ہو کر آئینگے۔ غرض جو جسکے دل میں آیا سو کہا۔ مگر سرسید جو کچھ
 دل میں ٹھان لیا تھا اُسپر استقلال کے ساتھ قائم رہے اور تاریخ معین پر بسم اللہ مجربا و مؤہبا
 لکھ کر جہاز میں سوار ہو لندن روانہ ہو گئے۔ راہ میں وہ دریائی سفر کے حالات اور جہاز کے واقعات لکھ کر
 وقتاً فوقتاً سوسائٹی کے اخبار میں چھپنے کو بھیجتے جاتے تھے؛ اُسی کے ضمن میں انھوں نے یہ بھی

جلد بند ہوا اگر اسکو اول سے آخر تک دیکھا اور فوراً اسکا جواب لکھنا شروع کیا جسکو مرض الموت نے افسوس ہی کہ ختم نہ ہونے دیا۔

پھر لندن جانے سے پہلے جب انھوں نے ایک رسالہ احکام طعام اہل کتاب پر لکھکر شائع کیا تو عموماً انکو کرٹان کا خطاب دیا گیا اور جا بجا اسکے چرچے ہونے لگے۔ جب ولایت کے سفر میں چند روز باقی رہ گئے تو انھوں نے اس خیال سے کہ انگریزی طریقہ پر کھانا کھاؤ سے بخوبی واقفیت ہو جائے۔ یہ معمول باندھ لیا تھا کہ مسٹر سواتیہ جو بنارس میں ایک سوداگر تھے اور سرسید کی کوٹھی سے انکی کوٹھی ملی ہوئی تھی۔ ایک دن شام کا کھانا یہ انکے گھر پرچا کر کھاتے تھے اور ایک دن وہ انکے گھر پرچا کر کھاتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ ”اتفاق سے انھیں دو غیر مولوی سید بعلجان مرزا پور سے بنارس میں مجھ سے ملنے کو آئے۔ رات کا وقت تھا اور میرے ہاں کھانے کی باری تھی ہم دونو میز پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ مہدی علی آپہنچے۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ مولوی مہدی علی نے ایک مسلمان کو اسطرح ایک انگریز کے ساتھ کھانا کھاتے دیکھا تھا؛ سخت نفرت ہوئی اور باوجود میرے ہاں مہمان ہونے کے کھانا نہ کھایا اور کہا کہ میں کھا چکا ہوں۔ صبح کو مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے اس وجہ سے کھانا نہیں کھایا۔ میں نے کہا کہ اگر آپ کو یہ طریقہ ناپسند ہو تو دوسرا بندوبست کیا جائے۔ انھوں نے سوچا کہ شرعاً تو ممنوع نہیں ہے صرف عادت کے خلاف دیکھنے سے نفرت ہوئی ہے آخر قبول کر لیا اور سب سے پہلی دفعہ دن کا کھانا میرے ساتھ میز پر کھایا۔ دن تو اسطرح گزر گیا مگر رات کو یہ شکل پیش آئی کہ رات کا کھانا مسٹر سواتیہ کے ہاں تھا؛ میں نے اُسے پوچھا کہ اگر آپ کو وہاں کھانے میں تاثر ہو تو یہاں انتظام کیا جائے انھوں نے پھر سی خیال سے کہ شرعاً ممنوع نہیں۔ اقرار کر لیا کہ میں بھی وہیں کھا لوں گا۔ چنانچہ رات کو وہاں کھانا کھایا پھر ایک اور روز بعد مرزا پور واپس چلے گئے۔

اخباروں میں برابر اعتراضوں کی بوجھاڑ ہوتی تھی۔ انکی ایک تحریر میں یہ فقرہ تھا کہ ”ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے ساتھ تربیت و شایستگی میں وہ نسبت رکھتے ہیں جو ایک چشمی بد صورت ایک لائق اور خوبصورت آدمی کے ساتھ رکھتا ہے“ اسپرمدت تک اخباروں کے کالم کے کالم حیاہ ہوتے رہے اور عام مجلسوں میں بہت دن تک اسکا چرچا رہا چنانچہ انھیں دنوں میں ایک جلسہ کی کیفیت۔ جو تقریب عورت جبرادہ عبید اللہ خان فیروز جنگ مولوی سید مہدی علی خان کے مکان پر منعقد ہوا تھا اور حسین صاحبزادہ موصوف اور مولوی صاحب اور دیگر شرکامی جلسہ کے درمیان خوب مباحثہ ہوا تھا۔ سوسائٹی کے اخبار میں مفصل چھپی تھی۔

جب یہ تمام نکتہ چینی سے بھرے ہوئے اخبار سرسید کے پاس لندن میں پہنچے تو انھوں نے ایک مضمون۔ جسکا عنوان ”عزازتوں نگار سید احمد“ تھا۔ سوسائٹی اخبار میں چھپنے کو بھیجا جس میں اول تمام وطن کے نکتہ چینوں کا شکریہ ادا کیا تھا کہ انھوں نے میرے علیوں سے مجھے ماہ کیا اور آخر میں اہل وطن سے مخاطب ہو کر لکھا تھا کہ ”وہ دن آنے والا ہے کہ تم میرے ان لفظوں کو جنھیں اب گالیان سمجھتے ہو سو ہالیان سمجھو گے۔۔۔ اسی باران وطن سے

”رات تھوڑی حسرتیں دل میں بہت صلح کیجیے بس لڑائی ہو چکی“

وہ وشکایت ہو چکے، بس اب گلے مل لیجیے اور اپنے ملک کی بھلائی پر متوجہ ہو بیجے، اپنے ملک کے بچوں کی تربیت کا بندوبست کیجیے اور جو الزام ہمارے ملک پر ہیں انکو مٹائیے، دنیا میں اپنے ملک کو تربیت یافتہ اور شایستہ کر کے دکھائیے اور چلے حوالوں کو اٹھا رکھیے

جب اسپر بھی اہل وطن کی مخالفت کم نہوئی اور اخباروں میں برابر مخالفانہ مضامین

لکھا تھا کہ ”جہاز میں باورچی اور جانور ذبح یا صاف کر نیوالا انگریز ہی، تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ جوڑے جانور ہمیں اور جن میں خون زیادہ ہے۔ جیسے بھیڑ بکری مینڈھا وغیرہ۔ اُسکو تو وہ ہمیشہ گردن کی شرگ میں آ رہا پھر پھر ذبح کرتے ہیں کیونکہ اُنکے ہاں بھی دم مسفوح ناجائز یا حرام ہے یا اسکے اخراج کا ذبح اور پرندوں کی نسبت وہ یہ کہتے ہیں کہ پرندوں میں مثل چو پاؤں کے دم مسفوح نہیں ہے اور اُن کی مثال دریائی جانوروں کیسی ہے پس اُنکا ذبیحہ صرف اُنکا مار ڈالنا ہی ایسے پرندوں کو ذبح نہیں کرتے بلکہ گردن توڑ کر مار ڈالتے ہیں“ چونکہ اہل کتاب کا ذبیحہ مطلقاً جسطرح کہ وہ کرتے ہوں مسلمانوں کو اپنے مذہب کے موافق کھانا جائز ہے ایسے سرسید نے لکھا تھا کہ ”میں نے اور میرے ساتھیوں نے اُن دونوں قسم کے گوشتوں کے کھانے میں کچھ تامل نہیں کیا اور خوب مزے دار گوشت مٹن اور بیف اور مرغ و کبوتر کے کھائے والحمد لله الذی جعل دیننا تسریلاً عسراً والصلوة والسلام علی صاحبہ الشریعۃ السہلۃ الھدٰی“ اور جہان تک ہم کو معلوم ہے تمام ترک اور مصر و شام کے مسلمان جو عیسائی قوموں کے جہازوں میں سفر کرتے ہیں وہ بھی عموماً اسطرح عیسائیوں کے ساتھ انھیں کے باورچیوں کے ہاتھ کا صاف یا فنج کیا ہوا اور انھیں کے ہاتھ کا پکایا ہوا بے تکلف کھاتے ہیں۔

جب یہ خبر ہندوستان میں پہنچی تو مخالفین کو ایک اور ہتھیار سرسید پر ہاتھ صاف کرنے کو ملا، عیسائیوں کے ہاتھ کی گردن مڑوڑی مرغی کھانے کو انھوں نے سید کے کافر ہونیکا بہت بڑا ثبوت قرار دیا کیونکہ قرآن مجید کی رو سے منقحہ حرام ہے پس جس شخص نے قرآن کے حکم سے انحراف کیا اُسکے کافر اور مرتد ہونے میں کیا کلام ہے؟

پھر لندن سے جو تقریر سرسید کی آتی تھی اور سوسائٹی کے اخبار میں چھپتی تھی اُس پر عام

انہ بارشعلہ طور کا پور کی مخالفت نہ تحریر کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط امین لکھتے ہیں ”جو مضمون کہ
 امین لکھا گیا اپنے پڑھا ہوگا اور امید ہے کہ اور بہت کچھ لکھا جائیگا۔ اگرچہ ایسی باتوں سے کبھی دل کو طال ہوتا ہے جو
 مقتضای بشریت ہے مگر فی الفور رفع ہو جاتا ہے اور دل کو صرف دو خیالوں سے تسلی ہوتی ہے؛ اول تو اس خیال سے
 کہ آج تک کوئی نیکی چاہنے والا ایسا نہیں ہوا جس کے مقابل میں کوئی نہ کوئی مخالفت نہ کھڑا ہوا ہو آدم، نوح،
 ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، محمد رسول اللہ، خلفای اربعہ، محی الدین جیلانی، مجدد الف ثانی، محمد اسماعیل
 دہلوی، و علیٰ ہذا القیاس؛ پس میں تو انکی جوتیوں کے برابر بھی نہیں ہوں، میری مخالفت پر کمر باندھنی
 کچھ بڑی بات نہیں ہے۔ دوسرے اس خیال سے کہ میں دیکھتا ہوں جون جون مخالفین نے نیکی کا مقابلہ کیا ہے
 دونوں نیکی بڑھتی گئی ہے؛ پس اگر میرا کاروبار میری نیت سچی اور نیک ہے تو انشاء اللہ تعالیٰ امین کچھ
 نقصان نہیں ہوئیگا اور اگر وہ نیک نہیں ہے اور میں غلطی سے اسکو نیک خیال کر رہا ہوں تو بلاشبہ ٹوٹ جائیگا
 اور مخالفت۔ جو اس صورت میں ضرور ہے کہ نیکی پر ہونگے۔ کامیاب ہونگے اور ایسی حالت میں مجھکو بھی انکی کامیابی
 پر خوشی کرنی ہوگی، نہ اپنی تدابیر کے ٹوٹنے اور اپنے دھوکے میں پڑے ہونے کا رنج“

اس خط اور نیز انکے دیگر خطوط سے۔ جو ولایت سے انھوں نے مولوی صاحب ممدوح کو
 لکھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انکو اپنی سچائی پر اور اسکی وجہ سے اپنی کامیابی پر پورا پورا بھروسہ تھا اور لوگوں
 کی مخالفت کی انکو مطلق پروا نہ تھی۔ ایک خط امین خطبات احمدیہ کی نسبت مولوی محمد علی خان کو
 لکھتے ہیں ”بعد چھاپہ کے چند نسخے آپکے پاس بھیجوں گا؛ تا دامت کہ مخدوم چمکیوید؟ خدایا مخدوم ہمدی اگر مرا
 اکافر و مرتد دانہ پاک نیست زیرا کہ این معاملہ را بانست نہ با مخدوم من ہمدی۔ لیکن محبت من از تو محبت اور من
 کہ مگردان۔ او خداوند از ہای پوشیدہ درون سینہا تو میدانی کہ من باتو و بادین حقہ اسلام دادہ تو چہ میکنم

چھپتے رہے تو انھوں نے ایک تحریر جس کا عنوان ”عرضہ خدمت اہل وطن“ تھا سوسائٹی
 اخبار میں چھپنے کو بھیجی جسکی ابتدائی سطروں سے کسی قدر اُس مخالفت کا اندازہ ہوتا ہے جو
 اسوقت تک ہندوستان کے مختلف اطراف سے ہو چکی تھی یا ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کام اور
 کوشش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”پس جو میرا گناہ ہے وہ بجز اپنے ہموطنوں کی عمر و آسلاام کی
 خصوصاً خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ نیست یارانِ طوق غم ازین تقصیرا +++ اگرچہ میری اس
 دلسوزی کو میرے ہموطنوں نے ناپسند ہی نہیں کیا بلکہ اُلٹا سمجھا اور کوئی الزام اور عیب اور برائی اور سخت کلامی
 نہیں چھوڑی کہ علانیہ اور خفیہ میری نسبت منسوب نہ کی ہو؛ مگر جو کہ میری یہ دلسوزی اپنے ہموطنوں سے
 یا ہم قوموں سے کسی صلہ کی توقع پر نہ تھی بلکہ اسکا اجر خدا سے لینا ہے اسیلے میرے ہموطنوں نے کوئی بات
 جو میرے ساتھ کی۔ جھکونا گوار نہیں گزری اور خدا نے مجھ کو اپنے ارادہ پر مستحکم رکھا۔ نہ پرانے دوستوں
 کی باتیں بُری معلوم ہوتی ہیں، نہ نئے شفیقوں کی تشبیح رنج دیتی ہے، نہ کانپور کی حبیب آواز سے
 رنج ہوتا ہے، نہ لکھنؤ کی نغمہ سرائی سے دل دکھتا ہے، نہ آلہ آباد اور اگرہ کی لطف آمیز باتیں رنج دلاتی ہیں۔
 نہ مراد آباد اور امپور کے فتوے اور دہلی کے اہل جبہ و خالقاہ حاجیان حرمین شریفین کی گفتار و رفتار
 دل کو دکھاتی ہے؛ عام بھلائی کے جوش نے کسی دوسری چیز کے سمانے کی دل میں جگہ نہیں چھوڑی
 والحمد للہ علی کلک“

معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے جو بڑے بڑے منصوبے باندھے تھے انہیں خاص کر مسلمانوں
 کی طرف سے سخت مخالفتوں کے ہونے کا انکو کامل یقین تھا اور ولایت سے وہ اُن
 مخالفتوں کے چھیلنے کے لیے تیار ہو کر آئے تھے۔ وہ ولایت سے مولوی سید محمد علی خان کو

مدرسۃ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے جو باوجود ذی وجاہت اہل ذی عرب
 ہونیکے علوم دینیہ سے بھی آشنا تھے ؛ ایک مولوی امداد علی ڈپٹی کلکٹر کانپور اور دوسرے مولوی
 علی بخش خان سب جج گورکھپور ۔ اگرچہ یہ دونو صاحب مذہبی عقائد و خیال کے لحاظ سے ایک دوسرے
 کے ضد حقیقی تھے ۔ یعنی پہلے سخت وہابی اور دوسرے سخت بدعتی ، اور یہ ایسا اختلاف تھا کہ کسی
 بات پر دونو کا اتفاق کرنا محال عادی معلوم ہوتا تھا ؛ باوجود اسکے مدرسۃ العلوم کی مخالفت پر دونو
 ہم زبان اور متفق الکلمہ تھے ؛ یہاں تک کہ ہندوستان میں جس قدر مخالفین اطراف و جوانب سے
 ہونے لگے انکا منبع انھیں دونو صاحبوں کی تحریریں تھیں ۔ اگر انکی مخالفت کا باعث مذہبی جوش
 اور حمیت اسلامی ہوتی تو انکا کام نہایت تعریف کے لائق ہوتا مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں کی تمام
 مخالفتوں کی طرح انکی مخالفت بھی محض ذاتیات پر مبنی تھی جسکے بیان کرنے کی یہاں ضرورت
 نہیں ۔ ایک دروجہ انکی مخالفت کی یہ تھی کہ بعض جلیل القدر انگریز مدرسۃ العلوم کے سخت
 مخالف تھے اور انھیں سے بعض کے ساتھ ان دونو صاحبوں کو خاص تعلق تھا ایسے سرسید
 کی مخالفت کو انھوں نے ایک ذریعہ انکی خوشنودی اور اپنی سرخروئی کا سمجھا تھا ۔

پھر بہت سے دیسی اخباروں نے جب یہ دیکھا کہ سرسید سے بہت سے مسلمان عموماً
 بدگمان اور متنفر ہوتے جاتے ہیں تو انھوں نے اپنے اخباروں کی گرم بازاری اسی میں
 دیکھی کہ جہاں تک ممکن ہو کوئی پرچہ ایسا نہ نکلے جس میں سرسید اور انکے اعوان و انصار پر اعتراض
 کی بوچھاڑ نہ ہو ۔ بعض مولوی جو زمانہ کے انقلاب سے نہایت کس مرہیں حالت میں تھے
 انھوں نے سرسید کی عام مخالفت سے اس طرح فائدہ اٹھانا چاہا کہ انکی تصنیفات کا رد لکھنے پر

وچہ اعتقاد دارم ؟ پس اگر مرا محبوب من ممدی لاندہب یا کافر گوید یا سمیع اللہ و امداد اعلیٰ مرتد داند مرا
چہ پاک ؟ تو بر من مہربان باش ۔

الغرض جب سرسید لندن سے واپس آئے اور الہ آباد میں پہنچے تو انکو معلوم ہوا کہ کہ صندلاع
شمال مغرب اور دہلی میں اس مضمون کے خطوط اور اشتہار جاری ہوئے ہیں کہ کوئی مسلمان سید احمد خان
سے نہ ملے اور نہ انکے ساتھ کھانا کھاوے اور جو ایسا کر گیا وہ دائرۃ اسلام اور جماعت اہل اسلام سے
خارج ہو جائیگا ۔ ہم نے سنا ہی کہ اسی مضمون کا ایک خط نواب ضیاء الدین احمد خان مرحوم میں
لوہارو کے پاس بھی ۔ جو سرسید کے بڑے گارڈ دوست تھے ۔ دہلی میں پہنچا تھا ۔ انھوں نے
خط پڑھ کر کہا کہ ”خدا مارے یا چھوڑے“ سید احمد کافر ہو یا مسلمان ، مجھے تو نہ ہو سیکر گا کہ میں سید احمد خان
سے نہ ملوں اور نہ انکے ساتھ کھانے اور کھلانے سے پرہیز کروں ۔“ سرسید کی زبانی معلوم ہوا کہ ولایت آئین کے
بعد بہت دن تک اکثر لوگ انکے ساتھ کھانے سے پرہیز کرتے رہے مگر رفتہ رفتہ بیمار چھے ہوئی گئے ۔
پرہیز ٹوٹا گیا یہاں تک کہ مسلمانوں کا انگریزوں کے ساتھ کھانا ۔ جیسا کہ ظاہر ہے ۔ اب ایک عام
بات ہو گئی ہے ۔ وہی لوگ جو میز اور کرسی اور چھتری کانٹے کے نام سے بدکتے تھے اب انگریزوں کو
اپنے گھر بلا کر اور خود انکے ہاں جا کر اسی طریقہ سے انکے ساتھ کھانا کھانا فخر سمجھتے ہیں اور کوئی شخص
انکو کریانہ نہیں جانتا ۔

لیکن مذکورہ بالا مخالفتوں کو بمقابلہ اس طوفان عظیم کے ۔ جو آگے چل کر اٹھنے والا تھا ۔

محقق ایک چھپر چھارہ اور نوک جھوک سمجھنا چاہیے ۔ جو میں سرسید نے تہذیب الاخلاق
جاری کیا اور کالج کے قائم کرنے کے لیے کوشش شروع ہوئی ، مخالفت کی گھٹا چاروں طرف اندھ گھنڈ کر اٹھی ۔

یہ خواہش تھی کہ وہ خط بجنسہ انکی لائف میں درج کیا جائے مگر ہماری غیرت تقاضا کرتی کہ اس ملعون تحریر کو سرسید کی لائف میں نقل کر کے قوم کی نالائقی تمام دنیا پر ظاہر کریں۔ چونکہ سرسید کے مخالفوں کی عام تحریریں اور رسالے اور کتابیں اور میگزین اور اخبار زیادہ تر کذب و افتراء و بہتان اور معاندانہ کج بحثیوں سے بھرے ہوتے تھے اسلئے سرسید جہاں تک ہو سکتا تھا کسی کا جواب نہیں دیتے تھے اور اپنے دوستوں کو بھی جواب دینے سے منع کرتے تھے مگر اول اول جبکہ مخالفوں نے سرسید اور انکے بعض دوستوں کی نسبت غلط افواہیں اڑانی شروع کیں اور لوگوں نے سرسید کو مجبور کیا کہ یا تو ان باتوں کا جواب دیجیے ورنہ سمجھا جائیگا کہ آپ کی نسبت مخالفوں کے الزامات سب صحیح ہیں اور نیز ان تحریروں سے چند ہی کے رک جائے گا بھی اندیشہ تھا اسلئے کبھی کبھی سرسید اور مولوی سید مہدی علی نے تہذیب الاخلاق میں ان کے جواب لکھنے پر قلم اٹھایا ہے۔ از انجملہ سرسید کا مضمون ”دافع البہتان“ اور سید مہدی علی کا مضمون ”سلمانان“ اور ”سوال و جواب“ خصوصیت کے ساتھ دیکھنے کے لائق ہے۔

”دافع البہتان“ سرسید کا وہ مضمون ہے جو انھوں نے مولوی علی بخش خان مرحوم سب ٹرنٹ جج گورکھپور کی کتاب تائید الاسلام کے جواب میں لکھا تھا اس مضمون کو سرسید ذیل کی فقرہ پر ختم کیا ہے ”جو کوئی میری اس تحریر کو دیکھیں گے تعجب کریگا کہ جناب سید الحاج (یعنی مولوی علی بخش خان) نے کیوں ایسے سخت اور محض غلط بہتان مجھ پر کیے ہیں؟ ظاہر اسکا سبب +++ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سید الحاج نے جب یہ رسالہ لکھا ہے قریب اسی زمانہ کے حج کو تشریف لیجا نیوالے تھے۔ انھوں نے خیال کیا ہوگا کہ لاؤ حج کو تو جاتی ہیں جتنے گناہ کرنے ہیں سب کر لیں، حج کے بعد تو سب پاک ہی ہو جائیں گے؛ جیسے کہ بعض آدمی جیسا کہ لیا جاتا ہے تو ہیں

کمر باندھی اور فی الواقع اس سے اُنکو بہت بڑی کامیابی ہوئی اُنکی کتابیں تمام ہندوستان میں شایع ہو گئیں اور کئی کئی بار اُنکے چھپنے کی نوبت آئی۔

الغرض سرسید کے خیالات اور اُنکی تحریرات کے برخلاف مستقل کتابیں اور رسالے لکھے جانے لگے۔ رسالہ طعام اہل کتاب کے رو میں مولوی امداد علی نے امداد الاحساب لکھی، مولوی محمد علی نے منزہ لا وہام نام ایک سالہ شایع کیا، تہذیب الاخلاق کے توڑ پر خاص اخبار اور رسالے جاری ہوئے، کانپور سے نورالآفاق اور نور الانوار اور مراد آباد سے لوح محفوظ نکلا، اگرہ سے تیرھویں صدی شایع ہوا، امدادالآفاق۔ شہاب ثاقب اور تائید الاسلام وغیرہ ضلوع شمال مغرب سے اور اشاعت السنہ پنجاب سے شایع ہوئے، سرسید کو طرد، لاف زب، کرستان، نیچری، دہریہ، کافر، دجال اور کیا اور کیا خطاب دیے گئے، اُنکے کفر کے فتوے پڑھ رہے اور قصبہ قصبہ کے مولویوں سے مہرین اور دستخط کرائے گئے یہاں تک کہ جو لوگ سرسید کی تکفیر پر سکوت اختیار کرتے تھے اُنکی بھی تکفیر ہونے لگی، سرسید کے نام گالی اور دشنام کے بھری ہوئے گناہم خطا چاروں طرف سے آنے لگے اور ان گناہم خطون کا سلسلہ جہان تک کہ ہم کو معلوم ہو کم و بیش اخیر تک جاری رہا۔ سرسید نے ان نالائق خطون میں سے ایک آدھ خط راقم کو بھی دکھایا ہے اور کیا ہوا جبکہ منشی سراج الدین احمد سرسید کی لائف لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے سرسید کے پاس آیا تھا اور اُنکے پاس سرسید نے اس غرض سے بھیجا تھا کہ اُسکو نہایت جلی حرفون میں میری لائف میں درج کر دینا چنانچہ وہ خط منشی صاحب کے مسودات میں ہم کو دستیاب ہوا ہے جس میں اول سے آخر تک نہایت مستند گالیاں۔ جو ذیل سے ذیل آدمی کی زبان پر بھی نہیں آسکتیں۔ بھری ہوئی ہیں۔ اگرچہ

پس ہلکوجو اپنی قوم کے ہاتھ سے ہونا چاہیے تھا اُسکا کروڑوں حصہ بھی ابھی نہیں ہوا۔ ہلکودیکھنا چاہیے کہ ہماری قوم نے ہم سے کیا کیا؟ کچھ نہیں کیا، بہت کیا تو یہ کیا کہ دوچار خاگنام دشنام کے لکھ بیجے، ہنسنے شکر کیا کہ ہمارا تو کچھ نہیں بگڑا اور انکاد لٹھنڈا ہو گیا۔ اس سے زیادہ کسی کو غصہ آیا اور کوئی اخبار نویس بھی اتفاق سے انکا دوست ہوا یا دوپتھر اور ایک کاسٹھ کی کل اُنکے ہاتھ میں ہوئی تو انھوں نے اپنے دل کے غصہ کو جھوٹ سچ باتیں چھاپ کر یا چھپو کر ٹھنڈا کیا، ہم تو اسپر بھی راضی ہیں؛ مگر اُس دن کا ہلکوا فسوس ہے جب کہ وہ لوگ خود اپنی باتوں پر فسوس کریں گے اور سمجھیں گے جو سمجھیں گے۔

ہم کو ملحد اور ذنیق اور لامذہب کہنا کچھ تعجب نہیں ہے کیونکہ ہماری قوم نے خدا کے واحد و اکبر کے سوا باپ دادا کے رسم و رواج کو اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا مانا ہے اور پیغمبر آخر الزمان محمد رسول اللہ کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کیے ہیں، کتاب اللہ کے سوا انسا فون کی بنی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے، اور ہم اُس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسا ہی برباد کر نیوالے ہیں جیسے رسد امجد ابراہیم اپنے باپ آزر کے بتوں کے توڑنے والے تھے۔ ہم سچے خدای واحد و اکبر کے جلال اور سچے پیغمبر محمد رسول اللہ کی نبوت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنی چاہتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ہلکوں ملحد و ذنیق و لامذہب نہ کہیں اور نہ سمجھیں تو کیا کہیں اور کیا سمجھیں؟ کیونکہ ہم اُنکے خداؤں اور پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے۔

مگر طرفہ یہ ہے کہ ہلکوں کرستان بھی کہتے ہیں اور ہماری قوم کے ایک اخبار نویس نے چھاپا کہ ہم عیسائی ہو گئے اور ایک گرجا میں جا کر بیٹھا یعنی صلیب پر لٹا دیا۔ ہلکوں اپنی قوم کے حال پر نہایت افسوس کیا کہ اب ہماری قوم کا یہ حال ہو گیا ہے کہ علانیہ جھوٹ بولنے اور جھوٹ چھاپنے میں کچھ شرم و غیرت و حیا نہیں آتی۔

تو خوب پیمیزی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسئلے سے سب کھایا پیا نکل جاویگا۔ مگر جناب سید احمدا
 کرنا چاہیے کہ گوج میں سب گناہ آپ کے معاف ہو گئے ہوں اور شبلی و جنید کے مرتبہ پر آپ پہنچ گئے ہوں۔ میر
 حق العباد نہ حج سے بخشے جاتے ہیں نہ کسی بشارت سے۔ آپ نے جو اتمامِ مچھر کیے ہیں۔ جب تک میں ہی
 نہ معاف کروں معاف نہیں ہو سکتے پس مقتضای ایماندار ی یہ ہے کہ آپ حج در احمد کا احرام باندھیے اور
 گناہوں کی معافی چاہیے ورنہ روز جزا اپنے کرتوتوں کا مزا آپ کو معلوم ہو جائیگا۔“
 ایک اور مضمون سرسید نے انھیں مخالفتوں کے ہجوم کے زمانہ میں لکھا تھا جس کا عنوان
 ”حال خود و یارانِ خود“ ہے۔ یہ مضمون بھی نہایت لطیف اور دل چسپ ہے جس کے چند فقرے ہم
 اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

”ہمارے اور ہماری قوم کے حال پر حافظ کا یہ شعر صادق آتا ہے

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نگو گفتی جواب تلخ میزید لب لعل شکر نارا

پُرانے دل بعض تو ہکو بُرا کہتے تھے دے ہو گئے ہیں اور بعض نے دل جوش پر ہیں اور ہکو بُرا کہتے ہیں۔

تیز زبان مگر ہمارا دل اپنے کام سے ٹھنڈا نہیں ہے؛ ہکو وہی جوشِ محبت و ہمدردی اپنی قوم کے ساتھ ہے، انگلی
 دین و دنیا کی بھلائی اور تہذیبِ شایستگی کی دن رات فکر ہے، اُن کے غصہ سے ہکو رنج نہیں، ”انلی سخت کاڑھی
 کا ہکو غم نہیں؛ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ نہیں جانتے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ نہیں سمجھتے۔ + + +
 ہکو پھلون کے حالات سے اور خود اپنے دادا محمد رسول اللہ صلم کے حالات سے بالکل تسلی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں
 کہ جن لوگوں نے عام بھلائی پر کمزور ہندھی ہے اور اپنی قوم کی بہتری و بہبودی میں کوشش کی ہے انکو دنیا کے
 ہاتھ سے اور بتخصیص اپنی قوم کے ہاتھ سے کیا ملا؟ کوئی سولی دیا گیا، کوئی آہ سے چیر گیا، کوئی جلا وطن کیا گیا،

دلی اور لکھنؤ کے دوست بڑے عالموں کے جواب میں سے کچھ کچھ فقرے بطور نمونہ کے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں۔

مولوی کریم اللہ صاحب مرحوم دہلوی لکھتے ہیں ”در سنج این سانحہ ایمان ز داسے وقوع
 این واقعہ ہوش ربا و ظہور این محاملہ فحیبت افزا و حدوث این حادثہ اکاد افشا کے تعمیر کرنا اور کرنا بقول و فعل
 اس قائل کے ایسے مکان کا اور معاہدہ کرنی ایسے طلبہ کی اور اپنے مال معصوم کو غیر معصوم کرنا اور ہمسایے ہونا
 اُس خوش عقیدہ کے۔ کہ کسکا حال بد مال اس سوال میں مذکور ہے۔ بالکل باطل، اور ایسے مکان ناپاک کا نام
 مدرسہ کھنا اور محل تعلیم و تحصیل سمجھنا آدمیت سے ٹکنا ہے اور زمرہ حیوانات میں داخل ہونا ہے۔ اعوذ باللہ من الجحیم
 بعد الکور بل بالکل باطل بلکہ صرف کرنا مال کا ایسے محل میں موجب کُندہ ہونا جہنم، اور ایسے بے محل میں سعی
 ناہیملہ و رطب بننا لازم ++++ الحاصل معاہدہ ایسے غارتی ایمان اور مال کی اور شد سمجھنا اپنے مال کا خیال
 خام، نے نے یوں سمجھے کہ میں اپنے ہاتھ سے جہنم میں مکان تعمیر کرتا ہوں اور اپنے اعمال صالحہ کو مٹاتا ہوں۔
 پس مہربانہ بلکہ تمام سُستی و شیمی و خارجی و سائر مہربانہ و تمامی سکندہ سائل زمین پر واجب اور متمم کر کہ ایسے
 کلام واپسی اور ایسے واپسی عقیدہ والے پر عقیدہ اپنا نہ جاوین بلکہ ہر فرد ہر مذہب کا اس شخص کو ہادم بنا
 اپنے مذہب کا بوجھے اور اس امر پر چ پر دل نہاد نہوے اور اپنے دل میں اسکا انجام سوچ کر کیا حال بچایا ہے“
 مولوی عبدالحی صاحب مرحوم لکھنوی۔ جو علمای فرنگی محل میں نہایت نام برآوردہ تھے۔
 مقفے عبارت میں تحریر فرماتے ہیں ”وجود شیطان اور اجنہ کا منصوص قطعی ہیں اور منکر اسکا شیطان ہے
 بلکہ اس سے بھی زائد کیونکہ خود شیطان کو بھی اپنے وجود سے انکار نہیں ++++ اور وجود آسمان منصوص قرآنی
 ہے، منکر اسکا بتلای و سواس شیطانی ہے، حرمت منحقہ بطور منصوص کلام رب غفور ہے، اور سلفیت تا خلف

قومی ہمدردی جو خدا کی ایک بڑی نعمت ہے۔ خدا نے ہماری قوم کے دل سے کیسی مٹا دی ہو۔ اُس شخص کو یہ بوجھ
غیرت نہ آئی کہ میں ایک مسلمان شخص کی نسبت کس دل اور غیرت سے ایسی جھوٹ بات چھاپ دوں۔
ان باتوں سے ہلکو بلحاظ اپنی ذات کے کچھ بھی رنج نہیں ہوتا۔ مگر جو رنج و غم اور افسوس ہوتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ
کہ افسوس ہماری قوم پر خدا کی کیسی خلی ہو جو ایسی حالتوں میں گرفتار ہیں رہنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا
و ترحمنا لنكونن من الخاسرین۔

مولوی امداد العلی نے جو تین استفتے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں بھیج کر
سرسید کے کفر و ارتداد کے فتوے حاصل کیے تھے انہیں سے ایک استفتا اس مضمون کا تھا کہ جس شخص
کے ایسے اور ایسے عقائد اور اقوال و افعال ہوں وہ مسلمان ہی یا نہیں؟ اور دوسرا اس مضمون
کا تھا کہ جو مدرسہ ایسا شخص فلان فلان اغراض سے قائم کرنا چاہے اُس میں چندہ دینا اور اس کی اعانت
کرنی مسلمانوں کو جائز ہی یا نہیں؟ اور تیسرا اُسی تاریخ ہندوستان کے ترجمہ کرنے کی بابت تھا
جس میں مصنف نے آنحضرت کی نسبت اپنے عقیدہ کے موافق سخت اور ناملائم الفاظ لکھے۔

یہ تمام فتوے اور استفتے مولوی امداد العلی نے اپنے ایک سالہ کے آخر میں جس کا نام ”امداد الآفاق
برجم اہل النفاق“ جو اب ریچہ تہذیب الاخلاق“ ہے چھاپ کر اُس رسالہ کو تمام ہندوستان میں مفت تقسیم
کیا تھا۔ اس کی ایک جلد ہماری نظر سے بھی گزری ہو، اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں
کے جتنے فرقے ہندوستان میں ہیں کیا سنی، کیا شیعہ، کیا مقلد، کیا غیر مقلد، کیا وہابی، کیا بدعتی،
سب فرقوں کے مشہور اور غیر مشہور عالموں اور مولویوں کی ان فتووں پر مہرین یا دستخط ہیں
اور خاص کر سنی مولویوں میں سے اکثر نے بہت شرح اور بسط کے ساتھ جواب لکھے ہیں۔ از انجملہ

لکھتے ہیں ”دیکھو دشمن آدمی کو ایسا اندھا کر دیتی ہے اُسی اخبار (شعلہ طور) میں تاریخ ہندوستان کے مضمون کو نقل کر کے بشتر و مد لکھا ہے کہ ”جس شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا ہو وہ کیسا جہنمی ہے“ حالانکہ خود بھی اُسی عبارت کو لکھتے ہیں ؛ پھر مجھ میں اور انہیں کیا فرق ہے ؟ صرف اتنا کہ میں نے انگریزی سے نقل کیا اور انھوں نے اردو سے “

یہ نرا لطیفہ ہی نہیں ہے بلکہ اُس فتوے کے موافق جو مفتی سعد اللہ صاحب نے اسی ترجمہ کی بابت سرسید کی نسبت دیا ہے۔ مولوی امداد علی بھی تکفیر کے مستحق ٹھہرتے ہیں ؛ کیونکہ مفتی صاحب اپنے فتوے کی تائید میں شفا ی قاضی عیاض سے نقل کرتے ہیں کہ ”ایک شخص نے امام مالک سے پوچھا کہ اُس شخص کا کیا حکم ہے جو کہتا ہے کہ قرآن مخلوق ہے ؟ امام مالک نے ظم دیا کہ ان الفاظ کا بولنا والا کافر ہے اس کو قتل کر ڈالو۔ اُسے کہا حضرت میں نے تو دوسرے شخص کا قول نقل کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہنسے تو تجھی سے سنا ہے“ **لطیفہ** پھر جب کہ سرسید ولایت سے واپس آ گئے اور تہذیب الاخلاق جاری ہو گیا اُس وقت مولوی امداد علی نے سرسید کے پاس ایک پناہ رسالہ چھپا ہوا بھیجا جس میں اسی فتویٰ کی دھمکی دیکھی تھی اور لکھا تھا کہ ”مفتی سعد اللہ صاحب کا فتوے تکفیر میں جناب سید احمد خان کی۔ جو ترجمہ تاریخ پر مرتب ہو ہے۔ اقام کے پاس موجود ہے۔ معلوم نہیں کہ سید احمد خان کے حواریں اُس فتوے پر بھی ایمان رکھتے ہیں یا نہیں“ سرسید تہذیب الاخلاق میں اسی دھمکی کی نسبت لکھتے ہیں ”پہلے تو ہم گھبرائے کہ یہ مفتی سعد اللہ صاحب کی ہیں؟“

۱۔ مفتی سعد اللہ صاحب ہندوستان کے ایک شہر عامر تھے جو قادیان کا قریب تھا۔ جن مانہ میں سرسید کی آمد و رفت مفتی صدر الدین خان مرحوم دہلوی کے مکان پر بہت زیادہ تھی غالباً اُسی زمانہ میں مفتی سعد اللہ صاحب بطور طالب علم ان کے دلی میں وارد تھے اور مفتی صدر الدین خان سے پڑھتے تھے۔ جب یہ تمام علوم عقلیہ و نقلیہ و فارغ ہو چکے تو لکھنؤ میں جبکہ غالباً امجد علی شاہ زندہ تھے اُنکو مذہب اہل سنت کے افتا کا معزز عہدہ مل گیا تھا اور اُس وقت سے واجد علی شاہ کے اخیر زمانہ تک یہ اُسی عہدہ پر مامور رہے۔ اُسی زمانہ میں ان کا ایک بہت بڑا واقعہ مولوی سید امیر علی صاحب قتل کا گذرا تھا۔ ہنومان گروہی میں ہندوؤں نے ایک مسجد کو ڈھا کر مندر بنانا چاہا تھا اور اہل دربار کو کچھ دے دلا کر رضی کر لیا تھا سید امیر علی کچھ جمعیت لیکر وہاں ہندوؤں سے مقابلہ کرنے کو پہنچے۔ چونکہ سید امیر علی سنی المذہب تھے اسلئے نائب نے مفتی سعد اللہ سے اس بات کا فتوے لکھوایا کہ فوج بھیج کر سید امیر علی کو اس اردہ سے روکا جائے اور اگر وہ نہ مانیں تو اُنکو قتل اور انکی جمعیت کو پراگندہ کر دیا جائے چنانچہ سید امیر علی شہید کئے گئے ۱۲

اتفاق اسپر ماثور ہے، انکار اسکا موجب مگر ابھی و فجور ہے ++++ مذہب نیچر خدا جانے کیا بلا ہے، ہر مفسد شرع اور متدین کو اُسکے قبول سے ابا ہے ++++ ہر مسلمان کو حق جل شانہ اتباع شریعت محمدیہ پر قائم رکھے، اور مذہب نیچر اور شرب بدتر سے محفوظ رکھے۔ جو شخص کہ اعتقادات اُسکے فاسدہ ہیں۔ جو کہ سوال میں مسطور ہیں وہ شخص مخرب دین ابلیس لعین کے دوسرے صورت اسلام میں تخریب دین محمدی کی فکر میں ہے اور بنام تجدید مدرسہ جدیدہ افساد شریعت اُسکی منظور نظر ہے۔ جو چیزیں کہ اُسکے نزدیک موجب تہذیب ہیں اہل سنت کے نزدیک باعث تخریب ہیں فَاَلْحَذَرُ اَلْحَذَرُ يَا أَيُّهَا الْمُسْلِمُونَ وَالْمُخْرِبُ الْمُخْرِبُ يَا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ

ان تمام فتووں کا جواب اور جن عقائد و اقوال پر سرسید کی تکفیر کی گئی ہے اُنکا ثبوت محققین اہل اسلام کی تصنیفات اور اُنکے کلام سے مولوی سید مہدی علی خان اُن دو مضمون میں جو ”تکفیر مسلمانان“ اور ”سوال و جواب“ کے عنوان سے تہذیب الاخلاق میں اُسی زمانہ میں چھپے تھے اور نیز دیگر مضامین میں بوجہ استیفاء دیا ہے اور سرسید کی تصنیفات میں بھی اُنکے جوابات متفرق طور پر مل سکتے ہیں ایسے اُن تمام مفتاؤں اور فتووں اور دُنکے جوابات کا اس مقام پر نقل کرنا کچھ ضرور نہیں ہے مگر سرسید کے دو ایک لطیفے جو مخالفوں کی نسبت تخریر کی رو میں اُنکے قلم سے ٹپک پڑے ہیں یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

لطیفہ جس نے مانہ میں سرسید ولایت میں تھے اُنکے پاس اخبار شعلہ طور کا پور میں مولوی سید اماد العلی کا ایک مضمون سرسید کے خلاف چھپا ہوا پہنچا تھا: اُس میں تاریخ الفتن سن کا وہی ترجمہ ہے آخر کار سرسید کی تکفیر کا فتویٰ لکھا گیا بعینہ نقل کر کے صاحب مضمون نے لکھا تھا کہ ”جس شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا ہو وہ کیسا جہنی ہے“ سرسید ولایت ہی ایک خط میں مولوی صدیق خان کو

مولانا صاحب سی انتظام میں رہے، سوالات کا مسودہ مسجد نبوی میں روضہ مطہرہ کے روبرو ہوا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں اکثر ہندوستانی اور عرب سے مولانا صاحب یہی ذکر فرماتے رہتے اور اسی کی بحث ہوتی رہتی۔ مولانا صاحب شہر تائب اور ایک اور رسالہ کی کئی جلدیں لے گئے تھے، وہ بھی وہاں تقسیم فرمائیں۔ سید احمد خان صاحب کا کفر اور اسلام اور اُنکے کفر کے فتووں کا مدار اُنکا حال بیان کرنیوالوں پر منحصر ہے؛ نہ مکہ والے اُنکو جانیں، نہ مدینہ والے اُنسے واقف۔ اگر کوئی چاہے تو سو فتوے اُنکے اسلام کے حرمین شریفین سے واقعی حال بیان کر کے لاسکتا ہے۔۔۔ سید احمد خان صاحب کا اسلام مسلمانوں کے دلوں پر نسلاً بعد نسل کندہ ہوتا چلا جائیگا اور تھوڑے عرصہ بعد سید احمد خان صاحب کے نام کے ساتھ مجتہد و مجدد کا لفظ لکھنا شروع ہو جائیگا۔ اُنکے اسلام کے ثبوت میں کاغذ اور سیاہی کی مدد ضرور نہیں۔ جوابات کفر کی ہر وہ کفر کی ہر اور جو اسلام کی ہر وہ اسلام کی۔ سید احمد خان صاحب صرف اس سبب سے کہ حرمین شریفین کے عالموں نے اُنکے کفر کے فتوے دیدیے کافر نہیں ہو سکتے؛ جیسے بیان کے عالم ہیں ویسے ہی وہاں کے صرف زبان کا فرق ہے، اُنھیں کتابوں سے وہاں والے فتوے لکھتے ہیں انھیں سے یہاں والے

اسی مضمون میں وہ ایک جگہ ہندوستانی مولویوں کا۔ جو مکہ معظمہ میں رہتے ہیں ذکر کرتی ہو لکھتے ہیں ”دو تین مولانا صاحبوں کے سامنے میں نے سید احمد خان صاحب کی تعریف کی اور واقعی حال اُنکا بیان کیا تو اُنھوں نے جواب دیا کہ فلاں مولانا صاحب یا حکیم صاحب یا منشی صاحب ابھی ہندوستان سے آئے ہیں وہ اُنکو خلافت کہتے ہیں، تم ہرگز سید احمد خان کا کتنا نہ مانو، ورنہ کافر ہو جاؤ گے۔ میں نے کہا بہت اچھا سید احمد خان صاحب کا کتنا نہ مانو گے، اُنکو بُرا جانو گے مگر پھر کس کا کتنا مانوں؟ آپ کا؟ سو آپ کو بھی تو فلاں مولانا صاحب فرماتے ہیں اسکا کیا علاج؟ غرض ہندوستانی عالموں اور جاہلوں کا وہاں بھی یہی خراب حال اور لڑائی ہے۔“

اگرچہ حافظ محمد حسین صاحب نے حرمین شریفین کے فتووں کی حقیقت اپنے مضمون میں اچھی طرح

یہ وہی ہیں جن کو ہم نے دلی میں دیکھا ہے؟ اور یہ وہی مفتی سعد اللہ صاحب ہیں جنہوں نے لکھنؤ میں ایک نیک نیت مسلمان آل رسول ابن علی اولاد نبی کے کفر اور قتل کا فتوے دیکر عشرہ محرم میں انکا سر ہنومان گڑھی سے تیز پر چڑھا کر لکھنؤ میں لانا چاہا؛ تو ہمارا دل ٹھنڈا ہو گیا اور سمجھے کہ آل رسول کے قتل و کفر پر فتوے دینا انکا قدیمی پیشہ ہے۔“

اگرچہ مولوی امداد العلی کی کوشش سرسید کے کفر و ارتداد کے فتوے حاصل کرنے میں حدیث غایت کو پہنچ گئی تھی؛ دلی، رامپور، امروہہ، مراد آباد، بریلی، لکھنؤ، بھوپال اور دیگر مقامات کے ساتھ عالموں اور مولویوں اور واعظوں نے کفر کے فتوے پر تہرین اور دستخط کیے تھے؛ گویا ہندوستان کے تمام اہل حل و عقد کا اس حکم پر اجتماع ہو گیا تھا، صرف خدا کی طرف سے اسکی تصدیق اور تصویب باقی رہ گئی تھی سو مولوی علی بخش خان نے یہ کمی بھی پوری کر دی۔ انھوں نے غالباً اسی غرض سے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اور مکہ معظمہ میں جا کر مذاہب اربعہ کے مفتیوں کے سامنے دو استفعے عربی زبان میں پیش کیے جنہیں سے ایک کا ترجمہ یہ ہے

”آپ کیا فرماتے ہیں اُس شخص کے باب میں جو ابلیس کے وجود خارجی سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اُسے مراد قوت یہیمہ ہے جو نفس انسان میں ہے، اور مانکہ کاسجدہ آدم کے واسطے حقیقی سجدہ نہ تھا بلکہ اُس سے قوس کا مطیع ہونا مراد ہے، اور انبی و ائست کبر سے عدم اطاعت قوت یہیمہ مراد ہے جو آدمی کی اغوا کرنے والی ہے نہ کہ حقیقی سجدہ سے انکار کرنا، اور کہتا ہے کہ افلاک اجسام نہیں ہیں بلکہ اُنہیں فضائے بسیط یا سبع سیارات مراد ہیں، اور کہتا ہے کہ لونڈی غلام بنانا حرام ہو گیا ہے، آیہ امامتا بعد و اما فداء سے اور یہ آیت نازل ہوئی ہے فتح مکہ میں اور یہ سب سے اخیر آیت ہے جو قیدیوں کے باب میں نازل ہوئی ہے، اور کہتا ہے کہ معراج خواب میں ہوئی تھی اور جسم کے ساتھ آنحضرت کے

(یعنی کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف اتنا کھڑکھوٹ جائیگے کہ ہم ایمان لائے اور انکی آزمائش نہ کی جائیگی) اب ہم پوچھتے ہیں کہ اس معیار کے موافق سید احمد خان کا ایمان کامل ٹھہرتا ہے یا ان لوگوں کا جنھوں نے اُس کو کافر اور واجب القتل ٹھہرایا؟ غدر کے بعد جب کہ مسلمانوں کی حمایت کرنا ایک سنگین جرم سمجھا جاتا تھا۔ اور دین اسلام امن اور انتظام کا دشمن اور فتنہ و فساد کا بانی خیال کیا جاتا تھا۔ اُسے زیادہ حیثیت اسلامی اور جوش ایمانی کے امتحان کا وقت اور کونسا ہو سکتا ہے؟ اسوقت اسی کافر واجب القتل کے سوا اسلام اور اہل اسلام کی حمایت کے لیے نہ ان مفتیوں میں سے کوئی اٹھا جنھوں نے اُسکے کافر و مرتد ہونے کے فتوے لکھوائے اور نہ ان مفتیوں میں سے جنھوں نے اُسکے کفر و ارتداد کے فتووں پر انکھین بند کر کے نہرین اور دستخط کیے۔

”درہند چو اوپے و آن ہم کافر پس ہمہ ہندیک مسلمان نبود“

باوجود ان تمام مخالفتوں کے سرسید نے اپنے سخت ترین مخالفوں سے۔ جب کہ وہ کفر اور سبب القتل ہونیکے فتوے تمام ملک میں شایع کر چکے تھے۔ التجا کی کہ مدرستہ العلوم کی مذہبی تعلیم۔ جس میں میری مداخلت سے آپ کو اندیشہ ہے۔ اُسکا انتظام اور اہتمام آپ اپنے ہاتھ میں لیجیے، میں اس سے کسی طرح علی حسرت نہ کر رہا ہوں۔ اس پر مولوی امداد علی نے انکو لکھا کہ ”تم اپنے افکار اقوال سے روادار ہمسے ہو جاؤ تو ہم شریک ہوتے ہیں“ مگر مولوی علی بخش خان نے اس شرط پر منظور کیا کہ آپ کو اور آپ کی کمیٹی خزانۃ البصاۃ کو امور مذہبی میں مداخلت نہ ہو بلکہ مذہبی تعلیم کے واسطے ایک اور کمیٹی مقرر کی جائے جسکے وہی لوگ ممبر ہوں جن پر عام اہل اسلام کو اطمینان ہے اور جو لوگ مذہبی تعلیم کے واسطے چندہ دین اُس روپیہ سے سود حاصل نہ کیا جائے اور اُسکی آمدنی جائز صرف مذہبی تعلیم میں

ظاہر کردی ہو پھر بھی ممکن ہو کہ ہندوستان کے ساتھ عالموں کا سرسید کی تکفیر پر اتفاق کرنا اور حرمین شریفین کے مفتیوں اور دیگر عالموں کا اُنکے ساتھ ہم زبان ہونا بعض ناواقف لوگوں کو سرسید کے مسلمان ہونے کی نسبت شبہ میں ڈالے اور ممکن ہو کہ بعض ناظرین کتاب کے دل میں یہ خیال گزے کہ تیس برس بعد ان بے دبانے فتووں کا سرسید کی لائف میں ذکر کرنا گویا انکی تکفیر میں از سر نو جان ڈالنی ہو۔ مگر ہمارے نزدیک سرسید کی لائف ناممکن رہتی اگر ان فتووں کا ذکر انہیں کیا جاتا درحقیقت یہ کفر و ارتداد کے فتوے نہیں ہیں بلکہ سرسید کے اعلیٰ درجہ کے مسلمان ہونیکے وثیقے ہیں۔ یہ تمنے ہمیشہ انہیں لوگوں کو نصیب ہوئے ہیں جو دنیا کی مخالفت کے خوف سے کبھی حق بات کہنے سے نہیں چو کے۔ امام غزالی اپنے ایک رسالہ میں لکھتے ہیں کہ ”جس شخص پر لوگ حسد نہ کرین اُسکو حقیر جان! اور جسکو کافر اور گمراہ نہ کہیں اُسکو ناچیز سمجھ“ ابوالامہ علی رضی اللہ عنہ نے جو ایمان کی تعریف بتائی ہے سچ یہ ہے کہ۔ ہم نے اپنے زمانہ میں اُسکا صحیح مصداق سید احمد خان کے سوا کسی کو نہیں دیکھا، وہ فرماتی ہیں ”الایمان ان توثر الصدق حیث یضرب علی الکذب حیث ینفصل“ (یعنی ایمان کے یہی ہیں کہ جب سچ کہنا مضر ہو اور جھوٹ کہنا مفید۔ اُسوقت سچ کو جھوٹ سے مقدم سمجھا جائے) سرسید کو اپنی سچائی کی بدولت صرف مسلمانوں ہی کی مخالفت کا نشانہ بننا نہیں پڑا بلکہ اکثر موقعوں پر محض ملک و قوم کی خیر خواہی کی بدولت۔ جیسا کہ اُنکی بانیوگرنی جا بجا شہادت دیتی ہے۔ بڑے بڑے جلیل القدر افسرین اور حاکموں کی خفگی اور حد سے زیادہ ناراضی برداشت کرنی اور بعض اوقات اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا پڑا ہے۔ خدا تعالیٰ نے ایمان کی سچائی کا معیار یہ نہیں بتایا کہ کسی مفتی نے اُسکے کفر کا فتویٰ نہ دیا ہو بلکہ اُسکا صحیح معیار آزمائش میں پورا اُترنے کو قرار دیا ہے اور فرمایا ہے ”احیہ الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون“

تو ہم شریک ہوتے ہیں“ اگرچہ اس امر کو اُس بات سے جو ہمیش کی تھی کچھ تعلق نہ تھا با اینہم میں اُس کو قبول کر لیتا مگر مجھے خیال ہوا کہ اگر ہمارے محب قلبی نشی چراغ علی صاحب (جو شیعہ مذہب رکھتے تھے) مجھے کہیں کہ تم سے ہو جاؤ تو ہم شریک ہوتے ہیں“ تو پھر میں کیا کروں گا؟ بقول شخصے کہ ”گوری کا جو بن چٹکیوں ہی میں گیا“ میرا تو یوں ہی تنکا بوٹی ہو لیگا +++ جناب مولوی محمد قاسم صاحب اور جناب مولوی محمد یعقوب صاحب جو متعصبانہ جواب دیا اُس سے ہر شخص جسکو خدا فی عقل اور محبت اور حب ایانی دی ہوگی نفرت کرتا ہوگا۔ شیعہ مذہب کی تعلیم کا سلسلہ بالکل علاحدہ ہے جس سے اہل سنت و جماعت کو کچھ تعلق نہیں، پس یہ کہنا کیسا سبھا تعصب ہے کہ گاہ اٹھ پرہ بن شیعہ بھی ہونگے ایسے ہم شریک نہیں ہوتے۔ خدا کے کہ وہ یہ خیال فرما کر کہ ہندوستان میں شیعہ بھی رہتے ہیں۔ نہ معظمہ کو سدھارین مگر افسوس ہے کہ میں سنتا ہوں حج اور طواف میں بھی شیعہ ہوتے ہیں“

”افسوس ہے کہ شیعہ دینی میں اس زمانہ میں بہ نسبت اُس زمانہ کے۔ جب کہ امام محمد سمیع بن بخاری شیعوں کے روایت کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں فرماتے تھے۔ نفاق اور شقاق بہت زیادہ ہو گیا ہو۔ مگر حالتِ مانگی ہے۔ ہر کہ اگر شیعہ اپنے تعصب سے سینوں کو چھوڑیں اور سنی اپنے تعصب سے شیعوں کو چھوڑیں تو دونوں غارت اور برباد ہو جائیں گے۔ ہندوستان میں مسلمان تعداد میں کم ہیں، دولت میں کم ہیں، عدد میں کم ہیں، اگر پھر انہیں بھی یہ غمناکی و ماضی اور وہابی و بدعتی کا تفرقہ پڑے تو بجز برباد اور غارت ہونے کے اور کیا نتیجہ ہو؟ ارے کجخت متعصبو! تم آپس میں لڑا کرنا اور ایک دوسرے کو کافر کہا کرنا مگر جو بات سب کے فہم کی ہو اسی میں کیوں ایک ل ہو کر شریک نہیں ہوتے؟ عالمگیر نے ایک عامل کی بددیانتی کا ذکر نظیر کسی

سے خدا کا شکر ہے کہ سرسید کی چیخ پکار سے ہمارے علماء اب اس تفرقہ کو مٹانے کی فکر میں ہیں چنانچہ ذرۃ العلماء نے سب فرقوں کو شریک کرنے کا ارادہ کیا ہے اگرچہ بعض علماء اس کے خلاف ہیں ۱۱

خرج کیجائے۔ سرسید نے انکی تمام شرطیں منظور کر لیں اور انکو قواعد مدرسۃ العلوم میں داخل کر دیا اور مولوی صاحب کو لکھا کہ میں عنقریب یہ تمام خطا کتابت ممبران کمیٹی خزانۃ البضائع کے پاس بھیج کر منظوری حاصل کر لیتا ہوں۔ اگرچہ بعض ممبروں نے اس بات سے سخت اختلاف کیا کہ کمیٹی خزانۃ البضائع کو تعلیم مذہبی سے کچھ تعلق نہ رہے مگر کثرتِ رے سے وہی تجویز جو مولوی علی بخش خان چاہتے تھے منظور ہو گئی اور یہ قرار پایا کہ اہل سنت کے مشہور دیندار عالموں میں سے بیس بزرگوں کی خدمت میں درخواست کیجائے کہ وہ تعلیم مذہب اہل سنت و جماعت کی کمیٹی کے ممبر انتخاب کریں۔ البتہ اتنا گناہ ہو گیا کہ مذہبی کمیٹی کے ممبروں کا انتخاب کرنے والوں میں بشمول مولوی علی بخش خان علمائے اہل سنت کے بہت سے نام کمیٹی خزانۃ البضائع نے خود تجویز کر دیے اور منجملہ میں رہ گئے دو یا تین ممبر کمیٹی خزانۃ البضائع کے بھی مذہبی کمیٹی کے ممبر انتخاب کرنے کے لیے نامزد کئے گئے۔ جسوقت مولوی علی بخش خان کے پاس اس روداد کی نقل پہنچی وہ سخت ناراض ہوئے۔ اٹھ سو روپے کا چندہ جو انھوں نے مدرسۃ العلوم میں دینے کا وعدہ کیا تھا اسکا دینے سے انکار کیا اور مدرسۃ العلوم کی مذہبی کمیٹی کے اہتمام وغیرہ سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو گئے۔ جن دیندار عالموں سے درخواست کی گئی تھی کہ کمیٹی مذہبی کے ممبر انتخاب کریں انھیں سے کثرتِ رے جواب نہ ملا اور مولوی محمد قاسم صاحب اور مولوی محمد یعقوب صاحب نے یہ جواب دیا کہ ہر گاہ اس مدرسہ میں شیعہ بن ہونگے اسلئے ہم شریک نہیں ہوتے۔

ان تمام واقعات کی طرف سرسید نے تمذیبِ لاطلاق کے ایک مضمون میں اشارے کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ”جناب حاجی مولوی سید امداد علی صاحب نے لکھا کہ ”تم اپنے افعال و اقوال سے توبہ کرو اور تم سے ہو جاؤ“

دس چھانٹ لئے ہیں اور بیس نکال ڈالے ہیں ، اکثر یہ بھی منگیا کہ انھوں نے سورہ الرحمن میں ”فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَان“ صرف ایک جگہ رکھا ہے باقی مکرر سمجھ کر سورت میں سے نکال ڈالا ہے ۔

مولوی علی بخش خان نے جو ایک کتاب موسوم بہ تائید الاسلام سرسید کے خلاف لکھی تھی اور جسکی بہت سی جلدیں وہ عرب میں شائع کرنے کو لیگئے تھے اُس میں بے شمار عقائد سرسید کی طرف ایسے منسوب کئے ہیں جو بالکل خلاف واقع ہیں ؛ مثلاً یہ کہ مادہ مثل ذات باری تعالیٰ کے ملی ہے ، یا ذات باری تعالیٰ خود مادہ ہی ہے ، یا یہ کہ باوجود قانون قدرت کے بعثت انبیاء کی ضرورت نہیں ، یا یہ کہ جب علوم جدیدہ یا انگریزی پڑھنے سے معلوم ہو کہ مذہب اسلام میں ضعف و کمزوری ہے تو مذہب اسلام کا ترک کر دینا لازم ہے ، یا یہ کہ نبوت انبیاء سابقین یا کتب سماویہ کے ناسخ ہونا ، یا معاذ اللہ قرآن شریف کے عمداً بول و براز میں آلودہ کرنے یا اُس کے پھینک دینے سے کفر ہو جاتا ہے ، یا کفر اور حرام کو حلال ٹھہرانے سے ، یا معاذ اللہ کسی نبی کو گالی دینے سے ، یا بہشت و دوزخ اور قیامت کے انکار سے ، یا ضروریات دین کے انکار کرنے سے آدمی کافر نہیں ہوتا ؛ یا یہ کہ گرمی کے موسم میں رمضان کے تیس روزے فرض نہیں ہو سکتے ، یا تھوڑی سی شراب کا متوالانہ کر دے یا اتنا جو اکیلنا جو بے قید نہ بنا دے حرام نہیں ہو سکتا ، یا یہ کہ صلوٰۃ سے مراد مطلق دعا پڑھ لینا ہے اور وہی واسطے ادائی فرض کے کافی ہے باقی جو ترکیب صلوٰۃ پنجگانہ کی مقرر ہے وہ اصول مختصر علماء کا اتباع ہے ۔ اسی طرح اور بہت سے اتہامات سرسید کی نسبت کتاب مذکور میں کئے گئے ہیں جنکو سرسید نے اپنے مضمون دافع البہتان میں ایک ایک کر کے لکھا ہے

دوسرے عامل سے کیا، اُسے عرض کیا ”حضور! پانچون انگلیان برابر نہیں ہیں“ عالمگیر نے کہا ”بے، مگر بوقت خوردن ہمہ برابر میشوند“ پس اے بزرگو! اس بات میں کیون تعصب کو کام فرماتے ہو جس میں سب کا فائدہ مشترک ہو“

”جناب سید اکلاح مولانا حاجی علی بخش خان صاحب سے جو معاملہ پیش آیا وہ تو طشت از بام ہے، انکی اور ہماری تو وہی مثل ہو گئی“ من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو“ یعنی وہ ہمکو بد عہد کہتے ہیں ہم انکو بد عہد کہتے ہیں۔ بہر حال کسی نے بد عہدی کی ہو، وہ بات جس سے کھنڈت پڑ گئی اس قدر پہچاننا کہ تمام امور تعلیم نہ ہی تنہا جناب مدوح کو کیوں نہ سپرد کیے گئے دیگر بزرگان دین کو کیوں شریک کیا؟ و ماہذ الا شقاق مبین“

سر سید کی مخالفت اگر محض دینداری اور حمیت اسلامی کی بنیاد پر کی جاتی تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی بلکہ اُسکا نہ ہونا تعجب تھا کیونکہ اُس سے پایا جاتا کہ مسلمانوں کو دین و مذہب کی کچھ باتیں نہیں رہی؛ چنانچہ اسی خیال سے سر سید اکتہ کرتے تھے کہ مذہب جو لگ میرے مخالفت میں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اسلام کے برخلاف ہوں اور میرے خیالات سے اسلام کو نقصان پہنچتا ہے پس جو چھ کہ وہ اپنی دلست میں اس خیال سے کرتے ہیں اُسپر وہ بزرگ تعریف کے لائق ہیں نہ مذمت کے، مگر افسوس۔ رہنمائی افسوس ہے کہ زیادہ مخالفتیں محض نفسانیت، خود مرضی، یا عناد پر مبنی ہوتی تھیں اور اسی لئے براہ اسکے کہ سر سید کے اقوال۔ جو انھوں نے مذہبی مسائل کے متعلق جمہور کے خلاف لکھے ہیں رہت رہت بے کم و کاست بیان کئے جاتے۔ بیسیوں باتیں انکی نسبت غلط مشہور کی گئیں، انکی تفسیر کی نسبت اس بات کی عموماً شہرت دی گئی کہ سید احمد خان نے قرآن کے تیس پاروں میں ۵

تجویز ہوئے ۔ سرسید نے اس خیال سے کہ قلیل رقم مسلمانوں کے کس کام آئیگی۔ نواب افٹنٹ گورنری جو ان دنوں بنارس آئے ہوئے تھے۔ عرض کر کے اسی میدان کے قریب مسجد کے لیے ایک دوسرے قطعہ کی ملنے کی اجازت دلوادی اور شفا خانہ کے چندے میں سے ڈھائی ہزار روپیہ مسلمانوں کو دلو کر وہاں مسجد تعمیر کرا دی ۔ بنارس کے مسلمان سرسید کے نہایت شکر گزار ہوئے اور مسجد کے پیشطاق پر یہ بیت کندہ کرانی تجویز کی

”در آوان سعید و از براس طاعت یزدان
بنا گردید این مسجد ز سعی سید احمد خان“

سرسید نے اس تجویز کو ناپسند کیا اور اس بیت کے کندہ کرانے کی اجازت نہیں دی ۔ بنارس میں تو یہ کارروائی ہو رہی تھی اور تمام ہندوستان کے دیسی اخبار و نمون لکھا جا رہا تھا سید احمد خان نے شفا خانہ کے واسطے مسجد منہدم کرا دی ۔ یہ شور و شغب ایک مدت تک ہندوستان کے نق اخباروں میں ہا مگر سرسید نے اسکی کچھ پروا نہ کی اور اصل حال سے اخباروں کو مطلع نہیں کیا ۔ آخر اسی اخبار کے اڈیٹر نے ایک پرچہ میں لکھ دیا کہ ہم اصل حالات دریافت کر کے اپنے اخبار میں چھاپینگے سرسید نے اڈیٹر کی یہ تحریر اخبار میں دیکھ کر اسکو لکھ بھیجا کہ مجھ پر سے الزام رفع کر نیکیے لے آپ اخبار میں کچھ نہ لکھیں اور اخبار نویسوں کو بلکے دین چند روز بعد اڈیٹر کی شکایت اخباروں میں چھپنی شروع ہوئی اگر وعدہ کیا تھا وہ پورا نکلیا کیونکہ سرسید پر سے الزام رفع کرنے کا کوئی پہلو ہاتھ نہ آیا ۔ آخر علیگڑھ اخبار سے اڈیٹر نے مجبور ہو کر ۲۶-۲۷ مئی ۱۸۸۷ء کے پرچہ میں نام حال اول سے آخر تک بحوالہ کاغذات مثل میونسپلٹی بنارس کے تحریر کیا ۔ اب اخباروں میں یہ چھپنا شروع ہوا کہ نہایت افسوس ہے نہ سرسید نے اصل حال سے مطلع کیا اور نہ سو سائٹی اخبار کے اڈیٹر نے مدت تک اس واقعہ پر کچھ روشنی ڈالی ۔

اور ہر ایک کے تحت میں یہ فقرہ لکھتے جاتے ہیں کہ ”لعنة الله على قائله وعلى معتقده“
 مذہبی عقائد اور اقوال کے سوا اور طرح طرح کے اتہامات اُس خیر خواہ خلائق پر لگائی جاتی تھے۔
 اس بات کا تو سرسید کی وفات تک ہزاروں آدمیوں کو یقین تھا کہ انھوں نے اپنا سر دیش ہزار
 روپے کو انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیا ہے؛ اکثر لوگ سمجھتے تھے کہ بعد مرنے کے انگریز انکا سر کاٹ کر
 لندن بجاؤینگے اور لندن کے عجائب خانہ میں رکھینگے۔

ایک بار یہی سر بیچنے کا تذکرہ سرسید کے سامنے ہوا؛ اُس وقت راقم بھی موجود تھا، اُس مرحوم نے
 نہایت کشادہ دلی کے ساتھ فرمایا کہ ”جو چیز خاک میں مل کر خاک ہو جانے والی ہو اُسکے لئے اس سے زیادہ
 اُور کیا عزت ہو سکتی ہے کہ دشمن لوگ اُسکو روپیہ دیکر خریدیں، اُسکے ڈکشن سے کوئی علمی نتیجہ نکالیں، اور اُس
 قیمت کا روپیہ قوم کی تعلیم میں کام آوے دس ہزار چھوڑ دس روپے بھی اگر اُسکی قیمت میں ملیں تو میری بڑی مفت
 منجملہ اُن بے شمار اتہامات کے جو سرسید پر لگائے جاتے تھے ایک وہ صریح بہتان تھا جو ”
 میں بمقام بنارس اُنپر لگایا گیا۔ سرسید نیشن لیکر علی گڑھ آنے سے چند مہینے پہلے جب کہ“

پرنس آف ولز بنارس میں تشریف لائے۔ اُنکی تشریف آوری کی یادگار میں ایک شفا خانہ بنارس
 میں بننا تجویز ہوا تھا اور جو کمیٹی یادگار قائم کرنے کے لئے مقرر ہوئی تھی اُسکے ایک ممبر سرسید بھی تھے۔
 کمیٹی کی درخواست پر مینو پیسلٹی بنارس نے شفا خانہ کے لئے ایک قطعہ زمین دینا تجویز کیا جس
 علاوہ اُور کچے گھروں کے ایک چھوٹا سا خام چبوترہ بھی تھا جسکو مسلمانوں نے ناز پڑھنے کے لئے
 عارضی طور پر بنالیا تھا۔ مینو پیسلٹی نے خود اُس میدان کو صاف کرا دیا اور جسطرح اُور گھروں کے
 مالکوں کو کمیٹی یادگار سے معاوضہ دلایا تھا اسی طرح اُس چبوترے کے معاوضہ میں ۳۲ روپے دینے

تو انکی جان لینے کی دھمکیوں کے گناہم خطوط اُنکے پاس آنے لگے۔ اکثر خطوں کا یہ مضمون تھا کہ ”ہم نے اس بات پر قرآن اٹھایا ہے کہ تمکو مار ڈالینگے“ ایک خط میں لکھا تھا کہ ”شیر علی جسے لارڈ میو کو مارا تھا۔ اُسے نہایت حماقت کی اگر وہ تمکو مار ڈالتا تو یقینی بہشت میں پہنچ گیا ہوتا“ ۱۹۱۱ء میں۔ جبکہ سر سید کالج کی طرف ایک پوٹیشن لیکر حیدر آباد گئے تھے اور حضور نظام (خلد اسد ملکہ) کے ہاں بشیر باغ میں مہمان تھے۔ ایک مولوی نے ہمارے سامنے سر سید سے یہ ذکر کیا کہ کلکتہ میں ایک مسلمان تاجر نے آپ کے قتل کا ”صمم ارادہ“ کر لیا تھا اور وہ کسی شخص کو اس کام پر مامور کرنا چاہتا تھا۔ اس بات کی مجھ کو بھی خبر ہوئی۔ چونکہ میں علیگرھ کی طرف آیا تھا اُس سے خود جا کر ملا اور اُس سے کہا کہ میں علیگرھ جانیوالا ہوں اور میرا ارادہ سید احمد خان سے ملنے کا ہے۔ جب تک کہ میں اُنکے عقائد اور مذہبی خیالات دریافت کر کے آپ کو اطلاع نہ دوں آپ اس ارادہ سے باز رہیں۔ چنانچہ میں علیگرھ میں آیا اور آپ سے ملا اور بعد دریافت حالات کے اُسکو لکھ بھیجا کہ سید احمد خان میں کوئی بات میں نے اسلام کے خلاف نہیں پائی تو کو چاہیے کہ اپنے منصوبے سے توبہ کرو اور اپنے خیال خام سے نادم ہو۔ معلوم نہیں کہ اُس مولوی کا یہ بیان صحیح تھا یا غلط مگر سر سید نے جو یہ حال سنا اُسکو جواب دیا وہ لطف سے خالی نہ تھا؛ اُنھوں نے کہا ”افسوس ہے کہ اپنے اُس دیندار مسلمان کو اس ارادہ سے روک دیا اور تمکو ہمارے بزرگوں کی میراث سے۔ جو ہمیشہ اپنے بھائی مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے قتل ہوتے رہے ہیں۔ محروم کھا“

ایک دفعہ خاص علیگرھ میں کسی نے بذریعہ گناہم تحریر کے سر سید کو یہ دھمکی دی کہ اگر آئندہ تم گاڑی میں سوار ہو کر اپنی کوٹھی سے باہر نکلے تو تمھاری خیر نہیں، میں بندوق مارے بغیر ہرگز نہ رہوں گا مگر سر سید نے ان دھمکیوں کا کبھی کچھ خیال نہیں کیا؛ نہ انکی کسی عادت میں فرق آیا، اور نہ اُنھوں نے اپنی حفاظت کا

تب سرسید نے تہذیب الاخلاق میں ایک آرٹیکل لکھا جس میں تمام اخباروں کے اقوال۔ جو سرسید کے برخلاف لکھے گئے تھے۔ نقل کر کے ہر ایک پرچہ پر جدا جدا ریا کر کیے ہیں۔ انان جملہ اودھ اخبارین جسکے ڈیٹر اسوقت مرحوم غلام محمد خان تپش تھے۔ یہ فقرہ چھپا تھا ”اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں مضمون نہایت دیرین چھپا ! یعنی اسوقت جب کہ سید صاحب کی بدنامی تمام دنیا میں مشہور ہو چکی“ اس پر سرسید مرحوم نے نہایت لطیف ریا کر کیا ہو جسکے الفاظ یہ ہیں ”اسکے عذر میں نہایت ادب سے اپنے شفیق کے سامنے حاکم کا یہ شعر پڑھا ہو

” در کوے نیک نامی مارا گذر نہ دادند گر تو نمی پسندی تقصیر کن قضا را “

لیکن اگر ہمارے دوست اس فقرہ کو یوں ارقام فرماتے تو شاید لفظ بدنامی کے صحیح معنی ہو سکتے ”یہ مضمون نہایت؟ میں چھپا ! یعنی اسوقت جبکہ تمام اخباروں کی بدنامی دنیا میں ہو چکی“ پھر لکھتے ہیں ”ہم کو امید ہو کہ خدا وہ دہا بہت جلد لائیکا کہ ہماری قوم بدنامی کے صحیح معنی سمجھ لگی اور ہمارے ملک کے اخبار خود اپنی عزت کرنی سیکھیں گے“

اسی طرح بیسیوں اہتمام سرسید پر ’ مدرستہ العلوم پر ’ اسکے طالب علموں پر لگائے جاتے تھے ’ مدر

کی نسبت ایسی خبریں اڑائی جاتی تھیں جسے لوگوں کے دل میں نفرت پیدا ہو یا اسکے معاونوں کو۔

اور مخالفوں کو خوشی ہو ؛ چنانچہ ایک دفعہ ایک سنگ سلام و اہل سلام نے مشہور کر دیا کہ جس کو ٹھٹھی میں

ہائی اسکول کی جماعتیں پڑھتی ہیں اسکی چھت گر پڑی اور بیس تیس طالب علم اسکے نیچے دب گئے۔

اسی قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں مگر وہ جو مثل مشہور ہو کہ ”اپنا گھٹنا کھولے اور آپ ہی لا جوں مرے“

ایسی باتیں بیان کرنے سے سوا اسکے کہ اپنی اور اپنی قوم کی نالائقی سارے زمانہ میں مشہور ہو اور کوئی

نتیجہ معلوم نہیں ہوتا۔

الغرض جب سرسید کے کفر و ارتداد اور واجب القتل ہونے کے فتوے اطراف ہندوستان میں شائع ہوئے

اُن گستاخیوں کو دیکھ کر جو سرسید کی نسبت کی گئی تھیں شدت غیظ و غضب سے از خود رفتہ ہو گئے۔ کاتب کی نسبت یقین ہو گیا تھا کہ اخبار رفیق ہند کا ایڈیٹر ہی اور سرسید نے خود اُس کا خطا بھی طرح پہچان لیا تھا؛ بالاینہ اُس مرحوم کی یہ خواہش تھی کہ کاتب خط کی اس حرکت سے درگزر کی جائے اور اُس کو کانفرنس میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے کیونکہ وہ خود اس تحریر کے لکھنے سے انکار کرتا تھا مگر خان بہادر اور سردار صاحب اور دیگر اہل پنجاب نے سرسید کی سفارش اُس کے باب میں منظور نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے اپنا اخبار جو غالباً بند ہو گیا تھا۔ چند مدت بعد پھر جاری کیا۔ پہلے ہی اخبار سرسید کا حد سے زیادہ طرفدار اور مداح و ثنا خوان تھا؛ چنانچہ ۱۸۸۷ء میں جب سرسید نے پنجاب کا سفر کیا اور لاہور میں پہنچے تو اسی اخبار میں سرسید کی نسبت ایک لمبی حویۃ عبارت چھپی تھی جس کے سب پر یہ شعر لکھا تھا

”مرجاسید اولادِ نبیۃ مدنی جان جان بادِ فدایت کہ وحید ز منی“

مگر جب دوسری بار یہ اخبار جاری ہوا تو سرسید کی مخالفت میں تمام اگلے پچھلے مخالفوں سے گویے سبقت لیگیا۔ وہی شخص جس کی نسبت پہلے ”سید اولادِ نبی مدنی“ لکھا گیا تھا اس پرچہ میں کوئی بُرائی ایسی نہ تھی جو اُس کی طرف منسوب کی گئی ہو اور کوئی آلہ لوگوں کو اُس سے بدظن کرنے کا ایسا نہ تھا جو اس پرچہ میں استعمال نہ کیا گیا ہو۔ سرسید کے دوست اُس کی زبان درازیاں دیکھ کر بگڑتے تھے اور اس کا جواب لکھنے پر آمادہ ہوتے تھے مگر سرسید سب کو منع کرتے تھے اور کسی کو اُس سے مقابلہ کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ”موسم کی آمد ہی چند روز میں خود بخود فرو ہو جائیگی“

اب سرسید کے انتقال کے بعد ۱۸۹۹ء میں وہ ایک مدت تک بند پکڑتے سری بار پھر جاری ہوا ہی

کبھی کوئی خاص انتظام کیا۔ سرسید کی وفات سے چند مہینے پہلے ایک مخالف گروہ کی نسبت یہ مشہور ہوا کہ انکا ارادہ سید کے قتل کرنے کا ہی اور فی الحقیقت اُس گروہ کا جوش اُس حد کو پہنچا ہوا تھا کہ اُنسے ایسی حرکت کر بیٹھنا کچھ بعید نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایک دن سرسید کے بعض حباب اُنسے کہا کہ آپ سوار ہونا چھوڑ دیں اور کچھ زائد چوکیدار رات کے پہرے کے لیے کوٹھی پر مقرر ہونے چاہئیں اور ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ کوئی اجنبی شخص بلا اطلاع اور بغیر تفتیش حال کے کوٹھی کے اندر نہ آنے پائے۔ سرسید یہ باتیں سن کر تعجب کرتے تھے اور ہنستے تھے؛ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے صلاح کار دوستوں کو نادان اور وسواسی سمجھتے ہیں اور ایسا انتظام کرنے کو ایک نہایت سبک حرکت خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ کسی طرح کا انتظام نہیں کیا گیا، نہ کسی کے آنے جانے کی روک ٹوک کی گئی، نہ چوکیدار رکھے گئے، نہ سوار ہونا موقوف ہوا۔

۸۸۔ تب میں جب پہلی بار محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا منعقد ہونا لاہور میں قرار پایا تو خان بہادر برکت علی خان۔ جنکی تحریک سے لاہور میں اس جلسہ کا ہونا قرار پایا تھا۔ اُنکے ایک مخالف کی طرف سے کانفرنس کی تاریخوں سے ایک دن پہلے ایک نہایت گستاخ تحریر سرسید کا نام پہنچی جس میں علاوہ اور نالائق باتوں کے نہایت بُرے لفظوں میں یہ مطلب بھی ادا کیا گیا تھا کہ تم کانفرنس میں آنے کا ہرگز ارادہ نہ کرنا ورنہ جو حال ملے گا وہاں بہادر کا کیا گیا ہے اُس سے بدتر تمہارا حال کیا جائیگا۔ سرسید نے جو وقت علی گڑھ سے لاہور کی روانگی کا مقرر تھا اُس میں کچھ تبدیلی نہیں کی صرف خان بہادر کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے لیے چلنے سے پہلے اُنکو تار دیا اور جب اُنکی خیریت معلوم ہو گئی تو فوراً لاہور کو روانہ ہو گئے۔ لاہور پہنچ کر وہ تحریر انھوں نے خان بہادر اور سردار محمد حیات خان کو دکھائی۔ دونوں صفا

نہ صرف آپ کو بلکہ تمام قوم کو جسکے مذاق پر اخباروں کی بُرائی بھلائی کا انحصار ہی دنیا میں سوا اور بدنام کریں۔ سرسید بھی ان اخباروں کے آوازے تو اڑے سنتے سنتے اُنکے عادی ہو گئے تھے یہاں تک کہ جس اخبار میں اُنپر کوئی چوٹ نہ ہوتی تھی اُسکو دیکھ کر تعجب کرتے تھے چنانچہ تہذیب الاخلاق میں ایک جگہ لکھتے ہیں ”ہمارا حال تو اُس بڑھیا کا سا ہو گیا ہے جسکو بازار کے لونڈے چھیڑا کرتے تھے اور جبہ چھیڑنے والے نہوتے تو کہتی کیا آج بازار کے لونڈے مر گئے“

اسی طرح سرسید کی تمام تحریریں۔ جو اُس مخالفت کے زمانہ میں تہذیب الاخلاق میں چھپی تھیں نہایت لطیف اور دلچسپ ہوتی تھیں اذان جملہ دو تین فقرے مختلف مقامات سے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں۔

ایک مقام پر لکھتے ہیں ”ہمارے ایک دوست نے ہمسے نقل کی کہ ضلع سہارنپور میں ہمارے حال پر بحث ہو رہی تھی +++ ایک صاحب نے کہا ”ہو تو کر شان مگر ہماری قوم کی بھلائی اگر ہوگی تو اسی کر شان سے“ یہ نقل سنکر میں نہایت خوش ہوا اور میں نے کہا کہ اگر حقیقت مجھے ایسا ہو تو اس کر شانی خطاب پر ہزار مسلمان نثار ہو +++ صاحب نے ایک ناواقف شاعر سے پوچھا کہ صاحب کیسا شعر کہتا ہے اُس نے نہایت دلی جوش سے کہا کہ ”آن قمر ساق ہمہ خوش میگوید“ صاحب نے کہا کہ ”جیسی عزت مجکو قمر ساق کے لفظ سے حاصل ہوئی اعلیٰ سے اعلیٰ خطاب سے بھی ممکن نہیں“ اسی طرح خدا کرے کہ یہ لفظ کر شان کا میرے لیے عزت قومی کا باعث ہو“

ایک جگہ لکھتے ہیں ”حضرات ہماری قوم ہی مثل ہو دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا؛ از برادران دور داز یگانگان نفور، ایک گوشہ میں پڑا ہوں، نزدیک و دور یگانہ و بیگانہ سے لعن و طعن سنتا ہوں، جس طرح بیگانگان مجھ سے نفرت کرتے ہیں برادران وطن بھی۔ الا ماشاء اللہ۔ اسی طرح متنفر ہیں۔ قصور یہ کہ اپنی نسبت

اور چشم بددور اب بھی باوجود اسکے کہ سرسید دنیا سے رحلت کر چکے ہیں اپنی وضع داری نبلا ہے جاتا ہے لیکن اب سرسید کا نام صراحتہ کم لیتا ہے بلکہ جو کچھ سرسید یا اُنکے کاموں کے برخلاف لکھنا ہوتا ہے اُسکو عید گڑبھٹن پر ڈھال دیتا ہے مگر ہم خوش ہیں کہ سرسید کی مخالفت کی بدولت ابکی بار اُس میں خود بخود ایک ایسی خوبی پیدا ہو گئی ہے جو ملک کے حق میں نہایت مفید ہے وہ برخلاف اُن اخباروں کے جو ہندو مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنا چاہتے ہیں دونو قوموں میں آشتی اور مصاکحت کی بنیاد ڈالتا معلوم ہوتا ہے۔ اُسکی یہ پالیسی۔ جیسا کہ اُسکے مخالف خیال کرتے ہیں۔ کسی غرض پر مبنی کیون نہ ہو ملک کے حق میں بہر حال مفید ہے۔

ایک شخص نے چند اجزا سرسید کی لائف کے نام سے لکھ کر اُنکے پاس بھیجے جس میں بہت سی باتیں خلاف واقع درج تھیں اور جا بجا اُنکی تنقیص کی گئی تھی مگر مولف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔ سرسید نے اُس پر یہ ریمارک کر کے اخبار میں چھپوا دیا ”ایک ہمارے شفیق غائبانہ نے۔ جنسے ہم سے ملاقات ظاہر نہیں نہیں ہے۔ ہماری لائف اپنے خیال کے مطابق لکھ کر ہمارے پاس بھیجی ہے جس میں ایسی باتیں بھی ہیں جنسے ہم نہ واقف نہیں ہیں۔ ہم اُنکا شکریہ ادا کرتے ہیں اور یہ ربا عی سب حال لکھتے ہیں

اے آنکہ مراندیدہ بشناختہ نا دیدہ تصورم چنان ساختہ

بایزد بے مثال مانند نیم حقا کہ ندیدہ و نشناختہ

سب زیادہ سرسید کا ذکر خیر بیچ اخباروں میں ہوتا تھا جنکے اڈیٹر اور پورپرائٹر عموماً مسلمان تھے اور گرم بازار میں صرف اس بات پر منحصر تھے کہ اپنی قوم کے خیر خواہ اور جان نثار پر بھبتیان اُرائیں اُسکے کارٹون بنائیں اُسکی ہجو کے اشعار شائع کریں اُسکی خوبیوں کو عیب بنا کر دکھائیں اور اس طرح

جو وضع اور لباس میں سرسید کی پیروی کرتے تھے سخت مشکلیں پیش آئیں بلکہ خود سرسید اسی روک ٹوک کے سبب بعض یوروپین افسروں سے۔ باوجودیکہ بیرون ایک جگہ رہے۔ کبھی نہ مل سکے۔ مگر جس بات کو انھوں نے اپنے نزدیک بہتر سمجھا کسی کی مخالفت کے خوف سے اُسکو ترک نہیں کیا؛ بیسا سمجھا ویسا ہی کہا اور وہی کیا۔ جب کبھی اُنکو معلوم ہوا کہ کسی افسر یا حاکم اعلیٰ نے ہندوستان کے یوروپین ڈریس پر اعتراض کیا ہی فوراً اخبار میں اُسکا جواب لکھا یہاں تک کہ جب لارڈ ڈفرن نے اسی تبدیل وضع کے خلاف ایک عام مجمع میں کچھ تقریر کی اور وہ اخباروں میں چھپی تو سرسید نے ایک نہایت زبردست آرٹیکل اسکے برخلاف لکھ کر اپنے اخبار میں شائع کیا اور اس طرح کے بے شمار آرٹیکل سوسائٹی اخبار کی جلدوں میں اُنکے لکھے ہوئے موجود ہیں۔

جو مسلمان سرسید کے مخالف تھے وہ بھی انگریزوں کی اس مخالفت سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ پناچہ مولوی امداد علی اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں ”بعض اہالیان ہند نے واسطے دھوکا دینے حکام سے اپنا طریقہ مذہبی اور لباس ملکی اور وضع قومی چھوڑ کر برخلاف اپنے ہموطنوں اور ہموقوموں ہم پیشوں کے جاکٹ اور کوٹ پتلون پہننا اور میز و کرسی پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا اس مراد سے اختیار کیا ہی کہ ہکو حکام وقت۔ جنکے لباس اور طعام کی یہ وضع ہے۔ اپنا مخلص اور پیرو جانیں اور اُنکے محکومین ہکو حکام کا ہمسر مانند صاحب لوگوں کے سمجھیں۔ سو نتیجہ اُنکے خبیث طینت کا کہ مکر و دغا ہی یوں ظاہر ہی کہ اکثر حکام سولے فربہی دغا باز سمجھنے کے اُنکو اچھا نہیں جانتے اور اُنکی وضع اور چال چلن کو پسند نہیں کرتے“

باوجود ان تمام مخالفتوں کے جو مسلمانوں کی طرف سے ہوتی تھیں سرسید نے جو اُنکے مقابلہ میں ابتدا سے خاموشی کا طریقہ اختیار کیا تھا بغیر اشد ضرورت کے کبھی اُسکو ترک نہیں کیا نہ وہ خود جواب دینا

بھائیوں کا بھلا چاہتا ہوں، انکی عام رای کی مخالفت سے نہیں ڈرتا بلکہ جو انکے بھلے کی ہو وہی کہتا ہوں۔
یہی کمبخت خصلت ہے جسے مجھ کو اس حال پر پہنچایا ہے۔

پھر ایک جگہ لکھتے ہیں ”دنیا میں کوئی نہیں رہا، پیر نہ پیغمبر نہ زاہد خدا پرست نہ فاسق نفس پرست؛
سب کو گزرا ہے مگر میں سمجھتا ہوں۔ بشرطیکہ میری سمجھ کی غلطی نہ ہو۔ کہ حضرت مرزا جانناں منظر علیہ الرحمہ۔ جنگو
بلحاظ ان نسبتوں کے جو مجھے اُس خانوادہ سے ہیں ناز سے پردہ ادا کنا زیادہ ہے۔ انکا یہ شعر میری خاک مرقد کا کتابہ ہوگا

بلوچ تربت من یافتند از غیب تھریرے کہ این مقتول اجز بیگناہی نیست تھیرے

سر سید نے جو لباس طعام و مکان اور طرز ماند و بود اور طرز معاشرت وغیرہ میں تعلیم یافتہ ترکوں
کا طریقہ اختیار کیا تھا اور جس سے انگریزین اور مسلمانوں میں میل جول پیدا کرنا مقصود تھا مسلمان تو
اس طریقہ کو ناپسند کرتے ہی تھے بلکہ اُسکو عیسائی ہو جانیکے برابر سمجھتے تھے مگر تماشایہ ہے کہ بعض متعصب
مغرور انگریز بھی اس سے نہایت ناراضی ظاہر کرتے تھے اور گویا اس بات کا ثبوت دیتے تھے کہ انسانی
اخلاق میں منو کے زمانہ سے آج تک وجود اس قدر علمی اور عقلی ترقیات کے ایک ذرہ برابر بھی ترقی نہ

ہوئی اور جو فرق منو نے شد اور برہمن میں کھاتھا وہی فرق اس زمانہ کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے
شایستہ لوگ حاکم و محکوم میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ فیاض طبع اور کشادہ دل انگریز جو
ہندوستان میں بکرا انگلستان کے اصلی جوہر یعنی آزادی کو کھو نہیں بیٹھتے وہ ان باتوں کا کچھ خیال
نہیں کرتے اور ہندوستانیوں سے خواہ وہ کسی لباس میں ہوں ناک بھون نہیں چڑھاتی مگر سنگد
انگریزوں کو ہرگز گوارا نہیں کہ ہندوستانی جو ہماری جوتیوں کے تلے ہیں وہ ٹرکش کوٹ پتلون
اور ٹرکی ٹوپی اور انگریزی بوٹ پہنکر ہسے ملنے کو آئیں۔ چنانچہ اسی بنا پر بعض اوقات ان لوگوں کو

کہ جو مضمون کسی انگریزی اخبار میں مدرسہ یا بانی مدرسہ کے خلاف چھپتا تھا سرسید کو انھیں دو صاحبوں پر اس کے لکھنے کا گمان ہوتا تھا۔ چنانچہ انڈین آبزورر مطبوعہ ۱۸۷۲ء میں جو ایک سخت آرٹیکل مرتبہ معلوم اور سرسید بلکہ تمام مسلمانوں کے برخلاف چھپا تھا اس پر بھی سرسید کو یہی خیال ہوا کہ ان دونوں افسروں میں سے کسی کا لکھا ہوا ہے۔ اس پر سرسید نے دو آرٹیکل تہذیب الخلاق میں لکھے جن کا انگریزی ترجمہ ساتھ ہی تھا چھاپا تھا اس میں سے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں

”انڈین آبزورر مطبوعہ ۲۸ ستمبر ۱۸۷۲ء میں آرٹیکل لکھنے والے نے ہم کو (یعنی مسلمانوں کو) سخت متکبر اور متعصب کہا ہے اور یہی سبب ہم کو گورنمنٹ کا بھون اور اسکولوں سے کم فائدہ حاصل کرنے کا قرار دیا ہے۔ اس آرٹیکل کو پڑھ کر اول اول تو ہم کو بہت تردد اور خوف معلوم ہوا؛ تردد تو اس بات کا ہوا کہ یہ کس کا لکھا ہوا ہے؟ مسٹر ڈی بی آئی کا؟ یا مسٹر سی اس کا؟ اور خوف اس بات کا ہوا کہ اگر پچھلے کا ہو تو ایسا نہ ہو کہ وہ کبھی ہمارے ملک کا فائنٹ گورنر ہو جائے اور مسلمانوں کی زندگی اُس کے ہاتھ میں پڑ جاوے۔ مگر چونکہ اُس آرٹیکل کے مضمون اکثر وہ ہیں جو مدت ہوئی کہ ہم سن چکے تھے اس لیے وہ ہمارا تردد اور خوف ذرو نجات دیتے رہے“

”مگر ہم کہتے ہیں کہ ہاں ہم (یعنی مسلمان) متکبر بھی ہیں اور تعصب بھی؛ پر کیون نہ ہم ایسا طریقہ تعلیم تیار کریں جس سے ہمارے تکبر اور تعصب میں بھی خلل نہ آوے اور ہم تعلیم بھی پادین“

”انڈین آبزورر کا آرٹیکل لکھنے والا ہم کو طعنہ دیتا ہے کہ ”خاص مسلمانوں کے کلچر قائم کرنے کے لئے کافروں

(یعنی انگریزوں) سے کیوں مدد لی جاتی ہے؟ اور یہ بھی لکھتا ہے کہ ”اگر ایسا مدرسہ خود مسلمانوں ہی کی کوشش سے قائم ہوگا تو یہ ترقی و بہتری کی دلی خواہش کا ثبوت ہوگا؛ لیکن اگر لارڈ نارٹھبروک صاحب جیسے لوگوں کی بخاوت

چاہتے تھے اور نہ کسی دوست کا اپنی طرف سے جواب دینا پسند کرتے تھے چنانچہ انکی بہت سی تحریریں دیکھی گئی ہیں جنہیں انہوں نے اپنے دوستوں کو مخالفوں کا جواب دینے سے روکا ہے؛ بلکہ ایک دفعہ خود اقم کو ایک اسی قسم کی تحریر اخباروں میں چھپوانے پر نہایت شرمندہ کیا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انکو اپنی سچائی پر کس قدر بھروسہ تھا اور کہاں تک وہ سلف کے اس سچے مقولہ پر یقین رکھتے تھے کہ ”مَا ذُو حَقٍّ وَلَا تَقَى الْعَالَمُ عَلَى خِلَافِهِ“

انہوں نے ۱۶۶۹ء میں ولایت سے سوسائٹی اخبار کے اڈیٹر کو لکھا تھا ”رد و قبح پر متوجہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے اسلئے کہ جوابات جھوٹی ہے وہ تھوڑے ہی زمانہ میں مثل جھوٹے موتی کے بے آب ہو جاوے گی؛ خواہ وہ بات خود اس شخص کی (یعنی میری) ہو اور خواہ اس کے مخالف کی۔ پس میں نہایت عاجزی سے آپ کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ جو لوگ میری برائی لکھیں آپ بلا تکلف اپنے اخبار میں نقل کیجیے مگر کوئی حرف بھی اس کے جواب کے طور پر ارقام نہ فرمایا کیجیے؛ صرف اسکی صحت اور عدم صحت پڑھنے والوں کی رائے پر چھوڑ دیجیے امید ہے کہ آپ اپنی عنایت سے میری التماس کو قبول فرمادینگے“

لیکن اگر کسی انگریز کا مضمون سرسید کے خیالات یا مدرستہ العلوم کے خلاف کسی انگریزی اخبار میں چھپتا تھا تو اسکا جواب دئے بغیر وہ کبھی نہ رہتے تھے اور اکثر ایسے مضامین کا انگریزی ترجمہ بھی ساتھ کے ساتھ چھپوا دیتے تھے۔ جس زمانہ میں انہوں نے مدرستہ العلوم کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ کیا اکثر یورپین افسر انکے مخالف ہو گئے تھے اور جیسا کہ پہلے حصہ میں مذکور ہو چکا ہے کمیٹی نے مدرسہ کے لئے جس قطعہ زمین کے ملنے کی گورنمنٹ سے درخواست کی تھی ضلع کے حکام اسکا ملنا نہیں چاہتے تھے۔ خصوصاً ڈاکٹر سر رشتہ تعلیم اضلاع شمال مغرب اور صاحب کلمہ ضلع علیگر طرہ سخت مخالف تھے یہاں تک

ایک روشن ہیرا یا لعل نہیں بن سکتا۔“ پس اب ہم پوچھتے ہیں کہ آیا ہماری قوم کو سنگریزوں میں اور کنگروں میں پڑا رہنا اور ہر ایک کی ٹھوکرین کھانا اور دشنام سُنانا ہی پسند ہے یا اپنی حالت میں کچھ ترقی کرنے کا ارادہ؟ یہ سچ ہے کہ جو شخص بزرگانی کسی کی نسبت استعمال میں لاتا ہے وہ خود اولاً اپنے آپ کو اُن سو لاکھ ثابت کرتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اُس آرٹیکل کا لکھنے والا ہکو متکبر اور سخت متعصب بتاتا ہے حالانکہ وہ ہم سے بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے مگر ہکو اس پر خیال کرنا نہیں چاہیے بلکہ جو لفظ ہمارے دشمن نے بھی ہمارے حق میں کہے ہوں اُن سے بھی ہکو نصیحت پکڑنی چاہیے۔“

”ایک مقام پر اُس آرٹیکل کا لکھنے والا لکھتا ہے کہ ”کیٹی کو مناسب ہے کہ +++ اس امر کی تفتیش کرے کہ آیا اُس قوم (یعنی مسلمانوں) میں کبھی کوئی بڑا فلسفی یا شاعر پیدا بھی ہوا ہے جو ایمان داری کے ساتھ اپنی نسبت خود سے باتیں بیان کرے جو کیٹی نے بیان کی ہیں“ اگر اس عبارت کا یہ مطلب ہو کہ ہمارے ملک کے ڈاکٹر سولک، انٹرکشن کے وقت میں (یعنی اُنکے طریقہ تعلیم کے اثر سے) کوئی شخص ہماری قوم کا ایسا ہوا ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب صاف ہے نہیں۔ اور اگر کبھی کے لفظ سے غیر مفید زمانہ مراد ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آرٹیکل کے لکھنے والے کو دو بارہ کیمبرج یونیورسٹی میں جا کر ہسٹری آف فلازنی اور ہسٹری آف اورینٹل لٹریچر پڑھنی چاہیے۔“

انڈین آبرور کے مذکورہ بالا آرٹیکل میں جو سخت الفاظ مسلمانوں کی نسبت استعمال کیے گئے ہیں اور جن کا جواب سرسید کو بھی کسی قدر سختی کے ساتھ دینا پڑا اُن سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء تک اینگلو ایڈوینیٹ کے خیالات مسلمانوں کی نسبت کیسے تھے اور وہ مسلمانوں کی قوم کو کس قدر ناقابل اور اُنکی تعلیم کے لیے کوشش کرنے کو کس قدر بے سود اور لا حاصل سمجھتے تھے اور مدرستہ العلوم کی نسبت کیسے مخالفانہ خیالات رکھتے تھے۔ با اینہم جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ آج اُسی قوم کو تمام اعلیٰ فہر

قائم ہوا تو کچھ دلی خواہش کا نشان نہ ہوگا، ” اگرچہ ایسا لکھنا ایک عیسائی کو اور خصوصاً اُس قوم والے کو۔ جس سے ہم نے مدد مانگی اور جو اپنے تئیں انسان کی خیر خواہ اور سچی دوست سمجھتی ہو۔ زیبا نہ تھا مگر ہم دل سے قبول کرتے ہیں کہ جو کچھ اُس نے لکھا ہو بالکل صحیح اور بالکل سچ ہو اور اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ درحقیقت وہ نہایت نالایق بے شرم بے حیا اور تمام دنیا کی قوموں میں ذلیل ہوگی جو اب بھی ایسے طعنے سنکر اس مدرسہ کے قائم ہو جائے۔ میں دل و جان سے روپیہ سے اور کوشش سے مدد نہ کریں گی۔“

”انڈین آبزروور میں آرٹیکل لکھنے والا ہماری ناقص انگریزی کی ہنسی اُڑاتا ہو مگر یہ اس سے کچھ بچ نہیں کیونکہ یہ جو کچھ ہے انڈین ایجوکیشنل سسٹم کی عمدگی کا ثبوت ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ ہماری یونیورسٹیاں اور ہمارے ملک کے ڈائریکٹر پبلک انٹرکشن کی ایسی ہی تعلیم ہے اور صرف ہماری ہی ایسی تعلیم نہیں بلکہ ہزاروں دہزاروں کی ایسی تعلیم ہے اسی لئے اُس سے بھاگتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں۔“

پھر دوسرے آرٹیکل میں اُسی انڈین آبزروور والے آرٹیکل کی نسبت ایک جگہ لکھتے ہیں ”سیلیکٹیڈ خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان میں یہ سوال بحث میں آیا تھا کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا اثر ایسا کیوں نہیں ہوتا جیسا کہ انگلستان میں ہوتا ہے؟ سوا کا جواب انڈین آبزروور کا آرٹیکل لکھنے والا یہ دیتا ہے کہ ”انکو (یعنی مسلمانوں کو) گورنمنٹ کی ذات سے یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ سور کے بالوں سے ریشم کی تھیلی بنا دے“ پس اب ہم اپنی قوم سے پوچھتے ہیں کہ علم کو یوتانے ہم کو سور کا خطاب دیا ہے؛ آیا ہم کو اسی خطاب میں خوش رہنا چاہیے یا کوشش کر کے اور اپنی حالت کو درست کر کے دنیا کو بتلانا چاہیے کہ اس خطاب کا مستحق کون تھا؟

”دوسرا جواب اسی سوال کا اُس آرٹیکل لکھنے والے نے یہ دیا ہے کہ ”جس شے پر اسکا (یعنی تعلیم کا) اثر ہوتا ہے دو دونوں ملکوں (یعنی ہندوستان اور انگلستان) میں مختلف ہے گو آگہ دونوں کا ایک ہی ہو؛ سنگریزہ یا کنکر سے

بے شک مانہ کا اقتضا یہی تھا کہ معلمان اپنی حالت درست کرین، وقت کی ضرورتوں کو سمجھیں اور خواب غفلت سے بیدار ہوں مگر اس کا اقتضا بالکل اسکے برخلاف تھا؛ اس کا اقتضا وہ تھا جو ملکہ سبانی سلیمان کا پیغام سنکر اپنے درباریوں سے کہا تھا کہ ”إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً“ حکمران قوم جب مفتوح ہوتی ہے۔ خواہ فتح قوم دشمن اور منصف ہو اور خواہ وحشی اور ظالم۔ دونوں صورتوں میں اس کا میلان بستی اور تنزل کی طرف ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ اسکو درحقیقت گورنمنٹ نہیں گراتی بلکہ وہ آپ ہی اپنے بل میں گرتی چلی جاتی ہے۔ جس چال پر وہ قدیم سے چلی آتی ہے اس کے خلاف دوسری چال چلنا اسکے لئے ایسا ہی دشوار ہوتا ہے جیسے کسی جسم کا اپنی خیز طبعی کے خلاف حرکت کرنا۔ مفتوح قوم کو۔ گو کہ اسکی اقبال مندی کا زمانہ بالکل ختم ہو گیا ہو۔ مدت دراز تک اقبال مندی کے خواب برابر نظر آتے رہتے ہیں اور اسکی امیدوں کا طلسم بدستور بندھا رہتا ہے۔ انکو اپنی بستی اور تنزل کا شعور مطلق نہیں ہوتا اور اپنی حالت کی ملاح کا کبھی بھولکر بھی انکے دل میں خیال نہیں گذرتا۔ اگر بالفرض اپنے تنزل پر متنبہ ہوتے ہیں تو اسکو زمانہ کی نا انصافی اور اپنی حق تلفی پر محمول کرتے ہیں، اپنی نالائقی کی طرف ہرگز منسوب نہیں کرتی۔ اسی بھلاوے میں وہ گرتے گرتے اس گہرے گڑھے میں جا پڑتے ہیں جہاں سے ابھرنا نامکن ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی ایسی ہی حالت تھی؛ وہ کچھ تو ڈیڑھ سو برس سچست ہوتے چلے ہی آئے تھے اس پر طرہ یہ ہوا کہ واقعہ شہ نے انکو اور بھی نیچے گرا دیا۔ اب انکے ابھرنے کی بظاہر کوئی صورت باقی نہ رہی تھی اور وہ وقت کچھ دور نہ تھا کہ امریکا اور آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کی طرح ملک میں ان کا عزم اور وجود برابر ہو جائے۔ پس اگر دنیا فی الواقع عالم اسباب ہے تو اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے

اور اعلیٰ سے اعلیٰ حکام اور ارکان سلطنت اس مدرسہ کے صرف ملح و ثنا خوان ہی نہیں بلکہ دل سے اُسکے مددگار ہیں اور اُسکو ترقی دینا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کی نسبت اُنکے وہ خیالات نہیں رہے جو اب سے ستائیس برس پہلے تھے تو ایک عجیب انقلاب معلوم ہوتا ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ سرسید کی کوشش، حسن تدبیر، صبر اور استقلال نے اس قلیل عرصہ میں مدرسۃ العلوم اور مسلمانوں کی حالت کو کمانچھ کمانتک پہنچا دیا ہے۔

سرسید کی کامیابی اور اُسکے اسباب

سرسید کو اپنے مقاصد میں جو غیر متوقع کامیابی گذشتہ تیس برس کے اندر اندر ہوئی وہ اس حد سے گذر گئی ہے کہ لوگوں کو باور کرانے کے لئے اُسکا ثبوت دینے کی ضرورت ہو؛ پس بجائے اُسکے کہ اُسکا ثبوت پیش کیا جائے اُسکے اسباب کا سراغ لگانا بہتر معلوم ہوتا ہے؛ کیونکہ جو امر تیس برس پہلے محال معلوم ہوتا تھا اسکا اسقدر جلد وقوع میں آجانا بلاشبہ اُسکے اسباب کی عظمت پر دلالت کرتا ہے اور چونکہ قوم کو ابھی سرسید جیسے بہت سے کامیاب شخصوں کی ضرورت ہے اسلئے امید ہے کہ اُنکی کامیابی کے اسباب کا بیان کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

ممکن ہے کہ سرسید کی کامیابی کی نسبت یہ خیال کیا جائے کہ انھوں نے جتنے کام کیے وہ سب زمانہ کے مقتضا کے موافق کیے اور اسلئے زمانہ خود اُنکی تائید کر رہا تھا۔ پس اُنکی کامیابی اسقدر تعریف کے لائق ہے جیسے اُس تیراک کی تیرائی جو دریا کے بہاؤ پر بے تکان تیرتا چلا جاتا ہے۔ مگر ہرگز نزدیک اس خیال میں کسی قدر غلطی ہے۔ زمانہ کا تقاضا اور چیز ہے اور زمانہ کا مقتضا اور چیز،

ٹرکی ہی میں نہیں ہو بلکہ ہندوستان میں بھی موجود ہو۔ اس ملک (یعنی انگلستان) کے لئے جو مسلمانوں کی سب سے زیادہ آبادی کا مالک ہے۔ نہایت ضروری ہو کہ اس امر کی نسبت عمدہ کیفیت معلوم کرے۔ اس سوال کے فیصلہ پر کہ آیا اسلام اور شایستگی باہم موافقت رکھتے ہیں یا نہیں۔ پانچ کروڑ آدمیوں کی آئندہ زندگی کا مدار ہو۔ کیا یہ آبادی (یعنی ہندوستان کے مسلمان) روز بروز مخالفت ہوتی جائیگی؟ کیا اسکے سرگروہ ممبر جہالت کے ساتھ کسی دوسری جگہ ہندو کرینگے تاکہ ہمارے دشمنوں کے ہاتھوں میں۔ جو اور ملکوں میں ہیں۔ چلے جائیں؟ اگر ایسا ہو تو انگلستان جس قدر جلد مصائب کے مقابلہ کے لئے تیار ہو اسی قدر بہتر ہو۔ مگر اس معاملہ میں کرنل گریم کی کتاب ”سید احمد خان“ نے ایک ضخیم روشنی ڈالی ہے۔ یہ ایک کتاب ہے جو مغربی خیالات کی ہمدردی کا ایک عجیب و غریب تماشا دکھاتی ہے جو بیک انگریزی دنیا سے ناواقف شیخ العرب کے خون نے ظاہر کیا ہے۔“

غرض کہ یہ خیال کرنا ٹھیک نہیں کہ سرسید کو جو کچھ کامیابی ہوئی وہ صرف اس وجہ سے ہوئی کہ انکی کوششیں زمانہ کے مقتضائے موافق تھیں، بلکہ انکی کامیابی صاف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کوششیں سہولت، دانائی اور راستبازی کے ساتھ کجاتی ہیں وہ زمانہ کے اقتضا پر غالب آسکتی ہیں۔

سب سے بڑا ثبوت اس بات کا۔ کہ زمانہ کا تقاضا۔ جب تک کوئی زبردست ہاتھ اسکی پشتی پر نہ ہو۔ کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ ہے کہ مدت دراز سے گورنمنٹ ہندوستان میں تعلیم نسوان جاری کرنا چاہتی ہے اور بیس چھیس برس سے تمام تعلیم یافتہ ہندو مسلمانوں میں اسکا جوش پھیلا ہوا ہے، اخباروں اور دیگر ذرائع میں سب سے زیادہ اسی مضمون کا زور شور ہے، بیسیوں ناول اور رسالے اسی باب میں لکھے گئے ہیں اور لکھے جاتے ہیں، جا بجا اسی غرض سے کمیٹیاں قائم ہیں، اس سے زیادہ زمانہ کا تقاضا اور کیا ہو سکتا ہے؟

کہ مسلمانوں نے اب تک جو کچھ اپنی پورے شکل حالت میں ترقی کی ہو وہ صرف سرسید کی چل سالہ کوششوں کا نتیجہ ہے ۔

کرنل گریم سرسید کی لائف میں ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ ”غدر کے زمانہ میں اور اُس کے بعد بہت مدت تک مسلمانوں پر ایک بدلی چھائی رہی ۔ اُس خوفناک زمانہ کے تمام مکروہات اُنکی طرف منسوب کیے جاتے تھے اور کچھ شک نہیں کہ یہ تعصب (یعنی انگریزوں کا) زیادہ تر بے جا تھا ۔ مسلمانوں کو اس کا بہت رنج تھا اور یہ بات اُنکو بُری معلوم ہوتی تھی ۔ بظاہر کسی شخص نے اُنکی حمایت کی ہامی نہیں بھری ۔ سید احمد خان نے یہ مشکل کام اپنے دمر لیا اور جانتک اسکی قدرت میں تھا اُسے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی بات کو پھر بنادیا “

تھیوڈور مارلین اپنے اُس آرکھل میں جو سرسید کی وفات کے بعد مئی ۱۸۵۸ء کے کالج میگزین میں چھپا تھا۔ لکھتے ہیں کہ ”غدر سے پہلے اور اُس کے بعد چند سال تک تقریباً تمام انگریز مسلمانوں کو بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے اور اعتبار کے اعلیٰ عہدوں پر اُنکو ترقی دینے اور اُنکی خواہشوں کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے پر کسب طبع و خامند نہیں ہوتے تھے ۔ نہایت نمایاں انقلاب جو فی الحال اینگلو انڈینز کے خیالات میں ظاہر ہوا ہے یہ سرسید کی تلقین کا نتیجہ ہے ۔ اُسے مسلمانوں کے دل میں جہان نفرت اور بدگمانی تھی وہاں اعتماد اور وفاداری کا درخت لگادیا اور انگریزوں کو یقین دلادیا کہ مسلمان وفادار ہیں “

اکیڈمی نام ایک لایت کا اخبار موزعہ ۱۹۔ دسمبر ۱۸۵۸ء کرنل گریم کی لائف اور سید احمد خان پر ریویو کرتے ہوئے لکھتا ہے ”کم سے کم اس قدر تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اسلامی دنیا کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فرو گذشت کرنا نہیں چاہیے ۔ کروید کا زمانہ گزر گیا ، اب اسلام دوسری جانب جوش ظاہر کر رہا ہے ۔ اگرچہ اولہ فیشن مسلمان سولیزیشن کی ترقی کے مخالف ہیں مگر انہیں ایک آزاد خیال گردہ بھی موجود ہے ۔ یہ گردہ صرف

ایک خاص حد تک صحیح مانا جاسکتا ہو مگر جس طرح سرسید کے رسوخ سے اُسکی تائید ہوئی ہے اسی طرح مزاحمت بھی کچھ کم نہیں ہوئی ؛ اسی رسوخ و اعتبار کی بدولت ایک مدت تک سرسید کی نسبت لوگوں کو طح طرح کی بدگمانیاں رہیں ۔ ہزاروں آدمی یہ سمجھتے تھے کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت سے مسلمانوں کو عیسائی یا لامذہب بنانا منظور ہے اور ہزاروں یہ خیال کرتے تھے کہ مدرسہ قوم کے فائدہ کے لئے قائم نہیں کیا گیا بلکہ اسیلئے قائم کیا گیا ہو کہ انگریزی سلطنت کو زیادہ استحکام ہو ۔ اگرچہ اس خیال کا دوسرا جز صحیح تھا مگر پہلا جز اسیلئے غلط تھا کہ حالت موجودہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی اسی بات پر موقوف ہے کہ انگریزی سلطنت کو زیادہ استحکام ہو ۔

بہر حال سرسید کے رسوخ سے مدرسہ کو یقیناً بہت کچھ فائدہ پہنچا ہے ۔ خصوصاً سر جان اسٹریچی کی گورنمنٹ نے سرسید کا حوصلہ ہی نہیں بڑھایا بلکہ اُنکے ارادوں میں جان ڈالی ہے اور جتنے لفٹ گورنر اضلاع شمال مغرب میں اور جتنے وائسرائے کل لچ کے قیام کے بعد آئے سب نے کل لچ پر رہنا جو جہ مبذول رکھی ہے ؛ مگر رفاہی مشن کے عظیم الشان کام میں ۔ بجائے اسکے کہ یہ رسوخ محدود معاون ہوا ہو ۔ اُس نے اور اُلٹی مزاحمت کی ہے ۔ ہر ایک قوم اور خاص کر مسلمانوں کی قوم مذہبی خیالات کا مصلح اگر کسی کو تسلیم کر سکتی ہے تو اُسی شخص کو کر سکتی ہے جس میں وہ تمام خصوصیتیں موجود ہوں جو مذہبی تقدس کے لیے درکار ہیں نہ کہ ایسے شخص کو جس میں بظاہر اس قبیل کی کوئی حیثیت نہ پائی جائے بلکہ سراسر اُسکی زندگی ایک دنیا دار آدمی کیسی زندگی ہو خصوصاً سلطنت میں تقرب اور رسوخ پیدا کرنا عام اس سے کہ مسلمانوں کی سلطنت ہو یا انگریزوں کی ۔ مذہبی تقدس کے بالکل خلاف سمجھا جاتا ہے باوجود اسکے سرسید نے لاکھوں مسلمانوں کے دل میں اپنی اکثر اصلاحیں نہ نشین کر دیں پھر کیونکر

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آج تک جیسی کہ چاہیے کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ اسکا کوئی زبردست حامی مثل سید احمد خان کے کھڑا نہیں ہوا۔

ہمارے نزدیک سرسید کی کامیابی کا اصل سبب یہ تھا کہ انکی ذات میں وہ تمام خصلتیں اور اخلاق بالطبع موجود تھے جو ایک رفارمر کی ذات میں جمع ہونے ضرور ہیں۔ رفارمر کے لیے سب زیادہ ضروری چیز سچائی اور راستبازی ہو کہ جس بات کو وہ اپنے نزدیک قوم کے حق میں بہتر سمجھے۔ اگرچہ ایک زمانہ اسکا مخالف ہوا۔ اس کے ظاہر کرنے میں کچھ پس و پیش نہ کرے۔ راستبازی کی مثال بعینہ ایسی ہی جیسے ریختہ کی چٹائی جو عین برسات کے موسم میں کیجائے؛ راستباز آدمی کو بلاشبہ بہت سی مخالفتوں کا نشانہ بننا پڑتا ہو اور اسلئے اسکی کامیابی میں بہت دیر لگتی ہو مگر جو رفا ایک فحہ کھا گیا پھر اسکو جنبش نہیں ہوتی۔ سرسید کو اپنی راستبازی کی بدولت بعض اوقات جیسا کہ اس کتاب میں جا بجا بیان ہوا ہے۔ سخت خطرات پیش آئے ہیں مگر بہت جلد وہ تمام خطرے رفع ہو گئے اور راستی نے اپنا پاء اُترش دلون پر بٹھا دیا۔ استقلال۔ جسکی نسبت کہا گیا ہو کہ ”الصبر مفتاح الفرج“ وہ بھی بغیر استیبار کے پیدا نہیں ہوتا کیونکہ جسکو اپنے کام پر بھروسا نہیں ہوتا وہ کبھی اپنے ارادہ پر قائم نہیں ہو سکتا چنانچہ سرسید نے جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ سید ممدی علیخان کو ولایت سے لکھا تھا کہ مجھ کو چون غافل ہوئے نیکی کا مقابلہ کیا ہو دوں دوں نیکی بڑھتی گئی ہو؛ پس اگر میرا کار بار سچا اور میری نیت نیک ہو تو انشاء اللہ تعالیٰ اس میں کچھ نقصان نہیں ہونے کا۔“

اکثر خیال کیا جاتا ہو کہ گورنمنٹ میں سرسید کا سوخ و اعتبار سب سے بڑھکر انکی کامیابی کا باعث ہوا ہو۔ بلاشبہ مددِ مہتمما العلوم کے قائم کرنے اور اسکو موجودہ حالت تک پہنچانے میں اس خیال کو

تذکرہ احباب کے اپنے قلم سے لکھ جائیں؛ مگر امید ہے کہ جو شخص مدرستہ العلوم کی ہٹری لکھ گا وہ اس فرض کو فراموش نہ کریگا کیونکہ یہ ذکر اسی موقع سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

لیکن ایک شخص جو سرسید کے کاموں کا صرف مددگار ہی نہ تھا بلکہ اس گاڑی کے ہانکنے میں گویا راہبر کی جڑ تھا۔ اگر اس موقع پر اسکا ذکر قلم انداز کیا گیا تو ہمارے نزدیک سرسید کی کامیابی کا ایک بڑا سبب بیان کرنے سے رہ جائیگا۔ اُس شخص سے ہماری مراد محسن الملک سید ممدی علی خان ہیں جو تمام قوم کے اتفاق سے سرسید کے بعد اُنکے جانشین ہوئے ہیں۔ یہی وہ شخص ہے جسے سب سے پہلے سرسید کو سمجھا۔ اُنکی سچائی کو پرکھا، اُنکے منصوبہ کی تھاہ دریافت کی اور اُنکے مقاصد کی عظمت کا اندازہ کیا اُن کا اُسوقت ساتھ دیا جب کوئی ساتھی نہ تھا۔ اور اُسوقت مدد دی جب کسی سے مدد کی امید نہ تھی۔ سرسید ولایت میں خطبات احمدیہ لکھ رہے تھے اور سید ممدی علی ہندوستان سے اُسکے لیے میٹرل بھیجتے تھے وہ ولایت میں اُسکو چھپوا رہے تھے اور یہ ہندوستان سے اُسکی چھپائی کے لیے چندہ وصول کر کر کے روانہ کرتے تھے۔ جب سرسید ولایت سے واپس آئے اور کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم کرنی چاہی اُسوقت اُنپر عجب مایوسی کا عالم تھا، جو منصوبے دل میں باندھ رکھے تھے اُنہیں سے کسی کے پورا ہونے کی امید نہ تھی۔ سید ممدی علی مرزا پور سے بنارس گئے اور سرسید کی ڈھارس بندھوائی، چنانچہ کمیٹی بڑی دھوم دھام سے قائم ہوئی۔ جب کمیٹی نے اس بات کے دریافت کرنے کو کہ مسلمان سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں کیوں نہیں پڑھتے۔ انعامی رسالے لکھوانے کا اشتہار دیا سید ممدی علی نے نہایت کوشش سے ایک مہسوطہ اسے لکھا جو سب رسالوں میں اول درجہ کا تسلیم کیا گیا اور پانسو کا انعام۔ جسکے وہ مستحق تھے۔ اپنے سے نیچے درجہ کا رسالہ لکھنے والے کو دلوا دیا۔ جب تنزیل الخلاق

کہا جاسکتا ہے کہ گورنمنٹ مین انکار سوخ اور اعتبار مطلقاً انکی کامیابی کا باعث ہوا ہے۔
 لیکن اگر فرض کریا جائے کہ سرسید کی تمام کامیابیوں کا مدار اسی سوخ اور اعتبار پر تھا تو بھی
 اصل سبب انکی راستبازی اور سچائی ٹھیرنگی کیونکہ برٹس گورنمنٹ مین ایک نیٹو کا اس قدر سوخ و اعتبار
 پیدا کرنا۔ جب تک کہ انکی وفاداری اور خلوص کا سونا سخت امتحان کی آگ پر پایا نہ گیا ہو۔ ہرگز ممکن نہیں نا
 سب سے زیادہ انکے کاموں میں مدد اور انکے ارادوں کو تقویت انکے دوستوں نے دی ہے
 اور یہ بھی ایک نتیجہ انکی راستبازی اور خلوص کا تھا۔ فی الواقع سرسید کو محض اپنی صداقت اور بے ریا
 محبت کی بدولت ایسے سچے دوست اور اعران و انصار ملے جو اس زمانہ میں نادر الوجود اور عجائب
 روزگار سے تھے۔ شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ سرسید کے اعران و انصار انکو اپنا مذہبی پیشوا سمجھا انکے کاموں
 میں مدد دیتے تھے، سو اس سے زیادہ کوئی غلط خیال نہیں ہو سکتا: انکے دوستوں اور مددگاروں
 میں جہان تک کہ ہمارے علوم ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو انکو اپنا مذہبی پیشوا جانتا ہو یا انکے
 تمام اقوال اور تمام رایوں کو تسلیم کر لیا ہو۔ سرسید کے بہت سے دوست ایسے بھی تھے جنکو قومی معاملہ
 کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی بعض انکی کوششوں پر ہنستے تھے اور انکی جدوجہد کو رایگان سمجھتے تھے مگر ہر کام
 میں مدد دینے کو دل و جان سے حاضر تھے۔ جب چندہ کی ضرورت ہوتی تھی پہلے دوستوں کا لگا جاتا تھا
 پھر اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پیرا جاتا تھا۔ اگرچہ مقام اس بات کا مقتضی تھا کہ ان تمام بزرگوار
 جس ذوق و شوق سے سرسید کے کاموں میں مدد دی ہے اور جس امنگ اور چاؤ سے مدرستہ العلوم نے
 چند دن میں شریک ہوئے ہیں اور جو بیش بہا خدمتیں قوم کی اُنسے بن آئین انکو مفصل بیان
 کیا جائے، خصوصاً اس وجہ سے کہ سرسید کی آخری تمنا۔ جو پوری نہ ہوئی۔ یہ تھی کہ ایک کتاب بطور

سمجھی کہ سرسید کی رائے کا ہر حال میں اتباع کیا جائے۔ اگر سرسید انکی رائے کے خلاف بھی کسی تجویز پر زور دیا اُسکو بھی طوعاً و کرہاً منظور کر لیا اور یہ سمجھا کہ اگر انکی رائے فی الواقع غلط ہو تو اسکا تدارک ممکن ہو لیکن اگر محتمل کے سبب مدرسہ کام سے انکا جی چھوٹ گیا تو اسکا کچھ تدارک نہیں ہو سکتا۔ حیدر آباد سے اگر انھوں نے علیگر ٹھہر ہی مین رہنا اختیار کیا اور بہت سے علمی کام مدرسہ کے خالق انجام دیے، محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کو ترقی دینے کی تدبیریں کیں اور اُسکی طرف مسلمانوں کو ماضی توجہ دلائی اور خود ہر ایک جلاس میں نہایت مفید لکچر اور ایسیچین دین۔ پھر یہی مین جا کر وہاں مسلمانوں کو مدرسہ اور کانفرنس کی طرف متوجہ کیا یہاں تک کہ انھوں نے کانفرنس کو بمبئی مین بلایا مگر سرسید کے کبر سن کے سبب وہاں کانفرنس کا منعقد ہونا موقوف رہا۔ سرسید کی وفات سے پہلے وہ پھر علیگر ٹھہر مین آئے اور اُنکے اخیر دم تک وہ مین رہے اور اس آخری رفاقت مین بھی دوستی اور محبت کا تپ پورا پورا ادا کیا۔ سرسید کی وفات کے بعد جو غیر معمولی مستعدی اور سرگرمی قومی خدمات مین اُنسے ظہور آئی وہ اس بات کا کافی ثبوت ہو کہ اُس مرحوم کے بعد کوئی شخص محسن الملک سے زیادہ انکی جانشینی مناسب نہ تھا۔ انھوں نے اپنی صحت اور طاقت سے بڑھ کر چندہ جمع کرنے مین کوشش کی توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔

باوجود ان تمام خدمات کے اپنے ہر ایک کام کو ہمیشہ سرسید ہی کی طرف منسوب کیا اور اپنے جانشین ایک مشین سے زیادہ کبھی کچھ نہ سمجھا۔ اٹا وہ کے ایڈریس مین جب لوگوں نے انکی قومی خدمات کی تعریف کی انھوں نے اُسکے جواب مین صاف صاف کہہ دیا کہ ان خدمات کو میری طرف منسوب کرنا تمہمت ہو، اس تعریف کا سید احمد خان کے سوا کوئی مستحق نہیں۔ سرسید کے بعد انکا جانشین بننے کی جہانتک کہ ہم کو معلوم ہو

جاری ہوا اور سرسید نے رفاہی مشن کا کام علی الاعلان شروع کیا سید مہدی علی پہلے شخص تھے جنہوں نے نہایت دلیری سے سرسید کی تائید میں مضامین لکھنے پر کمر باندھی جو معزز خطاب مولوی اور واعظ سرسید کو دے رہے تھے سید مہدی علی نے بھی انکا استحقاق پیدا کیا اور کفر کے فتوؤں کی بوچھاڑ۔ جو اکیلے سید پر پڑ رہی تھی۔ آدمی اپنے سرسیدی ۔

سرسید کی تحریریں اکثر نشر کا کام کرتی تھیں مگر سید مہدی علی کی تحریریں ذمہ ہم کا کام کیا ؛ سرسید ہمیشہ مسلمانوں کو نفرت و ملامت کرتے تھے ، اگلے علما کی غلطیاں ظاہر کرتے تھے ، جو کچھ اپنی تحقیق ہوتی تھی۔ اکثر بغیر اس کے کہ سلف کے اقوال سے اسپرست شہاد کریں۔ حوالہ قلم کر دیتے تھے ، سید مہدی علی نے مسلمانوں کے اسلاف کے کارنامے بیان کر کے قوم کے دل بڑھائے اور جو کچھ سرسید کی تائید میں لکھا مستند اور معتبر کتابوں کے حوالہ سے لکھا ۔ انکا اکثر مضامین بجائے خود بڑے بڑے رسالے ہیں جو نہایت چھان بین اور تلاش کے بعد لکھے گئے ہیں ۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین لکھنے میں باوجود اس کے کہ انکی صحت ہمیشہ نازک حالت میں رہی ہے وہ اس قدر منہما ہو گئے تھے کہ سرکاری کام میں حرج واقع ہونے لگا ۔ سناہو کہ انکے بالادست افسر کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اس نے سرسید کو لکھا کہ مہدی علی کو سمجھاؤ وہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوں ورنہ مجبوراً انکی نسبت رپوٹ کرنی پڑیگی ۔

مدرسۃ العلوم کو جو مالی مدد انہوں نے اپنی جیب سے اپنی کوشش سے پہنچائی اسکا اندازہ کرنا مشکل ہے ۔ سرسید سے کیا مدرسہ کے انتظام کے متعلق اور کیا مذہبی مسائل کے متعلق وہ اکثر اختلاف کرتے تھے مگر مخالفت کبھی نہیں کی ۔ ہمیشہ سرسید کا دل ہاتھ میں رکھا اور مدرسہ کی مصلحت میں

انھوں نے سرسید کی تقلید اختیار کی؛ یہاں تک کہ انکو زندہ دلاں پنجاب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ انھوں نے ہندوستان کے اور حصوں کی طرح سرسید کو مسلمانوں کی صرف دنیوی ترقی کا خواستگار مگر دین کا محرب نہیں ٹھہرایا بلکہ انکو دنیا اور دین دونوں کا سچا خیر خواہ اور خیر اندیش سمجھا۔ حق یہ ہے کہ قومی خدمات کی داد جو قوم کی طرف سرسید کو ملنی چاہیے تھی اُس کا حق پنجاب کے مسلمانوں کے برابر کسی صوبہ سے ادا نہیں ہو سکا اور جو تقویت برٹش گورنمنٹ کی امداد اور حضور نظام کی فیاضی اور بعض دیگر ریاستوں کے عطیوں سے ہوئی پنجاب کے عام مسلمانوں نے اُس سے کچھ کم تقویت سرسید کو نہیں پہنچائی۔

سرسید کی کامیابی کے اسباب میں اگر کالج اسٹاف کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ ایک بہت بڑی نا انصافی ہے؛ خصوصاً یوروپین اسٹاف کے بعض ممبروں نے باوجود غیر قوم اور غیر مذہب ہونے کے کالج کے کام اور اُسکی ترقی اور فروغ دینے میں درحقیقت سرسید کے دست و بازو کا کام کیا ہے۔ انھوں نے صرف منصبی فرائض پر جنکے لئے وہ بلائے گئے تھے۔ بس نہیں کی بلکہ سرسید کے خاص مشن میں جسپر کالج دیکھی گئی تھی۔ معتد بہ حصہ لیا ہے۔ انھوں نے کالج کو گورنمنٹ اور مسلمانوں کا معتمد علیہ بنایا اور ساتھ ایک خاص تعلق پیدا کیا جسکی وجہ سے سرسید کالج اور بورڈنگ ہوس کی طرف سے بالکل اور فالغ بال ہو گئے۔ انھوں نے اپنے اقوال اور افعال سے ثابت کر دیا کہ وہ مسلمانوں کی مانند بے سچے خیر خواہ اور اُنکے ترقی کے دل سے آرزو مند ہیں۔ مگر درحقیقت یہ سب نتیجے اُسی مرحوم کی راستبازی اور صاف دلی کے تھے؛ اگر وہ یوروپین اسٹاف پر پورا پورا اعتماد نہ کرتے اور کالج اور بورڈنگ ہوس کی باگ اُنکے حوالہ نہ کر دیتے تو ہرگز امید نہ تھی کہ یوروپین پروفیسر اپنے معمولی فرائض سے ایک انجمن آگے بڑھنے کا ارادہ کرتے۔

انکو مطلق خواہش نہ تھی مگر تقریباً تمام ٹرسٹی، تمام کالج اسٹاف، تمام کالج سٹوڈنٹس، صوبہ کے تمام اعلیٰ حکام اور افسر۔ جو کالج کے ہی خواہ تھے، تمام ڈیلیکٹ۔ جو پچھلے سال بمقام لاہور محمد ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک ہوئے، تمام مسلمان اخبار اور عموماً تمام مسلمان۔ جنکو قومی معاملات سے دلچسپی تھی۔ سب اس بات پر متفق تھے کہ انکو کالج ٹرسٹیز کا سرٹری بنایا جائے اسلئے انکو اسکے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ اس جوئے کو اپنے کندھے پر رکھیں۔

الغرض سرسید کو ایسے دوستوں کا ملنا۔ جنکا نواب محسن الملک کو ایک عمدہ نمونہ سمجھنا چاہئے۔ ان کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب تھا اور یہ محض انکی راستبازی اور قوم کی سچی ہمدردی کا نتیجہ تھا۔ ایسے سے مرغ زیرک خود بخود آکر جال میں پھنس جاتے تھے اور اُس زمانہ پر جو آزادی میں گندہ اٹھا رہے کرتے تھے۔ جیسا کہ نظیری نے کہا ہے

”نالا از بہر رہائی ننگند مرغ اسیر خور و افسوس زمانے کہ گرفتار نبود“

ایک اور خدا ساز تائید سرسید کے منصوبوں کی یہ ہوئی کہ پنجاب کے مسلمان۔ جنھوں نے برٹش گورنمنٹ کی بدولت ایک مدت کے بعد نئی زندگی حاصل کی تھی اور اسلئے انگریزی تعلیم اور انگریزی خیال خیر مقدم کرنے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ سرسید کی منادی پر وہ اس طرح دوڑے جیسے پیاسا پانی پر دوڑتا، انھوں نے صرف یہی نہیں کہ مدرسۃ العلوم کو مالی مدد پہنچائی بلکہ سچ یہ ہے کہ سرسید اور انکے کاموں کی کامیابی صوبہ نے عام طور پر ایسی قدر نہیں کی جیسی پنجاب والوں نے کی۔ کالج میں انھوں نے ہر ایک صوبہ زیادہ لڑکے تعلیم کے لیے بھیجے، ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ انھوں نے سب زیادہ دلچسپی ظاہر کی، سرسید کی ہر قسم کی اصلاحیں انھوں نے سب زیادہ قبول کیں اور قوم کی بھلائی کے کاموں میں سب سے بڑھ کر

مقناطیسی پیدا کر دی تھی اور چھاپے کی آزادی نے اُسکے لیے ہر ایک میدان صاف کر دیا تھا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اگر آزادی کا زمانہ نہ ہوتا اور گورنمنٹ کی طرف سے زبانوں پر مہر لگی ہوئی ہوتی تو سرسید کو اس طرح کھلے بندوں اپنی رائیں ظاہر کرنے کا موقع نہ ملتا مگر یہ بات فراموش کرنی نہیں چاہئے کہ جس وقت انھوں نے رسالہ اسباب بغاوت لکھ کر گورنمنٹ میں پیش کیا وہ ایک ایسا نازک وقت تھا کہ اس وقت کسی کو آزادانہ رائے ظاہر کرنے کی جرأت نہ تھی؛ چنانچہ کسی قدر انکو اپنی جرأت اور دلیری کا خمیازہ بھگتنا بھی پڑا، بعض جلیل القدر انگریز انکے سخت مخالف ہو گئے جس سے کچھ دنوں وہ مارشل لا کی زد میں رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آزادی کا زمانہ نہ ہوتا تو بھی شاید یہ چشمہ ابلے بغیر نہ رہتا۔

سرسید میں مختلف لیاقتوں کا جمع ہونا

ایک شریف اور لائق نگلشمن نے۔ جب کہ سرسید زندہ تھے۔ ہمارے سامنے انکا ذکر کرتے وقت کہا تھا کہ ”یورپ میں بلاشبہ ایسے لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں جو کسی خاص علم یا فن یا صنعت میں فرد کامل ہیں جنکا نظیر ایشیا میں ملنا مشکل ہے لیکن ایسے جامع حیثیات اشخاص۔ جیسے سید احمد خان ہیں۔ وہاں بھی لیاب بلکہ نایاب ہیں“ اسی لئے آلہ آباد میں ایک عام جلسہ کے موقع پر ایک لائق اور فاضل پنڈٹ نے یہ الفاظ کہے تھے کہ ”ہم مسلمانوں سے دولت میں زیادہ ہیں، تعلیم میں زیادہ ہیں، تعداد میں زیادہ ہیں؛ مگر افسوس ہے کہ ہم میں کوئی سید احمد خان نہیں ہے؛ بلکہ اگر ہم بیس بھی ملکر ایک ہو جائیں تو بھی سید احمد خان کے برابر نہیں ہو سکتے“

سید احمد خان بہادر شمس العلماء مولوی دکن دار اللہ نے اپنی ایک تحریر میں یہ قول نقل کیا ہے ۱۲

اگر سرسید کی ذات میں صرف راستبازی ہی کی صفت ہوتی اور اُس کے ساتھ فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی نہ ہوتی تو شاید اُنکی کامیابی میں زیادہ دیر لگتی بلکہ ممکن تھا کہ اُنکو اپنی کوشش کا پھل اپنی زندگی میں دیکھنا نصیب نہ ہوتا مگر خوش قسمتی سے اُنکے ظرف میں زہر و انگبین دو نہ موجود تھے گو اُنکی بہت گوئی نے بہت سے لوگوں کو بدکایا مگر فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی نے ایک زمانہ کو اُنکی طرف جھکایا اُنھوں نے ابتدا سے اخیر تک جس کام کے لیے چندہ کھولا اُس میں سب سے پہلے خود سبقت کی اور اپنی بساط اور حیثیت سے برابر بڑھ کر دیا وہ ایک بانی مدرسہ کی نسبت اپنے ایک دوست کو ولایت ہی لکھتے ہیں،

”افسوس کہ آپ نے اپنی تقریر میں یہ فرمایا کہ خود بانی نے جو فضل اُسی سے اپنے شہر کے تمام مسلمانوں میں زیادہ دی تھا ہیں۔ کس قدر روپیہ دیا، اُس وقت البتہ آپ کی لغت ملامت محتاجانِ شہر پر جو نام شبینہ کو محتاج ہیں۔ درست بجا ہوتی میں سو سائٹی کے لیے سب بھیک مانگتا ہوں مگر دس ہزار کئی سو روپیہ مجھ فقیر نے اپنے پاس سے دیا ہی، پس اسیرِ حالت میں اگر میں آپ سے سو روپے دینے کو کہوں تو کچھ مضائقہ نہیں“

اس کے سوا عزم جزم اور دلیری۔ جوہر کامیابی کی جڑ ہی اور دنیا کے تمام کامیاب شخصوں میں ہے دیکھی گئی ہے۔ سرسید میں معمولی آدمیوں سے بہت بڑھ کر تھی۔ وہ مشکل سے مشکل کام کو۔ جب ضرورت سمجھ لیتے تھے۔ بغیر تردد اور تذبذب کے اُسکو فوراً کر بیٹھتے تھے اور جب کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر قی فیصلہ کر لیتے تھے پھر کبھی اُس میں پس و پیش نہ کرتے تھے۔ اس کے سوا اُن میں اور اکثر خصوصیتیں ہیں۔

تھیں جنکے بغیر کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا کام دنیا میں انجام نہیں پاسکتا جیسے متعدی خاکشی، فرائض کی پابندی، حُرُم و احتیاط وغیرہ وغیرہ۔

ایک اور خداداد قابلیت اُنکی فصاحت بیان تھی جس میں سچی ہمدردی کے جوش و کشش

اُس ضرورت کا احساس کر لیا کہ وہ ان سب کاموں میں ایک کو کرنے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید کبھی ایک کام پر ہاتھ ڈالتے تھے، کبھی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہوتے تھے، ایک ماہ میں انھوں نے اردو و کشمیری لکھنے کا ارادہ کیا، پھر اُسی زمانہ میں اردو لٹریچر کی تاریخ لکھنے کے لیے میٹرل جمع کیا، اُس سے پہلے وہ صوبہ شمال مغرب میں ایک عظیم الشان یتیم خانہ کی بنیاد ڈالنے والے تھے، انگریزی زبان سے علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ کرنے کے لئے انھوں نے بڑے بڑے سامان کئے تھے، اگرچہ یہ سب کام ادھورے رہے مگر ان باتوں سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جہاں قومی ضرورتیں ایک شخص کے سوا دوسروں کو محسوس نہیں ہوتیں وہاں ایک فرد کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ سرسید کی فطرت میں مختلف بلکہ متضاد کاموں کے کرنے کی قابلیت تھی جسکی نسبت مسٹر ارنلڈ نے سرسید کی وفات کے بعد اپنی ایسیج میں بمقام لاہور یہ الفاظ کہے تھے کہ ”دنیا میں بڑے آدمی اکثر گزرے ہیں مگر ان میں ایسے بہت کم نکلیں گے جن میں یہ صفت انگیز اوصاف اور لیاقتیں جمع ہوں۔ وہ (یعنی

سرسید) ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق، تعلیم کا حامی، قوم کا سوشل ریفارمر، پولیٹیشن، مصنف اور مضمون نگار تھا۔“

سے ہم چاہتے ہیں کہ بقدر ضرورت انکی چند نمایاں لیاقتوں کا اس عنوان کی ذیل میں جداول ذکر کریں۔

اگرچہ یہ ظاہر سرسید کے پولیٹکل ورکس میں چند تحریروں اور ایسیجوں کے سوا اور کچھ

نظر نہیں آتا مگر درحقیقت جیسا کہ انکی بائیوگرافی سے ثابت ہوتا ہے۔ شہدائے بعد جو کچھ

انھوں نے لکھا یا کیا اسکا بہت بڑا حصہ مسلمانوں کی پولیٹکل حالت کی اصلاح سے علاقہ رکھتا ہے۔

اس شخص نے نہ انگریزی تعلیم پائی تھی۔ جسکے بغیر انگریزی طرز حکومت کا ذہن نشین ہونا قریب ناممکن کے

تھا۔ اور نہ ملک میں کوئی نظیر کسی ایسے پولیٹیشن کی دیکھی تھی جسکی تقلید کچھ کام آتی، اور نہ گورنمنٹ کی

فی الحقیقت یہ بات کچھ کم تعجب انگیز نہیں ہے کہ جس شخص کو تعلیم و تربیت کے زمانہ میں اسکول کی ہوا تک نہ لگی ہو اور جسے چالیس برس کی عمر تک تعلیم میں کسی قسم کا تجربہ حاصل نہ کیا ہو وہ تعلیمی معاملات میں ایسا امتیاز پیدا کرے کہ علمی دنیا میں اسکو مسلمانوں کی تعلیم کا پروفٹ خیال کیا جائے۔ یا جس شخص نے ایک ایسی سوسائٹی میں ہوش سنبھالا ہو۔ جہاں دوسو برس سے کسی نے پالٹکس کا خواب تک نہ دیکھا تھا۔ وہ بغیر اسکے کہ کسی پولٹکل خدمت پر مامور رہا ہو انگلشن گورنمنٹ میں ایک رکن سلطنت خیال کیا جائے۔ یا جو شخص مذہبی تعلیم میں متوسط سے بھی کم درجہ رکھتا ہو اور جسے علوم جدیدہ کا ایک حرف کسی استاد سے نہ پڑھا ہو وہ مذہب اور سائنس میں مصاحت کرانے کا بیڑا اٹھائے اور اسلام میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈال جائے۔ اسی طرح اور مختلف لیاقتیں جو اس شخص کی ذات میں جمع تھیں انہیں سے ایک بھی ایسی نہیں معلوم ہوتی جو تعلیم یا اکتساب سے حاصل ہوئی ہو۔ اگرچہ سرسید کی تمام لیاقتوں کا اصل مخرج انکی غیر معمولی قابلیت اور استعداد تھی مگر اس قابلیت کو قوت سے فعل میں لانیوالی زمانہ کی ضرورتیں اور ان ضرورتوں کا پورا پورا احساس اور قوت میں ان ضرورتوں کے رفع کرنیوالوں کا قحط تھا جسے سرسید کو۔ اس معمار کی طرح جو تعمیر کے لیے آپ ہی اینٹیں پکائے، آپ ہی مصالح تیار کرے، آپ ہی پاڑا بندھے، آپ ہی ٹوکری ڈھونڈے، آپ ہی نقشہ بنائے اور آپ ہی عمارت چمکے۔ ایک سر و ہزار سودا کا مصداق بنا دیا تھا۔ دنیا میں عموماً کام کرنے والے لوگ الگ ہوتے ہیں اور سوچنے والے الگ، ایک مصنف مشکل سے ہماری وسنگتراشی کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے، عمدہ لکھنے والے اکثر عمدہ بولنے والے نہیں ہوتے، مذہبی تحقیقات میں مصروف رہنے والوں کو ملکی معاملات سے بہت کم لگاؤ ہوتا ہے، مگر جہاں سب چیزوں کی ضرورت ہو اور ایک کے سوا کوئی

اگرچہ اپنی جان کے بچنے کی بہت کم امید تھی مگر انگریزی تسلط کے جلد از سر نو قائم ہو جانے کا پورا یقین تھا۔ اُنکے ایک دوست جو اس وقت بجنور میں موجود تھے۔ اُنکا بیان ہے کہ ”میں اُس بد علی کے وقت۔ جبکہ تمام روہیلکھنڈ میں کوئی یوروپین یا یوریشین باقی نہ تھا۔ سید احمد خان ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ کم و بیش ایک سال بعد تمام ملک میں انگریزی تسلط بدستور قائم ہو جائیگا۔ اور گورنمنٹ کے بے شمار خیر خواہوں میں کسی کی چہرہ سے وہ اطمینان اور انتقال ظاہر نہیں ہوتا تھا جیسا سرسید کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا“ ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں کہ سرسید نے۔ جب کہ تمام ضلع بجنور میں نواب محمود خان کی دوہائی پھر رہی تھی۔ نواب کے سونہ پر صاف کہہ دیا تھا کہ انگریزی عملداری جانے والی نہیں ہے، آپ ملک گیری کا خیال دل سے نکال ڈالیں۔ اور جب کہ سرسید کا اثاثہ الیت اور کتابیں اور سب کچھ بجنور میں لٹ چکا تھا اور جانے لائے پڑے ہوئے تھے۔ وہ تاریخ سرکشی بجنور کے لئے نہایت اطمینان کے ساتھ ٹیبل جمع کرتے آتے تھے اور روزانہ تمام حالات قلمبند کرتے تھے اور تمام تحریریں جو کہ وہ نواب یا چودھریوں کو لکھتے تھے، حوالے پاس سے وصول ہوتی تھیں، یا وہ خود آپس میں ایک دوسرے کو بھیجتے تھے سب ہم پہنچا کر کتاب میں درج کرتے تھے، ایسا اطمینان۔ سوا اُس شخص کے جو ملکی معاملات میں پُرانا تجربہ کار یا جسکی رائے امور میں فطرۃً سلیم واقع ہوئی ہو۔ دوسرے کو ہرگز نہیں ہو سکتا۔

سرسید کی پوٹیکل قابلیت پر اس سے زیادہ اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ اُسے غدر کے بعد اینگلو انڈین اخباروں اور اینگلو انڈین افسرین کی عام رائے کے برخلاف اپنی کتاب باب بغاوت میں نہایت زور شور کے ساتھ اُس بات کی تردید کی کہ شہہ کا غدر ایک ملکی بغاوت تھی یا اسکی بنیاد برٹش حکومت کے خلاف کسی عام سلاش پر تھی؛ اور اس امر کے ثابت کرنے میں کامیاب ہوا۔

کسی ایسی خدمت پر مامور ہوا جہاں ملکی معاملات کا کچھ تجربہ حاصل ہوتا؛ باوجود اسکے اس نے اپنی مال اندیش اور سلیم طبیعت سے خود ہی اس مشکل کو حل کر لیا اور ایک ایسا پولیٹکل کورس اختیار کیا جو بالکل صحیح اور بے خطا تھا۔

وہ سلطنت مغلیہ کے ایک قدیم متوسل گھرانے کا ممبر تھا اور خود دار اخلاق کی خاک سے پیدا ہوا اور قلعہ معٹے کے سایہ میں نشوونما پائی؛ اسلئے یہ ایک نہ چرل بات تھی کہ فاتح قوم کی حکومت کو وہ ایک ناگواری کی نظر سے دیکھتا۔ مگر اسکی عقل اسکی طبیعت پر غالب تھی، اسلئے قومی تعصبات اسکو مغلوں نہیں کر سکے۔ اُس نے دیکھا کہ ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت کا اٹھ جانا کوئی اتفاقی یا غیر متوقع امر نہ تھا بلکہ فی حقیقتہ انہیں حکمرانی کی لیاقت باقی نہیں رہی تھی اور اُنکا دور پورا ہو چکا تھا اور اسلئے ضرور تھا کہ ہندوستان پر کوئی دوسری قوم حکمران ہو۔ اُس نے انگریزی طرز حکومت کو نہایت غور سے دیکھا اور اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ ہندوستان کے حق میں۔ جہاں مختلف مذہب اور مختلف نسل کا توہین آباد ہیں۔ اور خاص کر مسلمانوں کے حق میں۔ جو بتیس دانتوں میں زبان کی مانند ہیں۔ کہ قوم کی حکومت انگریزی حکومت سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ پس بجائے اسکے کہ اُس نے برٹش حکومت کو ناگوار کی نظر سے دیکھا ہو۔ اُسکو مسلمانوں کی حکومت کا نعم البدل سمجھا اور اسکی خیر خواہی کو ملک اور قوم خیر خواہی کا ایک سب سے عمدہ ذریعہ خیال کیا۔

وہ جس قدر انگلش قوم کی دشمنی اور شائستگی سے واقف تھا اُس سے زیادہ اسکی ملکی اور جنگی طاقت سے باخبر تھا۔ اسکو قدر کے نازک موقع پر جب کہ فی الواقع سلطنت کے ارکان متزلزل ہو گئے تھے اور بڑے بڑے سمجھدار آدمیوں کو یہ امید نہ رہی تھی کہ ہندوستان میں انگریزی تسلط پھر قائم ہوگا۔ اگرچہ

کتاب پر یہ ریا کرک کیا گیا تھا کہ ”ہمارے نزدیک سید احمد خان کی شکایتوں کا اثر بہت جلد اور بہت وسعت کے ساتھ ہوا ہے نسبت ان شکایتوں کے جو ال موہن گھوس اور اسکے اسکول کے نوجوان آدمی نہایت فصاحت کے ساتھ کرتے ہیں“ ایک اور ثبوت سرسید نے اپنی پوٹیکل قابلیت کا سہ ماہ میں اس وقت دیا جب کہ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب ”آرمانڈین مسلمانز“ نے ہندوستان سے لیکرا انگلستان تک تمام حکمران قوم کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے ہمیشہ کے لئے بدگمانی کا بیج بودیا تھا۔ وہ تیرہ برس سے برابر اس کوشش میں تھے کہ جو بے اصل شکوک و شبہات حکمران قوم کے دل میں مسلمانوں کی نسبت پیدا ہو گئے ہیں انکو رفع کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہوا انگریزوں اور مسلمانوں میں صفائی اور خلوص اور دوستانہ میل جول کو ترقی دیکھائے۔ مگر ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب ان غلط فہمیوں کو اور تقویت دینے والی اور گویا کہ سرسید کی تیرہ برس کی کوشش کو برباد کرنے والی تھی۔ اگرچہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ سرسید کو اس وقت کلچر، ابتدائی مشکلات کا سامنا تھا اور وہ رات دن اسی ادھیڑ بن میں مصروف رہتے تھے باوجود کہ کتاب مذکور کا شایع ہونا تھا کہ انھوں نے سب کام چھوڑ کر اسپر ریو لکھنا اور پاپو نیو مین اسکو ہونا شروع کیا۔ اس ریویو نے ڈاکٹر ہنٹر کی غلطیاں اور مسلمانوں کے مذہب سے انکی ناواقفیت انگریزوں میں پھیلانے شروع کی اور اس غلط خیال کو کہ اسلام بغاوت کی تعلیم دیتا ہے اور وہابی مسلمان غنٹ کے لئے خطرہ کی چیز ہیں انکے دل سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ اسنے اس غلط فہمی ہی کو دفع نہیں کیا بلکہ ضعیف بھی ثابت کر دیا کہ ایسی ناذک حالت میں۔ جیسی کہ اس وقت ہندوستان کی حالت تھی۔ ایسی تحریریں شایع کرنا۔ جو حاکم و محکوم میں تفرقہ ڈالنے والی، حاکموں کے غصہ کو مشتعل کرنے والی اور محکوم قوم کو مایوس کرنے والی ہوں۔ سراسر مصلح ملکی کے برخلاف ہیں۔ یہی وجہ تھی

کہ اس کشتی کا اصل باعث محض سپاہیوں کی عدول حکمی تھی جسے رفتہ رفتہ اُن عام غلط فہمیوں کے سبب جو گورنمنٹ کی نسبت ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ملکی بغاوت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اُسے جو اسباب ان غلط فہمیوں کے بتائے اُن پر پارلیمنٹ میں مدت تک مباحثے رہے اور آخر کار انہیں سے اکثر بالاتفاق تسلیم کئے گئے؛ یہاں تک کہ گورنمنٹ نے اُنکا فوراً تدارک کیا۔

سر سید نے اس کتاب میں گورنمنٹ پر نسبت منشیئل کانگریس کے کچھ کم نکتہ چینی نہیں کی مگر سر سید کی نکتہ چینی کئی باتوں میں کانگریس سے مختلف تھی۔ سر سید نے جو الزامات گورنمنٹ پر عائد کئے تھے اُنکی اطلاع گورنمنٹ آف انڈیا اور پارلیمنٹ کے سوا کسی تنفس کو نہیں ہوئی اور کانگریس نے جو الزام گورنمنٹ پر لگائے اُنکی تمام ملک میں منادی کی گئی۔ سر سید نے رعایا اور گورنمنٹ کی غلط فہمیاں دور کرنے میں کوشش کی اور کانگریس نے غلط فہمیوں کے پھیلانے میں۔ سر سید نے اُن باتوں کی خواہش کی جسے تمام ملک کا فائدہ تصور تھا اور کانگریس نے زیادہ تر اُن باتوں پر زور دیا جسے صرف تعلیم یافتہ جماعتوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہو۔ سر سید کی تمام خواہشوں میں گورنمنٹ اور رعایا دونوں کی مصالح ملحوظ رکھی گئی تھیں اور کانگریس کی اکثر خواہشیں گورنمنٹ کی مصالح ملکی کے برخلاف تھیں۔ اسی لئے سر سید کی اکثر شکایتوں کا۔ جو کہ اُسے بنفسی و احد اپنی طرف سے پیش کی تھیں فوراً تدارک کیا گیا اور کانگریس کو۔ باوجودیکہ وہ تمام ملک کی قائم مقامی کا دعوے کرتی ہو۔ آج تک ایک بات کے سوا جسکی بنیاد قانونی کونسل میں محض سر سید کی تحریک سے ۱۸۶۱ء میں پڑ چکی تھی کسی بات میں نمایان کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ چنانچہ اخبار سینٹ جیمس بچٹ میں سر سید کی

لکھی یہی لیجس لیٹو کونسل میں ہندوستانیوں کا جرنیل الکشن کے ممبر مقرر ہونا ۱۱

سرسید کا سب سے اخیر کام ملکی معاملات کے متعلق مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہونے سے روکنا تھا جس کا مفصل حال ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور جس کے اعادہ کی اب ضرورت نہیں ہے۔ مگر ہکوا انکی ایک لطیف تحریر دستیاب ہوئی ہے جو انھوں نے لندن میں ایک بڑے عالی مرتبہ انگریز کو کسی وقت لکھ کر بھیجی تھی اور جس سے ملکی معاملات کے متعلق انکی اصلی رائے ظاہر ہوتی ہے۔ اس چٹھی کے چند فقرے اس مقام پر نقل کرنے مناسب معلوم ہوتے ہیں جن سے سرسید کا ایک بہت بڑا سٹیٹسمن ہونا ثابت ہوتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ ”میں مسلمان ہوں، ہندوستان کا باشندہ ہوں اور عرب کی نسل سے ہوں؛ انھیں دو باتوں سے کہ میں عرب کی نسل سے ہوں اور مسلمان ہوں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب اور خون دونوں کے کاٹنے میں سچا ریڈیکل ہوں۔ اہل عرب اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ بجائے اسکے کہ وہ خود اپنے اوپر حکومت کریں۔ کوئی اور مت کرے۔ اس وقت تک اہل عرب آزاد ہیں اور اپنے مشائخ کے جھنڈوں کے نیچے رہتے ہیں۔ وہ سلطان ملکی ان نہیں کہتے بلکہ اپنے ویران اور پتھر پرے جزیرہ نمال کا خادم سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی آزادی کو تمام دنیا کی نعمتوں سے تہین۔ اونٹ چراتے ہیں، جو پر زندگی بسر کرتے ہیں، اونٹنیوں کا دودھ پیتے ہیں اور اپنی ارادی میں خوش رہتے ہیں۔“

”ابھی تک میری رگوں میں عرب کا خون گردش کرتا ہے اور پھر میرا مذہب یعنی اسلام۔ چسپڑے چھپوراوا اور پکا یقین ہے۔ وہ بھی ریڈیکل اصولوں کو سکھاتا ہے اور شخصی گورنمنٹ سے موافق نہیں اور نہ رستم تازی کی کمان سے بلکہ موروثی حکومت ناپسند کرتا ہے۔ ایک پریزیڈنٹ جس کو لوگ منتخب کریں اس کو اسلام پسند کرتا ہے اور اس بات کے پسند نہیں کرتا کہ دولت ایک جگہ اکٹھی رہے۔ اسی اصول کے موافق اسلام کیانی نے یقاعہ بنایا کہ یہ تخت ہوتا ہے“

کہ سرسید کا ریویو نہ نکلنے کے بعد ڈاکٹر ہنٹ نے اس مضمون کے متعلق پھر سانس تک نہیں نکالی اور انگریزی اخباروں نے بجائے اسکے کہ سرسید کی تردید کرتے۔ نہایت شد و مد کے ساتھ انکی تائید کی اور اسے چینی کی حالت میں۔ جو حکمران گروہ میں عموماً پھیلی ہوئی تھی۔ سرسید کے ریویو کو کلکنا نہایت غنیمت سمجھا گیا۔

اگرچہ سرسید کی مذکورہ بالا تحریروں سے ملک و رقوم اور خود گورنمنٹ کے حق میں بہت عمدہ نتائج پیدا ہوئے لیکن انکی اعلیٰ درجہ کی پولٹکل قابلیت کا بھید درحقیقت اینگلو اور نیٹل کالج میں چھپا ہوا ہے۔ اگر کوئی اصلی چیز مسلمانوں کو پولٹکل بے وقعتی سے نکالنے والی اور گورنمنٹ میں انکا اعتبار زیادہ کرنے والی اور گورنمنٹ کو ہندوستان کی چھ کرور رعایا کی طرف سے مطمئن کرنے والی ہو سکتی ہے تو وہ یہی محمدن کالج ہو سکتا ہے۔ اسی لیے سرسید کی وفات پر پاپویر نے لکھا تھا کہ ”سرسید احمد خان۔ جو ایک دور اندیش مدبر ہونے کی وجہ سے تعلیم کا نہایت سرگرم حامی تھا۔ اسکے انتقال کے ساتھ

اس نہایت مفید، بار آور اور نہایت زبردست پولٹکل طاقت کا خاتمہ ہو گیا جس نے موجودہ صدی کے اخیر ربع میں

ہندوستان کی اسلامی دنیا کو متحرک کر دیا تھا“ اور اسی بنا پر لندن کے بڑے بڑے نامور اخباروں نے انکی

وفات کو ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی پولٹکل طاقت کے زوال سے تعبیر کیا ہے

اور اسی وجہ سے مسٹر کین ممبر پارلیمنٹ نے کالج کی نسبت یہ ریمارک کیا تھا کہ ”وہ ایک خالص تعلیمی جوش و

نسبت زیادہ تر ایک پولٹکل جوش پھیلانے والا ہے“ اور اسی واسطے سر آکلنڈ کالون نے اپنی ایسیج میں اس

تذبیروں کی نسبت۔ جو سرسید نے رسالہ اسباب بغاوت میں رعایا اور گورنمنٹ کی غلط فہمیاں رفع کرنی

کے لئے بتائی تھیں۔ یہ الفاظ کہے تھے کہ ”انہیں خیالات سے ہمارے ہندوستان کے انتظامی مسائل حل ہونگے

اور انہیں خیالات کی دوسری صورت میں لکھ کر رکھی ہیں“

کسی شخص کے اُسکی جائیداد بہت آرمیوں میں تقسیم ہو جاوے کیونکہ کتنی ہی زیادہ جائیداد کیوں نہ ہو وہ بعد و نسلوں کے یقیناً بہت سے حصوں میں تقسیم ہو جاوے گی۔ پس میں دو طرح کیا بلحاظ مذہب اور کیا بلحاظ خون کے ریڈیکل ہوں۔

”لیکن ہمارا مذہب جسے یہ خیالات آزادی کے میرے دل میں پیدا کیے۔ اُسے اور باتیں بھی سکھائی ہیں؛ ایک یہ کہ اگر خدا کے حکم سے ہم کسی ایسی قوم سے مفتوح ہو جائیں۔ جو کہ ہم کو نہ ہی آزادی دیتی ہو، انصاف ہم پر حکمرانی کرتی ہو، ملک میں امن قائم رکھتی ہو اور ہماری جان اور مال کو محفوظ رکھتی ہو۔ جیسا کہ انگریزی سلطنت ہندوستان میں کرتی ہو۔ تو اُس حالت میں ہم کو اُسکا تابع دار اور خیر خواہ رہنا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ وہ ریڈیکل اصول جو ہم نے اپنے باپ دادا اور اپنے مذہب سے لے کر اپنے آپ کو صرف اسی حالت میں عمل کرنا چاہئے جب کہ زمانہ کی حالت اُنکے عمل میں لانے کے موافق ہو نہ کہ اُس حالت میں جب کہ زمانہ کے حالات اُنکے موافق نہ ہوں؛ مثلاً جب کہ اُنکے اختیار کرنے سے ملک کے اندرونی امن یا گورنمنٹ کے قائم رہنے میں فرق آوے یا اُسکو کمزور اور ضعیف کر دے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ہر ایک قوم اور ہر ایک خیال کے لوگ خواہ وہ کنسرٹو ہوں، خواہ لبرل اور خواہ ریڈیکل۔ سب اس اصول کو قبول کرینگے۔“

یہی خیالات جو اس تحریر میں درج ہیں سرسید نے کانگریس کی مخالفت کرنے سے پہلے ہی ممبری کو نسل کے زمانہ میں لارڈ پین کے سامنے اپنی اسپیچ میں۔ جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہوا اُس وقت ظاہر کئے تھے جبکہ کونسل میں سلفٹ گورنمنٹ کے قانون کا مسودہ پیش تھا۔ اُس ایجنڈے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ رپریزنٹیٹو اصول کو اسی حالت میں پسند کرتے تھے جبکہ اُسکے جاری کرنے سے ملک میں سوشل اور پولیٹیکل خطرات کے پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ پس جو لوگ اُنکی پچھلی تحریروں کو حال کی تحریروں کے خلاف سمجھتے ہیں یہ اُنکی سمجھ کی غلطی ہو۔ ہاں آئین شک نہیں کہ ہندوستان میں قومی اختلافات کا خیال زیادہ تر اُنکا اُس وقت پیدا ہوا جبکہ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کے خلاف شمال مغرب کے

منجملہ انھیں سزاؤں کی ایک بھی سزا ہو کہ وہ اپنی اور اسکے متعلق اضلاع میں پنجابی انتظام کیا گیا اور یہ قانونی ملک بنا دیا گیا۔
اسکے بعد وہ سفر نامہ میں لکھتے ہیں کہ ”حقیقت میں اب وہ زمانہ نہیں ہا جس میں ڈسپاٹک گورنمنٹ کو لوگ پسند کرتے تھے اور نہ اب وہ بھلائیوں ہیں جو ہزاروں برائیوں کے ساتھ اگلے زمانہ کی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ملی ہوئی تھیں اور جنہیں اُن برائیوں کا علاج ہوتا تھا۔ جو رگن کے جرح و مرہم نہ تھے۔ اب اُنکا ہونا کسی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ممکن نہیں ہے۔ وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستان میں بجای کانسٹیوٹنشل گورنمنٹ کے ڈسپاٹک گورنمنٹ جیسی قدیم سے تھی۔ زیادہ تر مفید ہوگی وہ نہایت غلطی میں ہیں۔“

لیکن آخر کار اُنکو یقین ہو گیا کہ جب تک مثل انگلستان کے ہندوستان کی تمام قومیں ملکر ایک نہ پنجاب میں جو قریب ناممکن کے ہے۔ اسوقت تک ایک خالص کانسٹیوٹنشل گورنمنٹ ہندوستان کی ملت کے مناسب ہرگز نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جو ایسیچ اُنھوں نے قانون سلف گورنمنٹ پر لارڈ رپن کے مدین کی تھی اُس میں اُنھوں نے نہایت مدلل طور پر اس مطلب کو بیان کیا تھا اور اصل مقصد اُس ایسیچ بسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ یہ تھا کہ تمام ہندوستان کے لوکل بورڈوں میں ووٹنگ ممبر انکشن سی اور ملت نوٹیشن سے مقرر کیے جائیں کیونکہ لارڈ رپن اضلاع متوسطہ کے سوا باقی صوبوں میں کل ممبران سے مقرر کرنا چاہتے تھے مگر آخر کار جیسی کہ سرسید کی رائے تھی وہی قاعدہ تمام صوبیات کے لئے مقرر کیا گیا جو اضلاع متوسطہ کے لئے قرار پایا تھا اور اسی قاعدہ کی بدولت تمام بورڈوں میں کم و بیش مسلمان ممبروں کی صورت آج تک دکھائی دیتی ہے ورنہ خاص خاص مقامات کے سوا کسی بورڈ کی ممبری پر اُنکی شکل نظر نہ آتی۔

اگرچہ اکثر اسٹنٹی اور نصفی کے لئے پنجاب میں مقابلہ کا امتحان نیشنل کانگریس کے قائم ہونے سے پہلے

ہجران غاصب شخصوں کے۔ جب کلام اس وقت میں بنا ہوا تھا۔ اور کون پسند کر سکتا ہو۔“

سرسید کی یہ باتیں صرف زبانی ہی نہ تھیں بلکہ غدر کے بعد انھوں نے اس بات کا عملی ثبوت بھی دیا تھا کہ جہاں انتظام ملک کا مدار قانون پر نہیں بلکہ زیادہ تر حکام کی زبان پر ہو وہاں رہنا وہ ہرگز پسند نہ کرتے تھے؛ کیونکہ غدر کے بعد جبکہ قسمت دہلی ضویہ شمال مغرب سے نکال کر ضویہ پنجاب کے ساتھ ملحق کی گئی۔ انھوں نے دہلی کی سکونت فوراً ترک کر دی اور اپنے تمام بڑے بڑے کاموں کا مرکز علیگر ٹھکانہ قرار دیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۶۶ء میں جب کہ سر ڈونلڈ مکلوڈ صاحب لفٹنٹ گورنر ضویہ پنجاب نے دہلی میں دربار کیا۔ حسین سرسید کو بھی علیگر ٹھکانہ سے بلایا گیا تھا۔ تو سرسید سے پرائیوٹ ملاقات کے وقت صاحب ممدوح نے اس بات کی سخت شکایت کی کہ تھے سائنٹفک سوسائٹی علیگر ٹھکانہ میں جا کر قائم کی اور اپنے قدیم وطن دہلی کو اس کے فوائد سے محروم رکھا۔ سرسید نے کہا کہ میں پنجاب گورنمنٹ کو یہی کہہ رہا ہوں۔ اب ہو۔ ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ کا نمونہ بھتا ہوں اور اسی لئے جب سے کہ قسمت دہلی پنجاب میں شامل کی گئی میں دہلی میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ اسی کے قریب قریب انھوں نے ۱۹۰۰ء میں ڈی فٹز پیٹرک صاحب جو دہلی میں ڈپٹی کمشنر رہ چکے تھے اور آخر کو پنجاب کے لفٹنٹ ہوئے۔ انگلستان جاتے ہوئے جہاز میں تقریر کی تھی جس کا ذکر انھوں نے اپنے سفر نامہ میں کیا۔

وہ لکھتے ہیں کہ ”ایک دن پنجاب کا انتظام کی بھلائی برائی کا ذکر کیا، میں نے کہا ہاں ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ ہو اور بلاشبہ سکھوں کی عملداری سے ہزاروں جہت رہے؛ لیکن شاید پنجاب کے لوگ اس سے خوش ہوں کیونکہ انکو آگ (یعنی سکھوں کی عملداری) میں سے نکال کر صوبہ میں بٹھایا ہو؛ مگر ہم لوگ اس کو پسند نہیں کرتے۔۔۔۔۔ جہاں تک مجھ کو معلوم ہو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ غدر میں جہاں اور نہلا میں اہل دہلی اور اس کے متعلق اضلاع کو دی گئیں

اسکو تبدیل نہیں کر سکتے تو کم سے کم اسکی تبدیلی کی خواہش اُنکے دل میں ضرور ہوتی ہو۔ ہندوستان کی موجودہ گورنمنٹ ظاہر ہو کہ نہ رپبلک ہے اور نہ پارلیمنٹری اور اسلئے اسکو بجز ایک شایستہ اور مہذب مائزگی ہونے کے۔ جو ملک میں امن، کھانا اور رعایا کے حقوق کو انصاف اور نیکی کی نئی فصل کرنا چاہتی ہے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ پس ایک ایسی گورنمنٹ کی پالیسی کے برخلاف۔ جیسی کہ ہندوستان کی گورنمنٹ ہے۔ اگر کوئی ایجنیشن پھیلا دیا جائے اور اُنہیں کامیابی نہ تو غور کرنا چاہیئے کہ رعایا کا خیال کس طرف مائل ہوگا؟ کیا انکا خیال اس طرف مائل ہوگا کہ کونسل تبدیل ہو جائے یا موجودہ گورنر جنرل کی جگہ کوئی دوسرا گورنر جنرل بھیجا جائے؟ ہرگز نہیں بلکہ خود گورنمنٹ سے ناراضی کا پھیلنا اُسکا نتیجہ ہوگا۔ اگرچہ ناراضی پھیلانے والے گورنمنٹ کے تبدیل کرنے پر کچھ قابو نہ رکھتے ہوں مگر گورنمنٹ سے ناراضی کا پھیلنا خود گورنمنٹ کے لئے، ملک کے لیے اور رعایا کے لئے شدید نقصان کا باعث ہوتا ہو۔

سر سید ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ”سلطنت شخصی ہو یا جمہوری، ایک امر میں دو تو کا اصول ایڈمنسٹریشن ہوتا ہو، اور وہ یہ ہو کہ اپنی گورنمنٹ کی طرح ہو سکے قائم اور مضبوط رکھنا سب سے مقدم اور سب سے بڑا انصاف ہے اور اسے رعایا کے واجبی حقوق کی حفاظت کرنا ہو۔ پہلے امر کے متعلق ایک مہذب سلطنت یا سلطنت جمہوری بھی دہی کرتی ہے۔ مگر مہذب سلطنت یا شخصی سلطنت کرتی ہے؛ کوئی نظریہ دنیا میں ایسی نہیں ہے کہ ایسے وقت میں ایک مہذب یا جمہوری سلطنت وہ نہ کیا ہو بلکہ ایک نام مہذب یا شخصی سلطنت نے کیا ہو۔“

اُنکا قول تھا کہ اُن بادشاہوں میں سے جو ظالم کہلاتے ہیں دو ایک کے سوا۔ جو حقیقت میں تھے۔ کسی بادشاہ نے ظلم کرنے کے ارادہ سے ظلم نہیں کیا؛ بلکہ صرف اس خیال سے کیا کہ ویسا کئے بغیر اُنکی حکومت قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ ان یہ ممکن ہے کہ اُنکے اس خیال اور اندازہ میں غلطی ہو۔

جاری ہو چکا تھا اور جس وقت سرسید نے کانگریس کے خلاف لکھنؤ میں ایسیج دی اس وقت جو نتائج اس قاعدہ سے مسلمانوں کے حق میں مترتب ہونے والے تھے وہ ظہور میں نہیں آئے تھے مگر سرسید نے اسی وقت اس نقصان کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا جو اس قاعدہ سے مسلمانوں کو پہنچنے والا تھا۔ چنانچہ بجا میں۔ باوجودیکہ وہاں مسلمانوں کی تعداد ہندو قوموں سے بہت زیادہ ہے۔ ۱۳۳۰ء سے ۱۹۳۰ء تک اس سٹنٹی میں منجملہ ۲۵ کے صرف سات مسلمان کامیاب ہوئے اور نصفی میں منجملہ ۲۷ کے ایک مسلمان بھی کامیاب نہیں ہوا۔ اور اگر وہ نو عمر دن کا مارٹن مقابلہ کے امتحان پر ہوتا اور کچھ عرصے نو منیشن کے ذریعہ سے مقرر نہ کئے جاتے تو نصفوں میں اب تک شاید ہی کوئی مسلمان نظر آتا اور اس سٹنٹی پر بھی خال خال مسلمان رہ جاتے۔ علیٰ ہذا القیاس وایسری کی قانونی کونسل میں اگر نو منیشن کا اختیار گورنمنٹ اپنے ہاتھ نہ رکھتی تو ایک مسلمان کو بھی کونسل کی شغل دیکھنی نصیب نہ ہوتی۔ اسی قسم کے خیالات تھے جنکی وجہ سے سرسید نے مسلمانوں کو نیشنل کانگریس میں شریک ہونے سے روکا اور اسی لئے انھوں نے قانون سلف گورنمنٹ کے مسودہ پر اپنی ایسیج میں کہا تھا کہ جب تک ہندوستان کی حالت مثل انگلستان کے نہ ہو جہاں عیسائیوں کو یہودیوں کی نسبت ووٹ دینے میں کچھ تامل نہیں ہوتا۔ اس وقت تک انگلستان سے ربرزنٹیٹو سٹینڈیشن کا اصول مستعار لینے میں بڑے بڑے مشکلات کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ پولکل ایجیڈیشن کی نسبت سرسید کی یہ رائے تھی کہ اس کے بد اثر سے کوئی گورنمنٹ خواہ وہ ریپبلک ہو یا پارلیمنٹری اور یا مانر کی۔ محفوظ نہیں رہ سکتی ریپبلک گورنمنٹ میں اس کا لازمی نتیجہ بشرطیکہ ایجیڈیشن کو پوری قوت حاصل ہو جائے پریزیڈنٹ کی تبدیلی ہو اور پارلیمنٹری گورنمنٹ میں وزرا کی تبدیلی اور اگر وہ گورنمنٹ مانر کی ہو تو اس کا اثر سیدھا گورنمنٹ تک پہنچتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایجیڈیشن کیسے

اور کیا وہ جماعت کثیر جو ہر بات میں انکی مخالفت کرتے تھے، سب بالاتفاق منشیل کانگریس سے صرف اس بنا پر علمی و اختیاری کی کہ سید احمد خان کے نزدیک انکا ایمین شریک ہونا مناسب تھا اور لکھو کھا مسلمانوں نے ان کاغذوں پر انکھین بند کر کے دستخط کر دیے جو پیٹریاٹک ایسوسی ایشن نے اس بات کی اظہار کے لیے ولایت بھیجے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہیں۔

سرسید نے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کی غرض سے جو غیر معمولی کوششیں کی ہیں انکی تفصیل پہلے اور دوسرے حصہ میں کافی طور پر بیان ہو چکی ہے۔ یہاں ہم صرف ان بڑی بڑی باتوں کی طرف اشارہ کریں گے جن سے تعلیمی معاملات میں انکی عالی دماغی، حسن تدبیر اور اصول اشاعت تعلیم سے ایک قدرتی مناسبت پائی جاتی ہے۔

تعلیم کے مسئلہ پر کبھی نظام تعلیم (ایجوکیشنل سسٹم) کے کاغذ سے اور کبھی طریقہ تعلیم کے سے اور کبھی دیگر حیثیتوں سے بحث کی جاتی ہے مگر سب سے مقدم اور اہم مقام بالشان حیثیت سے تمام حیثیتیں متفرع ہوتی ہیں۔ یہ ہے کہ کسی قوم میں ایک اجنبی اور غیر مانوس تعلیم جاری کیا سبیل ہے؟

جو قوم ہزار برس سے زیادہ عرصہ سے ایک ایسی تعلیم کی پابند چلی آتی ہو جس میں عقلی اور نقلی دونوں تعلیموں نے مل جل کر ایک مقدس مذہبی تعلیم کی بلکہ خود مذہب کی شکل اختیار کر لی ہو۔ اس قوم میں ایک نئی قسم کی تعلیم کا جاری کرنا جو مضامین تعلیم اور ذریعہ تعلیم دونوں کے کاغذ سے بالکل وپری اور غیر مانوس ہو۔ بعینہ ایسا ہے جیسے کسی قوم میں جو اپنے مذہب کی سخت پابند ہو۔ ایک نئے مذہب کو جاری کرنا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۸۳۵ء میں جب گورنمنٹ نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم جاری کرنی چاہی

انکی رائے تھی کہ گورنمنٹ کا اچھا برا ہونا درحقیقت کوئی اصل چیز نہیں ہے بلکہ اصل چیز رعایا کا
 بُرا یا اچھا ہونا ہے۔ اگر رعایا اچھی اور شایستہ ہے تو گورنمنٹ کو خواہ مخواہ شایستہ بننا پڑتا ہے اور اگر
 رعایا شایستہ نہیں ہے تو گورنمنٹ کو بھی ویسا ہی بننا پڑتا ہے۔ اسی لئے مسلمانوں کو انکی برتری نصیحت
 یہی تھی کہ اگر انگریزی حکومت میں عزت سے رہنا چاہتے ہیں تو تعلیم اور سولیزیشن میں ترقی کریں
 اور عزت حاصل کرنے سے پہلے اسکا استحقاق پیدا کریں۔

انکی نہایت پختہ رائے تھی کہ ہندوستان کے لئے انگلش گورنمنٹ سے بہتر گو کہ انہیں کچھ نقص بھی
 ہوں کوئی گورنمنٹ نہیں ہو سکتی اور اگر امن و امان کے ساتھ ہندوستان کچھ ترقی کر سکتا ہے تو انگلش
 گورنمنٹ ہی کے ماتحت رہ کر کر سکتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ”گو ہندوستان کی حکومت کرنے میں انگریزوں
 کو متعدد روائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت نہ انھوں نے یہاں کی حکومت بے زور حاصل کی اور نہ مکرو فریب سے۔“
 بلکہ درحقیقت ہندوستان کو کسی حاکم کی اس کے اصلی معنوں میں ضرورت تھی سو اسی ضرورت نے ہندوستان کا حکام ہند

انھوں نے کئی موقعوں پر یہ ظاہر کیا ہے کہ ”میں ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ کا استحکام کچھ نا

کی محبت اور انکی ہوا خواہی کی نظر سے نہیں جانتا بلکہ صرف اسلئے جانتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خیر

استحکام میں سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک گروہ اپنی حالت سے نکل سکتے ہیں تو انگلش گورنمنٹ ہی کی بدولت نکل سکتے ہیں۔

اگرچہ سرسید کو مسلمانوں نے عموماً اپنا مذہبی پیشوا نہیں مانا لیکن شاید ہندوستان میں ایسا

ایک مسلمان بھی نہ ہوگا جو ملکی معاملات میں انکو قوم کا لیڈر نہ سمجھتا ہو اور اسکا بڑا ثبوت یہ ہے کہ

سرسید کی ایک آواز پر سپہ مشنارے، حدود و چند ہندوستان کے تمام مسلمان کیاستی، کیا شیعہ

کیا وہابی، کیا غیر وہابی، کیا پڑھے لکھے اور کیا آن پڑھ، کیا وہ لوگ جو انکی پارٹی میں گئے جاتے تھے

اگر ۱۸۵۷ء تک تمام ہندوستان میں مسلمان گریجوٹس کی تعداد بمقابلہ ہندو گریجوٹس کے مشکل سے اتنی ہوگی جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے۔

سر سید کو ۱۸۵۷ء میں جبکہ وہ بجنور سے مراد آباد بد لکھ گئے۔ تعلیم کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا۔ اس زمانہ سے لیکر اس وقت تک جبکہ کلچ نے نمایان ترقی کر لی۔ اُنکے تمام کاموں میں جو تعلیم و تعلق انھوں نے انجام دئے ایک خاص ترتیب پائی جاتی ہے جس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے ابتدا ہی میں وہ تمام مشکلات جو وقتاً فوقتاً پیش آنے والی تھیں اور ہر ایک مشکل کے ساتھ اسکا حل۔ بخوبی ذہن نشین کر لیا تھا۔ سب سے پہلے اُنکو تعلیمی معاملات پر غور کرنا اور تعلیم کے متعلق کسی قدر تجربہ حاصل کرنا ضروری تھا؛ چنانچہ انھوں نے اول اسی غرض سے دو اسکول یہلک چندو سے قائم کئے جسے لوگوں کی اُس دھچپی کا۔ جو اُنکو بہ نسبت سرکاری مدرسوں کے اپنے اسکولوں کے ساتھ بالطبع زیادہ ہوتی ہے۔ بخوبی اندازہ ہو گیا اور اس بات کا یقین ہو گیا کہ اگر مسلمانوں کو کچھ دھچپی ہو سکتی ہے تو خاص کر اُسی کلچ سے ہو سکتی ہے جو قومی چندہ قائم کیا جائے۔ اسکے بعد سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور یہ خیال کیا کہ شمالی ہندوستان کے باشندے۔ کیا ہندو اور کیا مسلمان۔ انگلش لٹریچر اور مغربی علوم کی حقیقت سے محض ناواقف ہیں؛ پس تا وقتیکہ

۱۸۵۷ء میں جب کہ سر سید پہلے ہی بار چندہ کے لئے لاہور گئے ہیں اس وقت انھوں نے راقم کے سامنے نابو نو بین چندر سے ایک سوال جواب پیش کیا تھا کہ صرف اس خیال سے کہ یہ کلچ خاص مسلمانوں کے لئے انھیں کے روپے سے قائم کیا جاتا ہے ایک طرف تو مسلمانوں میں اور دوسری طرف اُنکی ریس سے ہندوؤں میں تو قریب سے زیادہ جوش پیدا ہو گیا ہو۔ اور پھر خان بہادر برکت علی خان سے پوچھا کہ کیوں حضرت اگر یہ قومی کلچ نہوتا تو آپ ہماری مدارات اسی جوش و شجاعت کے ساتھ کرتے انھوں نے صاف کہہ دیا کہ ہرگز نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سر سید اپنے کام کے شروع ہی میں اس قومی فیلنگ سے بخوبی واقف تھے ۱۲

تو مسلمانوں کے ایک جم غفیر نے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ بذریعہ عرضداشت کے شہکایت پیش کی کہ گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر اس قدر توجہ کرنا صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اسکا ارادہ ہندوستان کو عیسائی بنانے کا ہے۔ برخلاف اسکے ہندوؤں نے اس واقعہ سے گیارہ برس پہلے جب کہ گورنمنٹ نے اُنکے لئے سنسکرت کلچ قائم کرنا چاہا تو اُس سے ناراضی ظاہر کی اور انگریزی کلچ قائم کرنے کے لئے گورنمنٹ سے اصرار کیا: کیونکہ اول تو اُنکے ہاں مذہبی تعلیم صرف برہمنوں کے خاص خاص افراد میں محدود تھی اور باقی تمام ہندو قوم میں مسلمانوں کے عہد میں دنیوی ضروریات کے لیے ایک غیر قوم کی زبان سیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ دوسرے۔ جیسا کہ سر جان اسٹریچی نے اپنی کتاب انڈیا میں لکھا ہے۔ نہ ہندو مذہبی تعلیم کے خواہش مند تھے اور نہ اُنکا مذہب ایسا تھا جسکی تعلیم ہو سکے۔ بہر حال مسلمانوں میں مغربی تعلیم کا جاری کرنا ایک نہایت مشکل کام قریب ناممکن سمجھا۔

پنچانوشتہ ۱۸۵۷ء سے۔ جبکہ کورٹ آف ڈائریکٹرز کے ایک نامور ممبر چارلس گرانٹ نے ہندوستان تعلیم پھیلانے کی صلاح دی تھی۔ اُس وقت تک۔ جبکہ ۱۸۶۰ء میں سر سید نے کیٹی خواستگار تر مسلمانان قائم کی۔ گورنمنٹ کی تمام تدبیریں اور تمام کوششیں۔ جو ہندوستان میں بغرض تعلیم کی گئیں۔ مسلمانوں کے حق میں بے سود ثابت ہوئیں۔ علاوہ طرح طرح کی ترغیبات کی طرف سے تعلیم کی اشاعت کے لئے وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھیں خاص مسلمانوں کے چند معقول اوقاف گورنمنٹ کے ہاتھ میں تھے جنکو وقف کرنے والوں نے تعلیم کے لئے مخصوص کیا تھا۔ جیسو بنگال میں جسن فند اور ضلع شمال مغرب میں نواب فند۔ مگر اُن سے بھی زیادہ ترغیب قومین مستفید ہوتی رہیں۔ باوجودیکہ ۱۸۵۷ء میں ہائی ایجوکیشن کے لئے کلکتہ بمبئی اور دہلی میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں

تعلقہ دارون سے گھرا ہوا تھا جنہیں سے بعض کالج کمیٹی کے ممبر بھی تھے اور ایک ایسے کام کی طرف سے جسکو بہت سے ذی وجاہت مسلمان ملکر کرنا چاہتے تھے اور جس میں مذہبی تعلیم بھی شامل تھی۔ گورنمنٹ کو مطمئن کرنا سب سے مقدم تھا۔ جس قطعہ زمین پر کالج کی نیورکھنی منظور تھی وہ نزولی زمین تھی جہاں ایک زمانہ میں سرکاری چھاؤنی رہ چکی تھی اور اکثر حکام اور افسرین چاہتے تھے کہ وہ زمین مسلمانوں کو دی جائے۔ مسلمان جنگی اولاد کی تعلیم کے لئے کالج قائم کیا جاتا تھا وہ تعلیم کے خرچ سے زیادہ کسی خرچ کو فضول اور بیکار نہیں سمجھتے تھے۔ اور سب سے زیادہ اس بات کا خیال تھا کہ کالج کی وقعت پبلک اور گورنمنٹ کی نظر میں جہاں تک ہو سکے جلد پیدا کی جائے؛ کیونکہ بڑا منصوبہ سرسید نے اُس کے لئے اپنے دل میں باندھ رکھا تھا وہ بظاہر ان کی زندگی میں پورا ہوتا نظر نہ آتا تھا اور مسلمانوں میں کسی سے یہ امید نہ تھی کہ سرسید کے بعد کالج کی وقعت اور اُس کا ایک انچھ آگے بڑھا سکے۔

سرسید نے ان تمام مشکلات کا مقابلہ کیا اور سب پر غالب آئے چندہ توقع بلکہ وہم و گمان یادہ وصول کر لیا۔ گورنمنٹ کو کالج کی طرف سے مطمئن ہی نہیں کیا بلکہ اُس کا مرنی اور سر پر بنادیا۔ کالج کے لئے وہی زمین جس کا ملنا قریب ناممکن کے ہو گیا تھا۔ گورنمنٹ سے اصل کی۔ مسلمانوں کو تعلیم میں اپنے بونے اور طاقت سے بڑھکر خرچ کرنا سکھا دیا یہاں تک کہ وہ ولایت کی تعلیم کے مصارف بہ کشادہ پیشانی برداشت کرنے لگے۔ کالج کی عالیشان عمارتوں اور عمدہ اسٹاف اور بورڈنگ ہوس کے انتظام سے اس کی وقعت بہت جلد پبلک اور گورنمنٹ کی نظر میں پیدا کر دی۔ الغرض جو کچھ سرسید نے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق پچیس برس کے

ویسی زبان کے ذریعہ سے انہیں یورپین سائنس اور لٹریچر کا مذاق پیدا نہ کیا جائے اس وقت تک
 انگریزی تعلیم کا ذوق و شوق انہیں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسی مقصد کے لئے انہوں نے علاوہ کتابوں
 کے ترجمہ کرانے کے سوسائٹی سے ایک اخبار نکالا جس میں بے شمار علمی اور لٹریچر مضامین انگریزی سے
 اردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئے اور جس نے فی الواقع اردو لٹریچر کا رخ دوسری طرف پھیر دیا اور انگلش
 لٹریچر کی عظمت ہزاروں کدلیں میں جو سلیم لطیف تھے۔ تہ نشین کر دی۔ پھر زیادہ تجربہ اور زیادہ
 بصیرت حاصل کرنے کے لئے انہوں نے ولایت کا سفر اختیار کیا اور وہاں پہنچ کر کیمبرج یونیورسٹی
 اور اسکے تمام انتظامات کو خود جا کر دیکھا اور اسکے مقابلہ میں جو نقص ہندوستان کی یونیورسٹیوں
 میں محسوس ہوئے ان پر ایک پیفلٹ لکھ کر انگلستان ہی میں شائع کیا؛ کیونکہ سرسید کا اصل مقصد
 جو پورا نہ ہو سکا۔ ہندوستان میں واپس آکر ایک محمدی یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا اور اس لیے ضرور
 تھا کہ ہندوستان کے نظام تعلیم میں جو نقص تھے ان کو ظاہر کیا جائے تاکہ ہندوستان میں ایک
 یونیورسٹی قائم کرنے کی ضرورت ثابت ہو۔ پھر ہندوستان میں پہنچتے ہی انہوں نے ایک طرف
 کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم کی جسکی تحقیقات سے ثابت ہو گیا کہ سرکاری کالجوں اور
 اسکولوں سے مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتیں رفع نہیں ہو سکتیں؛ اور دوسری طرف مسلمانوں کو
 جگانے کے لئے ایک ماہواری رسالہ جاری کیا جسے چند روز میں ایک مردہ قوم میں حرکت پیدا کر دی۔
 جب کلچ قائم کرنے کا ارادہ ہوا اس وقت انکو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا تھا۔ اولاً مسلمانوں
 سے جو قومی چندون کے مفہوم سے ناواقف اور تعلیم سے متنفر ملک اسکے مخالف تھے۔ چندہ وصول
 کرنا تھا۔ پھر جو موقع کلچ کے لئے تجویز کیا گیا تھا وہ چند ضلع کے بارع مسلمان یونیون اور

اُسوقت سے وہ اپنی بہر ایک تحریر میں ورنیکلز زبانوں کے ذریعہ سے علوم کی تعلیم دینے پر سخت اعتراض کرتے تھے اور انگلش ہائی ایجوکیشن کے موقوف کرنے کو ملک کے حق میں نہایت مضرت بتاتے تھے۔

جس زمانہ میں سر سید نے سوسائٹی قائم کی اُسوقت اُدھر تو مسلمان انگریزی کے نام سے کون اور بھاگتے تھے اور اُدھر انگریزی تعلیم کی ضرورت کا لوگوں کو یقین دلانا مشکل تھا کیونکہ تمام عدالتوں میں ویسی زبان مروج تھی، اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ کے لئے جو اُسوقت تک ہندوستانیوں کو مل سکتا تھا خاصا کہ شمالی ہندوستان میں مشرقی زبانوں کی تعلیم کافی تھی، کمپنی کی عملداری کو گئے ہوئے چند روز گزرے تھے اور ہندوستانیوں کو عملی طور پر اس بات کا یقین نہیں دلایا گیا تھا کہ وہ اعلیٰ اعلیٰ ملکی عہدوں میں حکمران قوم کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں پھر جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ یورپین سائنس اور لٹریچر کی عظمت۔ جب تک کہ انگریزی سے عہدہ عہدہ علمی اور لٹریچر میں مضامین ویسی زبان میں ترجمہ کر کے شائع نہ کیے جائیں۔ کیسے معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔ جب کہ یہ حالت تھی تو کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں میں ہائی ایجوکیشن کی اشاعت سے پہلے سوسائٹی کا قائم کرنا اور ترجموں کا شائع کرانا یا غیر ضروری تھا۔

بے شک ہائی ایجوکیشن کی حمایت کے جوش میں سر سید کے قلم سے بعض مواقع پر ایسے الفاظ نکل گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجموں کی غرض سے سوسائٹی قائم کرنے کو وہ اپنی ایک غلطی تسلیم کرتے تھے اور اسی بنا پر شمس العلماء مولانا شبلی نے ”مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم“ میں اسی غلطی کا جسکو سر سید چھ سات برس پہلے ایجوکیشن کمیشن میں تسلیم کر چکے تھے۔ ذکر کیا ہے اور اس بنا پر کہ مغربی علوم و فنون کا ویسی زبانوں میں ترجمہ ہونا ممکن نہیں ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے کو سر سید کی

قلیل عرصہ میں کر دکھایا وہ ایک ایسا عظیم الشان کام تھا جو پچیس برس پہلے بالکل محال معلوم ہوتا تھا۔
 ابتدائی کارروائیاں جو سرسید نے بطور بنیاد اور اساس اشاعتِ تعلیمِ انگریزی کے کیں۔ خواہ
 انکو اتفاقی سمجھا اور خواہ یہ خیال کر کہ وہ بہت سوچ سمجھ کر کی گئیں تھیں۔ سب ایسی ضروری معلوم
 ہوتی ہیں کہ بغیر انکے شاید اہل مقصد تک پہنچنا سخت دشوار ہوتا۔ سرسید نے جو چند موقعوں پر
 سائنٹفک سوسائٹی کے مقاصد کو اپنی رائے کی غلطی کی طرف منسوب کیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے
 کہ یورپین علوم کی اشاعت بذریعہ دیسی زبانوں کے ملک کو حقیقی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ اس سے
 بعض لوگ سچ مچ یہ سمجھ گئے ہیں کہ سوسائٹی کا قائم کرنا محض بے سود تھا اور یہ کہ سرسید نے اپنی
 اس غلطی پر متنبہ ہونے کے بعد انگریزی تعلیم کی اشاعت کی طرف توجہ کی ہے مگر یہ انکی سمجھ کی غلطی ہے
 سرسید کا جو خیال انگریزی تعلیم کی نسبت اخیر زمانہ میں تھا وہی خیال انکا اس وقت تھا جب کہ مراد آباد
 میں انھوں نے ورینکلر سکولوں کے خلاف اپنی رائے انگریزی اور اردو میں لکھا اور انکے
 اس وقت تھا جبکہ سائنٹفک سوسائٹی کو قائم ہوئے کچھ بہت دن نہ گزرے۔ اس طرح
 کی اس تجویز کی سخت مخالفت کی تھی کہ بجائے کلکتہ یونیورسٹی کے ورینکلر یونیورسٹی
 ترجموں کی ضرورت کو جیسا کہ وہ سوسائٹی کے قیام کے وقت ضروری اور لازمی سمجھتے تھے۔
 اخیر دم تک اسکو ضروری اور ملک کی عام تعلیم کو اس کے بغیر ناممکن سمجھتے رہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ
 اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم کی جگہ دیسی زبانوں میں مغربی علوم اور لٹریچر کی تعلیم دینے کو وہ ملک کے
 حق میں کچھ بھلائی نہیں سمجھتے تھے اور اسی لئے جب سے انکو یہ خیال پیدا ہوا کہ گورنمنٹ بجائے
 انگلش ہائی ایجوکیشن کے مشرقی علوم کی تعلیم دینا اور مغربی علوم کو بذریعہ دیسی زبانوں کے شائع کرنا چاہتی ہے

بیان کی تھیں پیش کی ہیں۔ اگر مولانا کی یہ اصلی رائے ہوتی تو ہم کو اس سے قرض کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی لیکن چونکہ انھوں نے خود سرسید کے بعض بیانات سے یہ رائے استنباط کی ہے اس لئے ہم کو سرسید کے خیالات کا اصل منشا ظاہر کرنا ضرور ہے۔

شاید اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک رفارمر کی شان اور اس کی حالت عام آدمیوں کی شان اور ان کی حالت سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ جس بات کو قوم کے لئے ضروری سمجھتا ہے اس کی تائید کرتے وقت اس بات کی کچھ پروا نہیں کرتا کہ مین پہلے کیا کہ چکا ہوں یا کیا کر چکا ہوں۔ وہ اس بات کو کہ اس کی پہلی کارروائی غلط ثابت ہو یا اس کے افعال و اقوال کو لوگ متناقض سمجھیں نہایت بہتر جانتا ہے نسبت اس کے کہ جو امر اس کے نزدیک سروسرست قوم کے حق میں ضروری ہے اس میں کسی طرح کی فروگزاشت ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید نے اپنے اصلی اور قدیم خیالات کو۔ جو کہ وہ ہندوستان کے پائلٹس کی نسبت رکھتے تھے۔ اخیر زمانہ میں صرف اس بنا پر بالکل بدل دیا کہ وہ خیالات مسلمانوں کی پورے شکل حالت کے موافق تھے؛ یہاں تک کہ نیشنل کانگریس کے بانی مسٹر ہیوم۔ جو سرسید کے قدیم دوست تھے۔ اُن سے ناراض ہو گئے اور انگلستان میں انھوں نے ہندوستان کے ایک شریف مسلمان سے نہایت تعجب کے ساتھ کہا کہ ”مجھ کو نیشنل کانگریس کا خیال صرف سید احمد کی کتاب ”اسباب بغاوت“ کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا مگر میں نہیں جانتا کہ اب لکھو کیا ہو گیا“

سرسید کو جس وقت قوم کی بھلائی کا خیال پیدا ہوا اُس وقت مسلمانوں کی حالت پر نیشنل صلوٰۃ اتی تھی کہ ”اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی“ انہیں صد ہا باتیں صلاح طلب و رائے متعلق صد ہا مشکلات حل طلب تھیں۔ اگر سرسید جزئیات کی صلاح یا حل کرنے کا ارادہ کرتے تو عمر بھر میں ایک کام کو پورا کرتے

اُس وقت سے اخیر دم تک وہ فیمل سوسائٹی سے بالکل علیحدہ رہے؛ غدر سے چند روز بعد اُنکی والدہ اور بی بی کا انتقال ہو گیا اور دہلی کی آمدورفت بالکل موقوف ہو گئی۔ اگرچہ زنانہ سوسائٹی کی حالت سے وہ بے خبر نہ تھے مگر جو فیملنگ خود اُس سوسائٹی میں رہ کر اور ہر وقت آنکھ سے اُنکی حالت دیکھ کر ایک ذکی آہس آدمی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے وہ صرف سُنی سنائی یا کبھی کبھی کی دیکھی ہوئی باتوں سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی۔ دوسرے اُنکے خاندان کی فیمل سوسائٹی کی حالت نسبت اکثر مسلمان خاندانوں کے بہت عمدہ تھی؛ اُنکے خاندان کی عورتوں سے میری اکثر رشتہ دار عورتوں کو ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو اُنکے اخلاق و عادات اور لیاقت اور سنجیدگی کی حد سے زیادہ تعریف کرتی ہیں۔ خود سرسید نے ایجوکیشن کمیشن میں اور اپنی متعدد ایسی چوں میں اپنے خاندان کی عورتوں کے لکھے پڑھے ہونے کا حال بیان کر کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ مسلمان عورتیں عموماً جاہل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب مرآۃ العروس پہلی ہی بار چھپ کر شائع ہوئی تو جو نقشہ اُس میں عورتوں کی اخلاقی حالت کا کھینچا گیا تھا اُس کو دیکھ کر سرسید کو نہایت رنج ہوا تھا اور وہ اُس کو مسلمان شرفا کی زنانہ سوسائٹی پر ایک قسم کا اہتمام خیال کرتے تھے۔

لیکن سب سے بڑا مانع تعلیم نسوان پر متوجہ ہونے کا یہ تھا کہ اُنھوں نے اُسکی دشواریوں کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا اور اُنکے نزدیک بھی وہ وقت بہت دور تھا کہ مسلمان شرفا کی لڑکیوں کی تعلیم کا ایک باقاعدہ اور قابل اطمینان انتظام کرنا ممکن ہو۔ چنانچہ انگلستان جاتے ہوئے جب مس کا رنیر سے

سے یہ ایک شریف لیڈی برٹل کی رہنے والی ڈاکٹر کانیر کی بیٹی تھیں جنھوں نے ہندوستان کی عورتوں کی جمالت کا حال شکر ہندوستان

کا ارادہ اس غرض سے کیا تھا کہ ہندوستانی عورتوں کی تعلیم میں کوشش کریں اور اب وہیں انگلستان کو جاتی تھیں ۱۲

بھی عمدہ برآنہوتے۔ انھوں نے تمام خرابیوں کی اصلاح اور تمام مشکلات کا حل اس بات میں دیکھا کہ قوم میں تعلیم کی اشاعت کی جائے۔ مگر قومی تعلیم و تربیت خود ایک عظیم الشان کام تھا جس کے لئے صدیاں درکار تھیں اسلئے انھوں نے خیال کیا کہ سب سے مقدم مسلمانوں کو پوٹنٹل بے وقتی سے نکالنا اور ملک کی حکومت میں جس قدر حصہ لینے کا گورنمنٹ نے انکو بحیثیت ہندوستان کی رعایا ہونے کے حق دیا ہو اُسکا اُن میں استحقاق پیدا کرنا ہو جو بغیر اسکے کہ قوم میں ایک مناسب تعداد ہندوستان اور انگلستان کی یونیورسٹیوں کے گریجویٹس کی پیدا ہو جائے۔ کیس طرح ممکن نہیں۔ اسکے سوا تمام ترقیات کی جڑ خیالات کی ترقی اور دماغی تربیت ہی جس کے لئے نگاش لٹریچر کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہایت ضروری ہے۔ پس جس بات کو انھوں نے ہائی ایجوکیشن یا لٹریچر کی تعلیم میں مغل سمجھا اُسکی ہمیشہ مدافعت کرتے رہے۔ اسی بنا پر وہ جس طرح اونیورسٹی تعلیم اور روریکر تعلیم کے مخالف تھے اسی طرح۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ وہ ٹیکنیکل ایجوکیشن کی بھی اُس صورت میں سخت مخالف تھے کہ اُس سے لٹریچر کی تعلیم کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ لیکن اگر یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہے کہ وہ درحقیقت ہندوستانیوں کے لئے ٹیکنیکل ایجوکیشن کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے بلکہ اُسکی وجہ بھی وہی ہائی ایجوکیشن یا لٹریچر کی تعلیم کی حمایت تھی جسکی نسبت انکو خیال ہو گیا تھا کہ گورنمنٹ اُسکو بدرجہ موقوف کرنا چاہتی ہے۔

اسی اصول پر کہ جو سب سے اہم اور ضروری چیز ہے صرف اُسی پر سروسرست اکتفا کرنا چاہیئے سرسید نے جس قدر کوشش کی وہ اُنکوں کی تعلیم کے لئے کی اور اُنکوں کی تعلیم پر کبھی ہاتھ نہیں اٹا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے انکو تعلیم نسوان کا مخالف تصور کیا۔ اگرچہ ہمارے نزدیک اصل تعلیم نسوان کی طرف توجہ نہ کرنے کا یہ تھا کہ اول توجہ سے انکو مسلمانوں کی سوشل ریفارم کا خیال پیدا ہوا

رعایت کی۔ پس اگر اب ہم کسی نیک بات کے پھیلانے میں عام رواج کی رعایت نہ کریں گے تو خود خدا کی اس حکمت کو توڑینگے اور خود اپنے لئے نقصان کا سبب ہونگے۔“

”بہر حال میں خدا سے چاہتا ہوں کہ مس کارنپٹر صاحبہ کی کوششیں کامیاب ہوں اور ہندوستان میں کیا مدر اور کیا عورت سچائی اور علم کی روشنی سے جو دو تہل میں ایک میں۔ شہنمیری حاصل کریں۔“

سر سید کی اس تحریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گو وہ عورتوں کی تعلیم کو نہایت ضروری سمجھتے تھے مگر ہندوستانیوں کے اور خاص کر ہندوستان کے شریف مسلمانوں کے رسم و رواج، اہل و عادت اور مذہبی اوہام و خیالات سے اُسکو اس قدر بعید جانتے تھے کہ سہرست اسی میں کوشش کرنے کو بے سود اور رائگان سمجھتے تھے۔ اسی لئے انھوں نے بارہا اپنی ایسی چون میں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن سے لوگوں کو اس بات کا شبہ ہو گیا تھا کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے بالکل مخالف ہیں۔ یہاں ہم انکی خاص کر اُس ایسی جگہ کا جو انھوں نے ۱۸۵۷ء میں بمقام گرو اسپدور خاتونان پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں لکھ کر دی تھی اور جو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی ایسی تھی جس میں شریف ہندو مسلمان اور عیسائی عورتوں کو مخاطب کیا گیا تھا۔ خلاصہ نقل کرتے ہیں ایڈریس میں سر سید کی ان کوششوں کی شکرگزاری کے بعد۔ جو کہ وہ لڑکوں کی تعلیم کے لئے کر رہے تھے۔ اشارہ اس بات کا بھی ذکر تھا کہ وہ عورتوں کی تعلیم پر بھی اسی طرح توجہ کریں۔ سر سید نے اُسکے جواب میں کہا

”اے میری بہنو! آج کی رات میرے لئے شب قدر ہے کچھ کم قدر کی نہیں ہے۔ جو ایڈریس تمہاری طرف بھکودی گئی ہے

وہ میرے لئے ایسی عزت ہے جو آج تک ہندوستان میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ میں تمہاری اس شفقت کا دل سے

شکر گزار ہوں۔“

انکی ملاقات ہوئی اور انھوں نے ایک کتاب جس میں ہندوستانیوں کی رائیں اور چھپان مس صاحبہ کی کوششوں کی نسبت درج تھیں۔ سرسید کے سامنے اس غرض سے۔ کہ وہ بھی اپنی رائے تعلیم نسوان کے متعلق انہیں لکھ دیں۔ پیش کی تو سرسید نے انہیں مندرجہ ذیل عبارت لکھی تھی جو انکے سفرنامہ میں درج ہے۔

”بھکو پڑوہہ دخانی جہاز میں۔ جبکہ میں لندن کو جاتا تھا۔ مس کارنپٹر صاحبہ سے ملاقات حاصل ہونے کی عزت اور بے انتہا مستر حاصل ہوئی۔ جس میں نے اُن کا نام اور انکی کوششوں کا حال نسبت تعلیم ہندوستانی عورت کے ساتھ میں بہت مشتاق اُنکی ملاقات کا تھا۔ خدا کا شکر ہو کہ بطور نعمت غیر مترقبہ اُنکی ملاقات ہو گئی“

”اُنکی عالی ہمتی اور بلند نظری اور تہذیب خلاق اور نیک طبیعتی کا مثبت خود ہی مضمون ہی جو اُنھیں نے اختیار کیا ہے؛ یعنی اس گروہ کی تعلیم میں۔ جسکو خدا تعالیٰ نے مرد کے لیے بطور دوسرے ہاتھ کے بنایا ہے اور جسکو نیک کاموں کے بخوبی انجام ہونے کے لیے مرد کا مددگار کیا ہے۔ کوشش کرنا، حقیقت یہ مضمون اور اُس پر انکی کوشش نہایت قدر کے لائق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نیک کام پر کوشش ہونی۔ گودہ کسی طرح پر ہو۔ نہایت اچھی ہو؛ کیونکہ اگر وہ کوشش درست بنیاد پر قائم ہوگی تو وہ خود کامیاب ہوگی اور اگر اُس میں کچھ غلطی ہو تو اُس سے امید ہے کہ اور دن کو اُس نیک کام پر کوشش کرنے کی تحریک ہوگی جس سے توقع ہے کہ کوئی نہ کوئی کوشش بغیر کسی غلطی کے شروع ہوگی اور ٹھیک ٹھیک نیک نتیجہ تک پہنچے گی“

”نیک کام پر کوشش کرنے والوں کی کوششیں کبھی کبھی اسلئے کہ وہ اُن لوگوں کی عادات و رسم و رواج کو لے کر

طریقے پر جنکی بھلائی کے لئے کوشش کی جاتی ہے۔ قائم کی گئی ہیں۔ برباد ہو گئی ہیں۔ حقیقت میں ایسا کرنا گویا نیچے کا مقابلہ

کرنا ہے اور خود اُس نیکی کی رگڑ کاٹ کا آہ بننا ہے۔ خدا نے یوشع کے لئے سورج کا تھم جانا کہا، حالانکہ شاید وہ غلط تھا، کیونکہ

اگر وہ واقعہ بھی ہوا تو شاید زمین کا تھم جانا سچ ہوتا، مگر خدا نے نیک بات پھیلانے میں بالکل عام سمجھ کی جوائش میں تھی۔

لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہو۔ پس جو خدمت میں تمہارے لڑکوں کو لئے کر رہا ہوں درحقیقت لڑکوں کی تعلیم کے لئے ہے۔

”میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم اُن مقدس کتابوں کے بدلے جو تمہاری دادایان نانیان پڑھتی آئی ہیں۔

اس زمانہ کی مروجہ نامبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانہ میں پھیلتی جاتی ہیں۔ مردوں کو جو تمہاری لئے

روٹی لٹا کر لائیوالے ہیں زمانہ کی ضرورت کے مناسب کچھ ہی علم یا کوئی سی زبان سیکھنے اور کیسی ہی نئی چال چلنے کی ضرورت

پیش آتی ہو مگر ان تبدیلیوں سے جو ضرورت تعلیم کے متعلق نکلو پہلے تھی اُس میں کچھ تبدیلی نہیں ہوئی۔“

”تمہارا فرض تھا کہ تم اپنے ایمان اور اسلام سے واقف ہو، اسکی نیکی اور خدا کی عبادت کی خوبی کو تم جانو، اخلاق

میں نیکی اور نیکی دلی رحم و محبت کی قدر سمجھو اور ان سب باتوں کو بتاؤ میں لاؤ، گھر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں رکھو، اپنے

گھر کی مالک رہو، اُسپر مثل شہزادی کے حکومت کرو اور مثل ایک لائق وزیرِ رزادی کے منظم رہو، اپنی اولاد کی پرورش کرو،

اپنی لڑکیوں کو تعلیم دیکر اپنا سناؤ، خدا پرستی خدا پرستی ہمسایوں کے ساتھ ہمدردی اپنا طریقہ رکھو۔ یہ تمام سچی

علیم نہایت عمدگی سے اُن کتابوں سے حاصل ہوتی ہے جو تمہاری دادایان نانیان پڑھتی تھیں۔ جیسی اُس زمانہ میں

نیدھیں ویسی ہی اس زمانہ میں مفید ہیں۔ پس اس زمانہ کی نامفید اور نامبارک کتابوں کی تکو کیا ضرورت ہے؟

ان یہ بات سچ ہے کہ تمہارے خاندانوں کے مرنے کی نالائق اور جہالت سے تمہارے متعدد حقوق جو خدا کے حکم سے

تکڑے ہیں اور جنکا انسانیت کی رو سے تمہارا حق ہے۔ برباد ہو گئے ہیں، وہ حق تکوین جو واپس دلانے کی یہ تدبیر ہے

کہ تمہارے لڑکوں کی تعلیم میں کوشش کی جاوے۔ جبکہ تعلیم یافتہ ہو جاویں گے وہ مخصوص حقوق از خود بے مانگے

ملو واپس لینگے۔“

آخر میں سر شینہ نے ہندو اور عیسائی خاتونوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ ”اے میری ہندو

اور عیسائی بہنو! تم نے جو اپنی محبت اور وطنی یگانگت سے اپنی مسلمان بہنوں کے ساتھ اس ایڈریس میں اور اس ادوین

”اے میری بہنو! میں اپنی قوم کی مستورات کی بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔ ہماری قوم کے مردوں نے اپنے باپ دادا کی بزرگی کو خاک میں ملا دیا ہو مگر خدا کے فضل سے تم میں ہمارے باپ دادا کے بزرگ نشان بدستور موجود ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم مردوں میں شبلی اور حنیفہ موجود نہیں ہیں مگر خدا کا شکر ہے کہ تم میں ہزاروں لاکھوں رابعہ بصری موجود ہیں“

”تمہاری نیکی، تمہاری ہمدردی، تمہاری محبت، ہر قسم کی مشکلات کی برداشت اور اُس صبر و پختونگی کی پرورش گھر بار کا انتظام ہمارے فخر کا باعث ہو۔ اگر کوئی قوم تمام دنیا میں اپنے تئیں کسی قسم کا فخر دے سکتی ہو تو ہم اپنی قوم کی مستورات کو دنیا کی قوموں پر فخر دے سکتے ہیں۔ یہ ہمارا فخر تمہارے ہی سبب ہے“

”اے میری بہنو! میں اپنی قوم کی خاتونوں کی تعلیم سے بے پرواہ نہیں ہوں۔ میں دل سے انکی ترقی تعلیم کا خواہاں ہوں۔ مجھ کو جانتا کہ مخالفت ہو اس طریقہ تعلیم سے جو جسکے اختیار کرنے پر اس زمانہ کے کوتاہ اندیش مائل ہیں۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنا پرانا طریقہ تعلیم اختیار کرنے پر کوشش کرو۔ وہی طریقہ تمہارے لئے دین و دنیا میں بھلائی کا پھل دے گا اور کانٹوں میں پڑنے سے محفوظ رکھے گا“

اسکے بعد سرسید نے پرانا طریقہ تعلیم نسوان بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور پھر یہ کہا ”اے میری بہنو تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو جہین مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت میں درست ہو گئی ہو؛ اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں جہین مردوں کی حالت درست ہو گئی ہو اور عورتوں کی حالت درست نہ ہوئی ہو۔ ان سب واقعات نے میرے دل میں بہت کچھ اثر کیا ہے۔ میں نے تمہارے ملکوں کی تعلیم پر کوشش کی ہے اس سے تم نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں؛ بلکہ میرا یقین ہے کہ ملکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا

لے یہ ایڈریس اصل مسلمان عورتوں کی طرف سے جسکی بانی مہادی خان سوار محمد حیات خان بہادر کی بیگم صاحبہ تھیں دی گئی تھی مگر

۱۔ اسکے نیچے بعض ہندو اور عیسائی عورتوں کے بھی دستخط تھے ۱۲

سمجھینگے۔ پس جبکہ یہ حالت ہو تو اُسے کیا امید ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی قوم کی عورتوں کے مخصوص حقوق واپس دینگے؛ انکا بڑا سلوک اپنی قوم کی ہم کفو لڑکیوں کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے کہ وہ سرے سے اُنکے حقوق کا بوجھ ہی اپنے ذمہ نہ لیں بلکہ اُنکو بدستور جاہل اور ناتربیت یافتہ لڑکوں کو لئے چھوڑ دیں۔ اگرچہ ابھی تک سوسائٹی کے دباؤ نے بہت کچھ اُنکے جذبات کو دبا رکھا ہے لیکن آخر کار ایک طرف کی تعلیم اور دوسری طرف کی جہالت قوم کے حق میں یقیناً بُرے نتائج پیدا کریگی۔

مذہب کے متعلق جو کچھ سرسید کی مذہبی خدمات اور رفراریشن کے بیان میں لکھا گیا

اُس سے یا تو اُن کو ششون کا دکھانا مقصود تھا جو اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی اور حمایت میں اُسے ظہور میں آئیں اور یا اُس دلیری اور جرأت کا بیان کرنا تھا جو اُنھوں نے اپنی مذہبی تحقیقات کے اعلان کرنے میں ظاہر کی یہاں ہم اُنکی مذہبی تحقیقات کے متعلق ایک دوسری حیثیت سے بحث کرنا چاہتے ہیں جس سے اس بات کا اندازہ کرنا ممکن ہو کہ اس شخص میں مذہبی عقیدوں کے حل کرنے اور اُنکی پیچیدگیوں کے سلجھانے اور مذہب کو حقائق محققہ پر منطبق کرنے کی کس قدر قابلیت تھی؟ نہ وہ داعظ تھا نہ مفتی، نہ فقیہ تھا نہ محدث، نہ معانی و بیان کا ماہر تھا نہ منطق و فلسفہ کا مدعی تھا؛ باوجود اسکے زمانہ حال کے شبہات۔ جو لوگوں کے دل میں اسلام کی نسبت پیدا ہوتے تھے۔ اُنکا حل کرنے والا تمام ہندوستان میں صرف یہی ایک شخص تھا جسکی تحریریں مجروح دلوں پر ہم کا کام کرتی تھیں۔ اُسکے پاس اطراف ہندوستان سے اسلام کی نسبت بیسیوں حل طلب سوالات صرف اس وجہ سے آتے تھے کہ موجودہ علمائے اسلام اُنکا شافی جواب نہ دے سکتے تھے۔ چنانچہ بہت سے خطوط جو سرسید نے اس قسم کے سوالات کے جواب میں لکھے ہیں

جو درستہ العلوم کے غریب طالب علموں کو دی گئی ہے۔ شرکت کی وہ ایک نمونہ تمھاری محبت اور یگانگت کا ہے۔ میں
دل سے اُسکے لئے تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں کہ تم پر بھی خدا تعالیٰ کی برکت ہو اور ہر طرح کی ترقی اور
خوشی تک نصیب ہو۔ آمین۔“

اس ایسیج سے صاف ظاہر ہے کہ سرسید اس وقت تک جب تک کہ لڑکوں میں تعلیم عام نہ ہو جائے
لڑکیوں کے لئے ضروری مسائل مذہبی کی تعلیم کافی سمجھتے تھے۔ مگر انکی ایسیج میں یہ بات قابل غور
ہے کہ انھوں نے جو صرف لڑکوں کے تعلیم یافتہ ہو جانے سے یہ امید ظاہر کی ہے۔ کہ اُس سے عورتوں کے
منصوبہ حقوق بن مانگے از خود واپس مل جائیں گے۔ انکی یہ امید پوری ہوتی نظر آتی ہے یا نہیں؟ اگرچہ تعلیم
و تربیت کا نتیجہ ہی ہونا چاہئے کہ تعلیم یافتہ نوجوان عورتوں کے حقوق پہچانیں، انہیں تعلیم کی کمی
سے جس قدر عقل یا سمجھ یا اخلاق کی کمی ہے اُسکو اسی طرح برداشت کریں جس طرح اُنکے اسلاف برداشت
کرتے آئے ہیں، اُن سے۔ جب تک کہ قوم میں تعلیم نہایت محدود ہے۔ اُن باتوں کی توقع نہ رکھیو۔
یورپ کی ایک تعلیم یافتہ لیڈی سے کہنی چاہئے مگر افسوس ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان تعلیم ترقی
سے بجائے تحمل برداشت اور سلوک و درگزر اور قومی حمیت اور رقت جنسیت کے۔ سبق سیکھتے ہیں کہ
تمدن اور معاشرت کے جس درجہ پر اہل یورپ کو صدیوں اور قرون کے بعد پہنچنا نصیب ہوا ہے
انکو یونیورسٹی کی سند پاتے ہی اُسکے خواب نظر آنے لگتے ہیں اور مستثنیٰ صورتوں کے سوا ہر تعلیم یافتہ
نوجوان کی یہ تمنا معلوم ہوتی ہے کہ اگر ممکن ہو تو لندن یا پیرس کی کسی لیڈی سے شادی کریں اور
اگر یہ امر انکی قدرت سے باہر ہو تو غالباً وہ ایک مشن اسکول کی تعلیم پائی ہوئی نیٹو کرچن عورت کو
قوم کی اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان کی لڑکی سے جو باقاعدہ کسی اسکول کی تعلیم یافتہ نہ ہو۔ بہتر اور افضل

بھیجتے تھے کہ آپ کی تصنیفات سے ہکویہ اور یہ فائدے پہنچے ہیں۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ سرسید نے جس قدر اختلافات مذہبی مسائل میں علما و سلف کیے ہیں انہیں سے اکثر ایسے ہیں جنہیں اور لوگ بھی اُنکے ساتھ شریک ہیں۔ لیکن اس سے نہ سمجھنا چاہیے کہ انھوں نے محض اگلے محققین کی تقلید سے ان اختلافات پر مبادرت کی ہے۔ اول تو جس مقصد کے محققین نے جمہور سے اختلاف کیا ہے وہ مقصد سرسید کے مقصد کے ساتھ متحد نہ تھا۔ سرسید کے تمام اختلافات کا مقصد اسلام کی طرف سے معترضین کے اعتراضات یا مشکلیں کے شبہات کا رفع کرنا تھا بخلاف اگلے محققین کے جنکے اختلافات کا ہرگز یہ منشا نہیں ہو سکتا؛ کیونکہ جو اعتراضات آج کل مذاہب پر وارد کئی جاتی ہیں اُن سے اُن بزرگوں کے کان کبھی آشنا نہ ہوئے تھے۔ دوسرے جن لوگوں نے سرسید کی طرز تصنیف کو بغیر غور و یکھا ہے وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ وہ جب تک کسی مسئلہ کی نسبت خود اپنی کوئی رائے قائم نہ کر لیتے تھے اُس وقت تک کتابوں کی طرف بہت ہی کم رجوع کرتے تھے۔ پھر اگر کسی مصنف کا قول اُنکے موافق نکل آتا تھا تو اُس کو بھی اپنی رائے کی تائید کے لئے لکھ دیتے تھے ورنہ صرف اپنی رائے لکھ دینے پر اکتفا کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جب اُنکی تحریر چھپ کر شائع ہو چکی اُس وقت حسن اتفاق سے کسی محقق کا قول سرسید کی رائے کا مؤید اُنکے کسی دوست کو معلوم ہوا اور اُس نے یا تو سرسید کو اُس سے مطلع کر دیا اور یا بذریعہ تحریر کے کسی میگزین یا اخبار میں چھپوا دیا۔ اہل یہ کہ سرسید کو مذہبی تحریرات میں جس قدر اپنے دماغ سے کام لینا پڑتا تھا اُس قدر دوسرے مصنفوں کی کتابوں سے مدد لینے کی اُنکو توقع نہ تھی اور اس لئے وہ خود کتابوں کی طرف بہت کم رجوع کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ اُنکی تصنیفات میں کتابوں کے حوالے جتنے کہ ہونے چاہئے تھے اُن سے بہت کم ملتے ہیں اور جس قدر ملتے ہیں انہیں زیادہ تر ایسے ہیں

بعض اہل جہل کے بھیجے ہوئے ہمارے پاس موجود ہیں، بعض خطوں کے جواب تہذیب و اخلاق یا سٹیٹوٹ گزٹ وغیرہ کے ذریعہ شائع ہو رہے ہیں اور بعض اس مرحوم ہمارے لکھ کر لوگوں کو بھیجے ہیں۔ اکثر لوگ دور دورہ قصد کر کے اسی غرض سے سیریک پاس آتی تھے اور اپنے شہادت بیان کرتے تھے اور وطن پر کروا پس جاتے تھے۔ اس طرح اس مرحوم پاس بہت لوگ شکر کے خط لکھتے تھے۔

۱۵ ایک صاحب نے حکام احمد آباد بخدی تھا۔ غالباً لاہور شہر میں سیریک پاس یہ وال بھیجا تھا کہ قرآن مجید میں عیسیٰ کی نسبت ”برابرا لہ“ اور عیسیٰ کی نسبت ”برابرا لہ“ آیا ہو۔ اگر فی الواقع عیسیٰ کا کوئی باپ ہوتا تو انکا قول بوالہدیٰ کی جگہ بوالہدیٰ نقل کیا جاتا۔ اگرچہ سیریک تفسیر میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہو مگر خاص کر اس شہادے پر غور نہیں کیا۔ انھوں نے جواب میں یہ چند سطور لکھ بھیجیں ”جناب مخدومی! حضرت عیسیٰ نام لوگوں میں ابن مریم کے مشہور تھے۔ اس شہادت کے سبب قرآن مجید میں بھی انکو ابن مریم سے تعبیر کیا ہو۔ بہت لوگ اسی طرح اپنی زبان کے نام سے مشہور ہو رہے ہیں پس قرآن مجید میں جس طرح ابن مریم کہا گیا ہو برابرا لہ کی بھی کہا ہو۔ اس لفظ سے یہ سمجھنا کہ انکا کوئی باپ نہ تھا صحیح نہیں ہو۔ کیا سادات کو۔ جو بنی فاطمہ کے مشہور ہیں۔ آپ بن باپ کا پیدا ہوا خیال کرتے ہیں؟ والسلام“

۱۶ مولوی سید تراز علی بی۔ سے کدل میں جب کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ اسلام کی نسبت طرح طرح کے شہادت پیدا ہو گئے تھے۔ انھوں نے سیریک کو۔ جو اس وقت بمبئی کو نسل کلکتہ میں تھے۔ اپنے شہادت لکھ کر بھیجے۔ اس وقت تک سیریک انکو نہیں جانتے تھے۔ مگر انھوں نے فوراً انکو خط لکھا کہ خط کتابت سے کچھ فائدہ نہ ہوگا، تم چند روز کے لئے کلکتہ چلے آؤ اور ریل کے کرایہ کی ضرورت ہو تو میں بھیجا دوں۔ وہ فوراً کلکتہ چلے گئے اور چند محبتوں میں انکے تمام شہادت زائل ہو گئے۔

۱۷ انھیں خطوں میں سے ایک خط ہمارے سامنے سیریک کے نام سیموگہ علاقہ مدراس کے اہل اسلام کی جماعت کی طرف جو سپرد احمد قاضی سیموگہ اور شیخ بابن محمدن مشنری سیموگہ اور چار اور معزز مسلمانوں کے دستخط تھے۔ پتہ تھا جسکو چھپنے سے بچا جائے۔ مانگ لیا تھا۔ اس میں سے چند فقرے ہم انھیں کی عبارت میں یہاں نقل کرتے ہیں ”جناب کی تفسیر ہر ایک مسلمان کدل پر ایسی روشنی ڈالتی ہو جیسی اندھیری رات پر آفتاب کی۔ اس تفسیر کے بہت بڑا فائدہ یہ ملتا ہو کہ ایک تحصیل شدہ مولوی اور ایک روحانی ہر دو کو برابر سمجھاتی ہو۔ جسکو عقل سے کچھ بھی تعلق ہو وہ بلاشبہ یہ کہہ سکتا ہو کہ اس تفسیر کے پڑھنے سے سننے سے حق و باطل میں تمیز ہوتی ہو اور دل کو یقین ہو جاتا ہو کہ اسلام فطرت کے مطابق ہو۔ ہم آج تک مذہبی باتوں میں عقل کو دخل نہیں دئے۔۔۔۔۔ اور کبھی یہ نہیں خیال میں آیا کہ ان ہونی بات کیونکر ہو سکتی ہو۔ ہاں یہ تو ضرور سمجھتے تھے نصاروں کے (یعنی نصارے کے) تین خدا یا ان کے ایک ہو نا غیر ممکن ہو، بدستور ہندو کے ایک شخص کو تین موند اور دوسے زیادہ کہتی ہاتھ اور آدمی کو ہاتھ کا سر لگاؤ جانا یہ سب غلط۔ (یعنی عیسائیوں اور ہندوؤں کے ہاں جو نامکنا باتیں مانی جاتی ہیں انکو تو ہم غلط جانتے تھے) مگر وہی غیر ممکن بلکہ اس سے زیادہ تعجب انگیز باتیں ہمارے علماء و اعلیٰین کی گھڑت ہو کہ وہ کھائی نہ دی۔ احمد سدا اس حق کو تفسیر کی بدولت اس روحانی ملک بیمار ہون کو آج غسل صحت ملا۔۔۔۔۔ مسلمانوں کے پاک دلوں میں وہ گندی گندی باتیں جمی ہوئی تھیں جیسے کعبہ میں بتان، ابا نکلیک بیک دور ہونا خدا کے مقدس کلام کی سچی تفسیر کا نتیجہ ہو۔ ہم اس حسان کے بدلے اپنی کھال کی جو تیان بنا دیں تو حضرت کی تفسیر کے ایک فقرہ کا معاوضہ نہ ہوگا۔“

کے مطابق اور جاہل و عالم اور وحشی و شایستہ سب کی سمجھ کے موافق اور ہر زمانہ کی حالت کو مناسب اور صرف بتایا ہی نہیں بلکہ اپنے دعوے کا ثبوت اُس حد تک پہنچا دیا جس سے زیادہ مذہبی مسائل کا ثبوت ہرگز نہیں دیا سکتا ..

اُسی نے سب سے پہلے اس بات کو دریافت کیا کہ اسلام جو مدت دراز سے غیر قوموں میں مطلقاً مقہوم چلا آتا ہے اس کے مختلف اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ ہے کہ انھوں نے مسلمان فاتحوں اور کشورکشوں کی بے اعتدالیوں کو ایک نتیجہ اسلام کی تعلیم کا قرار دیا ہے اور اس کو مسلمانوں کے کردار کا جوابدہ تصور کیا ہے حالانکہ اسلام ہر ایک طعنہ اور ہر ایک اعتراض سے اُس وقت تک بالکل بری ہے جب تک کہ خود اُسکی تعلیم میں کوئی بات قابل گرفت کے نہ پائی جائے

اُسی نے سب سے پہلے اسلام پر سے عیسائی قوموں کا یہ لازم رفع کیا کہ وہ شایستگی اور سویلریشن کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا اور مسلمان جب تک کہ مسلمان ہیں دنیوی ترقیات بن حصہ نہیں لے سکتے .

اُسی نے سب سے پہلے یہ ثابت کیا کہ آنحضرت صلعم کا کوئی غزوہ اور کوئی ستر یہ اسل راہ پر مبنی نہ تھا کہ کفار کو تلوار کے زور سے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ جس قدر چھوٹی یا بڑی لڑائیاں آپ کے عہد میں کفار کے ساتھ ہوئیں اُنکا اصل مقصد امن کا قائم کرنا اور مسلمانوں کی مذہبی آزادی کے موافق کو دور کرنا تھا اور اُسی نے نہایت روشن دلیلوں سے اس امر کا ثبوت دیا کہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں لوگوں کو جبراً مسلمان کرنے کا حکم ہو بلکہ بے شمار آیتیں اسکے برخلاف صاف صاف دلالت کرتی ہیں کہ دین میں کسی قسم کا جبر واکراہ نہیں ہے .

جو انکے لئے اور لوگوں نے تلاش کر کے ہم پہنچائے ہیں ۱۰ کے سوا بہت سے مقامات انکی تصنیفات میں ایسے موجود ہیں جنہیں اگرچہ انھوں نے سلف کے اقوال سے اپنی رملے پر تشہاد کیا ہو مگر جب ان اقوال کے محل اور غیر شافی بیان کو سرسید کے مدلل اور شافی بیان کے مقابلہ میں دیکھا جاتا ہے تو دونوں میں اس قدر فرق معلوم ہوتا ہے کہ مشکل سے ان اقوال کو سرسید کی رائے کا ماخذ قرار دیا جاسکتا ہے۔ باوجود ان سب باتوں کے ہم بے شمار تحقیقات میں سرسید کی مذہبی تصنیفات میں ایسی اچھوتی پائی ہیں جنکو بظاہر اس چودھویں صدی کے محقق سے پہلے کسی کے قلم نے مس نہیں کیا اور بہت سے ایسے ارجل خیالات اور ارجل رائیں دیکھتے ہیں جنکو اسکی اولیات کے ساتھ تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اسی نے سب سے پہلے مذہب کی سچائی کا یہ معیار قرار دیا کہ اسکی تعلیم میں کوئی بات فطرت انسانی یا فطرۃ اللہ کے خلاف نہ ہو اور اسی نے سب سے پہلے اس بات کا دعوے کیا کہ اس معیار پر جیسا کہ اسلام پورا اترتا ہے دنیا کا کوئی مذہب ایسا پورا نہیں اترتا۔

اسی نے سب سے پہلے اس بات کو سمجھا کہ نبی کی عظمت اور بزرگی اس میں نہیں ہے کہ اس سے معجزات اور پیشین گوئیاں صادر ہوں بلکہ اسکی تمام عظمت اور تمام بزرگی اس میں ہے کہ جب منکرین اس سے معجزہ طلب کریں تو انکو یہ جواب دے کہ ”انما الایات عند اللہ“ اور ”سبحان ربی کنت لا ہذا رسولاً“ اسی کا ذہن سب سے پہلے اس نکتہ تک پہنچا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا قرآن میں کوئی نہ ہونا جسکو مخالفین آپ کی نبوت کے عدم ثبوت کی ایک دلیل قرار دیتے ہیں۔ یہی سب سے بڑی دلیل آپ کی سچائی اور نبی برحق ہونے کی ہے۔

اسی نے سب سے پہلے بتایا کہ قرآن میں سب سے بڑی وجہ اعجاز یہ ہے کہ اسکی تعلیم فطرت انسانی

اُسی نے سب سے پہلے قرآن سے مسئلہ اثبات کیا کہ اگر مسلمان کو اس بات کا احتمال بھی ہو کہ وہ متعدد ازواج میں عدالت نہ کر سکیگا تو اُسکو ایک وقت میں ایک سے زیادہ جبر و کرہی جائز نہیں ہے۔ اُسی نے سب سے پہلے اس بات کا ثبوت دیا کہ طلاق کے مسئلہ میں یہودیوں کے ہاں افراط ہے اور عیسائیوں کے ہاں تفریط اور اعتدال صرف اسلام میں ہی اور بس۔

اُسی نے سب سے پہلے رسول خدا صلعم کا نسب نامہ عدنان سے لیکر اسمعیل علیہ السلام تک زمانہ حال کے اصول مسلمہ کے موافق صحیح کر کے دکھایا اور مخالفین کے اس اعتراض کو دفع کیا کہ آنحضرتؐ کا بنی اسمعیل میں سے ہونا ثابت نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے عیسائی مصنفوں کی اس غلط فہمی کو دفع کیا کہ مکہ کے قریب اسمعیلؑ کا آباد ہونا محض بناوٹ اور افسانہ ہے اور بوسنہ حجر اسود، طواف کعبہ، اشہر حرم کی تعظیم اور مکہ و منا عرفات بن جو مناسک ادا کئے جاتے ہیں انہیں سے کسی بات کو حضرت ابراہیمؑ کے اصول سے تعلق نہیں ہے۔ نسبت پرستی کے اصول جو جنوبی عرب میں جاری تھے اُن سے تعلق ہے؛ اُسے نہایت روشن دلیلوں اور تاریخی شہادتوں اور بائبل کے حوالوں سے ثابت کیا کہ انہیں سے ایک بات بھی ایسی نہیں جسکی نظیر بنی اسحق یا بنی اسرائیل میں موجود نہ ہو۔

اُسی نے سب سے پہلے عیسائی مصنفوں کے اس اعتراض کو دفع کیا کہ قوم عاد کا قوم نوح کے بعد اُنکا جانشین ہونا۔ جیسا کہ قرآن سے پایا جاتا ہے۔ صحیح نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے قدیم جغرافیوں کی شہادت اور بائبل کے حوالوں سے ثابت کیا کہ فاران کا لفظ جو حضرت موسیٰ اور حقوق نبی کی بشارت میں آیا ہے اور جس سے مسلمان آنحضرتؐ صلعم کی نبوت کا

اُسی نے سب سے پہلے اس نکتہ کو ظاہر کیا کہ اپنی مذہبی آزادی کے برقرار رکھنے کے لئے دین کے دشمنوں سے لڑنا اور اُنکے ظلم و تعدی کا انتقام لینا ہی فطرت انسانی کا مقتضا ہے جس پر انسان عمل آمد کر سکتا ہے نہ یہ کہ ایک گال پر پٹا چمکھا کر دوسرا گال بھی سامنے کر دینا، کیونکہ نہ اسپر کبھی پہلے عمل ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے نص قرآنی سے ثابت کیا کہ اُن کفار و مشرکین کے سوا جو مسلمانوں سے محض دین کی بابت لڑیں، اُنکو جلا وطن کرین اور اُنکے برخلاف لوگوں کی مدد کرین۔ کسی مشرک یا کسی کافر کتابی یا غیر کتابی کے ساتھ دوستی کرنا، اُن سے میل جول رکھنا اور صفائی و خلوص سے ملنا دین اسلام کی رو سے منع نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے فقہاء کی اس غلطی کو پکڑا کہ ہر ملک مسلمانوں کے لئے یا دارالاسلام ہے یا دارالحرب اور ہر کافر حربی ہی یا ذمی؛ کیونکہ ہجرت اُن کے مین جب مسلمان بخاشی کی پناہ مین جا کر رہے تو اُسوقت ابی سینیا پر نہ دارالاسلام کا اطلاق ہو سکتا تھا نہ دارالحرب کا، اور ابی سینا کے عیسائیوں پر نہ اہل حرب کا اطلاق صحیح تھا نہ اہل ذمہ کا۔ اور اسی طرح جن ملکوں مین آج مسلمان عیسائی سلطنتوں کے محکوم ہیں اور مذہبی امور مین اسلامی سلطنتوں سے بھی زیادہ آزاد ہیں اُن ملکوں کو بھی نہ دارالحرب کہہ سکتے ہیں نہ دارالاسلام اور عیسائی حکمرانوں کو نہ اہل حرب کہہ سکتے ہیں نہ اہل ذمہ۔

اُسی نے سب سے پہلے نص قرآنی سے استدلال کیا کہ اسلام نے برخلاف شرایع سابقہ کے اسیران جنگ کے قتل کرنے یا غلام بنانے کو ہمیشہ کے لئے موقوف کر دیا ہے۔

علم کلام کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔ سب سے عمدہ نمونہ انکی تصنیفات کا ہے اور اسکا اندازہ اُس سیدھے سادے اور عام فہم طریقہ سے بخوبی ہو سکتا ہے جو اس تفسیر میں بمقابلہ علوم جدیدہ کے اسلام کی حمایت کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جو طریقہ دین کی حمایت کا بمقابلہ یونانی فلسفہ کے ہمارے قدیم متکلمین نے اختیار کیا تھا وہ اس زمانہ میں کچھ بکار آمد نہیں رہا یہاں تک کہ جو مصنفین اس زمانہ میں اُس طریقہ پر کار بند ہوئے ہیں انکی تصنیفات سے تعلیم یافتہ لوگوں کی تشفی نہیں ہوتی اور جو شبہات مذہب کی نسبت اُنکے دل میں خطور کرتے ہیں وہ بدستور کھٹکتے رہتے ہیں۔

آج کل ممالک عثمانیہ میں رسالہ حمیدیہ کی بہت شہرت ہے جو طرابلس کے مشہور عالم شیخ حسین افندی نے ۱۳۰۶ھ میں وہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات کی اصلاح کی غرض سے لکھا ہے اور چہر شام کے بارہ جلیل القدر عالموں نے اور روم و شام و مصر کے بہت سے نامور اخبار و رسائل میں تقریظیں اور ریویو لکھے ہیں۔ چونکہ ممالک مذکور میں کسی مسلمان عالم کی یہ مجال نہیں کہ سلف کی تقلید کے دائرہ سے قدم باہر رکھ سکے اس لیے مصنف موصوف کا طریقہ استدلال زیادہ تر انھیں اصول پر مبنی ہے جو قدیم متکلمین نے یونانی فلسفہ کے مقابلہ میں اختیار کیا تھا۔

مثلاً اُس زمانہ کے نئے اکتشافات میں سے اُس مسئلہ یہ ہے کہ سورج اور تمام ثوابت و سیارات جو قدیم خیالات کے موافق آسمانوں میں جڑے ہوئے تسلیم کئے جاتے تھے درحقیقت ایسا نہیں ہے بلکہ ب ایک فضا میں متدین۔ جسکی وسعت غیر متناہی ہے۔ جابجا بکھرے ہوئے ہیں اور بذریعہ کشش کے جو منجملہ قوانین قدرت کے ایک زبردست قانون ہے۔ اپنی اپنی جگہ پر قائم ہیں اور کبھی اُس حد سے تجاوز نہیں کرتے اور کوئی ایسا کرہ جو تمام عالم پر محیط ہو مثل آسمان یا عرش و کرسی وغیرہ کے اس فضائے

استدلال کرتے ہیں اُس سے وادی حجاز مراد ہی نہ وہ مقامات جنکو بعض عیسائی مصنفوں نے مسلمانوں کے برخلاف فاران کا مصداق قرار دیا ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے اُن عظیم الشان فائدوں کو بیان کیا جو دیگر مذاہب کو اور خاص کر یہ عیسوی کو اسلام کی اشاعت سے پہنچے۔

اُسی نے سب سے پہلے دین اسلام اور مغربی علوم میں مصاحت کی بنیاد ڈالی اور اسی عن سے کم و بیش دو تہائی قرآن کی تفسیر لکھی اور ایسے اصول مقرر کئے جنکے بموجب آئندہ نسلیں اُسکے اس دشوار کام کو پورا کر سکیں اور اگر اُس سے تفسیر قرآن میں کوئی لغزش ہوئی ہو تو انھیں اصول کے موافق اُسکی اصلاح کر سکیں۔

اُسی نے سب سے پہلے اس بات کو سمجھا کہ اسلام کے لئے اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ قرآن کی جن آیتوں کے معنی علمائے سلف نے۔ بہ پاس ادب، یا بخوف خرقِ اجماع، یا بسبب عدم ضرورت، یا اس وجہ کہ ممالکِ سلامیت میں علما ی اسلام کو پوری پوری مذہبی آزادی نہ تھی صاف صاف بیان نہیں اور خاص خاص صورتوں کے سوا تمام الفاظِ قرآنی کو اُنکے حقیقی معنوں پر مقصور رکھا ہے، اب بھی اُنکو اسی حالت پر چھوڑ دیا جائے، بلکہ ضرور ہے کہ جو الفاظِ حقیقت بطور مجاز و استعارہ و تمثیل کے استعمال کئے گئے ہیں اُنکے اصلی معنی بیان کئے جائیں اور جو شبہات اُنکے حقیقی معنی مراد لینے سے پیدا ہوتے ہیں اُنکو رفع کیا جائے۔

اگرچہ مذہبی تحقیقات کا خدو لاوہ بلکہ جو سرسید کی طبیعت میں ودیعت تھا اُسکا ثبوت اُنکی ہر ایک تحریر میں جو غدر کے بعد اُنکی قلم سے نکلی نمایان طور پر پایا جاتا ہے۔ مگر تفسیر القرآن حسین گو یا نے

لیکن جن لوگوں نے علوم جدیدہ کی تعلیم پائی ہے اور تعلیم نے انہیں اپنا پورا پورا اثر بھی کیا ہے ایسے جو ابون سے اُنکے دل کی خلش کا مٹنا دشوار ہے کیونکہ جن باتوں کو وہ مثل بدیہیات اولیہ کی جتنی سمجھے ہوئے ہیں اُنکی یقین محض احتمالات سے زائل نہیں ہو سکتا ۔

مگر جو طریقہ سرسید نے ایسے شبہات کے رفع کرنے کا اختیار کیا ہے وہ بالکل شارع کے اس اصول کے موافق ہے کہ ”کلموا الناس علی قدر عقولہم“ کیونکہ اُس جہان تک کہ دیکھا گیا ہے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی خاطر خواہ تشفی ہو جاتی ہے اور قرآن کے بیان میں شک و شبہ کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی ۔ سرسید کہتے ہیں کہ حسب طبع قرآن کا بلفظہ کلام الہی ہونا مسلم ہے اسی طرح یہ بھی مسلم ہے کہ وہ انسان کی زبان میں نازل ہوا ہے ۔ پس حسب طبع انسان کے کلام کے معنی لگائے جاتے ہیں اسی طرح خدا کے کلام کے معنی لگائے جائینگے ۔ ظاہر ہے کہ انسان کبھی الفاظ کو اُنکے حقیقی معنوں میں استعمال کرتا ہے اور کبھی مجازی معنوں میں ؛ پس قرآن کے الفاظ سے ہی حقیقی معنی مراد لیے جائینگے اور کہیں مجازی معنی ۔ بڑے بڑے جلیل القدر عالمون اور محققون نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ قرآن میں انسان کی عقل اور سمجھ کے موافق جو علمی ترقی سے پہلے اُسکی اصل خلقت میں ودیعت تھی۔ خطاب کیا گیا ہے ۔ پس جو کچھ مبداء و معاد کے متعلق قرآن میں بیان ہوا ہے ممکن نہیں کہ اُن الفاظ کو اُنکے حقیقی معنوں پر محمول کیا جائے کیونکہ حسب طبع انسان کی سمجھ خدا کی ذات و صفات و اسما و افعال کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہے اسی طرح واقعات بعد الموت اُسکے فہم کی رسائی سے وراء الوداہ ہیں اور کوئی لفظ یا الفاظ انسان کی زبان میں ایسے موجود نہیں ہیں جنکے ذریعہ سے اُن حقائق و معارف کو کہا ہی ہی تعبیر کیا جاسکے ۔ پس عرش

موجود نہیں ہے۔ یہ مسئلہ اب تھیوری کی حد سے نکل کر سائنس کے درجہ کو پہنچ گیا ہے جس پر تمام یورپ اور امریکا کے ہیأت دانوں کا اتفاق ہے۔ اگرچہ حکامی اسلام میں سے ابو بکر بن العربی کی بھی یہی رائے تھی مگر چونکہ اُس وقت تک کثرت کا قانون معلوم نہیں ہوا تھا اس لئے وہ رے سائنس کے درجہ کو نہیں پہنچی تھی۔ چونکہ قرآن مجید میں سبع سموات اور عرش و کرسی اور لوح و قلم اور جنت و جہنم کے الفاظ وارد ہوئے ہیں جو بظاہر اس نئی تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتے ہیں اور جسے بڑے بڑے کرون کا اور ایسے اجسام عظیمہ کا جو زمین اور آسمان سب پر محیط ہیں اس فضا میں موجود ہونا سمجھا جاتا ہے اس لئے مصنف رسالہ حمید یہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ خدا تعالیٰ کا ہمارے اوپر سات آسمانوں کا پیدا کرنا اور اُنکے اوپر کرسی اور کرسی کے اوپر عرش کا پیدا کرنا اور جو کچھ کہ ہوا یا آئندہ ہوگا اسکے ثبت کرنے اور لکھنے کے لئے لوح و قلم کا پیدا کرنا اور انسان کے اعمال کی جزا و سزا کے لئے بہشت و دوزخ کا پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ۔ جیسا کہ نصوص شرعیہ میں وارد ہوا ہے۔ انہیں سے کوئی بات ایسی نہیں ہے جو تحت قدرت کاملہ باری تعالیٰ داخل نہ ہو۔ پس جب تک کسی دلیل قاطع عقلی سے یہ ثابت نہ ہو کہ انہیں کوئی چیز بالفعل موجود نہیں ہے یا ان کا موجود ہونا محالات سے ہے اُس وقت تک کوئی وجہ نہیں کہ اُنکے وجود کا انکار کیا جائے۔

ہم بیان اس امر سے بحث کرنا نہیں چاہتے کہ ان چیزوں کے عدم وجود یا عدم امکان پر کوئی دلیل قاطع عقلی موجود ہے یا نہیں لیکن ہمارے نزدیک اس میں شک نہیں کہ جن لوگوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح کی غرض سے مصنف موصوف نے یہ کتاب لکھی ہے اُنکے دل کا کاٹنا ایسے بیانات سے نہیں نکل سکتا۔ اگرچہ ممکن ہے کہ مالک اسلامیہ میں علانیہ ایسی تصنیفات پر چون و چرا نہ کی جائے

خرق عادت کو دلیل نبوت کہتے چلے آئے ہیں۔ لیکن اس زمانہ میں وہ تمام دلیلیں جو خرق عادت کے ممکن ہونے یا اُن سے نبوت کے ثابت ہونے پر قائم کیجاتی تھیں سب بیکار ہو گئی ہیں۔ ہر شخص جسے زمانہ حال کے علوم طبیعیہ کی تعلیم پائی ہے اور اُنکو اچھی طرح سمجھا ہے وہ دل سے اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ قوانین قدرت کبھی نہیں بدلتے اور اسباب و سبببات میں کبھی تخلف واقع نہیں ہوتا۔ سب سے بڑا شبہ متکلمین کے استدلال پر یہ وارد ہوتا ہے کہ مثلاً جو معجزات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں ان میں سے کسی معجزہ کی نسبت یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے دعوتِ اسلام کرتے وقت یا اس وقت جبکہ آپ سے معجزے طلب کئے گئے منکرین کو کوئی معجزہ دکھایا ہو۔ بلکہ برخلاف اسکے قرآن سے بخوبی ثابت ہے کہ جب کبھی کفار کی طرف سے معجزے طلب کرنے میں اصرار ہوا تو آپ نے اسکے سوا کچھ نہیں کہا کہ ”انما الايات عند الله“ یا ”سبحان ربی هل کنث الا بشر“ سولا“ یا ”لو ان عندی ما استعجلون به لقضی الامر لی فی و بینکم“ یا ”ولو کنث اعدم یب الاستکثرت من الخیر وما مئیی السوء ان انا الا نذیر و بشیر لقوم یتؤمنون“ حالانکہ نبوت کا ثبوت اگر معجزہ پر منحصر ہوتا تو کفار کو عند الطلب معجزہ دکھانا ضرور تھا۔ بعینہ ایسا ہی انجیل سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر معجزات حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں ان میں سے کوئی معجزہ عند الطلب نہیں دکھایا گیا بلکہ برخلاف اسکے متی باب ۴ و ۱۲ و ۲۶ و ۲۷ اور مرقس باب ۶ و ۱۳ و ۱۵ اور لوقا باب ۲۲ و ۲۳ سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیح سے بارہا معجزے طلب کئے گئے مگر آپ نے اُنکے دکھانے سے انکار کیا۔

نیز مصنف موصوف نے قدیم متکلمین کی طرح آنحضرت کے معجزات کی نسبت یہ بھی لکھا ہے

وکرسی اور لوح و قلم اور جنت و جہنم اور اسی طرح تمام الفاظ جو مبادی و معاد کے متعلق قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں وہ سب بطور مجاز و استعارہ کے اطلاق کئے گئے ہیں نہ بطور حقیقت کے۔ یہی طرح جو خیال علم انسانوں کا آسمان اور زمین اور ستاروں کی نسبت تھا اُسی کے موافق قرآن میں اُنکا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ آسمان کو مثل ایک چھت یا سائبان کے زمین پر چھایا ہوا تصور کرتے تھے سو انھیں کی سمجھ کے موافق فرمایا ”وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا“ وہ زمین کو مثل فرش کے بچھا ہوا جانتے تھے سو انھیں کے خیال کے مطابق کہا ”وَالْأَرْضُ نَوْشًا هَا“ وہ ستاروں کو آسمان میں جڑا ہوا تصور کرتے تھے سو انھیں کے تصور کے موافق فرمایا ”إِنَّا زَيْنَبْنَا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةِ الْكَوَاكِبِ“ کیونکہ اصل مقصود آسمان اور زمین اور ستاروں کی حقیقت بیان کرنا نہ تھا بلکہ مصنوعات کی عظمت سے۔ جس طرح پرکہ وہ اُنکو تسلیم کیے ہوئے تھے۔ صانع کی عظمت و جلال کا تصور دلانا اور اُسکی طرف متوجہ کرنا مقصود تھا۔ یہ ایک نہایت مختصر اور نا کافی خلاصہ ہے اُن تحریروں کا جو سرسید نے اس قسم کے شبہات رفع کرنے کی غرض سے تفسیر کے مختلف مقامات میں بہت شرح و بسط کے ساتھ لکھی ہیں۔ اگر سرسید کو زیادہ تفصیل دیکھنی منظور ہو وہ تفسیر کی جلدوں کو اور اُنکے رسالہ اصول تفسیر کو مطالعہ کرے۔ یا مثلاً مصنف رسالہ حمیدیہ نے آنحضرت صلعم کی نبوت پر خوارق عادات یعنی معجزات سے استدلال کیا ہے اور جو کچھ معجزہ کے متعلق علم کلام کی کتابوں میں لکھا ہے اُسی کو زیادہ صفائی کے ساتھ اپنی عبارت میں ادا کیا ہے۔ اگرچہ خرق عادت کو دلیل نبوت گردانے پر قدیم سے رد و قلع ہوتی چلی آئی ہے یہاں تک کہ خود اہل اسلام میں سے بعض محققین نے نہایت زبردست دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ معجزہ کسی طرح دلیل نبوت نہیں ہو سکتا۔ مگر ہمیں شک نہیں کہ جمہور متکلمین قدیم سے

کہ جو گروہ کسی شخص کو دین یا شریعت کا ہادی سمجھتا ہے اُسکو جب تک انسانیت کے درجہ سے ویرا اور اہم نہیں ٹھہرا لیتا اسکے دل کو صبر نہیں آتا یہاں تک کہ اُسکو خدا اور خدا کا بیٹا تک نفی کی جرأت کر بیٹھتا ہے اور کم سے کم یہ کہ اُس میں ایسے اوصاف اور معجزات اور کرامتیں ثابت کرتا ہے جن سے وہ باوجود انسان ہونے کے نوع انسان سے بالاتر سمجھا جائے۔ معمولی واقعات۔ جو عادت الہی کے مطابق واقع ہوتے رہتے ہیں۔ جب اُسکی طرف منسوب ہوتے ہیں تو وہی اُسکی کرامتیں اور معجزے قرار پا جاتے ہیں۔ اگر ایک عام آدمی کسی کو بد عادے کہ تجھ پر بجلی گرے اور اتفاق سے وہ بجلی ہی سے مارا جائے تو کسی کو کچھ خیال نہیں ہوتا لیکن اگر وہ بد عا کسی ایسے شخص نے دی ہو جس کے تقدس کا خیال لوگوں کے دلوں میں ہو تو اُسکی کرامت یا معجزہ سمجھا جاتا ہے ++ انسان میں بعض ایسی قوتیں ہیں جو خاص طریقہ مجاہدہ سے قوی ہو جاتی ہیں اور کسی میں بمقتضای خلقت قوی ہوتی ہیں اور اُن سے ایسے ایسے امور ظہور میں آتے ہیں جو اُن لوگوں سے ظہور میں نہیں آسکتے جنکی قوتیں مجاہدہ سے یا بمقتضای خلقت قوی نہیں ہیں۔ حالانکہ وہ سب مور اُسی طرح واقع ہوتے ہیں جیسے تمام کام بمقتضای فطرت انسانی وقوع میں آتے ہیں مگر وہ امور بھی اُن مقدس شخصوں کے معجزے یا کرامات سمجھے جاتے ہیں۔ پھر بہت سی عجیب باتیں بزرگوں کی نسبت ایسی مشہور ہو جاتی ہیں جنکی حقیقت کچھ اصل نہیں ہوتی مگر جنکی طرف وہ منسوب کی جاتی ہیں اُنکی عقیدت کے سبب سے بلا تحقیق اُن پر یقین کر لیا جاتا ہو۔ اسی لئے انبیاء علیہم السلام کے اکثر کاموں کو بطور خوارق عادات کے بیان کیا گیا ہے اور بہت سی باتیں اُنکی طرف ایسی منسوب کی گئی ہیں جنکا کچھ ثبوت نہیں۔ انتہیٰ لمخصاً۔

اسکے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”انہیں غلط خیالات کے سبب لوگوں نے انبیاء سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ

کہ آپ سے خوارقِ عادات کا وقوع میں آنا تو اتر معنوی کی حد کو پہنچ گیا ہے اور جو بات تو اتر سے ثابت ہو اُس کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس زمانہ میں تو اتر کو اُسی حالت میں مفید یقین مانا جاتا ہے جب کہ روایت میں کوئی مضمون دلیل قاطع عقلی یا قانون قدرت کے خلاف مندرج نہ ہو۔

بہر حال کسی نبی کی نبوت کے ثبوت میں اُس کے خوارقِ عادات کو پیش کرنا۔ جیسا کہ قدیم متکلمین کا دستور تھا۔ اس زمانہ میں کچھ بکار آمد نہیں رہا بلکہ کسی نبی کی نسبت یہ ثابت ہونا۔ کہ اُس نے خوارقِ عادات کھانے کا کبھی دعوے نہیں کیا۔ یہی بڑی دلیل سچائی کی سمجھی جاتی ہے۔

سرسید نے برخلاف جمہور متکلمین کے خرقِ عادت کے واقع ہونے سے انکار کیا ہے اور اس دعوے کی تائید میں کہ عجزہ دلیل نبوت نہیں ہو سکتا قاضی ابن رشد اندلسی کی ایک لمبی تقریر انکی کتاب ”کشف عن منہاج الادب فی عقائد الملئہ“ سے نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بعد تسلیم کرنے اس بات کے۔ کہ خدا موجود، مرید، متکلم، قادر اور مالک عباد ہے اور وہ رسول بھیجا کرتا ہے اور اُسے معجزات بھی صادر ہوا کرتے۔ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جسے معجزے صادر ہوتے ہیں وہ خدا کے رسول ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کو۔

بحان آنحضرتؐ کے معجزات پر بحث کی ہے شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب تفسیرات انکایہ قول نقل کیا ہے کہ ”شق قمر ہمارے نزدیک معجزات میں سے نہیں ہے بلکہ علامات قیامت میں سے ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ”اقربت الساعة والنشق القمر“ اور خدا تعالیٰ نے اُن معجزات میں سے (یعنی آنحضرتؐ کے معجزات میں سے) اپنی کتاب میں کچھ ذکر نہیں کیا اور نہ کہیں انکی طرف اشارہ کیا ہے“

اُس کے بعد خود سرسید نے ایک نہایت مفصل اور شافی بحث فطرت انسانی پر اور اس بات پر کی ہے کہ انسان اپنی فطرت کی رو سے ہدایت کرنے والوں کا محتاج ہے اور اسی فطرت کا مقتضایہ ہے

اور چھپا لکا نہیں رکھا اسکا اصلی سبب یہ تھا کہ بڑا جزو اسلام کا +++ جسکی وجہ سے آپ خاتم النبیین ہوئے وہ صرف تکمیل تلقین توحید ذات باری کی تھی جو توحیدات ثلاثہ میں منحصر ہے۔ یعنی توحید فی الذات، توحید فی الصفات اور توحید فی العبادۃ۔ انبیاء میں معجزات کا (علی المعنی المتعارف) یا اولیاء اللہ میں کرامات کا یقین کرنا (گوکہ اعتقاد کیا جاوے کہ خدا ہی نے وہ قدرت یا صفت انہیں دی ہے) توحید فی الصفات کو مکمل کر دیتا ہے۔ کوئی عزت، کوئی بزرگی، کوئی تقدس اور کوئی صداقت اسلام اور انبیاء کی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ اُسے بغیر کسی لاؤلیٹ کے اور بغیر کسی دھوکا دینے کے اور بغیر کسی کرشمہ و کر توت کا دعوے کرنے کے صاف صاف لوگوں کو بتا دیا کہ مجھے تو خدا کے پاس ہیں، میں تو مثل تمہارے ایک انسان ہوں، میرے دل میں جو وحی اُٹالی ہے اُسکی میں تمکو تلقین کرتا ہوں؛ صلی اللہ علی محمد خاتم النبیین وحسبک یٰ یحییٰ

اوپر کے بیان سے ظاہر ہے کہ خوارقِ عادات جو عموماً انبیاء کی طرف منسوب کئے گئے ہیں سرسید اسکی وجہ یہ نہیں سمجھتے کہ انکی نبوت کا یقین لوگوں کو فی الواقع انکے خوارقِ عادات دیکھنے سے ہوا تھا بلکہ انکے نزدیک انسان کی فطرت کا مقتضایہ ہی ہے کہ انبیاء اور اولیاء اور تمام مقدس لوگ۔ جسے انکو عقیدت ہوتی ہے۔ انکی معمولی باتیں بھی اُسکو معجزہ اور کرامت معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اسی مطلب کو وہ آگے چلکر دوسری طرح پر بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ”لوگوں کا خیال ہے کہ انبیاء پر ایمان لانا بسبب ظہور معجزات باہرہ کے ہوتا ہے مگر یہ خیال محض غلط ہے۔ انبیاء پر یا کسی بادی باطل پر ایمان لانا بھی انسانی فطرت میں داخل اور قانون قدرت کے تابع ہے۔ بعض انسان از روی فطرت کے ایسے سلیم لطیف پیدا ہوتے ہیں کہ سیدھی اور سچی بات انکے دل میں بیٹھ جاتی ہے، وہ اسپر یقین کرنے کے لیے دیس کے محتاج نہیں ہوتے۔ باوجودیکہ وہ اُس سے مانوس نہیں ہوتے مگر انکا وجدان صحیح اُسکے سچے ہونے پر گواہی دیتا ہے۔ انکے دامن میں ایک کیفیت

قوم نوح، قوم عاد اور قوم ثمود کے انبیاء کے انکار کرنے کی یہی وجہ بیان کی کہ ”ان انتم الا بشر مثلنا“ اور انھیں غلط خیالات کی وجہ تھی کہ مشرکین عرب بھی آنحضرت صلم سے معجزوں کے طلبگار ہوتے تھے۔ کبھی کہتے تھے کہ اگر یہ پیغمبر ہیں تو کیوں نہیں انکے پاس فرشتے آتے؟ کیوں نہیں انکے پاس خزانہ اتارا گیا؟ کبھی کہتے تھے کہ یہ تو عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے ہیں، بازاروں میں پڑے پھرتے ہیں؛ یعنی انسانوں سے زیادہ کوئی بات انہیں نہیں ہے۔ کبھی آسمان سے پتھر بھی اترانے چاہتے تھے، کبھی آسمان کا ٹکڑا ٹوٹ کر گرنے کی خواہش کرتے تھے۔

اسکے بعد سریرہ، سورہ کہف، سورہ اعراف، سورہ بنی اسرائیل اور سورہ عنکبوت کی وہ آیتیں نقل کی ہیں جنہیں آنحضرت کو حکم دیا گیا ہے کہ جو لوگ معجزہ یا علم غیب کے تجھ سے متوقع ہیں ان سے کہہ دے کہ اسکے سوا کچھ نہیں کہ میں ایک بشر ہوں مثل تمہارے جسکو وحی سے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے اور بس؛ اور کہہ دے کہ میں بغیر خدا کی مشیت کے نہ اپنے نہیں نفع پہنچا سکتا ہوں نہ نقصان، اور اگر میں غیب کا علم رکھتا تو کثرت سے بھلائی مان حاصل کر لیتا اور برائی مجھکو چھوٹی بھی نہیں، میں کچھ نہیں ہوں سوا اسکے کہ مومنوں کو ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں اور کہہ دے کہ پاک ہے میرا رب میں کچھ نہیں ہوں مگر ایک انسان خدا کا بھیجا ہوا؛ اور کہہ دے کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں، میں کچھ نہیں ہوں مگر ایک علانیہ ڈرانے والا۔

ان آیتوں کے نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”آنحضرت صلم کے پاس رجو کہ افضل الانبیاء والرسل ہیں۔ معجزہ نہ ہونے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء سابقین (علیہم السلام) کے پاس بھی کوئی معجزہ نہ تھا۔ اور جن واقعات کو لوگ معجزہ (متعارف معنون میں) سمجھتے تھے وہ درحقیقت معجزات نہ تھے بلکہ ایسے واقعات تھے جو مطابق قانون قدرت کے واقع ہوئے تھے۔ خاتم النبیین (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے جو اس بات کو کھول دیا

نہ آنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، اور اگر اُس سے جیسا کہ جمہور تنکلیں قائل ہیں کوئی امر خارقِ عادت جو قوانینِ قدرت کے برخلاف ظہور میں آئے۔ مراد ہے توہم اُس کے انکار پر مجبور ہیں؛ نہ اسلئے کہ حکماء و فلاسفہ اُس کو کسی وجہ سے ناممکن سمجھتے ہیں بلکہ صرف اسلئے کہ قرآن ہکوصات صاف ہدایت کرتا ہے کہ قوانینِ قدرت کبھی نہیں بدلتے۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے سورہ قمر میں فرمایا کہ ”انا کل شیء خلقناہ بقدر“ اور رعد میں فرمایا ”کل شیء عندہ بقدر“ اور فرقان میں فرمایا ”خلق کل شیء بقدر“ اور روم میں فرمایا ”لا تبدل خلق اللہ“ اور ملائکہ میں فرمایا ”قلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا“ اور سورہ فتح میں فرمایا ”سنۃ اللہ الی قد خلت من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا“ اور بنی اسرائیل میں فرمایا ”قل کل یعمل علی شاکلۃ“ (ای علی طریقہ الی جیل علیہا) یہ تمام آیتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کوئی شے اپنے اندازہ سے۔ خدا تعالیٰ نے اُس کے لئے مقرر کیا ہے۔ نہ بڑھ سکتی ہے نہ گھٹ سکتی ہے اور خدا کی بنائی ہوئی زمین تبدیلی ممکن نہیں اور خدا کی سنت (یعنی عادت) نہ بدل سکتی ہے نہ دیگر گون ہو سکتی ہے اور ہر کوئی اُسی طریقہ پر چلتا ہے جو اُسکی جبلت میں رکھا گیا ہے۔ اتنے ملخصاً۔

بہر حال معجزہ۔ جن محنوں میں کہ وہ عموماً بولا جاتا ہے۔ سرسید کے نزدیک نہ اُس کا وقوع میں آنا ممکن ہے اور نہ نبی کی تصدیق اُس پر موقوف ہے۔ اُنکے نزدیک نبی کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اُسکی تعلیم تمام طبقاتِ اناس کی سمجھ کے موافق اور جاہل اور حکیم اور خدا پرست اور نفس پرست سب کو ایک نتیجہ پر پہنچانے والی ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ ”حکماء الہی اور انبیاء ربانی دونوں ایک سا کام کرتے ہیں، فرق یہ ہے کہ حکماء اُن چند لوگوں کو تربیت کر سکتے ہیں جن کا دل دماغ تربیت پاچکا۔“

پیدا ہوتی ہے جو اُس بات کے سچ ہونے پر انکو یقین دلاتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو انبیای صادقین پر صرف اُنکا وعظ و نصیحت سنکر ایمان لاتے ہیں، نہ معجزوں اور کرامتوں پر۔ اسی فطرت انسانی کا نام شارع نے ہدایت رکھا ہے۔ مگر جو لوگ معجزوں کے طلبکار ہوتے ہیں وہ کبھی ایمان نہیں لاتے اور نہ معجزوں کے دکھانے سے کوئی ایمان لاسکتا ہے۔ خود خدا نے اپنے رسول سے فرمایا کہ ”اگر تو زمین میں ایک سرنگ ڈھونڈھ نکالے یا آسمان میں ایک سیڑھی لگائے تب بھی وہ ایمان نہیں لائینگے“ اور ایک جگہ فرمایا کہ ”اگر تم کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب بھی بھیج دین اور اُسکو وہ اپنے ہاتھوں سے بھی چھو لیں تب بھی وہ ایمان نہیں لائینگے اور کہیں گے کہ یہ تو علانیہ جادو ہے“ پس ایمان لانا صرف ہدایت (فطرت) پر منحصر ہے، جیسے کہ خدا نے فرمایا ”اللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم“ ہادی باطل پر جو لوگ ایمان لاتے ہیں (یا ہادی برحق کی بات قبول نہیں کرتے) اُنکے دل میں بھی غالباً اسی قسم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اُسکا سبب کبھی اُنکی فطرت ہوتی ہے جو کجی کی طرف مائل ہو اور سیدھی طرف مائل ہی نہیں ہوتی؛ اور اسی طرف خدا نے اشارہ کیا ہے جہاں فرمایا ہے ”من یشاء اللہ یضللہ ومن یشاء یجعلہ علی صراط مستقیم“ اور آیت یہ ہوتا ہے کہ دین آباؤ کا اور سوسائٹی کا ایسا جوہر اُنکی طبیعتوں پر ہوتا ہے کہ سیدھی بات کے دل میں آنے کی جگہ ہی نہیں رہتی، اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ مٹھلے بالطبع ہو کر اُس بات پر غور نہیں کرتے اور اسی کی طرف خدا نے اشارہ کیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ ”فمن یرد اللہ ان یرہدہ لہ یشرح صدہ لا سلام ومن یردان یضللہ یجعل صدرہ ضیقاً حرجاً کانما یصعد فی السماء کذلک یجعل اللہ الرجس علی الذین لا یؤمنون“

پھر اسی معجزہ کی بحث میں سرسید نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر معجزہ سے جیسا کہ شاہ ولی اللہ اور بعض دیگر محققین نے لکھا ہے۔ یہ مراد ہے کہ وہ بغیر موجود ہونے اسباب کے طور میں نہیں آتا تو ہم ایسے امر کے واقع ہونے سے انکار نہیں کرتے مگر نبی کے ساتھ اُسکے مخصوص ہونے اور غیر نبی سے اُسکے ظہور میں

خالی ہیں؛ مگر جس جماعت کی تشفی کے لیے وہ کتاب لکھی گئی ہو، اُنپر اسکا منتر کچھ کارگر نہیں ہوتا۔ برخلاف اسکے جو طریقہ سرسید نے اپنی تفسیر میں اسلام کی حقیقت ثابت کرنے کا اختیار کیا ہے۔ اگرچہ پُرانے خیالات کے مسلمان۔ جنکے لئے درحقیقت یہ تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اسکی کسی بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن نئے خیالات کے لوگ۔ جو اس تفسیر کے مخاطب صحیح ہیں۔ وہ اُس سے خاطر خواہ تشفی پاتے ہیں۔

آج کل ہندوستان میں مذہبی آزادی کا یہ حال ہے کہ ہر شخص جس مذہب پر اور جس مذہبی تصنیف پر چاہے اعتراض کر سکتا ہے۔ باوجود اسکے سرسید کی مذہبی تصنیفات پر جب قدر اعتراضات آج تک سُنے گئے ہیں وہ سب قدیم خیالات کے مسلمانوں کی طرف سے سُنے گئے ہیں، کسی نے تعلیم یافتہ مسلمان نے اُنپر نکتہ چینی نہیں کی۔ اگرچہ آپس میں شک نہیں کہ نئے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اکثر مذہب کی طرف سے ایسے بے پردا ہیں کہ وہ کسی مذہبی تصنیف کے مخالف یا موافق لکھنے کو ایک فضول بات سمجھتے ہیں اور بہت بڑا حصہ اس گروہ کا وہ لوگ ہیں جو اس بات کے سمجھنے کی لیاقت ہی نہیں رکھتے کہ وہ کچھ لکھا گیا ہے وہ اسلام کے خالص اصول کے موافق صحیح ہے یا نہیں؛ مگر بائینہ نئے خیالات کے مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو دین اسلام کے دلدادہ ہیں، قرآن اور حدیث کو بخوبی سمجھتے ہیں اور جو کچھ مذہب کے متعلق آج کل لکھا جاتا ہے اُسپر نکتہ چینی کرنے اور رے دینے کی کافی لیاقت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے بھی کسی نے۔ سوا اسکے کہ بعض جزئیات میں سرسید سے اختلاف کیا ہو۔ اُن اصول کے تسلیم کرنے سے جن پر تفسیر مذکور کی بنیاد رکھی گئی ہے انکار نہیں کیا۔

سرسید نے جن اصول پر قرآن کے معنی بیان کئے ہیں اُنہیں ظاہر کوئی بات ایسی نہیں معلوم ہوتی جسپر کچھ گرفت ہو سکے، مگر آپس میں شک نہیں کہ بہت سی آیتوں کے معنی بیان کرنے میں جن اصول کی انکو

برخلاف اسکے انبیاء تمام کافہ انام کو تربیت کرتے ہیں جنکا بہت بڑا حصہ محض ناتربیت یافتہ، جاہل، وحشی، جنگلی، بدوی، بے عقل اور بد دماغ ہوتا ہے اور اسی لئے انبیاء کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ ان حقائق و معارف کو جنگو تربیت یافتہ عقل بھی مناسب غور و فکر و تامل سے سمجھ سکتی ہے۔ ایسے الفاظ میں بیان کریں کہ تربیت یافتہ دماغ اور کوڑ مغز دونوں برابر فائدہ اٹھاویں۔ قرآن مجید میں جو بے مثل چیز ہے وہ یہی ہے کہ اسکا طرز بیان ہر ایک کے مذاق اور دماغ کے موافق ہے اور باوجود اسقدر اختلاف کے دونوں نتیجہ پانے میں برابر ہیں۔ انھیں آیات کی نسبت (یعنی جن آیتوں میں جنت اور جہنم و تصور وغیرہ کا بیان ہے) دو مختلف دماغوں کے خیالات پر غور کرو: ایک تربیت یافتہ دماغ خیال کرتا ہے کہ بہشت وغیرہ کا جن الفاظ سے بیان ہوا ہے اُسے بعینہ وہی اشیاء مقصود نہیں بلکہ صرف اعلیٰ درجہ کی خوشی و راحت کو فہم انسانی کے لائق تشبیہ میں لانا ہے۔ اس خیال سے اُس کے دل میں ایک بے انتہا عمدگی نعمت جنت کی اور ایک نہ خفیف اوامر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے کی پیدا ہونی ہے۔ اور ایک کوڑ مغز یا شہوت پرست زائد سمجھتا ہے کہ حقیقت بہشت میں نہایت خوبصورت آن گزت حوریں ملیںگی، شرابیں پینے لگیں، میوے کھا دیں گے، دودھ اور شہد کی نابون پین اور جو دل چاہیہ کافرے اڑائیں گے، وہ بھی اس لغو و بیودہ خیال سے دن رات اوامر کے بجالانے اور نواہی سے بچے کوشش کرتا ہے۔ اور جس نتیجہ پر پہنچتا تھا اُسی پر یہ بھی پہنچ جاتا ہے اور کافہ انام کی تربیت کا کام بخوبی کیوں پاتا ہے۔ پس جس شخص نے قرآن مجید کی ان حقائق پر جو فطرت انسانی کے مطابق ہیں غور نہیں کیا اُسے حقیقت قرآن کو مطلق نہیں سمجھا اور اس نعمت عظمیٰ سے بالکل محروم رہا۔

اس طریقہ استدلال میں۔ جو کہ سرسید نے اسلام کی سچائی ثابت کرنے کے لئے اختیار کیا ہے۔ اور شیخ حسین افندی کے طریقہ میں۔ جو رسالہ حمیدیہ میں اختیار کیا گیا ہے۔ یہ فرق ہے کہ شیخ کے استدلال سے زیادہ تر وہ لوگ متاثر ہوتے ہیں جن پر نئی تعلیم نے کچھ اثر نہیں کیا اور جن کے دل بہرسم کے شکوک و شبہات سے

اسی اصول کے موافق سرسید نے اُس آیت کی تفسیر کی ہے جس میں زمین و آسمان کا چھ دن میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے اور جس پر سائنس کا یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ دنیا چھ دن سے بہت زیادہ عرصہ میں پیدا ہوئی ہے۔ اُنکی تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ اس سے کسی حقیقت یا کسی خبر کا بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ توریت میں بھی چونکہ اس موقع پر چھ دن کا لفظ واقع ہوا تھا اور عرب کے تمام اہل کتاب اور دیگر قومیں جو اہل کتاب سے میل جول رکھتی تھیں سب کا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا چھ دن میں بنی ہے اسلئے شارع نے اسلام کا اصل مقصد۔ یعنی خدا کی الوہیت اور توحید کا یقین دلانا۔ مخاطبین کی سمجھ کے موافق ان لفظوں میں ادا کیا ہے کہ ”ان لبکم اللہ الذی خلق السموات والارض فی ستة ايام“ چونکہ سرسید کے قول کے موافق بزرگوں اور مقدس لوگوں کی طرف خوارق عادات کا منسوخ کرنا انسان کی فطرت کا مقتضا ہے یہاں تک کہ اُنکی اکثر معمولی باتیں بھی معجزات یا کرامات تصور کی جاتی ہیں۔ ورنہ اصرار انبیاء بنی اسرائیل کے تھے جو عرب کے اہل کتاب میں مشہور تھے اُنہیں بہت سی باتیں بطور خوارق عادات کے مشہور چلی آتی تھیں اور قرآن میں اُن قصوں کا بیان کرنا مقصود بالذات نہ تھا بلکہ اُنہیں جو باتیں مخاطبین کی ہدایت اور تہذیب نفس میں دخل رکھتی تھیں صرف اُنکا مجملہ ذکر کرنا منظور تھا اسلئے یہ ایک لازمی بات تھی کہ انبیاء بنی اسرائیل کے قصوں میں سے جس قدر کہ قرآن مجید میں بغرض روحانی تعلیم کے اخذ کیا جائے وہ اُنہیں پیرایوں میں بیان کیا جائے جو اہل کتاب کے دلوں پر مثل علوم متعارفہ کے نقش ہو رہے تھے۔ کیونکہ قرآن کا اصل مقصد اُن نصیحتوں کا بیان کرنا تھا جو اُن قصوں سے استنباط ہوتی تھیں نہ کہ اُن قصوں کی نسبت اُنیسویں صدی عیسوی کی سائنٹفک تحقیقات کا بیان کرنا۔ ہاں بلاشبہ قرآن کا۔ جو خاصکہ توحید کی تکمیل کو لئے نازل ہوا تھا۔

پابندی کرنی چاہیے تھی اُنکی پابندی نہیں کی گئی اور اسی وجہ سے بعض آیات کی تفسیر میں سرسید کے بعضہ ہتھیال آدمی اُنکے ساتھ متفق نہیں ہیں۔

مثلاً سرسید حسبِ طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا قرآن میں مذکور ہونا تسلیم نہیں کرتے اس طرح اُنکے نزدیک انبیاء سابقین کے معجزات کا بھی قرآن میں کچھ ذکر نہیں ہے اور اسلئے اُنھوں نے انبیاء سابقین کے ہر ایک ایسے واقعہ کو جو ظاہر کسی امر خارقِ عادت پر دلالت کرتا ہے قانونِ قدرت کے مطابق ثابت کرنے میں کوشش کی ہے؛ مگر اُنکے بعض ہم خیال۔ باوجود اسکے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا قرآن میں مذکور نہ ہونا تسلیم کرتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی امر قانونِ قدرت کے خلاف وقوع میں نہیں آسکتا۔ مگر اُنکو اسی میں کچھ شک نہیں ہے کہ انبیاء سابقین کے اکثر واقعات اگرچہ نفسِ لامر میں موافق قانونِ قدرت کے واقع ہوئے ہوں۔ مگر قرآن مجید میں بطور خوارقِ عادت کے۔ جیسا کہ عرب کے اہل کتاب عقائد رکھتے تھے۔ بیان کئے گئے ہیں اور اُنکے نزدیک قرآن کا ہر طریق بیان ہرگز اسکی سچائی کے برخلاف نہیں ہے۔ کیونکہ قطع نظر اُردو لائبریری کے سرسید نے مذکور آیتوں کی تفسیر اس اصول کے مطابق کی ہے کہ قرآن میں بہت سی باتیں۔ بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ فی الواقع صحیح ہیں یا نہیں۔ محض لوگوں کی معمولی سمجھ اور اُنکے اعتقاد کے موافق بیان کی گئی ہیں۔ اور یہ اصول درحقیقت اُنھوں نے شاہ ولی اللہ کی کتاب حجۃ بالغہ سے اخذ کیا ہے جہاں وہ لکھتے ہیں کہ ”شائع نے محض لوگوں کی معمولی سمجھ کے موافق۔ جو دقائقِ علم و حکمت تک پہنچنے سے پہلے اُنکی مہلِ خلقت میں ودیعت تھی۔ اُنسے خطاب کیا ہے“ اور دوسری جگہ اسی کتاب میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ ”انبیاء کی شان اس بات کی مقتضی ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ انکی معمولی سمجھ اور عقل سے بڑھ کر چپہرہ مجبول ہو ہیں۔ کلام نہ کریں“

مسئلہ کی تحقیق اور اسی قسم کی اور بہت سی تحقیقاتیں اور بحثیں خاص کر توجہ کے لائق ہیں۔
 اگرچہ اس میں شک نہیں کہ سرسید نے اپنی تفسیر میں قرآن کے وہ سرسیر امر اور ظاہر کئے ہیں جن کے
 اعلان کرنے کی ممانعت قدیم سے ہوتی چلی آئی ہے مگر اس باب میں انھوں نے جو عذر کئے ہیں وہ بھی
 لحاظ کے قابل ہیں۔ انھوں نے اپنی تفسیر کی تیسری جلد میں علامہ ابن رشد کی ایک لمبی تقریر کا خلاصہ
 نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مسائل غامضہ جو جمہور کے سمجھنے کے لائق نہیں ہیں ان کو ایسے لوگوں
 کے سامنے جو ان کے اہل نہیں ہیں۔ بیان کرنے والا کافر ہے۔ اور اُن کی وجہ انھوں نے یہ بیان کی ہے
 کہ مثلاً ایک شخص کسی نص کی تاویل کرتا ہے سو ظاہر ہے کہ اُس کا مقصد ظاہری معنوں کو باطل کرنے اور
 تاویلی معنوں کے ثابت کرنے کا ہوتا ہے۔ پس جب کہ عام آدمیوں کے نزدیک ظاہری معنی باطل ہو گئے
 اور تاویلی معنی ان کی سمجھ میں نہ آئے اور وہ نص اصول دین سے علاوہ دیکھتی ہے تو ظاہر ہے کہ کفر تکفیرت
 پہنچ جائیگی۔ پس عام لوگوں کو سمجھا دینا چاہیے کہ یہ خدا کی باتیں ہیں خدا ہی ان کی حقیقت خوب
 نا ہے انتہی ملخصاً۔

اس تقریر پر سرسید لکھتے ہیں کہ ”نتیجہ اس تقریر کا یہ ہے کہ کوئی بات بھی شریعت کی۔ جو بیان حقیقت یا تاویلات
 کی قسم سے ہو۔ سوائے انہیں فی العلم کے کسی کے سامنے بیان نہ کیا وے۔ جس قسم کے لوگوں کو ابن رشد نے انہیں فی العلم
 میں قرار دیا ہے اس زمانہ میں تو ویسا شخص کوئی نہیں ہے بلکہ اگلے زمانہ میں بھی دو ایک کے سوا کوئی نہ تھا؛ پس
 ضرورۃً لازم آتا ہے کہ تمام مقدم باتیں شریعت کی بطور ایک معما و چیستان یا مثل راز فریبسن کے غیر معلوم رہنی چاہئیں“
 ”اگر ہمارا مذہب اسلام ایسا ہو کہ اُس کے اصول لوگوں کو نہ سمجھا سکیں جو ان کو سمجھنا چاہتے ہیں، یا ان لوگوں
 کی تشفی نہ کر سکیں جن کے دل میں شبہات پیدا ہوئے ہیں بلکہ ان سب کو اس پر مجبور کریں کہ ان باتوں کو اسی طرح مان لیں

یہ کام تھا کہ خرق عادت کا غلط خیال۔ جو توحید فی الصفات کا منافی تھا۔ اُسکی غلطی ظاہر کر دے
 سوائے نہایت تصریح کے ساتھ مستقل طور پر نہ کہ انبیاء بنی اسرائیل کے واقعات کے ضمن میں
 اُسکی غلطی کو ظاہر کر دیا اور خود خاتم النبیین کی زبان حق ترجمان سے بکرات و قرأت علی رؤس الاشهاد
 کھلا دیا کہ ”انما الایات عند اللہ عا لما اتانا نذیر مبین“

الغرض باوجود ان جزئی اختلافات کے۔ جو سرسید کے اسکول کے بعض اشخاص بعضی آیتوں
 کی تفسیر میں اُنکے ساتھ رکھتے ہیں۔ ظاہر اُن اصول کو سب تسلیم کرتے ہیں جن پر اس تفسیر کی
 بنیاد رکھی گئی ہے اور غالباً مستثنیٰ مقامات کے سوا۔ جنکو ہم کسی دوسری تحریر میں بیان کرینگے۔ جو کچھ
 کہ سرسید نے زمانہ حال کے مسائل کلامیہ کی نسبت لکھا ہے اسکو صرف تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ اس زمانہ
 کی اسلامی فتوحات میں شمار کرتے ہیں۔ خصوصاً وحی اور اُسکے نزول کی تحقیق، نبوت کی حقیقت،
 قرآن کے معجز ہونے کا بیان، جنت و دوزخ اور اُسکے نعیم و آلام کی حقیقت، آدم کے بہشت۔ سے
 نکلے جانے کی تحقیق، معجزہ کی بحث، ملائکہ اور شیطان کی بحث، جبریل و میکائیل کی حقیقت،
 ناسخ و منسوخ کی بحث، ہمت قبلہ کی تحقیق، حضرت عیسیٰ کے بن باپ پیدا ہونے کی تحقیق، شہدا
 کو زندہ سمجھنے کی تحقیق، قطع ید سارق کے مسئلہ کی تحقیق، نفع صور اور وزن اعمال کی تحقیق، روح
 اور اُسکے باقی رہنے کی بحث، آخرت اور قیامت کا بیان۔ حشر اجساد کی بحث، آفات اخسی و سماوی
 کا باعث انسان کے گناہوں کو قرار دینے کا بیان، خدا کے ساتھ موسیٰ کے کلام کرنے اور کوہ طور پر تجلی
 ہونے کی بحث، دیدار الہی کی بحث، بدر و حنین کی لڑائی میں فرشتوں کے آنے کی تحقیق، طوفان
 نوح کی بحث، حضرت یعقوب کے نابینا ہونے کے بعد بینا ہونے کی تحقیق، معراج اور شق صد کے

سمجھنے کے لائق نہیں ہیں نصیحتوں کے سمجھانے سے باز نہیں رہے بلکہ طرح طرح سے سمجھایا اور کوشش کی کہ انکو اُنکے اُنکے سمجھنے کے لائق کریں “

”اس خوف سے کہ اُن لوگوں کے نزدیک جب ظاہری معنی باطل ہو جائینگے اور اصل حقیقت یا تاویل کے سمجھنے کے لائق نہ ہونے کے سبب وہ اُسکو نہ سمجھیں گے تو اصول شرع سے منکر ہو جائینگے اور کفر تک نوبت پہنچا دیں گے۔ ہمو
حقیقت اور صداقت کے بیان سے باز نہیں رہنا چاہئے۔ اگر یہ الزام صحیح ہو تو قرآن مجید بھی با اینہم خرابی اس الزام سے بری نہیں رہ سکتا؛ خود خدا تعالیٰ فرماتا ہے ”یضل بہ کثیرا و یهدی بہ کثیرا“

ابن رشد نے اپنی تقریر میں یہ بھی بیان کیا تھا کہ ان باتوں کا بیان کرنا خاص کر اُس حالت میں اور بھی زیادہ خطرناک ہے جبکہ اصول شریعت میں تاویلات فاسدہ ہونے لگیں جیسا کہ ہمارے (یعنی ابن رشد کے) زمانہ میں لوگوں کو یہ بیماری لگ گئی ہے اس تقریر پر سرسید یہ یادرکھ کر رہے ہیں کہ ”تاویلات فاسدہ بھی اگر ہوں تو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتیں“ اسلئے کہ جو چیز غلط ہے اُسکی غلطی بہت دیر پا نہیں ہو سکتی، دوسروں کو اُسکی غلطی بیان کرنے کا اور غلط کو صحیح کرنے کا موقع ملتا ہے اور اگر وہ بیان ہی نہ کیا وین تو سچ بات کے ظاہر ہونے کا کبھی موقع ہی نہیں آ سکتا“

اسکے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”اصل یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں جبکہ علمائے اس قسم کی ائین لکھیں۔ غم ایک نہایت محدود فرقہ میں تھا جسکو وہ اپنے خاص خاص لوگوں کے سوا اوروں میں شائع کرنا ہی پسند نہیں کرتے تھے اور تمام لوگ اعلیٰ و ادنیٰ علوم کے ادنیٰ و سائل سے بھی بے بہرہ تھے، اور اُنکے دل شبہات و تشکیکات سے پاک تھے، اور یہی باعث ہوا کہ اُن علمائے ایسی رائے قائم کی تھی۔ مگر وہ زمانہ گیا، علوم و حکمت اب اس قدر عام ہو گئی کہ ایک بہت بڑا حصہ دنیا کا اُس سے واقف ہو گیا، طفل رستہ میں ارسطو اور افلاطون کی غلطیوں کا۔ جہاں جہاں

تو ہم اپنے مذہب کی صداقت فی نفسہ اور بمقابلہ دیگر مذاہب غیر حق کے کیونکر ثابت کر سکتے ہیں۔ ایک عیسائی کہتا ہے کہ تثلیث کا مسئلہ کہ تین تین بھی ہیں اور ایک بھی ہیں۔ ایک الہی مسلہ ہے؛ اس پر بے سمجھے یقین کرنا چاہیے پس اگر ہم مذہب اسلام کے بہت سے مسئلوں کی نسبت ایسا ہی کہنا قرار دیں تو کیا وجہ ہے کہ اُسکی تکذیب اسکی تصدیق کریں اس کے بعد اُنکی تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں عالم اور جاہل سب دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو اپنے مذہب کی ہر ایک بات کو بلا دلیل تسلیم کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو ہر ایک بات کی دلیل طلب کرتے ہیں؛ عام اس سے کہ وہ جاہل ہوں یا عالم کسی بات کا بغیر دلیل یقین نہیں کرتے۔ اس دوسری قسم کے لوگوں سے (جو اس زمانہ میں بہت کثرت سے ہیں) یہ کہنا کہ تم راہِ بخین فی العلم میں سے نہیں ہو لہذا مذہب کی ہر ایک بات کو بلا دلیل تسلیم کر لو اور اسی پر یقین رکھو۔ کس طرح اُنکے دل کو تشفی دے سکتا ہے؟ کیونکہ یقین کوئی اختیاری چیز نہیں ہے بلکہ اضطراری شے ہے کہ جب وہ شیعہ اُفح نہو جسے یقین میں خلل ڈالا ہے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس ضرور ہے کہ ہر ایک اہل قابل بیان کی حقیقت اور قابل تاویل کی تاویل اُنکے سامنے بیان کی جائے اور اس صورت پر جو لوگ اُن باتوں کے بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور بیان نہیں کرتے وہ اُسی دلیل سے کافر قرار پاتے ہیں جس دلیل سے کہ ابن رشد نے ان چیزوں کے بیان کرنے والوں کو کافر بتایا ہے۔

پھر وہ لکھتے ہیں کہ ”فرض کرو اُن متشککین کو اس قدر لیاقت نہیں ہے کہ وہ اُن حقیقتوں اور تاویلوں کو سمجھیں مگر اتنی بات تو اُنہیں ثابت ہوگی کہ اُسکے لئے دلیلین اور اُسکی صداقت کے ثبوت کے لئے وجوہاتین اور اُس کی حقیقت کے لئے بیانات ہیں مگر ہم اُنکو سمجھ نہیں سکتے۔ ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اُنکے سمجھانے کا جو فرض ہم پر تھا اُسکو تو بلاشبہ ہم ادا کر دیں گے۔ بہت لوگوں نے پیغمبروں کی نصیحتوں کو نہیں سمجھا مگر پیغمبر اس خیال سے کہ وہ اُنکے

سوشل خرابیان محسوس ہونے لگی ہیں مگر اتنی جرأت کسی کو نہیں ہوتی کہ تمام قوم کے برخلاف کسی بُری رسم یا ریت کو ترک یا کسی اچھی بات کو اختیار کیا جاسکے۔ سرسید نے اپنی ایک تحریر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اکثر لوگ ہیں جو بہت سی رسوم کو بُرا جانتے ہیں مگر انکو چھوڑ نہیں سکتے، اور بہت سی باتوں کو اچھا جانتے ہیں مگر انکو اختیار نہیں کرتے۔ بعضے تو یہ چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ دخلت کرے تو قرار واقعی اصلاح ہو، مطلب یہ کہ ہم بدنامی سے بچیں اور گورنمنٹ بدنام ہو، اور بعضے کہتے ہیں کہ برادری کا اتفاق ہو تو کام چلے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”لوگ اصلاح اور ترقی کو اتفاق پر منحصر رکھتے ہیں +++ مگر میں سمجھتا ہوں کہ رسوم کی اصلاح اور ترقی کا ذریعہ اتفاق نہیں ہے بلکہ اختلاف ہے۔ جس شخص کے دل میں اصلاح کا خیال ہو اسکو چاہئے کہ خود نہایت استقلال اور مضبوطی اور بہادری سے تمام قوم سے اختلاف کرے اور اُس رسم کو توڑے یا اُس میں اصلاح اور ترقی کرے۔ بے شک تمام قوم اُسکو بُرا کہیگی اور نگو بنائیگی، مگر پھر رفتہ رفتہ اُسکی پیروی کرنے لگیں اور جس طرح کہ اولادہ ہدف تیر ملامت ہوا تھا انجام کو دی سب کا ہادی اور پیشوا اور مصباح موم سار کیا جائیگا“

بلاشبہ جس شخص میں قوم کے برخلاف کسی کام کے کرنے کی جرأت نہیں ہوتی وہ کسی قوم کا مصلح بننے کی لیاقت نہیں رکھتا۔ سرسید میں یہی چیز تھی جس نے انکو اس منصب جلیل کے لائق بنایا تھا۔ ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں کہ کسی شخص نے حلتِ طعام اہل کتاب کے باب میں سرسید کی ایک تحریر دیکھی کہ یہ لکھا تھا کہ ”کاش ہم سید صاحب کو اپنے قول کے موافق عمل کرتے ہوئے بھی دیکھیں“ سرسید نے فوراً اس کے جواب میں لکھا کہ ”نہایت کیسہ وہ آدمی ہے جو کتنا کچھ ہوا اور کتنا کچھ ہو“ اور اُس سے بھی زیادہ کیسہ وہ ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم و رواج کی شرم سے یا لوگوں کے لعن و طعن کے ڈر سے اُس کے کرنے میں تاہل کرے۔

انھوں نے کی ہیں، ذکر کرتا ہے، ہزاروں آدمی ہر شہر و قصبہ میں ایسے موجود ہیں جو خود کچھ نہیں جانتے مگر بہت سے مسائل علوم و حکمت کے سن سن کر اُنکے کان آشنا ہو گئے ہیں، اور اکثر اناس وہ ہیں جنکے دل شبہات و تشکیکات سے مملو ہیں۔ اس زمانہ میں جو اہل علم ہیں انکا ایمان بھی حلق کے نیچے تک نہیں ہے، مونہ سے کہتے ہیں کہ جو کچھ قرآن و حدیث میں آیا ہے اُسپر یقین کرنا چاہئے مگر دل میں شبہات بھرے پڑے ہیں۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ یقین کرنے سے نہیں ہوتا بلکہ ہونے سے ہوتا ہے۔ پس اب یہ زمانہ ہے کہ جو کوئی بقدر اپنی طاقت کے اُن تمام حقائق اور تاویلات کو نہ کھولے اور لومہ لاثم سے نڈر ہو کر اگلے علما کی اُن غلطیوں کو جو اُس زمانہ کے ناکمل علوم اور ناکمل تحقیقات کے سبب حقائق کے بیان اور قرآن مجید کی تفسیر میں راہ پا گئی ہیں۔ عام طور سے سب کے سامنے بیان نہ کرے وہ اپنے فرض کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ ومن يفعل ذلك فهو يؤدى حق الله وحق دينه وحق اهل دينه وقومه۔ واللہ المستعان۔

اگرچہ ہندوؤں میں اس صدی کے آغاز سے وقتاً فوقتاً ایسے اولوالعزم آدمی اُٹھتے رہے ہیں جنھوں نے اپنی قوم کی سوشل خرابیوں کی اصلاح پر کمر باندھی ہے۔ جیسے راجہ رام موہن رلے، بابو کیشپ چندر سین، ایشر چندر ودیا ساگر، سریش چندر بھٹا چارج، رام تنولا ہیٹری، سوامی دیانند سرتی وغیرہ وغیرہ، مگر مسلمانوں میں ظاہراً و شخصوں کے سوا کہ دونوں دلی کی خاک سے اُٹھے تھے کسی نے اس کام پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ ایک مولانا اسماعیل وردوسرے سید احمد خان۔ گو کہ زمانہ کے اقتضا سے مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا ہوتے جاتے ہیں جنکو قوم کی

لے سرسید کے اس بیان میں کسی قدر تسامح ہے، ہمارے نزدیک یہ مطلب اُنکو اس طرح ادا کرنا چاہیے تھا کہ ”نڈر ہو کر اُن باتوں کو جنکے بیان کرنے کا اب سے پہلے کبھی وقت نہیں آیا تھا اور ایسے ہمارے قدیم مفسرین اُنکے بیان کرنے سے سکتا رہے تھے۔ عام طور سے سب کے سامنے بیان نہ کرے وہ اپنے فرض کے ادا کرنے سے قاصر ہے ۱۲

ایک مدت تک مفتوح قوم کو بیچرل طور پر فاتح قوم کے ساتھ رہنے ضرور ہیں۔ مسلمانوں کی یہ نفرت اور کراہیت اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ اس باب میں جو کچھ شریعت کا حکم ہے اُسکو علماء عوام اناس کے سامنے صاف صاف بیان نہیں کر سکتے تھے؛ اور اگر کوئی عالم ایسی جرأت کر بیٹھتا تھا تو اُسکی بات کو کوئی تسلیم نہیں کرتا تھا اور اُسکی طرف سے کھٹک جاتا تھا۔ ایک اور وجہ سے بھی علماء مسلمانوں کو انگریزوں کے میل جول سے مانع آتے تھے؛ اُنکو خوف تھا کہ حاکم و محکوم قوم کا میل جول۔ خاص کر اُس صورت میں کہ حکمران قوم اپنے دین کی اشاعت میں سرگرم ہو۔ ضرور ہے کہ محکوم قوم کو حاکمون کے مذہب کی طرف مائل کرے۔

المغرض غدر سے پہلے مسلمان عموماً انگریزوں کی مخالفت سے اور ہر ایک بات میں اُنکے ساتھ

الہ معتبر ذریعہ سے سنا گیا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب زمانہ میں ایک شریعت مسلمان مولوی نے۔ جو میان دو آب کے کسی ضلع میں مصلحت ماصدا میں تھے ایک روز کسی یوروپین حاکم کے بنظر پر اُنکے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھا لیا۔ یہ خبر فوراً مشہور ہو گئی، بی صاحب کی برادری نے اُنکو ذات سے خارج کر دیا۔ اُنھوں نے ہر چند اہل برادری کے سامنے آئین اور حدیثین پڑھیں مگر کسی نے التفات نہ کیا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ مولوی کے مخالف اور کچھ موافق دلی میں شاہ صاحب مسئلہ پوچھنے کو آئے۔ جب شاہ صاحب کے مدرسہ کے دروازہ پر پہنچے تو شاہ صاحب کے چھوٹے بھائی شاہ رفیع الدین اندر سے نکلتے تھے اُن لوگوں نے پہلے انھیں سے مسئلہ پوچھا۔ شاہ رفیع الدین نہایت صاف گواہ آزاد طبع آدمی تھے اُنھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جنھوں نے مولوی کو ذات سے خارج کیا اُنھوں نے جھک مارا اُسے کوئی کام شرع کے خلاف نہیں کیا۔ مگر کسی نے اُنکا کہنا نہیں مانا اور بڑے شاہ صاحب پاس پہنچے۔ اُنھوں نے صورت حال سن کر ایک لمبی چوڑی تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ اس مولوی نے ایسا کام کیا ہے کہ قریب کفر کے پہنچ گیا ہے جو لوگ مولوی کے مخالف تھے وہ یہ سن کر خوش ہو گئے مگر اسکے طرفداروں نے پوچھا کہ حضرت وہ اب کسی طرح مسلمان بھی ہو سکتا ہے؟ شاہ صاحب نے فرمایا کہ کفر کے قریب پہنچ جانے سے کوئی کافر نہیں ہو جاتا اس لئے وہ اسلام سے خارج نہیں ہوا مگر احتیاطاً اُسکو باپچون کھے اور آمنت بائیں پڑھواؤ اور قدم شریعت کا پانی پلوؤ اور پھر برادری میں شامل کرو۔ اگر شاہ صاحب اہل غدار پر تقریر کرتے تو غالباً اُنکا کہنا بھی کوئی نہانتا اور اُن مولوی کو برادری میں شامل نہ کیا جاتا ۱۲

جو کام سرسید کی ذات سے علاقہ رکھتے تھے اور جنگا کرنا نہ کرنا خود اُنکے اختیار میں تھا انہیں رسم و رواج کی پابندی کو اُنھوں نے بالکل چھوڑ دیا تھا۔ شادی غمی اور بیچ نہوار میں جو فضول رسمیں قوم میں جاری ہیں سرسید کے گھر میں کہیں اُنکا نام و نشان نہ تھا۔ اُنھوں نے اُس بیٹے کا نکاح جو ہائی کورٹ کا جج تھا دلی میں جا کر ایسا چپ چپاتے کر دیا کہ چند عزیزوں اور دوستوں کے سوا کسی کو خبر تک نہیں ہوئی اور اس خوشی میں بجائے اسکے کہ تورہ بندی یا دعوت وغیرہ میں زرِ خطیر خرچ کیا جاتا ایک مناسب رقم مدرستہ العلوم کی نذر کر کے تقریب کو ختم کر دیا۔ پوتے کی بسملہ میں علیگڑھ سے دلی جانے کی بھی کچھ ضرورت نہیں سمجھی اور نہ کسی عزیز یا رشتہ دار کو اس تقریب میں وطن سے بلایا۔ جب کانفرنس کا جلسہ ختم ہو چکا اُسی قومی مجمع میں بسملہ پڑھی گئی اور حاضرین کو معمولی شیرینی تقسیم ہونے کے بعد پانسو روپیہ مدرسہ کی نذر کیا گیا۔

سرسید کی کوشش سے جو نمایاں انقلاب مسلمانوں کی سوشل حالت میں ہوا وہ اُس مغائرت اور نفرت کا دور ہونا تھا جو انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان مثل سمندر کے حائل ہو رہی تھی حالانکہ دین اسلام اہل کتاب کے ساتھ دوستی اور میل جول رکھنے، اُنکا کھانا اور ذبیحہ کھانے اور اُنکے ہاں شادی کرنے کی صاف صاف اجازت دیتا تھا اور تمام ممالک اسلامیہ میں اُنکے ساتھ مسلمانوں کا یہی تہاؤ دیکھا اور سنا جاتا تھا باوجود اسکے ہندوستان کے مسلمان مثل ہندوؤں کے اُنکی ہر ایک چیز سے اجتناب کرتے تھے، اُنکے ہاں کی پتی ہوئی چیز بلکہ اُنکے ہاتھ کی مس کی ہوئی چیز کو بخش جانتے تھے اور اُنکے ساتھ کھانا کھانے کو عیسائی ہو جانے کے برابر خیال کرتے تھے۔ جس کا سبب کچھ تو ہندوؤں کی تقلید تھی جسے صد ہا رہین اور عادیین ہندوستان میں آکر مسلمانوں نے سیکھی تھیں اور کچھ قومی تعصبات تھے جو

پیدا کی ہے؟ اور انکی دیرینہ آرزو اس باب میں کس حد تک پوری ہوئی ہے؟ اور اگر سرسید کے ظاہری الفاظ کو دیکھا جائے تو انھوں نے سترہ^{۱۸۷۴}ء میں ایک موقع پر مسٹر بلنٹ ممبر پارلیمنٹ کے سامنے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ”ہماری یہ خواہش پوری نہیں ہوئی“ لیکن اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی سوشل معاشرت اور انکا سوشل بتاؤ جو غدر کے بعد تک انگریزوں کے ساتھ تھا اسی میں جب قدر انقلاب گذشتہ تیس برس میں ہوا ہے اگر سرسید کا قدم در میان میں نہ ہوتا تو اُسکے لئے ایک صدی بھی مشکل سے کافی ہو سکتی تھی۔ اگرچہ ابھی اس بات کا فیصلہ کرنا باقی ہے کہ طرِقی معاشرت میں انگریزوں کی تقلید کرنا کما تک ہماری حالت کے مناسب ہے لیکن اس میں کلام نہیں کہ سرسید نے مسلمانوں کی ایک معتد بہ جماعت کو قومی تعصبات کی بٹری اور ملکی رسم و رواج کی غلامی سے بالکل آزاد کر دیا ہے اور اس قابل ہو گئے ہیں کہ جس بات کو اپنے حق میں قرونِ مصلحت جانیں اسکو اختیار کریں اور جس کو مضرت سمجھیں اسکو ترک کریں۔

اگرچہ سرسید نے مسلمانوں کی باہمی معاشرت کی عام اصلاح کے متعلق کوئی عملی کارروائی نہیں کی بلکہ انکی سوشل حالت جو انگریزوں کے ساتھ تھی زیادہ تر اُسی کی اصلاح پر توجہ کی ہے لیکن درحقیقت انھوں نے مذہبی خیالات کی اصلاح اور مغربی تعلیم کی اشاعت سے قومی سوسائٹی کی عام اصلاح کا بیج بو دیا ہے۔ انکو معلوم تھا کہ مسلمانوں میں بہت سی سوشل خرابیاں پھنس رہی ہیں اور ہندوؤں کے میل جول سے پیدا ہوئی ہیں، اور بہت سی غلط مذہبی خیالات کی بنیاد پر قائم ہوئی ہیں، اور بعض نے دیگر وجوہ و اسباب سے وجود پکڑا ہے، اور ان تمام خرابیوں کی تعداد اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ انکی اصلاح کے لئے ایک طولِ طویل زمانہ اور بہت سے مصلح درکار ہیں۔

تشبیہ کرنے سے پرہیز کرتے تھے مگر انگریزوں کو مسلمانوں سے کوئی وجہ نفرت کی نہ تھی۔ لیکن غدر کے بعد انگریز بھی مسلمانوں سے کچھنے لگے اور دونو قوموں کا جمع کرنا مثل جماع نقیضین کے محال ہو گیا۔ مگر سرسید کو خوب یقین ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی پولکل حالت کی اصلاح کے لئے جس طرح انہیں مغربی تعلیم کا پھیلا نا ضروری ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اُنکے اور حکمران قوم کے سوشل تعلقات کو ترقی اور استحکام دینا ضرور ہے۔ جب تک دونو قوموں میں دوستانہ معاشرت اور میل جول پیدا نہ ہوگا اور دونو قوموں کو ایک دوسرے کے اصلی خیالات سے آگاہی حاصل نہ ہوگی اسوقت تک آپس میں صفائی اور خلوص اور اعتبار پیدا نہیں ہو سکتا۔

مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا؛ قطع نظر مسلمانوں کی مخالفت کے انگریزوں کی طرف سے بھی بہت سی رکاوٹیں نظر آتی تھیں۔ سب سے بڑا عذر انگریزوں کو یہ تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ۔ جنکے ہاں عورتوں کے پردہ کا رواج ہے۔ کسی طرح ہمارا دوستانہ میل جول نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ سرسید اس کا یہ جواب دیتے تھے کہ مسلمان جس طرح اپنی عورتوں کو غیر قوم کے مردوں سے چھپاتے ہیں اُسی طرح اپنے مسلمان دوستوں اور دور کے رشتہ داروں سے بھی چھپاتے ہیں مگر اس سے باہمی دوستی اور یگانگت میں کچھ فرق نہیں آتا؛ پھر کیا وجہ ہے کہ پردہ کی پابندی سے ہماری اور انگریزوں کی دوستی اور سوشل تعلقات میں فرق آئے۔ مگر حق یہ ہے کہ ایسی دو مختلف قوموں میں دوستانہ میل جول ہونا غیر ممکن ہے جنہیں سے ایک قوم میں عورتوں کا مردانہ سوسائٹی میں شریک ہونا اُسکے لئے باعث عزت سمجھا جائے اور دوسری قوم میں عیش شرم۔ لیکن باوجود ایسے سخت موانع کے سرسید نے اپنے مقصد میں توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔ اگرچہ یہ کمنا مشکل ہے کہ سرسید کی کوشش نے انگریزوں میں مسلمانوں کے ساتھ کمانتک مودت

اس جانکاہ اور دماغ سوز فکر سے دل بھلاتا تھا۔

جس زمانہ میں سرسید نے بائبل کی تفسیر لکھنی شروع کی اُس زمانہ کا حال اُن کے قدیم دوست محمد رحید خان اسطح بیان کرتے ہیں کہ میں اُن دنوں میں اکثر اُن کے ساتھ رہا ہوں۔ سرسید اس زمانہ میں کولنگ پر سونا قطعاً ترک کر دیا تھا؛ چونکہ اُس وقت تک کرسی کی نشست کی عادت نہ تھی فرش ہی پر چاروں طرف کتابیں بھیلی رہتی تھیں اور کتیلوں کے بیچ میں اُن کی نشست رہتی تھی۔ کبھی کبھی بات چیت کے لئے مجھے بھی پکڑ بٹھاتے تھے، نہ خود سوتے تھے اور نہ مجھے سونے دیتے تھے، باتیں بھی کرتے جاتے تھے اور تفسیر بھی لکھتے جاتے تھے، اور اس غرض سے کہ نیند نہ آئے بار بار خود بھی چا پیتے تھے اور مجھے بھی پلاتے تھے۔ جب نیند کا بہت ہی غلبہ ہوتا تھا وہیں کسی کتاب پر سر رکھ کر گھنٹا آدمہ گھنٹے سو رہتے تھے اور پھر اُٹھ کر لکھنے لگتے تھے، اسی طرح ساری رات گزر جاتی تھی۔

سرسید کے دماغ میں تصنیف و تالیف کے متعلق دو خاصیتیں عجیب و غریب تھیں۔ ایک یہ کہ مختلف آدمیوں اور مختلف کاموں کے ہجوم میں اُن کے خیالات منتشر نہ ہوتے تھے۔ اُن کے دفتر کا بڑا کمرہ جہاں وہ بیٹھ کر کام کرتے تھے صبح سے شام تک وہاں ہر قسم کے لوگ برابر آتے جاتے رہتے تھے اور ہر وقت دوستوں اور ملاقاتیوں اور ماتحت کام کرنے والوں کا مجمع رہتا تھا۔ اسی مجمع میں جہاں وہ اُس سب کام کرتے تھے تصنیف و تالیف کا دشوار گزار مرحلہ بھی وہیں طے کیا جاتا تھا۔ مشکل سے مشکل مضامین جو کہ اکثر جمہور کی رے اور مذہبی خیالات کے برخلاف ہوتے تھے، اور جنہیں قدیم علماء اور مصنفین پر نکتہ چینی کرنے کی ضرورت اور غور و خوض کرنے کی سخت حاجت ہوتی تھی۔ اُن کے لئے بھی کبھی نہیں دیکھا کہ وہ خیالات کے مجتمع کرنے کے لئے کسی علیحدہ کمرے میں جا کر بیٹھے ہوں، یا اور لوگوں کو اپنے پاس سے

اسلئے بجائے اسکے کہ وہ جزئیات کی اصلاح کی طرف توجہ کرتے انھوں نے جہان تک ممکن تھا مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح میں جو تمام اصلاحوں کی جڑ ہے۔ کوشش کی۔ سب سے پہلے انھوں نے مذہبی خیالات وادہام کی اصلاح کو ضروری سمجھا کیونکہ جن باتوں کو لوگ غلطی سے مذہب مبنی سمجھ لیتے ہیں انکا چھوٹنا قریب ناممکن کے ہو جاتا ہے۔ دوسرے سب سے بڑا ذریعہ خیالات کی اصلاح کا مغربی تعلیم کی اشاعت تھی جسے یورپین اقوام کو حسن معاشرت میں تمام دنیا پر فائق کر دیا ہے سو اسکے اشاعت میں جو کار نمایاں انھوں نے کئے وہ سب پر ظاہر ہیں۔

اگرچہ سرسید کی طبیعت ایسی ہمہ گیر واقع ہوئی تھی کہ جو کام انکو پیش آتا تھا اُس میں وہ ایسی دیکھ پی ظاہر کرتے تھے کہ گویا وہی انکا خاص کام اور ضروری فرض تھا؛ کالج کی تعمیر، بحث کی تیاری، جلسوں کا اہتمام، ممانوں کی مدارات، چندے وصول کرنے کی تدبیریں، ہر ایک کام کو وہ یکساں ذوق و شوق اور یکساں دلچسپی کے ساتھ انجام دیتے تھے مگر یہ بیان تھا کہ جیسا تصنیف و تالیف میں میراجی لگتا ہے ویسا اور کسی کام میں نہیں لگتا؛ اور فی الواقع۔ جیسا کہ دیکھا گیا ہے۔ رنج میں، خوشی میں، صحت میں، بیماری میں، خلوت میں اور جلوت میں اس مشغلے سے انکا جی نہیں اکتاتا تھا۔ گرمی کی دوپہروں میں۔ جبکہ ایک صبح خیر آدمی ضرور آرام لینا چاہتا ہے۔ یہ شخص ہمیشہ تصنیف و تالیف میں مصروف پایا جاتا تھا۔ بیماری کی حالت میں انکو کبھی نہیں دیکھا کہ دوپہر کو پلنگ پر جا کر کمر سیدھی کی ہو۔ بارہا ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ علالت یا کسی اور وجہ رات کو نیند اچاٹ ہو گئی اور انھوں نے میزکرسی پر بیٹھ کر کسی مضمون کے لکھنے میں صبح کر دی۔ جہاں اور لوگ بیماری کی راتیں لوگوں کو جگا کر، یا قہقہے کمانیاں سنکر، یا ہاے و اے کر کر بسر کرتے ہیں یہ شخص

یا کسی پیشدست سے لکھوانا شروع کرتے تھے (اگرچہ کیسا ہی مشکل و رطولانی مضمون ہو) یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُسکے تمام پوٹنس سلسلہ دار اپنے محل اور موقع پر انکی آنکھوں کے سامنے موجود ہیں؛ صرف انکو الفاظ کا لباس پہنانا باقی ہے۔ چنانچہ مستثنیٰ حالتوں کے سوا کبھی ایسا نہ ہوتا تھا کہ جس ترتیب سے غون نے کوئی مضمون لکھنا شروع کیا ہو اُسکو بغیر کسی قسم کی تبدیلی کے اُسی چال سے آخر تک نہ پہنچا دیا ہو۔ اس مطلب کے زیادہ نشین معنی کے لئے ناظرین مندرجہ ذیل مثال پر غور کریں۔

سرسید نے معراج کے مسئلہ کا بیان اپنی تفسیر کی چھٹی جلد میں ۱۴۱ صفحہ پر لکھا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ پر زمانہ حال کی ضرورت کے موافق نہ پہلے کسی نے ایسا لکھا ہے اور نہ آئندہ اُس سے زیادہ لکھنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس مضمون کے لکھنے کی جو کیفیت ہوئی ہے اُسکو سنکر اور پھر اس مضمون کی وسعت کو دیکھ کر نہایت تعجب ہوتا ہے۔ مولوی سید وحید الدین سلیم جنھوں نے تفسیر کے لکھنے میں کئی سال تک برابر سرسید کو مدد دی ہے اُنکا بیان ہے کہ ”جب تفسیر کی نوبت سورہ بنی اسرائیل تک پہنچی اور سید صاحب نے معراج کے مسئلہ پر مفصل بحث کرنے کا ارادہ کیا تو مجھے کہا کہ جس قدر روایتیں صحاح اور دیگر کتب حدیث میں معراج اور شوق صدر کے متعلق اور اس باب میں صحابہ کے اختلاف کے متعلق وارد ہوئی ہیں اور عقل نقل کی تقاض کی صورت میں خورائیں اور اقوال علمائے ہین اُن سب کو آپ اس طرح پر کتابوں میں سے انتخاب کر کے نقل کریں کہ ایک ایک صفحہ پر انکو لکھتے جائیں اور دوسرا صفحہ کورا چھوڑتے جائیں“ میں نے کتابیں دیکھنی شروع کیں اور بے شمار روایات و اقوال علمائے جو کہ سورہ بنی اسرائیل کی تفسیر میں درج ہیں۔ موافق ہدایت کے نقل کر کے سید صاحب کے سامنے پیش کیں۔ میں سمجھتا تھا کہ جب میں تمام روایتیں اور اقوال نقل کر لوں گا اسوقت سید صاحب اُنکو دیکھ کر معراج کے مسئلہ پر لکھنا شروع کریں گے۔ مگر میرا یہ خیال غلط تھا۔ اُنھوں نے اس مضمون کو اُس ترتیب پر جو اُن کے

اٹھا دیا ہو، یا اُنکے پاس بیٹھنے سے تنگدل ہو سہ ہوں، یا لوگوں کے اٹھ جانے کے انتظار میں مضمون لکھنا ملتوی کر دیا ہو۔ بے شک جب کوئی عمان باہر سے آتا تھا، یا کسی دوست مدت کے بعد ملاقات ہوتی تھی، یا کسی نور خاص وجہ سے، ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ لکھنا پڑھنا بند کر دیتے تھے؛ مگر ایسا کبھی نہیں دیکھا گیا کہ حاضرین کے ہجوم کے سبب اُنکے خیالات پر گندہ ہو گئے ہوں اور اسلئے اُنھوں نے مضمون لکھنے سے ہاتھ کھینچ لیا ہو۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ احباب جمع ہیں اور آپس میں دھپ بھٹین یا ہنسی چل کی باتیں کر رہے ہیں۔ جس سے خواہی نخواہی ایک کامی آدمی کا دھیان بٹ جاتا ہے۔ مگر یہ شخص بدستور اپنے مضمون کی ادھیڑ بن میں مستغرق ہے، کبھی لکھتا ہے اور کبھی سوچتا ہے اور دوستوں کے حرف و حکایت سے مطلق خبر نہیں ہوتا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ آوروں کے لئے مجمع عام میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف کرنا غیر ممکن ہے؛ بلکہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ مذہب کو اُتیسویں صدی کے سائنس پر منطبق کرنا یا کسی مذہبی مسئلہ کی نسبت جمہور کے برخلاف رائے قائم کرنا ایسی غیر مطمئن حالت میں سید احمد خان کے سوا دوسرے شخص کا کام نہ تھا۔

دوسری خاصیت شاید اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز تھی۔ جب مصنف کسی ایسے مضمون پر قلم اٹھاتا ہے جس کو اُس سے پہلے کسی نے نہ لکھا ہو اور جو ترتیب کے لباس سے اب تک عاری ہو (جیسی کہ عموماً سرسید کی مذہبی تحریریں ہوتی تھیں) تو اُس کے ذہن میں خیالات کا ایک بے ترتیب و غیر منتظم انبار ہوتا ہے جس کا مرتب اور منتظم کرنا اور ہر ایک پوائنٹ کو اُس کے مناسب موقع پر رکھنا اُس مصنف کا فرض سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ ایک ایسا دشوار کام ہے کہ مصنف کو اکثر اوقات کئی کئی دفعہ ترتیب بدلی اور بار بار کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے۔ لیکن جانتے کہ دیکھا گیا ہے سرسید جب کسی مضمون کو خود لکھنا

ہوئی ہے جیسی کہ ایک مسلم الثبوت رائے کی تائید کرنے والے کو ہونی چاہیے۔

اسباب بغاوت میں جو کچھ انھوں نے لکھا وہ تمام اینگلو انڈینز بلکہ شاید تمام انگلش نیشن کی رائے کے برخلاف تھا اور اسی لئے اُسکا مارشل لا کے دور دورہ میں شائع کرنا خطرناک خیال کیا جاتا تھا۔

جو اس کے جس دھڑے سے کہ اُسکا بہت بڑا حصہ منوایا گیا، اور جو کام کہ اُس نے اعیان سلطنت کی غیظ

و غضب کی آگ بجھانے میں کیا اور جو عمدہ نتائج اُس پر مترتب ہوئے اُس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ

کس قدر مدلل اور موجب لکھا گیا تھا اور اُس میں کیسے صحیح اصول پر استدلال کیا گیا تھا۔ اس طرح ڈاکٹر ہنٹر

کی کتاب کا ریویو ایک ایسے خیال کی غلطی ثابت کرنے کے لیے لکھا گیا تھا جو عموماً مدبران سلطنت کے دل

میں جما ہوا تھا اور جسکو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب نے اور بھی زیادہ پختہ کر دیا تھا۔ لیکن اس ریویو کے

شائع ہونے سے۔ جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے۔ اُس خیال کی غلطی علی العموم سب پر ظاہر ہو گئی۔

جسوقت کہ سر سید نے غلامی کے مسئلہ پر جمہور اہل اسلام کے برخلاف رسالہ لکھنے کا ارادہ کیا تو مولوی

سید مہدی علی خان نے اُسے کہا کہ تم اس باب میں ایک حرف بھی اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسا

نہیں لکھ سکتے جو اصول اسلام کے موافق صحیح ہو۔ لیکن جب انھوں نے سر سید کا ابطال غلامی کا مضمون

تہذیب الاخلاق میں اول سے آخر تک پڑھا تو انکو ماننا پڑا کہ اسلام نے فی الواقع ہمیشہ کے لئے غلامی

کا استیصال کر دیا ہے یہاں تک کہ سر سید نے تہذیب الاخلاق میں ایک موقع پر صاف صاف لکھ دیا کہ

کہ جن مسائل میں ہم اور سید مہدی علی متفق ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ”اسلام میں قیت نہیں ہے“

مسلمانوں کا جہاد کا مسئلہ جو تمام عیسائی دنیا میں انگشت نماتا تھا اور جس سے بڑھ کر کوئی بے چہی

اور ناخدا ترسی کا کام نہ سمجھا جاتا تھا۔ اُسکا مقابلہ۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ سر سید نے انجیل کے

ذہن میں تھی بجائے خود اسی وقت لکھنا شروع کر دیا تھا جبکہ مجھ کو روایات وغیرہ کے نقل کرنے پر مامور کیا تھا۔ وہ مسودہ کے ہر ایک صفحہ پر کہیں کہیں کچھ عبارت لکھتے تھے اور کہیں سفیدی چھوڑتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ میں ابھی اپنا کام پورا کرنے نہ پایا تھا کہ جو کچھ اُنکو لکھنا تھا وہ سب لکھ چکے اور اس مضمون کو کچھ کم ڈیڑھ سو صفحہ پر ختم کر دیا۔ جب میں اُن بے شمار روایتوں اور اقوال کا دفتر لیکر پہنچا تو انھوں نے وہ تمام کاغذات لیکر اُنکو فینچی سے کترنا اور اُن ٹکڑوں کا بجائے سفیدیوں پر لئی سے چکانا شروع کیا بیان تک کہ تمام پرچے جکا شمار بتانا مشکل ہے جہاں جہاں اُنکا موقع تھا چکا دیئے اور کاتب کو صاف کرنے کے لئے دیدیا۔ جب تمام مسودہ صاف ہو چکا اور میں نے اُسکو اول سے آخر تک پڑھا تو مضمون کی ترتیب اور انتظام اور تمام روایات و اقوال علما کو اپنے اپنے موقع پر چسپانہ دیکھ کر میرے ہوش جاتے رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سرسید کو مسودہ لکھتے وقت ان روایات کے مضمون سے اسکے سوا کچھ علم نہ تھا کہ جب میں کتابوں میں روایتیں تلاش کر رہا تھا اُسوقت جس قسم کے اختلافات انہیں پائے جاتے تھے اُنکا ذکر بالاجمال سرسید کے سامنے ہوتا رہتا تھا؛ صرف اس قدر واقفیت پر انھوں نے تمام مضمون کا خاکہ اپنے ذہن میں کھینچ لیا تھا اور ہر ایک روایت کا موقع اور محل جہاں جہاں کہ ہونا چاہئے تھا قرار دے لیا تھا۔ اگرچہ یہ دونو خاصیتیں جو ہم نے سرسید کی مصنفانہ قابلیت کے متعلق بیان کیں۔ فی نفسہ عجیب ہیں مگر ان سے سوا اُس شخص کے جو انکی طرز تصنیف کو بنظر غور دیکھتا رہا ہو دوسرا واقف نہیں ہو سکتا۔ اب ہم ایک تیسری خاصیت کا ذکر کرتے ہیں جسکو ہر سمجھدار آدمی جو انکی تصنیفات کو دیکھ گا یقیناً تسلیم کریگا اور اس سے ہماری مراد قوت استدلال ہے ظاہر ہے کہ سرسید کی بعض پونسل اور اکثر مذہبی تحریریں ایسی ہیں جنہیں انھوں نے ایک جماعت کشیر یا جمہور اہل اسلام سے اختلاف کیا ہے؛ باوجود اسکے اُنکو اپنے دعوے کے اثبات میں خلاف توقع اکثر ایسی کامیابی

لیکن چونکہ حق کبھی نہ کبھی ظاہر ہوے بغیر نہیں رہتا اسلئے آخر کار لوگ اُنکے حسن و قبح کی چھان بین کی طرف متوجہ ہوئے ہیں، اور انھوں نے صواب کو خطا سے اور گھرے کو کھوٹے سے الگ کیا ہے، اور باوجود اُنکی غلطیاں ظاہر ہونے کے۔ جسے کسی محقق کا کلام محفوظ نہیں رہ سکتا۔ جس درجہ کے یہ مستحق تھے وہ درجہ اُنکو دیا گیا ہے۔

سرسید کی طرزِ تحریر پر کچھ ریاکار کرنا جس قدر ضروری ہے اُس قدر مشکل بھی ہے۔ ضرورت تو ظاہر ہے؛ کیونکہ بیوگرافر اگر بالفرض اپنے ہیرو کی تمام کلی و جزئی حیثیات پر بحث نہ کر سکے تو کم از کم اُسکی نمایاں اور مسلم یا قوتوں کو دکھائے بغیر اپنے فرض سے عمدہ برا نہیں ہو سکتا۔ پس سرسید کی طرزِ تحریر جسے تیس تیس برس کے عرصہ میں اُردو لٹریچر کا رخ پھیر دیا اور مسلمانوں کے پوٹکل سوشل اور مذہبی خیالات میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اُسکے بیان سے کیونکر خاموش رہا جاسکتا ہے۔ اور مشکل اسلئے ہے کہ جس تحریر میں یہ تاثیر اور یہ کوشش تھا اُسکو ہم اُن متعارف خوبیوں سے۔ جو مشرقی لٹریچر میں کلام کی عمدگی کا معیار سمجھی جاتی ہیں۔ بظاہر معرّا پاتے ہیں۔ پس اس بات کا دریافت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے کہ جو تحریر تشبیہات و استعارات سے، صنائعِ لفظی و معنوی سے، شاعرانہ نزاکتوں سے اور فاصلانہ و منشیانہ تراش خراش سے خالی نظر آتی ہے اُس میں وہ کیا چیز تھی جسے تھوڑی سے مدت میں ایسے غیر مترقبہ نتائج پیدا کر دیئے۔ لیکن چونکہ سرسید کی بایوگرافی لکھنے کا مشکل کام ہونے اپنے ذمہ لیا ہی اسلئے چار ناچار ہم کو کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور ہے۔ سرسید کی ابتدائی تحریریں غالباً سید الاخبار میں درج ہونی شروع ہوئی تھیں جسکو اُنکے

لکھ چوکے سید احمد کاعف اُس زمانہ میں سید تھا اور اُنکے بھائی کو اُنھے بہت محبت تھی اسلئے اخبار کا نام اُنکے عزیز کا نام سے سید الاخبار رکھا تھا ۱۲

اس مشہور اخلاقی حکم سے کیا ہے کہ ”اگر کوئی تیرے ایک گال پر پٹا بچھ مارے تو دوسرا گال بھی اُسکے سامنے کر دے“ اور نہایت عام فہم طریقہ سے ثابت کیا ہے کہ فطرت انسانی کے موافق اور قابلِ عملدآمد جہاد کا حکم ہے جو قرآن میں آیا ہے نہ انجیل کا وہ اخلاقی حکم جو قرآن کی تعلیم پر اعتراض کرتے وقت مسلمانوں کو سامنے پیش کیا جاتا ہے اور جس پر نہ آجتا کبھی عمل ہوا ہے نہ آئندہ ہونے کی امید ہے۔

اسی طرح سرسید کی تصنیفات میں بے شمار مقامات ایسے نکلیں گے جو بادی النظر میں متنوع الثبوت معلوم ہوتے ہیں مگر جب اُن دلائل پر نظر کیجاتی ہے جو سرسید نے اُنکے ثبوت میں پیش کی ہیں تو مخالفوں کو بھی۔ بشرطے کہ تعصب خالی ہوں۔ تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں معلوم ہوتا۔

ہمارے نزدیک مصنفوں میں سرسید کا جو درجہ خاص کمند ہے ہی تصنیف و تالیف کے کاغذاتے قرار پاسکتا ہے اُسکا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا؛ کیونکہ اسوقت کچھ لوگ اُنکے حد سے زیادہ معتقد ہیں جنکو اُنکی تصنیفات میں کوئی لغزش یا خطا نہیں معلوم ہوتی۔ اور بہت بڑا گروہ اُنکے منکروں اور مخالفوں کا ہے جنکو اُنکی مذہبی تحریروں میں کفر و اکاد کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ پس جب تک یہ دونو گروہ موجود ہیں اُنکی تصانیف کے باب میں بغیر حیف و میل کے رائے دینے کی کسسی امید نہیں ہو سکتی۔ اسکے سوا اول تو مسلمانوں کے خیالات میں عموماً یہ بات جی ہوئی ہے کہ اعلیٰ درجہ کی مذہبی تصنیفات کے لیے ضرور ہے کہ وہ عربی یا کم سے کم فارسی زبان میں ہوں۔ اردو زبان میں کیسے ہی متفقانہ مضامین لکھے جائیں اور کیسے ہی بلند خیالات ظاہر کئے جائیں اُنکے نزدیک وہ اردو کی معمولی کتابوں سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ دوسرے جن لوگوں نے تقلید کے دائرہ سے کلکرتحقیق کے میدان میں قدم رکھا ہے اُنکی تصنیفات ہمیشہ علماء دین کے حلقوں میں ایک مدت تک مردود و مطرود رہے ہیں۔

جو ایک رفارم میں ہونی ضرور ہیں۔ انھیں خاصیتوں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ ابتدا سے تحریر یا تقریر میں تصنع اور الفاظ کی تراش خراش سے نفرت رکھتے تھے اور گریمر کی پابندی سے فطرۃً آزاد تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے جو اول اول دلی میں اپنے گرد شعرا کا جھگڑا دیکھ کر انکی دیکھا دیکھی شعر کہنا شروع کیا تھا کچھ بہت دن نہ گزرے کہ وہ ان تکلفات لایعنی سے جو شاعری کے لئے لازم ہیں اور حقائق نگاری میں مغل ہوتے ہیں۔ ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو گئے۔ انھوں نے سیت فیدلیہ میں اپنے بچپن کا حال لکھا ہے کہ انکے نانانے۔ جب کہ وہ بوستان پڑھتے تھے۔ انکا سبق بنا، سبق میں وہ شعر بھی تھا جسکا پہلا مصرع یہ ہے ”طلع باسمه حرف ست ہرستی“ انھوں نے اسکا ترجمہ کیا کہ ”طلع کے تین حرف تینوں خالی“ نانانے تین دفعہ ٹوکا اور بہت خفا ہوئے مگر یہی معنی کہے گئے، چونکہ محاورہ کے موافق ترجمہ ہی فصیح تھا اسلئے گریمر کا مطلق خیال نہ آیا۔ جو حال انکا اُس بچپن کے زمانہ میں تھا وہی اخیر دم تک باقی رہا۔ وہ تحریر یا تقریر کی رو میں گریمر کی کچھ پروا نہ کرتے تھے، وہ ان قیدوں سے جو شاعروں اور منشیوں نے مقرر کی ہیں بالکل آزاد تھے، وہ ان غلط لفظوں کو جو عام فہم اور خاص و عام کی زبان پر جاری ہوں۔ صحیح الفاظ پر ترجیح دیتے تھے، انکی زبان دلی کی بول چال میں محدود نہ تھی بلکہ جو لفظ یا جو جملہ بے اختیار قلم سے ٹپک گیا وہی انکی زبان اور وہی بول چال تھی، غالباً انھوں نے کسی لفظ کے استعمال کرتے وقت یہ خیال نہ کیا ہوگا کہ یہ لفظ اہل زبان بولتے ہیں یا نہیں؟ اور کسی فقرہ کو لکھ کر پھر یہ نہ دیکھا ہوگا کہ قواعد کی رو سے اسکی ترکیب صحیح ہے یا نہیں؟

یہ خاصیت جسکو ہم نے بیان کیا ایک سچے رفارم کے کلام میں ایسی ہی ضروری ہے

بڑے بھائی سید محمد خان نے ۱۸۳۶ء یا ۱۸۳۷ء میں اُسوقت جاری کیا تھا جبکہ سرسید کی عمر سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی۔ اگرچہ اُسوقت سے لیکر ۱۸۵۷ء تک انھوں نے متعدد کتابیں اور رسالے لکھے اور تاریخ کے متعلق لکھے اور انہیں سے بعض کتابیں (جیسے آثار الصنادید) بدرجہ غایت مقبول اور مشہور بھی ہوئیں لیکن طرزِ تحریر میں اُسوقت تک کوئی ایسی صریح تبدیلی پیدا نہیں ہوئی جسکے لحاظ سے سرسید کو اردو لٹریچر میں کسی ممتاز حصہ کا مستحق کہا جاسکے۔

البتہ یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ عبارت کی سادگی اور بے ساختگی۔ جو سرسید کی تحریر کی عام خاصیت ہے۔ وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی تحریروں میں بھی۔ جبکہ تصنیف اور تکلف انشا پر دانی کا زیور سمجھا جاتا تھا۔ برابر پائی جاتی ہے اور آثار الصنادید کا سب سے پہلا ادیشن۔ جسکی عبارت میں بہت کچھ ساختگی اور تکلف پایا جاتا ہے۔ وہ جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے تھے مولانا صہبائی کا لکھا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گو اُسوقت طبعِ سلیم کے اقتضائے خود سرسید کی طرزِ تحریر سیدھی سادھی تھی مگر سوائی کے اثر سے یقیناً سادھی عبارت لکھنے کو وہ خود مختارت کی نظر سے دیکھتے تھے جسکی وجہ سے انھوں نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ جن عبارتوں کی حقیقات نہایت جانکاہ و کشش سے انجام کو پہنچائی ہے اُنکا حال اپنی سیدھی سادھی عبارت میں جو اُسوقت خود اُنکی نظر میں کم وزن معلوم ہوتی تھی۔ تحریر کریں۔ مگر اس ادیشن کے شائع ہونے کے بعد وہ بہت جلد اس غلطی سے متنبہ ہوئے اور اُسکو دوبارہ اپنے سید ساکے نیچرل اسٹائل میں لکھ کر شائع کیا جسکا فریج میں ترجمہ ہو کر فرانس میں چھپا۔

نہایت صحیح اور سچا مقولہ ہے کہ ”اذا لا دلائل شیعاً سباً“ چونکہ سرسید سے قوم کی اصلاح

کا عظیم الشان کام ظہور میں آنا تھا اسلئے خدا تعالیٰ نے اُنکی ذات میں وہ تمام خاصیتیں جمع کر دی تھیں

پیدا ہوتا ہے؟ اسی ایک مقصد کے لئے کوئی الفاظ میں تراش و تراش اختیار کرتا ہے اور کوئی سادگی، کوئی کلام کی بنیاد و متانت اور سنجیدگی پر رکھتا ہے اور کوئی مزاح و ظرافت پر، کوئی سوچ سوچ کر علمی صفا میں اور فاضلانہ ترکیبیں استعمال کرتا ہے اور کوئی ڈھونڈ ڈھونڈ کر اہل زبان کے حاورے اور روزمرے ہم پہنچاتا ہے؛ اسی طرح کوئی کسی ڈھنگ پر چلتا ہے اور کوئی کسی طریقہ پر۔ مگر حق یہ ہے کہ کلام کی تاثیر کو ان باتوں سے کچھ علاقہ نہیں۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ چون ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند بے شک کلام کے موثر ہونے کے لئے اُسکا سادہ اور بے تکلف ہونا ضرور ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کلام سادہ اور بے تکلف ہوگا وہ موثر بھی ضرور ہوگا۔ کلام کیسا ہی سادہ اور بے تکلف ہو جب تک کہ متکلم کا دل آزادی اور سچائی سے بھرا ہوا نہ ہو۔ کبھی موثر نہیں ہو سکتا۔ جس طرح تلوار کا کاٹنا حقیقت اُسکی باڑ میں نہیں بلکہ سپاہی کے کرتبی ہاتھ میں ہے اسی طرح کلام کی تاثیر اُسکے الفاظ میں نہیں بلکہ متکلم کی سچائی اور اُسکے بزر والے اور بے لاگ زبان میں ہے۔ وہی الفاظ جو ایک سچے اور دلسوز ناصح کی زبان سے نکلے لوگوں کے دلوں پر تیر و سنان کا کام کرتے ہیں ممکن نہیں کہ ایک نمائشی واعظ کی زبان پر انہیں کچھ بھی اثر باقی رہے۔ سچے ناصح کے لعن و طعن میں جو اثر ہوتا ہے وہ جھوٹے واعظ کی بشارتوں میں نہیں ہوتا۔ سرسید کے کلام میں جو تاثیر تھی وہ حقیقت اُنکی سچائی اور حق گوئی کا نتیجہ تھا۔

باوجودیکہ مسلمان صد ہا سال سے نہ صرف مذہب میں بلکہ علوم و فنون میں، تاریخ میں، رسم و رواج میں، اخلاق و عادات میں، طریق معاشرت میں، غرضکہ ہر چیز میں اگلوں کی

جیسی سچائی اور راستبازی ۔ وہ مثل شاعرون اور انشا پردازوں کے اپنے کلام کی بنیاد الفاظ کی
 شستگی اور ترکیبون کی جستگی پر نہیں رکھتا بلکہ اُس بے قرار آدمی کی طرح ۔ جو گھر میں آگ لگی ہوئی
 دیکھ کر مسایون کو بے تابانہ آگ بجھانے کے لئے پکارتا ہے ۔ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو گھبراہٹ
 کی حالت میں بے ساختہ انسان کے مونہ سے نکل جاتے ہیں ۔ وہ واقعات پر تشبیہ و استعارہ کے
 پروئے نہیں ڈالتا بلکہ اُنکی تنگی تصویر کھلم کھلا سب پر ظاہر کرتا ہے ۔ وہ الفاظ و قواعد کا محکوم نہیں ہوتا
 بلکہ الفاظ اور قواعد کو اپنے جذبات کا محکوم رکھتا ہے ۔

الغرض سرسید نے خیالات کے ظاہر کرنے میں بناوٹ اور تصنع کو کبھی دخل نہیں دیا ، جس سادگی
 اور بے تکلفی کے ساتھ ابتدا میں مطلب نگاری شروع کی تھی غدر کے زمانہ تک جو کہ تقریباً بیس برس کا
 زمانہ ہوتا ہے اپنے اُسی سیدھے سادے اور نیچرل اسٹائل میں ہر قسم کی تحریریں ۔ کیا کتا بین ۔ کیا
 مضامین اور کیا مقدمات کے فیصلے اور تجویزین ۔ برابر لکھتے رہے ۔ اس بیس سال کی مشق و محنت
 نے ۔ جو کہ ایک انداز پر متصل جاری رہی ۔ ضرور ہے کہ اُنکی قلم میں ہر مطلب کے ادا کرنے اور ہر پیچیدہ
 مضمون کے سلجھانے کی ایک غیر معمولی طاقت پیدا کر دی ہوگی ؛ کیونکہ نیچرل قوے سے جب اُنکے مقتضا
 کے موافق برابر کام لیا جاتا ہے تو اُنسے اکثر فوق العادہ کرشمے ظہور میں آتے ہیں ۔ مگر ابھی وہ وقت
 نہیں آیا تھا جب کہ اس سیدھی سادی تحریر کے اصلی جوہر کھلنے والے اور اس ٹھنڈی آگ کے
 شعلے بلند ہونے والے تھے ۔

غالباً اس بات پر سب کا اتفاق ہوگا کہ تحریر یا تقریر کا اصل مقصد لوگوں کے دلوں پر اثر
 کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے مگر اس امر میں سب کی رائے مختلف معلوم ہوتی ہے کہ اثر کس طرح

ایسی اُجاگر نہیں معلوم ہوتی جیسی دیگر مصنفوں کے کلام میں معلوم ہوتی ہیں ورنہ صنائع لفظی کے سوا اُس میں تمام محاسن لفظی و معنوی موجود ہیں۔ تشبیہیں بھی ہیں، استعارے بھی ہیں، کنائے بھی ہیں، تشیلین برجستہ اور تلمیحیں نہایت لطیف ہیں، بذلے اور لطیفے حدی زیادہ لکھش ورد لفریب ہیں، کہاوتیں اور اشعار بر محل جا بجا نظر آتے ہیں۔ مگر اس قبیل کی جو چیز ہے اُس میں ایسا بے ساختہ پن پایا جاتا ہے کہ گویا بے قصد و بے ارادہ مصنف کو قلم سے پکی ہے۔

مگر جو چیز کہ سرسید اور دیگر مصنفوں اور مضمون نگاروں میں مابہ الامتیاز ہے وہ قدرتِ بیان ہے جس کے ثبوت کے لئے خود ان کی مختلف تحریروں کا دیکھ لینا کافی ہے۔ مصنف کی قدرتِ بیان کئی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ ہر ایک مضمون کو اُسی پیرایہ میں بیان کر سکے جو اُس مضمون کی حالت کے مناسب ہے۔ کیونکہ ہر قسم کے کلام کا پیرایہ بیان جدا ہوتا ہے۔ جس ڈھنگ پر ناول لکھا جاتا ہے اُس ڈھنگ پر تاریخ یا بیابانگری نہیں لکھی جاتی۔ جہاں مناسبت اور سنجیدگی کا موقع ہوتا ہے وہاں ظرافت نازیبا معلوم ہوتی ہے۔ تشبیہ استعارہ اگرچہ نظم و نثر کا زیور ہے مگر کسی سرشتہ کی سالانہ رپورٹ، یا کسی مقدمہ کے فیصلہ، یا کسی پبلک جلسہ کی روئداد میں اُس سے زیادہ کوئی چیز بدنام نہیں ہوتی؛ اسی لئے کہا گیا ہے ”ہر سخن وقتی دہر نکتہ مگانے دارد“ مگر جہاں تنگ دیکھا جاتا ہے ہر مصنف پر اُس کی طبیعت کے میلان کے موافق رفتہ رفتہ کسی خاص پیرایہ بیان کا رنگ چڑھ جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ ایک خاص مضمون کے سوا اور کسی موضوع پر کچھ نہیں لکھ سکتا اور یا جس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے اُس کو اُسی خاص رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔ مثلاً بعضوں کا قلم حسن و عشق کے میدان میں خوب دوڑتا ہے، پس یا تو وہ ایسے مضمون پر قلم ہی

لکیر پر فقیر چلے آتے تھے اور کوئی ایسی بات جس سے کبھی اُنکے کان آشنا نہ ہوئے ہوں۔ ہرگز سننی نہیں چاہتے تھے مگر سچ میں وہ کرشمہ ہے کہ تاریکی میں بھی وہ چمکے بغیر نہیں رہتا۔ جو شخص سب سے پہلے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر اور سوسائٹی کی رکاوٹوں کو برطرف کر کے قوم کی اصلی بھلائی کے خیالات صاف صاف ظاہر کرتا ہے۔ گو کہ وہ قوم کے مذاق اور اُلف و عادت کے کیسے ہی برخلاف ہوں۔ اُنہیں عجیب قسم کی کشش ہوتی ہے کہ اُنکے سننے کے لئے کیا موافق اور کیا مخالف سب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور دونوں فریق مختلف طور پر اُن سے متاثر ہوتے ہیں؛ پہلا اُن کو حق سمجھ کر بے چون و چرا قبول کرتا ہے اور دوسرا اُنہیں مقبولیت کے آثار نمایان دیکھ کر خائف ہوتا ہے کہ مبادا یہ خیالات تمام قوم میں شائع ہو جائیں۔ سرسید کی تحریر میں یہی چیز تھی جس نے اُن سیدھے سادھے اور معمولی لفظوں میں جادو کا سا اثر پیدا کر دیا تھا اور تمام قوم میں ہل چل ڈال دی تھی۔

مگر اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ سرسید کی تحریر جو بظاہر متعارف لفظی خوبیوں سے خالی معلوم ہوتی تھی وہ حقیقت اُس میں لفظی خوبیاں نہ تھیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جب عمدہ اور پاکیزہ خیالات ایسے صاف اور معنی خیز لفظوں میں بیان کئے جاتے ہیں کہ لفظوں کے ساتھ ہی ساتھ معنی بھی ذہنوں میں اُترتے جاتے ہیں تو خیالات کی خوبی ناظرین کو الفاظ کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی بلکہ محاسن لفظی خیالات کی شکوہ میں دب جاتے ہیں۔ اسکے سوا جب مصنف کی ہمت محض عمدہ خیالات کے پھیلانے پر مقصور ہوتی ہے تو اُس کے بیان میں محاسن لفظی کی اُسی قدر گنجائش ہوتی ہے جس قدر کہ ہر مقام کا مقتضا ہوتا ہے اور اسلئے وہ عبارت میں اس قدر گھل مل جاتے ہیں کہ جب تک بنظر غور نہ دیکھا جائے عام بیان اُن سے سادہ نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کی تحریر میں لفظی خوبیاں

نہیں اٹھاتے جس میں حسن و عشق کی چاشنی نہ ہو اور یا جو مضمون لکھتے ہیں اُسکو اُسی سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح بعض کی طبیعت پر استعارہ اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ سیدھے رستے سے بھی چکر کاٹے بغیر نہیں گزرتے، بعضے ہر ایک مضمون میں ظرافت کی چاشنی دینی چاہتے ہیں اگرچہ نفس مضمون اُس سے ابا کرتا ہو۔ غرض کہ جس مصنف یا مضمون نگار کو دیکھیے اُس پر کوئی نکتہ بھوت سوار ہوتا ہے۔

مگر سرسید کی تحریروں کو ہم اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ پاتے ہیں؛ اُنکی ہر قسم کی بے شمار تحریریں کیا تاریخی، کیا علمی، کیا مذہبی، کیا اخلاقی، کیا سوشل، کیا پولٹکل، کیا اوٹشل، اور کیا لیگل۔ علیگڑھ گزٹ، تہذیب الاخلاق، تصانیف احمدیہ، سالانہ رپورٹوں، عدالت و فیصلوں، جلسوں کی رودادوں اور پرائیوٹ خطوں وغیرہ میں موجود ہیں اُنکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک شاخ میں وہی پیرایہ بیان پایا جاتا ہے جو اُسکے لئے موزون اور مناسب ہے۔ حالانکہ مصنف کو خود خبر نہیں کہ کس مضمون کے لئے کونسا پیرایہ بیان موزون ہے مگر تحریر کی قدرتی قابلیت بغیر قصد و ارادہ کے قلم کو اُسی راہ پر ڈال دیتی ہے جیسراُسکو چلنا چاہیے۔ جس طرح پہاڑ کی زور سے کی موڑ توڑ اور بیچ و خم کے ساتھ رخ بدلتی چلی جاتی ہے اسی طرح ہر مقام کے مقتضائے موافق تحریر کا رنگ خود بخود بدل جاتا ہے۔ اگر علمی اور تاریخی مضامین میں دریا کے بہاؤ کیسی روانی ہے تو مذہبی اور پولٹکل تحریروں میں چڑھاؤ کی تیرائی کا سا زور ہے۔ اعتراضات کے جواب میں متانت اور سنجیدگی ہے تو بے دلیل دعووں کے مقابلہ میں ظرافت و خوش طبعی۔ نصیحتیں نشر سے زیادہ مخاشاں اور مرہم زیادہ تسکین بخش ہیں۔ غصہ مہربانی سے زیادہ پُر لطف ہے اور نفرین آفرین سے زیادہ خوش آئند۔ وہی ایک مسلم ہے

سجھانے پر کس قدر قدرت تھی ۔

تیسرے واقعات و حالات کے حسن قیج کی تصویر سطح کھینچنا کہ جو برائیاں بسبب الفت و عادت کے دلون میں کھب گئی ہوں انکی بُرائی ، اور جو خوبیاں سوسائٹی کے اثر سے نظرون سے پگھل گئی ہوں انکی خوبی فوراً دلون پر نقش ہو جائے ۔ یہ کمال بھی جو سرسید کی تحریر میں دیکھا جاتا ہے دوسری جگہ آج تک نہیں دیکھا گیا اور اسکی مثالیں خاص کر تہذیب الاخلاق کی قدیم اور جدید جلدون میں بکثرت موجود ہیں

مثلاً وہ ایک آرٹکل میں مسلمانوں کے کھانا کھانے کا طریقہ اسی طرح بیان کرتے ہیں کہ ”ہندوستان میں مسلمانوں کے کھانا کھانے کا یہی وہی طریقہ ہے جو ہندوؤں کا ہے ؛ صرف اتنا فرق ہے کہ ہندو چوکے میں بیٹھتے ہیں ، مسلمان دسترخوان بچھا کر بیٹھتے ہیں ۔ جس طرح ہندو سب طرح کا کھانا ایک ساتھ اپنے آگے رکھ لیتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی قابون اور کابیون اور غوریون اور شتریون اور پیالون میں سب طرح کا کھانا اور سب قسم کی روٹی اور ہر طرح کے کباب و فرنی کے خواجے اور بورانی کے پیالے اور چائے و ترے کی پیالیاں سب لگے پوجائے کی طرح سب اپنے آگے رکھ لیتے ہیں اور اس ایک دسترخوان پر کوئی فیروزی کلمہ شہادت کی انگلی سے اور کوئی (دست بخیر) چارون انگلیوں سے چاٹ رہا ہے ، کوئی پلاؤ میں اردی کھانے ملا کر کھا رہا ہے ، کسی نے سالن ملا ہوا پلاؤ کھا کر نان آبی سے تھرا ہوا پنچہ مبارک پوچھ کر روٹی کو سالن میں ڈبو کر کھانا شروع کیا ہے ، کسی نے بورانی کے پیالے کو موند سے لگا کر سرتا بھرا دیہ کمرہ کہ واسطہ بڑی تیز ہے ۔ ادھ ادھ کرنا شروع کیا ہے ۔ تمام چھوٹے برتن اور نیم خوردہ کھانا اور چھوڑی ہوئی ہڈیاں اور روٹی کے ٹکڑے اور سالن میں کی نکلی ہوئی لکھیاں سب آگے رکھی ہوئی ہیں ۔ اس عرصہ میں جو شخص پہلے کھا چکا ہے اُسے ہاتھ دھوا ، کھنکار کھنکار کر گلا صاف کرنا ، اور بیسن سے دانت رگڑنے ، اور زبان پر دوا انگلیاں رگڑ کر صاف کرنا شروع کیا ہے ۔ اور اور

مگر موقع کا تصور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جو حالت ان لفظوں سے ظاہر ہوتی ہے اُسکے بیان کرنے کے لیے ان سے بہتر الفاظ ملنے کا سقد مشکل تھے۔

دوسرے مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مطلب کو اس طرح سلجھا کر ادا کر جانا کہ جو مضمون

لفظوں میں سماتا نظر نہ آتا ہو وہ ایسی خوبی سے ادا ہو جائے جیسے انگوٹھی پر نگین چڑ دیا۔ اس کا طاق

جو قدرت سرسید کے قلم میں دیکھی گئی ہے وہ فی الواقع نادر الوجود تھی۔ قرآن مجید میں بے شمار مقامات

ایسے ہیں کہ سرسید کی تفسیر دیکھنے سے پہلے ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اُن مقامات کے معنی اُس اصول کے

موافق قرار دیئے جاسکیں جسکے مطابق سرسید نے تمام قرآن کی تفسیر کرنے کا دعویٰ کیا ہے؛ مگر تفسیر

دیکھنے کے بعد مستثنیٰ مقامات کے سوا کوئی مقام ایسا نظر نہیں آتا جسکی تفسیر اُسی اصول کے موافق پوری

نہ اُتر گئی ہو۔ اگرچہ اسکی مثالیں قرآن کی تفسیر میں جایا موجود ہیں مگر ایک نہایت بدیہی مثال

آدم کے قصہ کا بیان ہے۔ اس قصہ کی نسبت۔ جو کہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔ اگرچہ علامی سلف میں

سے بھی بعض محققین نے یہی لکھا ہے کہ یہ کسی واقعہ کی خبر نہیں بلکہ انسان کی فطرت کا بیان بطور

تمثیل کے کیا گیا ہے مگر علامی سلف اس رمز کی طرف ایک محفل اشارہ کر کے آگے بڑھ گئے ہیں؛

کسی نے قصہ کی تمام جزئیات کو تمثیل کے قالب میں ڈھال کر نہیں دکھایا۔ سرسید نے اول

تہذیب الاخلاق میں اسی مضمون کو ایک فرضی قصہ کے پیرایہ میں بیان کیا ہے اور پھر تفسیر

میں بحیثیت ایک مفسر کے تمام قصہ کے جزئیات کو انسان کی فطرت اور اُسکے قوی پر ایسی خوبی

سے منطبق کیا ہے کہ اُن سے پہلے کسی سے یہ کام بن نہیں آیا۔ پس صرف اسی مضمون کو تہذیب الاخلاق

یا تفسیر میں دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس شخص کو بذریعہ تحریر کے مشکل مشکل عقود کے

اُرنے لگتا ہے، باچھون تک کھڑے ہیں، سانس جلدی چلتا ہے، رگین تن جاتی ہیں، آنکھیں کان بھون
اور ہاتھ عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں، عین عین آواز میں نکلنے لگتی ہیں، آستین چڑھا ہاتھ پھیلا، اُسکی
گردن اسکے ہاتھ میں اور اُسکی ڈارھی اُسکی مٹھی میں پٹا ڈکٹی ہونے لگتی ہے، کسی نے بیچ بچاؤ کر چھڑا دیا تو غراتی ہو
بٹ دھڑلا گیا اور ایک دھڑ اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑ دیں سسلاتے اپنی اہلی
”جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اُس قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کیمن غرض ہو کر رہ جاتی ہے،
کیمن تو ن تکرار تک نوبت آ جاتی ہے، کیمن آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر
خیر گذر جاتی ہے، مگر ان میں کسی نہ کسی قدر کٹھن کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں
سے کٹھن کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

یامثلًا ایک آرکل میں۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی دنیوی ترقی میں کوشش کرنا
انکی دنیا اور دین دونوں کی خیر خواہی کا کام ہے۔ ایک موقع پر لکھتے ہیں ”اب دوسری طرح پر غور کرو اور
ایک نیٹالی دنیا بناؤ اور یہ تصور کرو کہ ہندوستان میں تمام مسلمانوں کے پاس دولت و حکومت اور نصب نہ رہے،
سب مفلس ورتان شبینہ کو محتاج ہوں (جیسا کہ انشاء اللہ تعالیٰ ان بد عقلیوں اور بد فہمیوں اور بد نصیبیوں کے
سبب۔ جو زمانہ حال میں اُنکے خطوط پیشانی سے پڑھی جاتی ہیں۔ غریب ہونی والا ہے) اور وہ بد بھیک مانگے پھرین
انکی اولاد جاہل اور نالائقی چور اور بد معاش ہو، واعظین کو۔ جو محض ریاکاری اور مکاری سے دنیا کماتے پڑے
پھرتے ہیں۔ کرنی ٹکا دینے والا یا فتمہ تر کھلانے والا نہ رہے، جناب حضرت پیر جی صاحب۔ جو لوگوں کو مرید کرنا پشاکر
بناتے پھرتے ہیں اور سالانہ ٹیکس یا جزیہ اُنپر مقرر کرتے ہیں اور ہر سال اُسکی تحمیل میں مصروف ہیں۔ انکو کوئی
دینے والا نہ رہے، یا جناب مولوی صاحب قبلہ۔ جو حدیث و تفسیر یا صدر اوشمن یا زغہ طالب علموں کو پڑھاتے ہیں۔

بے تکلف بیٹھے کھانا نوش فرماتے ہیں۔ نہ اُن ہاتھ مونہ دھونے والوں کو خیال ہے کہ ہم کھانا کھانے والوں کے قریب کیسی حرکات ناشائستہ کرتے ہیں اور نہ کھانا کھانے والوں کو اُن لوگوں کی کریہ آواز سننے اور زرد زرد ہلدی سے ہوئے رنگ کا لعاب نکلنے اور بلغم کے لوٹھڑے تھو تھو کر کے چلچلی یا تاش میں تھوک دینے اور بتاسے کی طرح اُس کے پانی پر تیرتے پھرنے کی پرواہ ہے۔ نغود باللہ منہا !!

یامثلہ ایک آرککل میں بے تہذیبک و میون کی بحث و تکرار کی تصویر اس طرح کھینچی ہے کہ ”جب کتے آپس میں ملکر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں، پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز اُن کے تھنوں سے نکلنے لگتی ہے، پھر تھوڑا جڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں، اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے، پھر باچھین چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں، اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے، ڈاڑھوں تک دانت باہر نکالتے ہیں، مونہ سے جھاک نکل پڑتے ہیں، اور عینف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور ایک دوسرے سے چٹ جاتے ہیں، اسکا ہاتھ اُسکے گلے میں اور اسکی مٹنگ اسکی کمر میں، اُسکا کان اسکے مونہ میں اور اسکا ٹینڈو اُسکے جڑے میں، اسنے اُسکو کاٹا اور اُس نے اُسکو پیچھا کر بھنبوڑا۔ جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔“

”نا حذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح پرتکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں، پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے، ایک کوئی بات کہتا ہے، دوسرا بولتا ہے واہ! یون نہیں، یون ہے، وہ کہتا ہے واہ! تم کیا جانو، وہ بولتا ہے تم کیا جانو، دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے، تیوری چڑھ جاتی ہے، منہ بدل جاتا ہے، آنکھیں ڈراونی ہو جاتی ہیں، باچھین چر جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے ہیں، تھوک

لے بیٹھن اہل میں انگریزی سے لیا گیا ہے مگر سرسید کا اس میں بہت کچھ تصرف ہے جسکے سبب وہ نسبت اہل کے بہت زیادہ دیکھ پ ہو گیا ہے

مثال

حالت میں۔ کہ ہم بخوبی یقین کرتے ہیں کہ مسلمان یقینی اپنے مذہب پر ٹپختہ ہیں، خدا کو ایک جانتے ہیں، رسول کو برحق سمجھتے ہیں، نماز روزہ حج زکوٰۃ فرض جانتے ہیں، اونے اونے آدمی ضروری نماز روزے کو سٹلے جاتا ہے، یا ہر طرح پر اس کے جاننے کا سامان یا موقع موجود ہے۔ آیا مذہب اسلام کے دوستدار کا یہ کام کہ اپنے تئیں بیرونی یا حضرت صاحب یا مولوی صاحب کہلانے اور دغا بازی سے دنیا کمانے کے لئے انہیں باتوں کا جبکی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹھا ہوا وعظ کیا کرے؟ یا جبکی ضرورت و حقیقت مسلمانوں کو اور خود اسلام کو ہر اسکی تدبیر کوشش کرے؟

”افسوس خدا ہاتھ نہیں آتا“ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہیں ہیں، ورنہ ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر ان کے سامنے بجاتا اور کہتا اؤ خدا! اور اے جناب رسول خدا! تم مجھ میں اور انہیں محاکمہ کرو اور بتاؤ کہ کون تمہارا دوستدار ہے؟ میں گنہگار؟ یا بدیندار؟ اور انشاء اللہ تعالیٰ اگر خدایا ہے اور قیامت درست ہے تو یہ معرکہ ہونا ہے۔ لیکن با اینہما اگر کوئی مبالغہ پر آمادہ ہو تو میں مبالغہ کو موجود ہوں

یا مثلاً شرعی حیلے۔ جو فقہ کے فتاویٰ میں گناہ سے بچانے یا گناہ پر دلیر کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ انکی مذمت پر سرسید نے ایک آرٹیکل ظریفانہ سوال و جواب کے پیرایہ میں تہذیب الاخلاق میں لکھا ہے جس کا عنوان ہے ”انشاء اللہ“ ہم اس آرٹیکل کو بحسنہ اس مقام پر لکھتے ہیں۔

<p>کافر کافر! یوں کہو ”انا مؤمن حقاً“ اس جگہ انشاء اللہ کا لفظ نہیں کہتے، ایسے موقع پر یوں بولنا کفر ہے۔</p> <p>پھر حضرت کس جگہ کہتے ہیں؟</p>	<p>کافر کافر!</p> <p>کیون حضرت کافر کیوں؟</p> <p>تخنہ کیا کیا؟</p> <p>میں نے کہا ”انا مؤمن انشاء اللہ“</p>
---	--

اے گوید ایک مولوی یا فقیہ ایک جاہل آدمی سے مخاطب ہے اور اسے جو یہ لفظ کہا ہے کہ انا مؤمن انشاء اللہ اس پر اسکو کافر بتاتا ہے ۱۲

انکو کوئی چار پیسے کو نوکر رکھنے والا نہ رہے (جیسا کہ اب بھی یہی حال موجود ہے کہ اچھے اچھے مولوی ٹکے ٹکے کو مار دیکھتی ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا) تو اسوقت دین کا کیا حال ہوگا “

” مگر اسکے ساتھ یہ بھی تصور کرنا چاہئے کہ بیٹ ایسی چیز ہے کہ دین رہے یا جاوے ، خدا ملے یا نہ ملے ، اُسکو

بھڑا چاہیے ؛ تو ایسی حالت میں مسلمانوں کو بیٹ بھرنے کی تو کچھ فکر کرنی چاہئے ہوگی ۔ سو اُسکا خیال بڑے

دینداروں کی نسبت تو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کے گھر چھتری عوار ہے ہیں ، کسی جنگل میں گھانسن چھیل ہے ہیں ،

کسی پہاڑ پر لکڑیاں چن رہے ہوں گے ، کسی کا گھڑا مل رہے ہوں گے ۔ اور جو ایسے پکے دیندار نہیں ہیں اُنکی نسبت

کچھ خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ کیا کریں گے ؟ معلوم نہیں کہ اُنسے جیٹھانے اور جزائر نوآباد بھریں گے ، یا یتیم خانے اور کلیسا

رونق پاویں گے ۔ پس ایسی حالت میں خیال کرنا چاہئے کہ دین اسلام کی کیا شان ہوگی ؟ اور اُسوقت ہم سلام

کریں گے اور پوچھیں گے کہ کیوں جناب قبلہ و کعبہ ؟ ہم جو مسلمانوں میں دنیوی ترقی و تہذیب و تربیت و شایستگی میں

کوشش کرتے تھے وہ ہمارا لامرعاش میں منہمک ہونا اور اُسکی ترغیب دینا اور امیر معاویہ کی طرف سے بالکل ذہول

اور غفلت کا پردہ ڈالنا تھا ؟ یا یہ کام خاص خدا کا اور بالکل دین کا اور سراسر معاد کا تھا “

” خدا تعالیٰ نے مذہب اسلام کو عین حکمت بنایا ہے ؛ اُسکی بھلائی چاہنے والے کو ضرور ہے کہ وہ بھی حکیم ہو ،

نہ مکار اور دغا باز ۔ اور حکیم کا یہ کام ہے کہ جو مرض دیکھتا ہے اُسکی دوا کرتا ہے ۔ اسوقت ہندوستان کے مسلمانوں کا

یہ حال ہے کہ امور معاشرہ و تمدن و معاشرت اور علم کی اتھری و خرابی کے سبب روز بروز حراب و ذلیل و حقیر و برباد ہوتے

جاتے ہیں ، اور واعظ و مولوی اور پیر جی خدا و رسول کے دشمن ، انکو روز بروز برباد و تباہ کرتے جاتے ہیں ۔ پس ایسی

لے جب کلچ قائم کرنے کی تدبیریں شروع ہوئیں اور تہذیب الاخلاق جاری ہو اُس وقت ایک آرٹیکل علی گڑھ گزٹ میں

کسی نے شایع کیا تھا جس میں یہ بھی لکھا تھا کہ جو قومیں امر معاشرہ میں منہمک ہو گئیں ہیں وہ دین سے بالکل غافل اور دست بزار

ہو گئی ہیں ۔ سید صاحب نے یہ آرٹیکل اُسی کے جواب میں لکھا تھا ۱۲

کوئی اشرفی نہیں۔ کیوں! سچ بات ہوئی کہ نہیں؟

بات ہی بات میں گناہ اُلٹ گیا کہ نہیں؟ یہ تو باتیں ہی

باتیں ہوئیں، روپے پیسے، سود بٹے کے معاملہ میں

بھی لفظوں ہی کے اُلٹ پھیر سے گناہ اُلٹ جاتا ہے۔

تو لہ بھروسہ سولہ روپے کی قیمت کا ہم سے قرض لو، سود

بچنے کو کہہ لو کہ بیس تو لہ چاندی لینگے، سولہ تو لہ پاندی

میں وہی تو لہ بھروسہ آیا، اور چار تو لہ چاندی سود میں

بچ کر ہی اور سود نہ ہوا۔ کھوٹا سونا جس میں ذرا سا

تانبہ کا میل ہو قرض دو، اور اُسی وزن کے برابر کھرا

سونا لے لو، مال تو زیادہ کا ہاتھ لگ گیا اور سود نہ ہوا۔

مکان گروی رکھو، راہن سے کھلو الو کہ سکونت میں بچے

بجل کی، کرایہ کا فائدہ ہوا اور سود نہ ہوا، گانو گروی لو

مثلاً ہزار روپے کو جس میں دو سو روپیہ سالانہ کا

فائدہ ہو، راہن سے اتنی روپیہ سال لینے کے اقرار پر

پٹا لکھوا لو، اور گانو پر قبضہ کر لو، کل منافع تحصیل کرو،

ایک سو بیس روپیہ سال سود کے۔ پٹے کے نام سے بچے

کہ نہیں؟ اور سود نہ ہوا۔

حضرت! کیا یہ ہوتا ہے؟

خدا کی قسم سب کرتے ہیں، جتنے مقدس، خدا پرست،

دہائی، نیم دہائی، مقلد، حنفی، زیمت دار،

تعلقہ دار ہیں سب کرتے ہیں، بڑے بڑے مولویوں نے

فتوے دیدیے ہیں۔

اب سمجھے کہ لفظوں کے اُلٹ پھیر سے گناہ پاٹ گیا کہ نہیں؟

اجی ابھی ہمارے پاس کوئی زکوٰۃ کار روپیہ لاوے اور ہم

مستطیع ہوں، ابھی گھر میں جا کر بیوی سے کہہ آؤں کہ

ہم نے اپنا کل مال تم کو ہبہ کیا، اب ہم مفلس بن گئے کہ نہیں؟

باہر آؤں اور زکوٰۃ کار روپیہ لے لیں، باتیں ہی تو ہیں،

ان بار بکیوں کے سمجھنے کے لئے علم درکار ہے۔

بھلا حضرت یہ تو ہوا، انشاء اللہ والی بات رہ گئی،

اُسکو بھی کسی مثال سے سمجھا دو۔

اَرِنے میان! یوں سمجھو کہ ہمنے تمہارا دل خوش

کرنے کو تم سے کہہ دیا کہ ہم کل تمہارے ہاں آویں گے انشاء اللہ،

ہمارا الادہ آنے والے کا کچھ نہ تھا، یوں ہی کہہ دیتا تھا، جب

ہم گئے تو معلوم ہوا کہ خدا نے نہیں چاہا، اسی پر وعدے کو

قسم سے بچنے، وعدہ پورا نہ کرنے، بے گناہ دھوکا دینے، جھوٹ بولنے اور جھوٹا نہ ہونے میں۔

حضرت پھر تو انشاء اللہ خوب اوزار ہے، کیا مسلمانوں کا برتاؤ اسی مسئلہ پر ہے؟

ہاں، جو پرہیزگار، مولوی، عالم، مشرع پر چلنے والے ہیں، گناہوں سے بچنا چاہتے ہیں، وہ ہمیشہ اس پر خیال رکھتے ہیں۔

حضرت من تو نہیں سمجھا۔

فقہ پڑھی ہو، اصول فقہ کو جانا ہو، عالموں کی صحبت اٹھائی ہو تو جانو۔ جاہل کندہ ناتراش نہ پڑھے نہ لکھے جانو تو کیا جانو؟

حضرت آپ ہی سمجھا دیجیے۔

آرے میان! ان کے معنی تو اگر: شاء کے معنی چاہا، اللہ کے معنی تو اللہ کے ہیں ہی، مگر وہ فاعل واقع ہوا ہے جس کے معنی نے کے ہوتے ہیں۔ اب سب ملو

تو یہ معنی ہوے "اگر چاہا اللہ نے" اب دو مسئلے فقہ

کے اور سمجھو! اگر کوئی امر کسی پر مشروط ہو، اسباب

نہ پورے ہونے شرط کے ادا نہ کیا جاوے تو کچھ گناہ لازم نہیں آتا "اذا فات الشرط فالت مشروط" ایک

مسئلہ ہوا؟ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ خالق جمیع افعال عباد کا خدا ہے۔ پس جب ان دونوں مسئلوں کو ملا

انشاء اللہ کے معنوں کو دیکھو تو پھر انشاء اللہ کہنے کے بعد کچھ گناہ نہیں رہتا۔

حضرت! میں مسئلے تو بخوبی سمجھ گیا، مگر اب تک میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ گناہ کیونکر نہیں رہتا؟ کیا وہ

لفظوں کے الٹ پھیرتے الٹ جاتا ہے؟

جاہل! اور کیا؟ ہماری جیب میں ایک گھڑی ہے، ہمارے دوست کو اسکی ضرورت ہے جب اُسے ہم سے

مانگی، ہم نے کہا کہ ہمارے گھر میں کوئی گھڑی ہی نہیں

اُسے کہا قسم تو کھاؤ، ہم نے کہا خدا کی قسم ہمارے گھر میں

کوئی گھڑی نہیں۔ ہمارے گھر میں ایک اشرفی

رکھی ہے، ہمارے دوست نے ہم سے اشرفی مانگی، ہم نے

کہا کہ ہمارے پاس کوئی اشرفی نہیں۔ اُسے کہا

قسم تو کھاؤ، ہم نے کہا کہ خدا کی قسم ہمارے پاس

پلٹ گیا کہ نہیں؛ مگر اس زمانہ میں جو کج خلق مقلدین فلسفہ ملاحہ
نکلتے ہیں وہ تو مذہبِ اسلام کی جڑ کاٹتے ہیں۔ یا اللہ کیا مشکل
پڑی ہے !!!

تھوڑی دور چلے گئے کہ ایک پیر مرد متبرک صدر سفید پوش
ملے، جانا کہ یہ بھی کوئی مولوی ہیں، پکار کر کہنے لگے کہ مجھے
آپ سے کچھ پوچھنا ہے، انھوں نے کہا کہ بھائی! کیا کوئی مذہبی
مسئلہ ہے؟ بولے حضرت! ہاں مذہب کا مسئلہ ہے۔ انھوں
نے کہا کہ بھائی! زمین مولوی نہ مولوی کی دم، مجھ سے
اور مذہبی مسئلوں کے پوچھنے سے کیا واسطہ؟ کبھی مولوی
صاحب جاکر پوچھو، اسی شہر میں بہت مولوی ہیں، یہاں
سے دس پندرہ کوس پر نامی نامی قصبے ہیں، وہاں مولویوں

کے ڈھیر کے ڈھیر ہیں، وہاں جاکر پوچھو!
نہیں حضرت! میں آپ ہی سے پوچھنا چاہتا ہوں،
آپ کا نام بھی تو مشہور ہے۔

اُس نے میان! شیطان کا نام تو مجھ سے بھی زیادہ مشہور ہے،
ابھی وہی شہرت تو مجھ کو ہوئی بھی نہیں، میں نیچری
مشہور ہوں، مولوی ملا نہیں ہوں، مجھ سے مت پوچھو!
حضرت! اگر مولوی ملاؤں تو دل تسکین ہوتی تو آپ تک کیوں
آتے؟ جب ل ہی کو تسکین تو مولوی ملاؤں کو کیا کریں؟ پھر آپ
نیچری گن یا پیچری بے پوتہ دل مانتا نہیں، خدا کے واسطے بتا دیجیے!
اچھا صاحب پوچھو کیا پوچھتے ہو؟ گریں کسی فتاوے و تاویل
کو نہیں جانتا، خدا کی کتاب اور خدا کے فتاوے کو جو سب کی

لے یہاں تک مولوی اور اُس کے جاہل مخاطب کی گفتگو تھی اس کے بعد گویا آئینہ کل اکھنڈ والا لکھتا ہے کہ اُس جاہل کا مقابلہ راہ میں نیچریوں کے
کسی سرگروہ سے ہو گیا پھر اُن دونوں کے سوال و جواب میں ۱۱

اللہ خدا کے فتاوے سے مراد فطرت انسانی ہے جس میں حسن و قبح اشیا کا علم ودیعت کیا گیا ہے اور جس کی طرف مجبر صادق نے اس حدیث میں
اشارہ کیا ہے کہ ”اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ وَتَوَافِقَاكَ الْمَقْشُورَ“ اور جو لوگ اس فتاوے کے موافق عمل کرتے ہیں وہ مفتیوں کے فتوؤں سے مستغنی
ہیں۔ چنانچہ پہنے خود دیکھا ہے کہ ذاب مصطفیٰ خان مرحوم رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے پاس ایک موضع گروی تھا، بہت مدت کے بعد
مالک نے اُس کو پھر ناچا، ہر چند کہ رہن نامہ میں تمام منافع موضع مروندہ کامرہن کو معاف و مباح کر دیا گیا تھا اور فک رہن کے وقت
مالک بخوشی کل زہر رہن ادا کرتا چاہتا تھا اور مفتیوں نے بھی اباحت کا فتوے دیدیا تھا مگر اُس مرحوم مغفور نے یہ حدیث پڑھی کہ استفت قلبک
ولو افقاک المفتون اور جب قدر محل اس موضع سے وصول ہوا تھا سب زہر رہن میں مجبور دیکر باقی روپیہ اہن سے لے لیا ۱۲

کہ سانس نہ ٹوٹنے پائے، ورنہ انشاء اللہ کا جوڑ ٹوٹ جاتا،
پھر جو چاہتے وہ کہہ دیتے، ذرا بھی جھوٹی قسم کھانے کا گناہ
نہ ہوتا۔

حضرت! بایں تو آپ نے خوب بتائیں، مگر میں
حیرت میں ہو گیا، اب تو رخصت ہوتا ہوں، اور کسی سے
بھی تحقیق کرونگا، میرا دل دھکے لگ کر رہا ہے۔

تو جس مولوی سے چاہنا پوچھنا، یہی بتا دیا۔ کہ
میں ابھی ہدایہ، شرح وقایہ، درمختار، بحر الرائق، نہر النہار
اور بڑے بڑے معتبر فتاویٰ ہر ایک جزئی کی روایت نکالوں،
اور تنے وہ قافے بھی دیکھا ہے، جو پرانے خاندانی
مولویوں اور قاضیوں کے ہاں ہوتا ہے، میں اس وقت
اسکا نام بھول گیا ہوں، یاد آجائیگا تو بتا دوں گا، ہمیں
ہر ایک مسئلہ کی نسبت دو روایتیں لکھی ہیں، ایک میں جائز
حلال، اور دوسری میں ناجائز حرام لکھ رکھا ہے، پھر
جو کسی روایت کے مطابق چاہا فتوے لے لیا، بہت ہوا
روپیہ دو روپیہ، فتوے کے نام سے نہیں۔ اور کسی نام سے
کبھی کبھی دیتے رہے۔ کیوں؟ بات کی بات میں گناہ

مشروط کیا تھا، اذاعات الشیرواۃ المشروۃ، بات کی
بات میں گناہ پلٹ گیا۔ کبھی تم عدالت میں گواہی
دینے بھی گئے ہو؟

ہاں صاحب! ایک دفعہ گیا تھا، میں نے تو جو سچ
تھا وہ کہہ دیا تھا، مگر میرا بھائی مقدمہ ہار گیا، میں کیا
کرتا، وہاں ایک کالی مغل کی گول چنٹ دار ٹوپی پہنے
ہوئے گوری رنگت کا مسلمان مولوی کرسی پر بیٹھا تھا،
اُس نے قسم دی کہ سچ کہنا، میں جھوٹ بولنے سے ڈر گیا،
سچ کہہ دیا۔

ہاں فقہ بخائن سے، عالموں کی صحبت نہ اٹھانے سے
یہی نتیجہ ہوتا ہے، ارے جب اُس مولوی جج نے
قسم دی تھی کہ سچ بولنا تو نے کہا ہوتا کہ خدا کی قسم سچ
بولوں گا انشاء اللہ، اگر وہ جج نام کا مولوی تھا اور فقہ
نہ جانتا تھا تو تو پکار ہی کر انشاء اللہ کہہ دیا ہوتا، اور
اگر وہ مولوی تھا اور ٹھیکرے ٹھیکرے برلائی آن پڑی تھی
تو پکار کر کہا ہوتا کہ خدا کی قسم سچ بولوں گا، اور جھٹ پٹ
دل میں کہ لیا ہوتا انشاء اللہ، مگر یہ خیال کما ہوتا

حصہ دوم

انشاء اللہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، تم نے ایک مولوی سے کہا کہ میں تم کو انشاء اللہ دس روپے دوں گا تو اس کے یہ معنی ہوئے ضرور بے شک تم کو دس روپے دوں گا۔

حضور! اپنے وعدوں کی نسبت تو مولوی بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ وعدہ لفظی نہیں ہوتا، بلکہ حکمِ نصوصِ صریحہ شریکۃ اور نذرِ معین کے واجب ہو جاتا ہے، مگر اور حکم کہتے ہیں کہ نہ وعدہ خلافی کا گناہ ہوتا ہے، نہ قسم ٹوٹنے کا گناہ ہوتا ہے، اور انشاء اللہ کو ایک سپر بناتے ہیں جو ہر ایک حربے سے بچا لیتی ہے، حضرت! خدا ماریا چھوڑے ان مولویوں جو اسلام بنا رکھا ہے اگر وہی اسلام ہو تو میرا سلام، اس نیچر پر ہی چمے جو سچائی کو اسلام بناتے ہیں۔

کرنے کا زیادہ یقین دلایا اور وعدہ پورا نہ کیا، تیسرا اس بات کا کہ خدا کو ضامن دیا اور اس کے نام کی عزت کا بھی کچھ ادب نہ کیا۔ اگر کسی بات پر قسم کھا کر انشاء اللہ کیا، دو قسم توڑنے پر گناہ سے نہیں بچتے، بلکہ دو گنا گناہ ہوتا ہے، قسم توڑنے کا، خدا کے ساتھ تعلیق کر کر اس کا ادب نہ کرنے کا، جب قسم کھانی کہ سچ کہوں گا اور ظاہر میں یا دل میں انشاء اللہ کہہ لیا اور پھر جھوٹ بولے تو تین گناہ ہوئے، جھوٹ بولنے کا، قسم توڑنے کا، خدا پر تعلیق کر کے اس کا ادب نہ کرنے کا۔ جس بات کا وعدہ کیا جاتا ہے جب مصمم اور نہایت مضبوطی اور سچی نیت سے اس کے پورا کرنے کا ارادہ ہوتا ہے اس وقت اس کے ساتھ

اگرچہ یہ تمام آرٹیکل ظرافت کے پیرایہ میں لکھا گیا ہے مگر اس میں جس قدر مسائل فقہاء کی طرف منسوب کئے گئے ہیں ان میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو فقہ کے قوادون میں موجود نہ ہو۔ اسی قسم کے فتوؤں کی نسبت کہا گیا ہے کہ ”استفت قلبک ولو افتاک المفتون“ اور ایسے ہی حیلوں کی نسبت جب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پوچھا گیا کہ ما الحیلۃ؟ تو آپ نے فرمایا ”تَرْکُ الْحِیْلَةِ“

یا مثلاً وہ امام غزالی کے ایک رسالہ کے ریویو میں اہل دنیا اور مشائخ و علما کی نسبت

بیچہ

آنکھوں کے سامنے کھلا ہوا ہے۔ جانتا ہوں، جو کہو گا اسی سے کہو گا۔

بہت اچھا آپ اُسی سے فرمائیے گا، میں پوچھتا ہوں کہ آپ انشاء اللہ کو جانتے ہیں؟

خوب جانتا ہوں، ہماری دلی کہنے والے تھے، بڑے شاعر تھے، ذرا مزاج میں ظرافت تھی، اُنکے یہ اشعار مجھے یاد ہیں، پہلے مصرع میں شاید کچھ لفظ اول بدل گئے ہیں۔

”مردی کہتے ہیں ہمکو تو نے کیوں رسوا کیا۔“

”کیا گنہ کیا جسم کیا تقصیر بمنے کیا کیا“

”واسطہ باعث سبب موجب جت کچھ بات بھی“

”راز وہ کبخت کیا تھا میں نے جو افشا کیا۔“

”کیا کہا کس سے کہا کسے سنا کس گھر ہی“

”کس جگہ کس وقت کس مہم آپ کا چرچا کیا“

حضرت! میں آپ سے انشاء اللہ خان شاعر کا

حال نہیں پوچھتا، انشاء اللہ کے لفظ کی نسبت حکم

شرع کا پوچھتا ہوں کہ کس مراد اور کس مطلب سے

اور کس مقام پر اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے؟

یہ کہو، ذرا مجھ کو خدائی فتاوے نیچر دیکھ لینے دو۔

اس میں تو یہ لکھا ہے کہ ملک کسی کام کی نسبت یہ نہ کہنا چاہئے

کہ میں کل کروں گا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اگر خدا چاہے

تو میں کل کروں گا۔ خدا سبب العلل ہونے کے ہر کام

کو۔ خواہ انسان کرے یا حیوان۔ اپنی طرف منسوب کرتا ہے

اسلئے انسان کو بھی لازم ہے کہ ہر چیز کو خدا سے متعلق

کرے، پس جس بات پر انشاء اللہ کا لفظ کہا جاتا ہے

انشاء اللہ کے لفظ سے اس بات پر تعلیق ہوتی ہے

اور وعدہ کو زیادہ استحکام ہوتا ہے، سنئے، اے کوکال

یقین ہو جاتا ہے کہ وعدہ کرنے والے نے خدا پر اس

وعدہ کی تعلیق کی ہے تو ضرور اُسکو پورا کر گیا۔ اگر تنے

کسی سے وعدہ کیا کہ میں کل تمہارے گھر آؤں گا اور اسکے

ساتھ انشاء اللہ نہیں کہا، اور نہیں گئے، تو صرف

وعدہ خلافی کا گناہ ہوا، اور اگر اُسکے ساتھ انشاء اللہ

بھی کہا اور پھر نہ گئے تو تین گناہ ہو ایک وعدہ خلافی کا،

دوسرا اس بات کا کہ جس وعدہ کیا تھا اُسکو وعدہ پورا

اور گواہ فیض درحقیقت وہ بت کوئی نقص یا عیب کی نہ ہو مگر اس وجہ سے کہ وہ اُسکے ناقص اور معیوب ہونے پر یقین رکھتے ہیں گو کہ وہ غلطی پر ہوں۔ خدا اور رسول کی شان سے اسکو بعید سمجھتے ہیں اور ایسے اُسپر یقین نہیں کرتے۔ غرض کہ اُنکو خدا کے تقدس اور رسول کی منزلت پر ایسا یقین ہے کہ وہ دوسرے کی اُسکے سامنے کچھ حقیقت نہیں سمجھتے۔ پھر وہ کوئی کیوں نہ ہو۔

اعمال میں سے فرائض کو حق سمجھنا، اور ضبط طبع پر ہو سکے اُنکو ٹوٹا پھوٹا مسلسل یا گنڈی دار ادا کرنا، اور اُس میں کوتاہی کو اپنی شامت اعمال سمجھنا، اور اُسپر تاسف کرنا، دل کو بدی اور بدبختی کیسہ اور فساد و بغض و حسد سے پاک رکھنا، کسی کے ساتھ دغا بازی نہ کرنا، کسی کا مال نہ مار رکھنا، کسی کو ایذا و تکلیف نہ پہنچانی، ہر ایک کے ساتھ محبت سچی دوستی سے پیش آنا، سب کی بھلائی چاہنا، سب کے ساتھ ایمان داری سے معاملہ کرنا اور رکھنا اختیار کیا ہے۔

دنیا تو گویا اُنکا مقصد ہی ہے ان باتوں کے سوا اُنھوں نے دنیا ہی دنیا کو بکڑا ہے، روپیہ کے ایمان داری سے پیدا کرنے میں، اپنی محنت و مشقت سے روٹی کمانے میں بے انتہا کوشش کرتے ہیں، روپیہ کمانے میں، عمدہ عمدہ مکانات بناتے ہیں، دنیا میں عزت و ترقی و شہرت حاصل کرتے ہیں، باغ بناتے ہیں، اور اُسکے پھولوں اور بیلوں کی سیر سے خوش ہوتے ہیں، میوے کھاتے ہیں، گھوڑوں پر چڑھتے ہیں، عمدہ سے عمدہ کپڑا پہنتے ہیں، اور اچھے سے اچھے کھانے کھاتے ہیں، قالینوں کے فرش کو جوتیوں کے تلے بچھاتے ہیں، تمام عیش و آرام جو کہ انسان عمدہ اخلاق اور شایستگی کے ساتھ کر سکتا ہے کرتے ہیں، خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو جس لئے اُسے پیدا کیا ہو برتتے ہیں اور کام میں لاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ خدا نے ہمارا دیا ہے ہم کیوں نہ برتیں اور کیوں

ایک مقام پر لکھتے ہیں ”اس مقام پر امام صاحب نے دو قسم کے دلوں کا حال لکھا ہے ایک نکاح و اسرار ملکوت اور کفر و ایمان کی حقیقت سمجھنے کے قابل ہیں (یعنی اہل دین) اور دوسرے وہ جو ناقابل ہیں (یعنی اہل دنیا) اور دونوں کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ مگر یہ مقام کسی قدر زیادہ تشریح کے قابل ہے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس مقام پر امام صاحب نے جو دوسری قسم کے لوگوں کا حال سے بحث کی ہے (یعنی اہل دنیا کے حال سے) ان میں وہ لوگ جو علانیہ اہل دنیا کہلاتے ہیں داخل نہیں ہیں؛ اہل دنیا سے میری مراد ان دنیا داروں سے نہیں ہے جن کو اہل دنیا بھی اللہ تعالیٰ سمجھتے ہیں۔ بلکہ اُن سے مراد ہے جنہوں نے دنیا کو بغیر کسی بے ایمانی اور دغا بازی کے اختیار کیا ہے؛ دنیا میں۔ بحیثیت دنیا داری۔ اپنی عزت، اپنا نام، اپنی شہرت، اپنا آرام، اپنی حشمت چاہتے ہیں؛ زہد و تقویٰ، علم و افتاء، صبر و قناعت کے ذریعہ سے دنیا و آخرت میں تفوق کی خواہش انہوں نے ظاہر نہیں کی؛ انہوں نے ایمان میں سے ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ پر دل سے یقین کیا ہو؛ وہ خدا کی ذات کو بے نقص اور رسول اللہ کو بے عیب سمجھتے ہیں؛ وہ کسی ایسی بات کو جس میں ان کی دلالت میں خدا پر کوئی نقص آتا ہو اور رسول اللہ پر کوئی عیب لگتا ہو۔ نہیں مانتے۔ گو وہ کسی بھی ہو اور کسی نے لکھی ہو، اور گو کہنے والے اور لکھنے والے کے نزدیک اُس سے کوئی نقص نہ آتا ہو اور عیب لگتا ہو۔

یہ وہ مقام ہے کہ امام غزالی نے اپنے رسالہ ”الفرقۃ بین الاسلام والزندقہ“ میں دو قسم کے لوگوں کا حال لکھا ہو ایک اہل دنیا۔ جنہوں نے ہوائے نفس کو اپنا خدا، سلاطین کو اپنا معبود، درہم و دینار کو اپنا قبلہ، حُب جاہ کو اپنی شریعت اور اہل دول کی خدمت کو اپنی عبادت قرار دیا ہو اور اس لئے وہ کفر کی ظلمت اور ایمان کی روشنی میں تیز نہیں کر سکتے۔ دوسرے اہل دین۔ جن کا دل دنیا کے میل گچیل سے پاک ہے، کامل ریاضت سے مجمل ہے، خدا کی یاد سے منور ہے، دُغیر و غیرہ اور اس لئے وہ کفر کی ظلمت اور ایمان کی روشنی کو بخوبی تیز کرتے ہیں۔ سرسید نے امام صاحب کے بظرافت اہل دنیا کے ایک خاص گروہ کو مستثنیٰ کر کے دنیا داروں کی برادری کی ہے اور پھر اہل دین کی خبر لی ہے ۱۱

مگر وہ دوسرا فرقہ بھی نہایت ہی خوفناک ہے جنکی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ ”انکو دل
دنیا کے میل کچیل سے پاک ہے، کامل ریاضت سے مجھلے ہے، خدا کی یاد سے منور ہے، فکر کی شیرینی سے شیریں ہے،
شریعت کی پابندی سے مزین ہے، مشکوٰۃ نبوت سے روشنی لیتا ہے، جلالدار آئینہ کی مانند ہے، انکو نورِ ایمان
نیشہ کی ہانڈی میں بے آگ کے سلگتا ہے، نور کے چکارے اُنکے دل سے نکلتے ہیں“ ہاں یہ سچ ہے کہ اس فرقہ
نے ہوائے نفس کو اپنا خدا، اور سلاطین کو اپنا معبود، اور درہم و دنانیر کو اپنا قبلہ نہیں بنایا، مگر خود
ہو امی نفس نے اُنکو اپنا خدا، اور خود سلاطین نے اپنا معبود، اور درہم و دنانیر نے اُنکو اپنا قبلہ بنایا ہے
پھر اُنکو بنانے کی کیا حاجت تھی۔

جسوقت کہ پیر صاحب یا مولوی صاحب کے گرد اُنکے متقین کا حلقہ ہوتا ہے اور حجرِ اسود
کی مانند اُنکے دست مبارک کے بوسہ دینے کو لوگ دوڑتے ہیں تو اُنکا دست مبارک میں الرحمن سے
بھی بالادست ہو جاتا ہے۔ مولوی صاحب، حضرت صاحب کی آواز کا چارون طرف سے اُنکے
کان میں آنا چاؤشانِ کسریٰ و کیفباد کی آواز سے بھی قوی اثر اُنکے دل پر ڈالتا ہے۔ مسکینی
اور اُنکسار اُنکو آسمان پر چڑھاتی جاتی ہے، اسلئے وہ اور زیادہ مسکین اور منکسر ہوتے جاتے ہیں۔
سادہ وضعی پر لوگ فریفتہ ہوتے ہیں، اسلئے وہ اور سادہ بنتے جاتے ہیں۔ دنیا سے نفرت
اُنکو دنیا دلاتی ہے، اسلئے وہ دنیا سے زیادہ نفرت کرتے جاتے ہیں۔ بے طعمی حاجت سے
زیادہ بغیر محنت کے درہم و دنانیر دلا دیتی ہے، اسلئے وہ زیادہ بے طمع ہوتے جاتے ہیں۔ اُنکی
ہر ایک بات پر لوگ آمنا و صدقہ فدا کہتے ہیں، اسلئے اُنکے دل میں دوسرے کی بات کی حقارت

لے یہ اقوال امام صاحب کے رسالہ سے لئے گئے ہیں جو اس جملہ پر ختم ہوتے ہیں کہ ”نور کے چکارے اُنکے دل سے نکلتے ہیں“ ۱۲

مصیبت بھگتین ؛ اگر خدا کو ان سے ہمارا عیش و آرام مقصود نہ تھا تو انکو پیدا ہی کیوں کیا تھا ۔ پس ہمارا فرض ہے کہ ہم انکو برتیں اور عیش اڑاویں ؛ مگر زیادتی نہ کریں کیونکہ جسطرح کے استعمال کے لئے وہ بنائے گئے ہیں اگر اُسطح پر استعمال نہ کریں تو مکھرام اور چور ہو گئے نہ شریف دنیا دار ۔ وہ نہ دعوے دینداری کرتے ہیں ، نہ کسی کے پیشوا بننا چاہتے ہیں ، نہ اپنے تئیں تابع سنت کو پسند کرتے ہیں نہ پیر مرشد ، نہ ممبر رپہ اعظ بننا چاہتے ہیں نہ استغناء کے مفتی ۔ سیدھی طرح سے خدا کے بندے رسول کی امت ہیں ، خدا کے دئے ہوئے عیش و آرام میں مست رہتے ہیں ۔ پس ایسے لوگ تو امام صاحب کی بحث سے خارج ہیں ۔

ہاں جو کچھ اس مقام میں امام صاحب نے لکھا ہے وہ اُن لوگوں کی نسبت لکھا ہے جو جبہ و علامہ اراہین ، دنیا چھوڑ دین کی راہ پر چلتے ہیں ، و زلات قال اللہ وقال الرسول میں بہرے ہیں ، دین ہی دین بیکارتے ہیں ، دین ہی کا اور خدا دین ہی کا بچھونا بناتے ہیں ، دنیا داروں نے جس قدر مختصر انچھو دین کے اختیار کئے تھے اُن دینداروں نے اُس قدر مختصر باقی دنیا کی اختیار کی ہیں ، اور جس قدر وہ دنیا کے حاصل کرنے میں مشغول تھے ، اسی قدر یہ دین کے حاصل کرنے میں مشغول ہیں ؛ گویا پہلے فرقہ کے بالکل برعکس ہیں ۔ اسی مقدس فرقہ کا (خدا ان سے پناہ میں رکھے) امام غزالی صاحب نے ذکر کیا ہے ۔ بے شک جب یہ فرقہ کر بلا اور نیم چڑھا ہو جاوے یعنی ہوائے نفس کو اپنا خدا ، اور سلاطین کو اپنا معبود ، اور درہم و دنانیر کو اپنا قبلہ ، اور حُب جاہ کو اپنی شریعت ، اور اہل دُؤل کی خدمت کو اپنی عبادت قرار دے تو کبھی کف کی ظلمت اور ایمان کی روشنی کو تیز نہیں کر سکتا ۔ فاقالہ الغزالی فو حق لا ریب فیہ ۔

آجائے تو جھپٹ گل جاتا ہے۔ اور اگر کبھی اگل دیتا ہے تو اس میں پر کہ اس سے بھی زیادہ لقمہ
ترتیر آویگا۔ یہی باتیں تھیں جنکے سبب حضرت عیسیٰ نے فروسیون اور صدوقیون کو یعنی
شریعت پر چلنے والے یہودیون کو ملاست کی۔ یہی لوگ اسکے مصداق ہیں کہ ”یلعنہم اللہ
و یلعنہم الالاعتون“ عمدہ زندگی وہی ہے جو سیدھی سادھی ایک دنیا دار کیسی ہو۔ پھر خواہ
وہ دوزخ میں جائے، یا بہشت میں۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ”مَا أَدْرِي مَا يَفْعَلُنِي وَلَا بَكْرُ“

اگرچہ سرسید نے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اُردو زبان اور اردو لٹریچر کو طرح طرح
سے مدد پہنچائی ہے مگر جو بے بہاد و خاصکر اُنکے لٹریچر کی اور کس سے اُردو لٹریچر کو پہنچی ہے اُسکے
حفاظ سے اُنکو فادراوت اُردو کو کتنا کچھ مبالغہ نہیں ہے۔ اگرچہ سرسید کے سوا اور بھی بہت سے
لائق لائق مصنف، مترجم اور مضمون نگار ملک میں موجود ہیں جو نئے نئے خیالات اور
نئے نئے اسلوبون سے اُردو زبان کو سرمایہ دار کر رہے ہیں؛ لیکن ہر شخص کی طرزِ تحریر میں
گو کہ وہ فی نفسہ کیسی ہی عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی ہو۔ یہ قابلیت نہیں ہوتی کہ وہ عام تحریرین کو اپنی
سطح پر لے آئے۔ بعضے اسٹائل ایسے اچھوتے اور شائع عام سے ایسے بعید ہوتے ہیں کہ اُردو لوگ
انکا تتبع کرنے کی دسترس اپنے میں نہیں پاتے، اور بعضے ایسے سپاٹ اور سیٹھے پھیکے ہوتے ہیں کہ
انکی طرف کسی کی توجہ مائل نہیں ہوتی، اور اسلئے دونو قسم کے اسٹائلون کا عام لٹریچر پر کوئی معتد بہ
اثر نہیں ہوتا۔ سرسید کی طرزِ تحریر میں یہی خصوصیت تھی کہ اُسکی لطافت اور خوبی کے سبب گل عموماً
اُسکو شوق اور توجہ سے پڑھتے تھے اور اُسکی سادگی اور بے تکلفی دیکھ کر ہر ایک کے دل میں بولیا ہی
کہنے کا حوصلہ پیدا ہوتا تھا۔ اگرچہ بیان کی قدرت اور اُسکا زور اور تاثیر جو اس شخص کی خاص تحریر میں

جنتی جاتی ہے۔ ہاتھوں کو مچھواتے چھواتے، ہر ایک مشکل کی حل کو دعائیں منگواتے منگواتے، ہر ایک مسئلہ کا فتوے دیتے دیتے، ایک وریجاری انہیں پیدا ہو جاتی ہے جسکے سبب لٹی بھلائی، دوزخ و بہشت، کفر و ایمان کی گنجی وہ اپنے ہاتھ میں سمجھنے لگتے ہیں۔ کسی کو کافر بنا دیتے ہیں اور کسی کو مرتد، کسی کو جہنم دیتے ہیں اور کسی کو بہشت، کبھی خازنِ جنت ہیں اور کبھی مالکِ جہنم۔ خدا کے نور کے دل میں بھڑکنے کے خیال سے ظلمت پر ظلمت میں پڑتے جاتے ہیں۔ یہ تمام باتیں مل کر حضرت کو ایک ایسا شخص بنا دیتی ہیں جو پھول پھلا کر گنپا ہو جاتا ہے۔ نہ کان رہتے ہیں جو کچھ سنیں، نہ آنکھیں رہتی ہیں جو کچھ دیکھیں، نہ موند رہتا ہے کہ حق بات کہیں۔ جو سرور اور دلی آسائش اور دل کے پھولنے سے جو مزہ اس فرقہ کو آتا ہے نہ کسی دنیا دار کو میسر ہوتا ہے نہ کسی دو تہمد کو اور نہ کسی صاحبِ تخت و سلطنت کو۔ پس اس فرقہ سے بھی کفر کی ظلمت اور ایمان کی روشنی کو تمیز کرنے کی توقع نہیں ہے۔ الاما شاء اللہ۔ کوئی آفت انسان کے لئے اس سے زیادہ نہیں ہے جبکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں نیک ہوں، کوئی گمراہی انسان کے لئے اس سے زیادہ نہیں ہے جب وہ جانتا ہے کہ میں پابندِ شریعت ہوں۔ وہ زبان سے اپنے تئیں گنہگار کہتا ہے مگر اسکا دل اسکو جھٹلاتا رہتا ہے۔ اس کہنے کو بھی وہ ایک نیکی اور تعالیٰ سمجھتا ہے۔ اپنی چال ڈھال شریعت کے موافق بناتا ہے مگر اسکا دل روز بروز سیاہ ہوتا جاتا ہے۔ انار کے دواگل نیچے ہونے، ڈاڑھی کے لمبی یا یک مشت و دواگلشت ہونے، کپڑے کو نجاست سے پاک کرنے، پانی کے پاک ناپاک ہونے پر دن رات بحث کرتا ہے۔ سب سے بے فتنہ لکھتا ہے، مگر دل کو نجاستوں سے پاک کرنے کا خیال بھی نہیں کرتا۔ اکل حلال و رصدق مقال پر بے بے وعظ کہتا ہے مگر جب کوئی فقرہ تر

اسٹائل کی پیروی کرنے والے تھے اسلئے اگر ان تمام فوائد کو صرف سرسید کی تحریروں سے منسوب کیا جائے تو کچھ بے جا نہیں۔

چونکہ اس مقام کو ہم تہذیب الاخلاق کے نتائج کے ذکر میں مفصل بیان کر چکے ہیں اسلئے یہاں اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائیں انکو فارسی نظم و نثر لکھنے کا بھی شوق رہا ہے اگرچہ فارسی زبان میں۔ جیسا کہ وہ خود بیان کرتے تھے۔ انھوں نے معمولی کتابوں کے سوا جو مکتبوں میں پڑھائی جاتی تھیں کوئی اعلیٰ درجہ کی کتاب نہیں پڑھی تھی مگر جن مجلسوں اور محبتوں میں انکا ابتدائی زمانہ گزرا تھا انہیں دن رات فارسی نظم و نثر کا چرچا رہتا تھا۔ مولانا صہبائی سے انکی دوستی اخوت کے درجہ کو پہنچی ہوئی تھی۔ مولانا سے جو طالب علم مکان پر فارسی پڑھنے آتے تھے ابتدائیں وہ سرسید ہی کی مکان پر انکو تعلیم دیا کرتے تھے۔ مفتی صدر الدین خان کے ہاں بھی انکا ایک پھیرا ہر روز ہوتا تھا جہاں صہبائی اوشیفۃ اور مومن وغیرہم کا جمع رہتا تھا۔ مرزا غالب کو وہ چچا کہتے تھے اور مرزا اسیر بزرگانہ شفقت کی نظر رکھتے تھے۔ نواب ضیاء الدین احمد خان انکے نہایت گارھے دوست تھے۔ اور یہ سب لوگ فارسی نظم و نثر میں کمال رکھتے تھے اسلئے ضرور تھا کہ فارسی لٹریچر پر انکی توجہ مائل ہو۔ مگر۔ باوجودیکہ یہ سب لوگ بیدل یا ابوالفضل یا جلالاے طباطبائی یا آؤر مشہور نازک خیال شادون کی پیروی کرنے والے تھے۔ لیکن ظاہر سرسید نے فارسی نثر میں بھی مثل اردو کی سادگی سے کبھی تجاویز نہیں کیا۔ اگرچہ انکی ابتدائی فارسی تحریریں۔ ایک سالہ کے سوا جو مسئلہ تصور شیخ کے بیان میں ہو۔ دستیاب نہیں ہوئیں مگر قدر کے بعد کی جو بعض تحریریں ملی ہیں انہیں ویسی ہی سادگی اور بے تکلفی

پائی جاتی ہے وہ تو اُسی کے دل و دماغ کا حصہ تھا، دوسرے کی تحریر میں اُس کا ڈھونڈنا حاصل ہے مگر جو صفائی اور سلاست اور تہذیب اور شایستگی اور گھلاوٹ آج عام قلمروں میں دیکھی جاتی ہو، اور جب قدر آکر کل نگاری کا سلیقہ اخباری دنیا میں پھیلا ہے اور جہاں تک اہل قلم میں ہر قسم کے معاملات پر آزادانہ رائے زنی اور نکتہ چینی کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا ہے اگر ذرا غور کر کے دیکھا جائے تو یہ سب اُسی ایک قلم کی آوازِ بازگشت ہے؛ اور اس کا اندازہ سطح ہو سکتا ہے کہ جو اخبارات سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کا اخبار نکلنے سے پہلے ملک میں جاری تھے اُن کا مقابلہ اُن اخباروں کے ساتھ کیا جائے جو اُس کے بعد جاری ہوئے اور جو اخبار یا میگزین تہذیب و اخلاق سے پہلے شائع ہوتے تھے اُن کا موازنہ اُن اخباروں یا میگزینوں سے کیا جائے جو اُس کے بعد شائع ہوئے؛ اس مقابلہ سے صاف معلوم ہو جائیگا کہ اُردو اخباروں نے ان پرچون سے کیا سبق حاصل کیا ہے۔ اگرچہ سرسید کی دیگر تصانیف سے بھی اُردو لٹریچر کو بہت کچھ مدد پہنچی ہے مگر سوسائٹی اخبار اور تہذیب و اخلاق نے خاص کر اُس میں ترقی کی روح پھونکی ہے کیونکہ اُن کے مضامین جلد جلد شائع ہوتے تھے اور مینے میں کئی کئی دفعہ پبلک کی نظر سے گزرتے تھے اور یہ سلسلہ بتیس برس تک برابر جاری رہا۔

بے شک یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان دونوں پرچون میں سرسید کے سوا اور بھی بہت کچھ لکھنے والے تھے خصوصاً سید محمد علی خان قدیم تہذیب و اخلاق میں گویا سرسید کے برابر کے شریک تھے اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جو لٹریچر اُن پرچون سے مترتب ہوئے اُن کو صرف سرسید کی تحریرات سے منسوب کیا جائے۔ لیکن چونکہ یہ سب لوگ سرسید کے قدم بہ قدم چلنے والے اور انھیں کے

مبلغ یکہزار و پانصد روپیہ سکہ انگریزی کہ بحبت تعمیر پورہ دنگ پوس مرحمت فرمودہ اند رسید۔ قوم راعتان فرمود
 و دلم ر قہویت دلو، و ساعدی مارا قوت بخشید۔ سپاس آن ازین قوم سپاس دشوار، مگر حرم علی اسد صلاہ آن
 کافی ست۔ من شکرتہ آن عطیہ یکامی آرم، و روزے می آید۔ و آن دور نیست۔ کہ تمام قوم و اخلاف شان نسلا
 بعد نسل بہ شکر گزاری، پنجو شاہزرگان۔ کہ در صلاح و فلاح قوم از قدم و قلم و درم در بخت نہ فرمودہ اند۔ رطب اللسان
 و عذب البیان خواہد بود۔“

”انچہ بر حالِ نارم دل سوختہ اند و حسرت فرمودہ۔ مخدوما احسانِ شما، مگر کیسچ جاسل سوختن
 و حسرت نمودن نیست۔“

حسن شہرت عشق رسوائی تقاضا میکند جرم معشوق بگناہ عاشق بیچارہ نیست۔
 اگر قوم مارا چشم بصیرت بودے و مالِ کار خود فہمیدے ما و شما این کوشش و کشاکش ضرور نہ بودے۔ بہ گاہ حال
 دین ست پس از ان قوم بجز بدگوئی و افترا پردازی و نا فہمی و از ما بجز حبس و تسلیم و رضا دیگر چہ توقع بودے۔ انصاف
 از دست نمیدہم و با کسی بدظنی روا نمیدارم، دوستانِ دشمن نامے من بد نیستند، حق بجانب شان ہمست، چہ آہنا
 سخن می شنوند و راہے می بینند کہ گاہے از اسلافِ خود شان نشنیدہ و ندیدہ بودند۔ ویرینہ غلطی ہائے ما رفتہ رفتہ
 استحکام آیات قرآنی بہم رسانیدہ بلکہ انان ہم ستمگر گشتہ۔ پس کسی کہ این اغلاط را و انماید چگونہ از غیظ و غضب
 شان مصون و از سب و شتم شان مامون تواند شد۔ آہنا از معارضاتِ بلیانِ ظلِ دیگر کہ بر این غلط ہائے دیر تہ ما
 وارد ساختہ آن را بہ اسلام نسبت میدہند۔ واقف نیستند، و از ان مشکلات کہ باعتبار علوم جدیدہ و تحقیقاتِ حدیث
 بر اصول مقررہ اسلاف ما از فقہاء و محدثین و مفسرین واقع میشود نہ بر اصل اسلام۔ اطلاع ندارند۔ بگوشِ شان
 و بگوشِ اسلافِ شان بمقابل سخن ہائے خود شان بجز کلمہ آمنا و صدقنا صدقے دیگر نہ رسیدہ۔ یک گونہ خلفشار

پائی جاتی ہے جیسی اُنکی اُردو تحریروں میں دیکھی جاتی ہے۔ ادا بجلہ ایک وہ فارسی کچرہ جو انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کرتے وقت کلکتہ کی مجلس مذاکرہ علمیہ میں پڑھاتھا اور جو اُنکے کچرون کے مجموعہ میں چھپ گیا ہے۔ اسکے سوا اُنکا ایک اُردو فارسی خط منشی سراج الدین احمد کے مسوات میں بمکولہ ہے جو اُنکو حیدرآباد میں دستیاب ہوا تھا اور جو سرسید نے ۱۳- اگست ۱۸۸۱ء کو حاجی سید محی الدین خان رضوی کے نام اُنکے خط کے جواب اور پندرہ سو روپیہ چندہ کے شکریہ میں لکھا تھا۔ چونکہ یہ خط اکیدین نہیں چھپا ہے اسلئے اُسکے تلف ہو جانے کے خیال سے ہم اُسکو بکبنہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

”مخدوم! ملاذا! نامہ یافتہ و متخیر گشتم۔ خوانم و برخوانم۔ بلندپاگی تو بسندہ اش را خود آن نام نشان می داد۔ تخیّر در آن بود کہ مخاطب آن کیست؟ بخلط خود را در انستم و باز برگشتم کہ آنچه در آن نامہ مرقوم است سزاوار پچھونے دامن آلودہ، کمترین مخلوقے، ہیچ میزے، گم کردہ را ہے نمیتواند شد، بجز آن کہ اوصاف حمیدہ و اخلاق پسندیدہ شما شخص خیالی خود را یا خود اوصاف خود را مخاطب ساختہ باشد۔ سخن دیگر تر را یاد آن نمی توانم۔ و اگر ازین فروتر آیم و خود را مخاطب آن نام حاشا کہ بدون اختیار مذہب و حدت وجود این چنین توانم دست، تاکہ من کہ حجاب خودم از میان برخیزم و تفاوت من تو و تو و من از میان بر افتد و ہمہ کچھ نوشتہ امیر خود شما مصداق آن باشید۔ و شد و ز من قال ”تو خود حجاب خودی احمد از میان برخیز“

”بہت فرمودہ اند کہ ”رضویت ذریعہ یک گوہری است نہ وسیلہ یک بختی“ مگر احمد تہ کہ بلا و شما یک گوہری و یک بختی ہر دو محقق است؛ گو این نسبت ہاے من باشما باعث ننگ عارشات و مارا سبب عزت۔ خدا دانہ کہ محبت پیشام و بجز محبت در گشت سینہ ام نہ گشتہ اند۔ الطاف و عنایت شما را شکر گزارم و باین محبت جان نشان

لعن و طعن کی بھر مار ہو رہی تھی۔ اُنکو لکھتے ہیں ”در مصر مناول کہ خطاب بہ من فرمودہ اند اگر بجائے لفظ
ویدارت احوالت بودے نہایت مناسب حال من بودے“ ”آنی کہ بہ احوالت خلقی ست تماشائی“ اگر غم ست ہمین قدرت
کہ غم نہ اتم خدایے من تماشائے کدام احوال من مکنند انہ ہوا الغفور الرحیم

گناہ من ارنا مدے در شمار ثرا نام کے بودے آمر زکار

اے خداے من ! اے رحیم و غفور من ! اے محبوب و مطلوب من ! خلق را بگذار ہرچہ خواہد تماشائے من
کند تو مرا نیک تماشا کن ۔

نئی گویم درین گلشن گل و باغ و بہار از من بہار از یار و گل از یار و باغ از یار و یار از من
آہ چہ گفتم و کجا رفتم خدایے من از من جدا نیست ، مرا گدشتن نمی تواند ، پس چرا پریشان شوم ، چرا اندیشہا
اکتم ، حمد و ثنائی او سراپیم کہ عین حمد و ثنائی خود ست ، منصور انا الحق گفتم پایہ بلند دشت ، من صرف
الحق گویم او خدا از من بشنو و مستجاب کن“

فارسی میں بھی سرسید کی قلم اُسی آزادی سے چلتی تھی جیسے اردو میں ۔ وہ اس بات
کی کچھ پروا نہ کرتے تھے کہ کوئی لفظ اہل زبان کے محاورہ کے خلاف نہ لکھا جائے لیکن اصل مطلب
بہت صفائی اور بے تکلفی سے ادا کر جاتے تھے ۔ مثلاً جسطح اردو میں اے حرف نہ کی جگہ او کا
لفظ خاص خدا کے لئے استعمال کرتے تھے اسی طرح فارسی میں بھی یہی لفظ بول جاتے تھے ۔ اردو
میں توانی گنجائش بھی تھی کہ نہایت بے تکلف اور لنگوٹے یا رکاوٹ کو اُو کہہ سکتے ہیں مگر
فارسی میں کہیں بھی او کا لفظ اے کی جگہ استعمال نہیں کرتے ۔ اسی طرح اور بھی بعض الفاظ انکی
فارسی تحریروں میں محاورہ کے خلاف نظر آتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک مطلب کو وہ جسطح

در عہد خلفائے عباسیہ سبب تراجم فلسفہ یونان بہم رسیدہ بود، علمای اسلام بدافعتِ آن برخاستند۔ تعجبِ این کہ ہم خود معترض بودند و ہم خود مجیب، مخالفے بمقابل نہ داشتند، خود گفتند و خود شنیدند و دانستند کہ فتح یافتند۔ قبول می کنم کہ فتح یافتند مگر حالانہ آن مدعیان اندونہ آن دعوے، نہ آن جام ست نہ آن ساقی، نہ آن بابہ ست نہ آن مینا، خود آن فلسفہ از پا در افتادہ ست و آن جام و مینا شکستہ، بنائے نور بر اساسِ نوپاشدہ۔ پس کسی کہ دعوے اسلام دارد و اسلام را حق میدانند و غلط را در آن امکان نمی پندارد چگونہ آن غلط ہا را بار کند و اسلام و اسلامیان را رسوا سازد۔ پس این در انکارِ آں و انہادر تکفیرِ این معذور اند، و این امری ست کہ فطرتِ انسانی انسان را بر آن مجبور می سازد۔ بہ این رہبر (یعنی دلیل) ما را واجب لازم ست کہ ہمہ مگفران و لاعینین خود را معذور داریم، و از سب و شتم شان رنجیدہ نہ شویم، و صدق و صفارِ پیشہ خود داریم و ہمہ ا معاف کنیم از مواخذہ عقبی و داورِ بی ہمتا ہم امین باشند۔ اما مخالفت و افترا نسبت بہ مدرستہ العلوم کہ کارِ صلاح و فلاحِ قومی ست۔ عفوِ آں بہ اختیار من نیست کہ حقوقِ عبادِ برگردنِ شان ست۔ اوشان دیندار و خداے شان۔ قل کفے باللہ بینی و بینکم شہید العلم فانی السموات والارض والذین آمنوا بالباطل و کفرو باللہ اولئک ہم الخاسرون۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

العبد المقتدر الی اللہ الصمد

سید احمد

کبھی کبھی وہ اردو تحریروں میں بھی ایک آدھ فقرہ فارسی کا لکھ دیتے تھے جو لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ سید مہدی علی خان نے انکو ولایت سے خط بھیجا ہے جس میں کسی موقع پر سرسید کی طرف خطا کر کے یہ صریح لکھا ہے ”آئی کہیدارت خلعتی ست تماشائی“ اس کے جواب میں سرسید۔ جبکہ ہندوستان میں اُن پر

حرکات بھی شامل ہوتی ہیں اور اسکا تماشا ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے ۔

سرسید نے پنجاب کا پہلا سفر ۱۸۶۳ء میں کیا تھا جب کہ تہذیب الاخلاق کو جاری ہونے پرے تین برس گزر چکے تھے ۔ اس وقت راقم بھی لاہور میں موجود تھا ۔ بلاشبہ جس گرجو شہی کے ساتھ اہل لاہور نے ریلوے اسٹیشن پر سرسید اور ان کے ہمراہیوں کا استقبال کیا تھا اور جس چاؤ اور امنگ و رفاضی اور فراخ جو صلی کے ساتھ ان معزز مہمانوں کی مدارات کی گئی اور جس شوق سے بیرونجات کے لوگ سید صاحب کی آمد آمد سنکر لاہور میں آئے اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ فی الواقع تہذیب الاخلاق نے سرسید اور ان کے کام کی عظمت کا نقش عموماً اہل پنجاب کے دل پر بٹھا دیا ہے ۔ مگر ۲۹- دسمبر کو جو لکچر کہ سید صاحب نے راجہ دھیان سنگھ کے ہوانخانے میں جہاں کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا ۔ دیا اُسکا سامان مجھ کو ہمیشہ یاد رہیگا ۔

سامعین پر ایک سکتہ کا سا عالم تھا ، کوئی مسلمان ایسا نہوگا جو زار قطار نہ روتا ہو اور جو اپنی بساط سے زیادہ چندہ دینے پر آمادہ نہو ۔ اگر میل قیاس غلط نہو تو میرے نزدیک جو اثر تہذیب الاخلاق نے تین برس میں اہل پنجاب پر کیا تھا اُس لکچر نے دو تین گھنٹے میں اُسکو دہ چن کر دیا ۔ خصوصاً مندرجہ ذیل الفاظ نے تمام حاضرین کی حالت دگرگون کر دی تھی ۔ اُنھوں نے کہا

”اے بزرگان پنجاب ! میں فرض کرتا ہوں کہ میں بد عقیدہ ہوں ، مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں

کہ ایک صاحب جو غالباً نارمل اسکول لاہور میں ہیڈ ماسٹر تھے اور سو ڈیڑھ سو سے زیادہ تنخواہ نہیں پاتے تھے اُنھوں نے

پانسو روپیہ چندگی فرست میں لکھا تھا ۱۲

اردو میں بے تکلف ادا کر سکتے تھے اُسی طرح فارسی میں کر سکتے تھے۔

پبلک سپیکنگ (یعنی مجمع عام میں اسپیچ یا لکچر دینا) یہ بھی منجملہ اُن اوصاف کے ہے جو سرسید اور اُن کے معاصرون میں بابہ الامتیاز تھے۔ مشہور ہے کہ تین چیزیں تین چیزوں کے ساتھ بہت کم جمع ہوتی ہیں؛ قوت نظری قوت عملی کے ساتھ، ذہن حافظہ کے ساتھ، اور تحریر تقریر کے ساتھ۔ یعنی سوچنے والے اکثر کام کرنے والے نہیں ہوتے، اسپرچ ذہین آدمی قویٰ الحفظ کم ہوتے ہیں اور اسی طرح جنکی قلم بین زور ہوتا ہے انہیں قوت گویائی نہیں ہوتی۔ مگر عجیب و غریب شخص جیسا سوچنے والا تھا ویسا ہی کام کرنے والا تھا، اور جیسا ذہن والا تھا ویسا ہی حافظہ والا تھا اور جیسا لکھنے والا تھا ویسا ہی بولنے والا تھا۔ وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

سرسید کی تقریر کی نسبت یہ ریمارک کیا گیا ہے کہ اُنکی کامیابی کا سبب بڑا ذریعہ اُنکی قوت تقریر تھی۔ اور جہاں تک غور کیا جاتا ہے یہ رے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے؛ کیونکہ تحریر کا اثر مدت کے بعد ظاہر ہوتا ہے اور صرف معدود آدمی اُس سے متاثر ہوتے ہیں، بخلاف تقریر کے کہ اُسکا اثر آن واحد میں بجلی کی طرح تمام سامعین کے دلوں میں دوڑ جاتا ہے؛ تحریر ہر شخص پر جو اُسکو پڑھتا ہے فرداً فرداً اثر کرتی ہے اور اسلئے وہ اثر ایک سے دوسرے میں سرایت نہیں کرتا، مگر تقریر کا اثر تمام مجلس پر دفعۃً واحدہ پڑتا ہے اور اسلئے تمام حاضرین ایک دوسرے کی حالت متاثر ہوتے ہیں؛ تحریر میں اثر کرنے والے صرف الفاظ اور معانی ہوتے ہیں اور تقریر میں اُنکے ساتھ سپیکر کا لب و لہجہ، اُسکی طرز ادا، اُسکی آواز کا سوز و گداز اور اُسکے اعضا و جوارح کی

انقلابِ عظیم پیدا کر دیا ہے۔ اسکا پورا پورا اندازہ کرنے کے لئے تھوڑی دیر کو قوم کی اُس دردناک حالت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ لینا کافی ہے جبکہ سید کی فصاحت و بلاغت نے ان لکچرین کی صورت میں اپنا مشن شروع کیا۔

کرنل کریم لکھتے ہیں کہ ”وہ (یعنی سید) ایک پیدائشی اور ریڑیہین۔ جب وہ اپنے خاص مقصد کے متعلق جوش میں بھری ہوئی تقریر کرتے ہیں تو اُنکی طرزِ تقریر مسٹر گلیڈسٹن سے مشابہ ہوتی ہے۔ اُس جوش کے ضبط کرنے کی کوشش میں اُنکے ہونٹ کانپنے لگتے ہیں۔ آواز دردناک ہو جاتی ہے اور چہرہ متغیر ہو جاتا ہے؛ اور یہ تمام درد و غم کی علامتیں اُنکے سامعین پر بجلی کی طرح اثر کرتی ہیں“

قومی اور ملکی مجموعوں میں بسیج یا لکچر دینے کا طریقہ قدیم یونان روم اور عرب میں برابر جاری تھا اور زمانہ حال میں فرانس انگلینڈ اور امریکا میں نہایت ترقی پر ہے۔ لیکن جہاں تک لکھا جاتا ہے ہندوستان میں اُنیسویں صدی سے پہلے کین اُسکا سرِ غنہین پایا جاتا۔ اور اسکی وجہ ظاہر ہے؛ جب تک سلطنت کی طرف سے رعایا کو ہر قسم کے خیالات اور رائیں ظاہر کرنے کی آزادی نہیں ہوتی کسی ملک میں عمدہ اور ریڑیا سپیکر پیدا نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ جب سے برٹش گورنمنٹ نے اس ملک میں آزادی کا سایہ ڈالا ہے یہاں بھی ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جنہیں سے بعض بنگالی لیڈروں نے پبلک سپیکنگ میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ لیکن جہاں تک سنا گیا ہے اُن لوگوں کی تمام اور ریڑی اور فصاحت انگریزی زبان میں منحصر ہے۔ گویا جو سڑک بزنک پٹ اور فاکس وغیرہم تیار کر گئے ہیں آنکھیں بند کر کے اُسی سڑک پر پڑے ہیں، اپنی زبان میں کوئی داغ بیل نہیں ڈالی۔ سید احمد خان پہلا شخص ہے جس نے

کہ اگر ایک کافر مرد آپ کی قوم کی بھلائی پر کوشش کرے تو کیا آپ اسکو اپنا خادم اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے؟
 آپ کے دولت سرانے میں۔ جس میں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، آپ کے لئے
 مسجد بنانے میں۔ جس میں آپ خدائے واحد و اکمال کا نام پکارتے ہیں۔ چوہڑے، چار، قلی، کافر،
 بت پرست، بد عقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں اور
 نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں، پس آپ مجھ کو بھی اس مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں
 ایک قلی چار کی مانند تصور کیجئے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجیے، اور اس وجہ سے
 کہ اسکا بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چار ہے۔ اپنے گھر کو مت ڈھائیے۔ کیا آپ صاحب
 مجھ بد بخت نامہ سیاہ کی شامت اعمال سے اپنی تمام قوم کو اور انکی اولاد کو نسل بعد نسل بونا اور خراب خستہ
 حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ سب صاحب میری حالت کو بدتر جانتے ہو اس سے عبرت لے کر
 اور برائے خدا اپنی قوم کی اپنی اولاد کی بھلائی و بہتری کی فکر کرو۔“

یہی الفاظ جو اس وقت معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس موقع پر جب سرسید کے مونہ
 سے نکلے تھے انہیں کچھ اور ہی جادو بھرا ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریر میں لفظوں
 اور معنوں کے سوا کچھ اور چیز بھی ہوتی ہے جو تحریر میں نہیں ہوتی۔

سرسید کے اخیر زمانہ میں کسی لائق یورپین نے انکے لکچرون پر ریویو کرتے ہو لکھا تھا کہ
 ”اگر یہ سچ ہے کہ دخت اپنے بھلون سے پہچانا جاتا ہے، اگر یہ صحیح ہے کہ بھلا وہی ہے جس کا انجام اچھا ہو،
 تو جو کامیابی سرسید کو بذریعہ اپنی لاثانی فصاحت کے حاصل ہوئی ہے اس سے انکی نیکی اور اسلامی حقیقت
 کامل طور پر ثابت ہوتی ہے۔ انکے لکچرون نے عجیب غریب اثر کیا ہے اور اس فصاحت کے بحر ذخار نے

انکو مجبور مانتا پڑا۔ لیکن نہ انکو زیادہ غور کرنے کی مہلت ملی اور نہ کچھ لکھنے کی نوبت آئی کیونکہ ملاقاتیوں کا صبح سے رات کے دس گیارہ بجے تک برابر تانتا بندھا رہتا تھا۔ باوجود اسکے جب اُس طول طویل لکچر کو دیکھا جاتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح بغیر قلمبند کیے اسی عمدگی اور حسن ترتیب کے ساتھ ایسے پیچ در پیچ اور نازک مطالب کو یوں سلجھا کر بیان کیا ہوگا؟ کیونکہ وہ کوئی معمولی وعظ نہ تھا بلکہ اُن تمام شبہات کا جواب دینا تھا جو سرسید کے مذہبی خیالات کی نسبت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں تھے، یا اُن دلائل کا بیان کرنا تھا جسے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اسلام کی سچائی کا یقین ہو، یا اُن ضرورتوں کا ذکر کرنا تھا جنہوں نے سرسید کو تفسیر قرآن لکھنے پر مجبور کیا۔ اور ان سب باتوں کے بیان کے لئے بہت کچھ غور و فکر اور مہلت درکار تھی۔ سفرنامہ پنجاب کے مؤلف سید اقبال علی لکھتے ہیں کہ ”مجھ کو سید صاحب اکثر ملنے

اور بات چیت سننے کا اتفاق ہوا ہے، میں اس قدر موثر کلام اُنکا بھی اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا“

یہ تو اُس لکچر کا حال ہے جو مذہب پر دیا گیا تھا، اس سے بھی زیادہ عجیب وہ پولٹیکل لکچر تھا جو نیشنل کانگریس کے خلاف اُنھوں نے لکھنو میں دیا تھا۔ ہم نے سنا ہے کہ اُسکا خیال اُنکو چند گھنٹے پہلے ہوا تھا باوجود اسکے وہ ایسا جامع اور مدلل اور پُر زور تھا کہ اُسکے بعد ہزاروں تحریریں اور تقریریں اس باب میں اُسکے موافق اور مخالف ہوئیں مگر اُس کے آگے سب سچ تھیں۔

افسوس ہے کہ سرسید کی بہت سی سیچیں۔ اس سبب کہ اردو زبان کے لئے شارٹ

ہینڈ رائٹنگ (یعنی مختصر نویسی) کا کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہوا۔ تلف ہو گئیں، ورنہ جس قدر

اپنی ملکی زبان میں پبلک سپیکنگ کی راہ نکالی ہے۔ نہ وہ انگریزی زبان جانتا تھا جس میں بڑے بڑے اور بیرون اور فصیحون کے لکچرون اور اسپیچون کے نمونے موجود تھے، اور نہ ان اصول و قواعد سے واقف تھا جو یورپین زبانوں میں اس فن کی تکمیل کے لئے مقرر کئے گئے ہیں، اور نہ اپنی زبان میں کوئی ایسی مثال دیکھی تھی جس سے اس راہ میں کچھ مدد ملتی۔ جس طرح اُسکے تمام اوصاف فطری اور پیدائشی تھے اسی طرح سپیکنگ کی لیاقت بھی محض خدا داد تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی اسپیچ یا لکچر کے لکھنے، یا پہلے سے اُسکے لئے تیار ہونے کا بالکل محتاج نہ تھا۔ ہم پہلے حصہ میں۔ جہان انگلستان کے سفر کا حال بیان کیا گیا ہے۔ لکھ چکے ہیں کہ سمٹوئین سوسائٹی آف سول انجینیرس کے سالانہ جلسہ میں۔ جہان انگلستان کے متعدد ڈیوک اور لارڈ اور بڑے بڑے نامور انجینیر موجود تھے اور جب کاموضوع انجینئرنگ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہاں جب انجینروں کی تقریریں ہو چکیں تو سرسید نے ایک ایسے فن کے متعلق۔ جس کو محض نا آشنا تھی ایسی برجستہ تقریر کی کہ تمام اہل جلسہ اُسکی داد دیتے دیتے تھک گئے اور اس تقریر کرنے کا خیال اُنکو اسوقت پیدا ہوا جب جلسہ کے اختتام پر پرسیڈنٹ نے اُنکے آنے کا شکریہ ادا فرمائی اور اُسکا جواب دینا ضرور ہوا۔

جو لکچر سرسید نے ۱۸۸۴ء میں بمقام لاہور اسلام پر دیا تھا وہ سب سے بڑی شہادت اُنکے پیدائشی اور بیرون ہونے کی ہے۔ لاہور کے تعلیم یافتہ مسلمانوں نے سرسید کی منظوری بغیر پروگرام میں لکچر دینے کی تاریخ چھوادی تھی اور سرسید چند وجوہ سے جنکا ذکر سفرنامہ پنجاب میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے مذہب پر لکچر دینا ہرگز نہیں چاہتے تھے مگر لوگوں کے اصرار سے

وہ فرمائی لکچر دینا اور فرمائی اسپیکر کرنی بالکل نہیں جانتے تھے اور وقت کی اگنی کے سوا کوئی راگنی نہ گاسکتے تھے۔ کبھی کبھی جو بعض اشخاص اُنکو کسی ایسی تقریر کرنے پر جسکا اُنکی طبیعت میں کچھ جوش نہ ہو۔ مجبور کرتے تھے اور سرسید کو اُنکی خاطر بھی عزیز ہوتی تھی تو وہ بادل نا خواستہ صرف اُنکی ہٹ پوری کرنے کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے مگر جو تقریر وہ کرتے تھے اس میں کچھ جان نہ ہوتی تھی۔

سرسید کی طبیعت کا جو شیلاپن جیسا اُنکی اسپیکر سے ثابت ہوتا ہے ایسا اور کسی چیز سے نہیں ہوتا۔ اسپیکر کرتے وقت جہاں کہیں ایسا موقع آ جاتا تھا اُنسے طبیعت کا اُبال ضبط نہ ہو سکتا تھا۔ لاہور میں جو سب سے آخری دفعہ اُنکا جانا ہوا اور وہاں کسی موقع پر تقریر کرتے وقت اُنکو جوش آیا اُس وقت اُنکی حالت ایسی متغیر ہو گئی کہ وہ فوراً خاموش ہو کر بیٹھ گئے اور اُس روز کھانے کی طرف مطلق رغبت نہیں ہوئی۔ ہمنے سنا ہے کہ ڈاکٹر نے اُنکی یہ حالت دیکھ کر سخت حمانعت کر دی تھی کہ آپ پبلک جلسوں میں اب تقریر کرنی بالکل چھوڑ دیں ورنہ جان کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ اُسکے بعد اُنھوں نے چند مختصر تقریروں کے سوا کہیں کوئی لمبی اسپیکر نہیں دی۔

سرسید میں وہ تمام اوصاف جمع تھے جو ایک ادیب میں ہونے ضروری ہیں۔ اُنکا حافظہ فطرۃ نہایت قوی تھا۔ گویا آخر عمر میں بسبب کبر سن کے نسیان پیدا ہو گیا تھا مگر بچپن اور جوانی اور کہولت کے زمانہ کے واقعات اور معلومات سب از بر تھے اور اسلئے اُنکی جنرل انفورمیشن نہایت وسیع تھی اور چونکہ واقعات سے تلخ استخراج کرنے کا اعلیٰ درجہ کا مادہ خدا نے دیا تھا اسلئے اُس معلومات میں اور بھی زیادہ وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ ہر ایک معاملہ کی نسبت جو کہ اُنکو پیش آتا تھا۔

انکی اسپیشین اخباروں میں چھپی ہوئی موجود ہیں اسقدر بلکہ شاید ان سے کچھ زیادہ سی ہوئی جو قلمبند نہیں ہوئیں۔ بارہا لوگوں نے اُن سے چاہا کہ آپ اپنی اسپیش چھپے لکھو الیا کریں اور جلسہ میں اُسی کو پڑھ دیا کریں مگر خاص خاص حالتوں کے سوا انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ لکھی ہوئی اسپیش کا جلسہ میں پڑھنا مجھے وبال معلوم ہوتا ہے، طبیعت کی آمد رک جاتی ہے اور جوش اور ولولہ بالکل باقی نہیں رہتا۔ سفرنامہ پنجاب میں انکی حسیقد اسپیشین اور لکچر چھپے ہوئے ہیں انہیں ایک بھی غالباً ایسا نہیں جو انھوں نے لکھ کر پڑھا ہو، سب برجستہ اور بر محل زبانی تقریریں کی گئی تھیں جو سید اقبال علی کی حیرت انگیز زود نویسی کے سبب قلمبند ہو گئیں ورنہ یہ بھی سب تلف ہو جاتیں۔

سرسید کی سب سے زیادہ زوردار اور مؤثر وہ اسپیشین ہوتی تھیں جو کسی پبلک جلسہ میں اپنی رائے کے خلاف بہت سی تقریریں سن کر نہایت جوش کی حالت میں بے ساختہ اُنکے موہ سے نکلتی تھیں خصوصاً تعلیمی معاملات میں جب انکی رائے یا پالیسی کے خلاف کسی جلسہ میں تقریریں ہوتی تھیں۔ خواہ وہ ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہو، یا ایجوکیشن کمیشن کا یا سنٹ کی مجلس ہو، یا سنڈکیٹ کا جلسہ ہو۔ اُس وقت عنان صبر اُنکے ہاتھ میں نہیں رہتی تھی، انکی آواز سے تمام ہال گونج اٹھتا تھا اور فریق مخالف اُنکے رعب میں دب جاتا تھا۔ مگر باوجود ہقدر جوش و خروش کے انکی تقریریں کبھی تمذیب شایستگی کی حد سے تجاوز نہ کرتی تھی۔ بے شک اپنے قومی جلسوں میں وہ اکثر مسلمانوں کو نفرین و ملامت کرتے تھے مگر اُس میں دلسوزی اور ہمدردی کا پہلو اسقدر غالب ہوتا تھا کہ نفرین و ملامت کسی کو ناگوار نہ ہوتی تھی۔

جب کہ اُس سے ثوابِ اخروی کی توقع نہ ہو۔ محض فضول جانتے تھے اور اسلئے انگریزی تعلیم میں جسکو وہ خلافِ مذہب سمجھتے تھے۔ مدد ملنے کی اُنسے ہرگز توقع نہ تھی۔ اُنکو اس بات کا یقین دلانا قریب ناممکن کے تھا کہ قوم کی مدد کرنا بعینہ اپنی اور اپنے خاندان کی مدد کرنا ہے۔ وہ اس بات کے محض بے خبر تھے کہ انگریزی تعلیم کو قومی ترقی میں کیا دخل ہے اور سرکاری نوکری کے سوا اُس سے تجارت و صنعت اور تمدن اور معاشرت میں کیا مدد ملتی ہے۔ اُنکو اس بات کا سمجھنا نہایت مشکل تھا کہ دین کا اعزاز اور دین کی ترقی بغیر دنیوی ترقی کے ناممکن ہے۔ دو تہمند اس بات کے سمجھنے سے قاصر تھے کہ ہکو اپنی اولاد کی تعلیم کی کیا ضرورت ہے اور متوسط اور ادنیٰ درجہ کے لوگ سرکاری مدارس کو اُنکی تعلیم کے لئے کافی سمجھتے تھے۔ تعلیم کے ساتھ تربیت کی ضرورت تو عام ذہنوں سے اس قدر بعید تھی کہ اب تک بھی مستثنیٰ شخصوں کے سوا لوگ اُنکو اچھی طرح نہیں سمجھے۔ گورنمنٹ کا بچوں اور اسکولوں کو چھوڑ کر خاص قوم کے روپے ہی کا لچ قائم کرنے کی ضرورت اور مصلحت سے سب بے خبر تھے۔

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے خیالات اُس ابتدائی حالت میں عام مسلمانوں کے ذہن سے محض اجنبی اور نا آشنا تھے جنکا لوگوں کے ذہن نشین کرنا خاصکر اُس شخص کو جسکی طرف سے قوم میں عموماً بدگمانی پھیلی ہوئی ہو حد سے زیادہ دشوار تھا۔ جن باتوں کے سمجھانے کے لئے آج کل کی ایسیچون میں صرف اجمالی اشارے کافی ہوتے ہیں اُسوقت اُنکو الف بے تے سے شروع کرنے اور اصل مقصد سے پہلے لمبی لمبی تہیدیں اٹھانے کی ضرورت تھی۔ باوجود اسکے سرسید نے جس صفائی سے ان تمام خیالات کو اپنی ابتدائی ایسیچون میں بیان کیا ہے اُنکو

خواہ مذہب سے متعلق ہو، خواہ رسم و رواج اور معاشرت و اخلاق سے، خواہ پالٹکس اور خواہ تعلیم سے۔ وہ ایک مستقل اور غیر مذہب رائے اپنے ذہن میں رکھتے تھے اور اسلئے کسی معاملہ پر انکو زیادہ غور کرنے کی بہت ہی کم ضرورت ہوتی تھی اور اگر کبھی ایسی ضرورت ہوتی تھی تو ذہن بہت جلد نتیجہ تک پہنچ جاتا تھا۔ تصور کی قوت کا یہ حال تھا کہ تقریر کرتے وقت تمام پوائنٹس جو انکو اپنی اپنی چیز میں بیان کرنے منظور ہوتے تھے گویا سب سلسل اور ترتیب وار انکے ذہن میں موجود ہوتے تھے اسی لئے ہم نے نہیں دیکھا کہ جس طرح عام سپیکر ایک پرچہ پر کچھ نوٹس قلمبند کر لیتے ہیں اور تقریر کے وقت ہر ایک پوائنٹ پر اسی ترتیب سے گفتگو کرتے ہیں۔ سرسید نے کبھی ایسا کیا ہو۔ انکو نہ بہت ایک کاغذ کے پرچہ کے اپنی ذہنی ترتیب پر زیادہ بھروسہ ہوتا تھا۔ اسکے سوا چہرہ کی بناوٹ جو کہ وجاہت اور ہیبت و وقار کی بولتی تصویر تھی۔ اور آواز کی گونج جس میں جوش کے وقت شیرازی گرج محسوس ہوتی تھی۔ یہ دو بڑے معاون انکے بیان کی تاثیر کے تھے۔ پھر زبان پر پوری قدرت اور ہر مطلب کے نشین کرنے کا خداداد سلیقہ اور عین وقت پر مناسب لفاظ کا سوجھ جانا انکی خصوصیات میں سے تھا۔ مگر سب سے بڑی چیز جو انکو دیگر سپیکروں سے علانیہ ممتاز ٹھہراتی ہے وہ قومی ہمدردی کا سچا جوش اور ولولہ تھا جسکے سبب جو بات مونہ سے نکلتی تھی وہ دل ہی سے اٹھتی تھی اور دل ہی میں جا کر بیٹھتی تھی۔

سرسید کی سحر بیانی خاص کر ان لکچروں اور آپچیوں سے زیادہ ثابت ہوتی ہے جو انھوں نے مدرسہ کے قیام کی ابتدائی کوششوں کے وقت مختلف مقامات میں دی ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ لوگ قوم اور قومیت کے اصلی مفہوم سے عموماً ناواقف تھے اور قومی کاموں میں مدد دینا۔

سمجھائی ہے ” اے صاحبو! تعلیم و تربیت کی مثال گٹھار کے آدے کیسی ہے کہ جب تک تمام کچے برتن بہ ترتیب ایک جگہ نہیں پُھنچے جاتے اور ایک قاعدہ دان گٹھار کے ہاتھ سے نہیں پکائے جاتے وہ کبھی نہیں پکتے۔ پھر اگر تم یہ چاہو کہ ایک ہانڈی کو آدے میں رکھ کر پکالو وہ ہرگز درستی سے نہیں پک سکتی۔ تم خیال کرو کہ بناب ملکہ معظمہ دکنوریا کو کس قدر دولت و شہرت اور سلطنت اور اختیار حاصل ہے، اُنکے بعد اسماعیل پاشا خدیو کو دیکھو کہ کیا کچھ دولت و حکومت اُنکو حاصل ہو، یہ لوگ بھی اپنی اولاد کی پوری تعلیم اپنے گھر پر نہیں کر سکتے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ حضور پرنس اوت ویلز فرزند ارجمند ملکہ معظمہ اور ولیعہد ہندو انگلنڈ یونیورسٹی آکسفورڈ کے ایک طالب علم ہیں اور جس زمانہ میں کہ میں لندن میں تھا میں نے اپنی آنکھ سے حسن پاشا خدیو مصر کے فرزند کو دیکھا کہ یونیورسٹی آکسفورڈ میں تعلیم پاتے تھے۔ لباس شاہی اور تاج خسروی سے یہ والا قدر شاہزادی طالب علمی کے لباس کو اور چو کو بنیاسپٹ ٹوپی کو جو اُس یونیورسٹی میں طالب علموں کے لئے مقرر ہے زیادہ معزز سمجھتے تھے۔“

ایک دوسرے موقع پر تعلیم کے اخراجات کی ضرورت مطرح جتائی ہے ”آہ کیا افسوس کی بات ہے کہ تم اپنے عزیز بیٹے کی بسم اللہ مین ہزاروں روپیہ خرچ کر دیتے ہو اس خوشی میں کہ ہمارا بیٹا پڑھنا شروع کرنے کے لائق ہوا، مگر اُس جگہ کے بنانے اور قائم کرنے کی کچھ فکر نہیں کرتے جہاں وہ پڑھے اور پڑھاری اس خوشی کو جو قبل از وقوع تھے اُس کو فرض کر لیا ہے۔ پورا کرے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ بغیر بوئے ہم بھیت کی کاٹنے کی توقع کرتے ہیں اور جس غلطی میں پڑے ہیں اُسکی درستی کی کچھ فکر نہیں کرتے۔“

ایک موقع پر قومی امداد کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے یہ تمثیل بیان کی ہے

”انسان کے اعضا میں تکرار ہوئی اور ہر ایک عضو نے خود عرضی اختیار کی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہر ایک کو مارا

دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ جو باتیں لوگوں کے ذہن سے اس قدر بعید تھیں اُنکو ایسی خوبی سے سمجھایا ہے کہ کوئی بات اجنبی نہیں معلوم ہوتی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا بھولی ہوئی باتوں کو ایک شخص یاد دلارہا ہے اور جو نقش و صندل ہو گئے تھے اُنکو اُجال رہا ہے۔ اُن اسپیشیوں پر بالکل اس شعر کا مضمون صادق آتا ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا مین تجیہ جانا کہ گویا یہ بھی میر دل مین ہے

پنی ریڈنگ کے جلسہ میں اُسناں بات کے سمجھانے کو کہ دولت مندوں کی اولاد کو تعلیم

کی کیا ضرورت ہو پریسوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا ”اے رئیسو اور اے دولت مندو! تم اپنی

دولت و شہمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ گو قوم کی بُری حالت ہو مگر ہمارے بچوں کے لئے سب کچھ ہو، یہی اُن لوگوں

کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے مگر اب اُنھیں کے بچوں کی وہ نوبت ہو جس کے لئے ہم آج اس اسٹیج پر کھڑے ہیں“

ایک دوسری اسپیش میں اس مطلب کو اُسطح بیان کیا ہے ”نواب خلیل اللہ خان شاہجہانی

کا نام آپ لوگوں نے سنا ہوگا، اُنکے پروٹے کو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ لوگوں کے پانودا بنے آتا تھا اور

دو چار پیسے لیجاتا تھا۔ تعلق آباد کے گانوں میں جس قدر مسلمان گھنسیارے آباد ہیں۔ جو سارے دن گھانس کھڑو کر

شام کو بیچتے ہیں۔ میں نے خوب تحقیق کیا ہے کہ سلطان محمد عادل تعلق شاہ کی اولاد میں ہیں ++++ دنیائیں

گزرے ہوئے زمانہ کے واقعات سے ہلکو عبرت اور نصیحت پکڑنی چاہئے ++++ دیکھو ہوشیار ہو، یہی حال

ہماری قوم کا ہونے والا ہے، کوئی اُٹار بھلائی اور بہتری کے اُنھیں نہیں دکھائے دیتے، بلکہ برخلاف اسکے

تنزل اور ارباب کی علامتیں موجود ہیں“

ایک اور موقع پریسوں کو بورڈنگ ہوس میں اولاد کے رکھنے کی ضرورت اُسطح

اور شرم کا لحاظ کرتے ہیں حد سے زیادہ اسکی تعریف کرتے ہیں اور یقین کہتے ہیں کہ وہ پاک خون جو مسلمانوں کی نسل میں ابراہیم خلیل اللہ سے چلا آتا ہے۔ انہیں بھی ہے، مگر انکی مصیبت پر دل لرز جاتا ہے اور ہلکا اپنی زندگی تلخ معلوم ہوتی ہے، اور تمام عیش و آرام خاک میں مل جاتا ہے۔ اور کون تم میں ایسا، کہ ایسی دردناک حالت اپنی قوم کی سنے اور اسکا دل نہ بھڑوے؟ اے بھائیو! ان تمام واقعات سے میں اُن لوگوں کو۔ جو اپنی اولاد کی اور اپنی قوم کی تربیت کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ خبردار کئے دیتا ہوں کہ دیکھو کیا ہوا !! اور سمجھو کہ آئندہ کیا ہوگا !!

اسی طرح سرسید نے اپنی ابتدائی سیچون میں طرح طرح سے قومی تعلیم کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا ہے۔ کہیں یورپ کی تمام ترقیات کی جڑ تعلیم کو قرار دیکر اسکی ترغیب دی ہو، کہیں تمام ہندوستانیوں کو متفق ہو کر خود اپنی تعلیم کا بوجھ اٹھانے کی تاکید کی ہو، کہیں ہندوستان کے اُمرا کی فیاضی کا یورپ کے دولتمندوں کی فیاضی سے مقابلہ کر کے اُنکو حقیقی فیاضی کے مفہوم سے خبردار کیا ہے، کہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اسلاف کی علمی ترقیات کا ذکر کر کے اُنکو غیر دلانی ہے اور جہل و بے علمی کی حالت میں سلف کے علم و فضل پر فخر کرنے کی مذمت کی ہے، کہیں علوم قدیمہ کا علوم جدیدہ سے مقابلہ کر کے علوم جدیدہ کی ضرورت ثابت کی ہے، غرض کہ جو کچھ زمانہ حال کے سپیکر تعلیم کے متعلق عام مجبوں میں بیان کرتے ہیں اُس میں شاید ہی کوئی بات ایسی ہوگی جنکی بنیاد سرسید نے اپنے مشن کے آغاز کی سیچون میں نہ ڈالی ہو، اور گو کہ اب وہ عام سیچون میں معمولی باتیں معلوم ہوتی ہوں مگر سرسید کی ابتدائی سیچون میں وہ عام ہندوستانیوں کے لئے بالکل نئی تھیں اور ایسی اہم اور ضروری تھیں کہ آج تک

بے چین ہوا؛ پانوں نے کہا کہ میں کیوں چل کر غذا ہم پہنچاؤں؟ ہاتھوں نے کہا کہ ہم کیوں غذا کو مونہ تک پہنچاؤں؟ آنکھوں نے کہا کہ ہم اُس میں کدو مال کھی کیوں دیکھیں؟ ناک نے کہا کہ غذا کا سڑا بسا بسا ہونا میں کیوں سونگھوں؟ مونہ نے کہا کہ میں کیوں چبا کر حلق میں نگلون؟ سب آپ آپ کو لیکر چپکے چپکے دو ایک دن تو جون توں گزر گئے؛ پھر تو پانوں کو لڑکھڑانے لگے، ہاتھ کاغیض لگے، مونہ ہلانے کی طاقت نہ رہی، آنکھوں میں اندھیرا آنے لگا۔ تب تو سب گھبرا گئے کہ یہ کیا ہوا؟ اس وقت عقل کے پاس گئے۔ اُس نے کہا کہ خود غرضی نے تمہارا یہ حال کیا ہے، تنے جانا کہ دوسرے کے کام سے ہمو کیا مطلب ہے؟ حالانکہ وہ حقیقت میں تمہارا ہی کام تھا اور اُس کا نقصان تمہارا ہی نقصان تھا۔ اس طرح سمجھو کہ اگر ہر ایک ضلع کے مسلمان یہ خیال کریں کہ دوسرے ضلع کے کالج میں مدد کرنے سے ہمو کیا فائدہ ہے تو نہایت بڑی غلطی اور حقیقت میں اپنا ہی نقصان ہے۔

ایک اور جگہ گورنمنٹی مدراس نے جو تحقیقات وہاں کے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق کی تھی اُس کا ذکر کرتے وقت انھوں نے کہا کہ ”اُس جٹھی میں ترجنا پالی کے مسلمانوں کا یہ حال مندرج ہے کہ ”خاص مانع ترقی تعلیم مسلمانانِ ترجنا پالی اُن کا افلاس ہے جس میں بہت سے مسلمان مبتلا ہیں، گو وہ نفیس ہیں مگر غریب ہیں، جب میں نے (یعنی صاحبِ جٹھی) مسلمانوں کے لڑکوں کو بلا نفیس اسکول میں داخل کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ کپڑے اُنکے پاس نہیں ہیں، اور بغیر کپڑے اپنے وہ نہیں آسکتے، غریب سے غریب مسلمان ہرگز اپنے لڑکوں کو ویسے آدھے ننگے پن کی حالت میں باہر نہ آنے دیگا جیسے کہ بڑے دولت مند ہندو اپنے لڑکوں کو مدرسوں میں بھیج دیتے ہیں“

”اے عزیزو! اب اس سے زیادہ کونسی بد بختی اور بد نصیبی ہے جس کے مسلمانوں پر آنے کی تم راہ دیکھتے ہو؟ اگرچہ ہم اپنے اُن غریب محتاج بھائیوں کی غیرت پر فخر کرتے ہیں اور وہ جوابی عزت

جب بھی یہی پیشہ ہوتا جواب تھا: وہی بہادری اور اولوالعزمی جو اگلے زمانہ میں ملکوں کو فتح کراتی تھی یا لوٹ مار سکھاتی تھی وہی اب دلوں کو فتح کراتی ہے اور جہل و تعصب کو مات دینا چاہتی ہے۔ سرسید کو جو صریح فوقیت اور امتیاز بہ اعتبار جسمانی اور دماغی قابلیت کے اپنے عام مہجسون میں تھا یہ ایک عمدہ شہادت اس بات کی ہے کہ جو پیوند یا ازدواج دو اجنبی خاندانوں میں متحقق ہوتا ہو اُس سے غیر معمولی نتائج پیدا ہوتے ہیں: سرسید کے پردادا ہرات کے سادات میں سے تھے جو شاہجہان یا عالمگیر کے عہد میں ہندوستان میں آئے تھے اور انکی نہ خیال کے لوگ کشمیر سے بعنوان تجارت سلطنت مغلیہ کے اخیر زمانہ میں اس ملک میں وارد ہوئے: پس نو خاندانوں میں اوپر سے کوئی قرابت یا رشتہ نہ تھا، صرف دوستی اور ملاقات کے سبب۔ جو سرسید کے دادا اور نانا میں تھی۔ اُنکے والدین کا ازدواج وقوع میں آیا تھا۔ اب خواہ اسکو حسن اتفاق سمجھو اور خواہ نواب دبیر الدولہ کی دشمنی کا نتیجہ قرار دو کہ انھوں نے اپنی بیٹی کے لئے ایسا بڑا انتخاب جسکے صلب سے ایسا عجیب و غریب شخص پیدا ہوا۔

سرسید کا حلیہ یہ تھا، رنگ سرخ و سفید، پیشانی بلند، سر بڑا اور موزون، بھون جدا جدا، آنکھیں روشن نہ چھوٹی نہ بہت بڑی، ناک نسبت چہرہ کی شان کے مقابلہ میں کسیدہ چھوٹی، کان لمبے، گلے میں دائیں جانب سولی جو ہمیشہ دائرہ میں چھپی رہتی تھی۔ چہرہ کی ہیئت مجموعی باوجود عبوس اور پرعب ہونے کے دلکش، جسم بہت فروہ، قد لمبا مگر جسم کی فروہی کے سبب میانہ نما، ہڈی چکلی، ہاتھ پانوں اور تمام اعضا نہایت قوی اور زبردست اور

سرسید والد کے گلے میں بھی سولی تھی جسکی نسبت انکلیان تھا کہ حضرت شاہ غلام مصطفیٰ بہت اور توجہ سے بالکل اچھی ہو گئی تھی ۱۲۔

تمام سپیکر اُسی بنیاد پر عمارت چُختے چلے جاتے ہیں ۔

شکل و شمائل ، اوضاع و عادات ، اخلاق و خصائل اور مذہب

شکل و شمائل

سر سید کے چہرہ کی بناوٹ اور بدن کی ترکیب اور تمام ہیأت مجموعی ایسی واقع ہوئی تھی کہ صرف اُنکی صورت دیکھنے سے باطنی عظمت کا خیال پیدا ہوتا تھا ۔ جس نے کبھی اُنکو نہ دیکھا ہو وہ بھی بغیر کسی قسم کے تعارف کے جب پہلے ہی بار اُنکو دیکھتا ہوگا تو ضرور ایک گریٹ مین تصور کرتا ہوگا ۔ یہ بات مشہور ہے کہ خود داری اور تکنت اور کسی چیز کو دیکھ کر تعجب ظاہر نہ کرنا اور اپنے تئیں لئے دے رہنا انگریزوں کی قومی خصلت ہے ؛ مگر ایک دوست کا بیان ہے کہ سر سید جب نینی تال گئے ہیں تو میں بھی وہاں موجود تھا ، جس وقت اُنکا جھپان ہوٹل میں پہنچا اکثر مسافر انگریز جو ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اپنے اپنے کمرے سے اُنکے دیکھنے کو باہر نکل آئے اور جب تک سر سید اپنے کمرے کے اندر نہیں گئے نہایت تعجب سے اُنکو براہ دیکھتے رہے ۔

کرنل گریم نے اُنکے چہرہ کو شیر بر سے مشابہ لکھا ہے ۔ اس تشبیہ کو عموماً پسند اور تسلیم کیا گیا ہے ۔ بی گزٹ مین کرنل گریم کی کتاب پر جسکے اول مین سر سید کی تصویر چھاپی گئی ہے ۔ ریویو کرتے وقت یہ لکھا تھا کہ ” کتاب شروع کرنے سے پہلے ہم سید احمد کی طرف ایک لطف انگیز دل کی کشش پاتے ہیں ؛ تصویر کیا ہے ؟ گویا ایک شیر کیسی پر عجب و باہمیت صورت کا بہادر اور دلیر ہمارے سامنے کھڑا ہے ؛ ہم حیران ہو کر سوچتے ہیں کہ اُس قدیم جنگجوئی کے زمانہ میں اس شخص کا کیا پیشہ ہوتا جب کہ مسلمانوں کی بہادری نے منجملہ انسانی ضروریات کو تعلیم کی ضرورت کا خیال اُنکے دل میں پیدا نہیں ہونے دیا تھا “ ہم کہتے ہیں کہ اُسکا

امادہ کر چکے تھے اور اس مقصد کے لئے انھوں نے ترکی لباس سے بہتر کسی لباس کو نہیں سمجھا تھا۔
یورپین طریقہ پر بود و باش رکھنا، کوٹھی بنگلون میں آبادی سے الگ ہونا، میز کرسی لگا کر
کھانا کھانا انھوں نے ولایت جانے سے پہلے ہی اختیار کر لیا تھا۔ قطع نظر اسکے کہ یہ طریقہ انگریزوں
کے میل جول کا ایک ذریعہ تھا۔ بڑا فائدہ اُس سے یہ تھا کہ وہ ہندوستانی سوسائٹی میں رکھ کوئی بڑا
کام سرگزا انجام نہ کر سکتے تھے۔

دنیا کا عام قاعدہ ہے کہ انسان جس سوسائٹی میں ہوش سنبھالتا ہے اُسکی رسوم و ریتوں
سے ایسا مانوس ہو جاتا ہے کہ انہیں اصلاح کی ضرورت اُسکو کبھی محسوس نہیں ہوتی اور اگر بعض کو
محسوس ہوتی ہے تو یہ جرات نہیں ہوتی کہ اُنکو چھوڑ دیں یا انہیں کچھ تبدیلی کر سکیں۔ مگر سرسید کی
طبیعت اس قاعدہ سے مستثنیٰ تھی اور ایسی ہی طبیعت والوں کی بدولت انسان وحشی چوپایوں کی
مت سے اس درجہ تک پہنچا ہے۔ غدر کے بعد جب سے کُنّا میل جول انگریزوں کے ساتھ زیادہ
ہوا وہ اپنے ہاں کے طریق خورد و نوش کو ناپسند کرنے لگے اور اُسکو بتدریج بدلنا شروع کیا۔
چنانچہ اول اول وہ عرب کے طریقہ کے موافق فرش پر بیٹھ کر اور ایک چوکی پر جو زمین سے چند انچ
اوپر ہوتی ہے کھانا رکھ کر کھاتے تھے مگر ولایت سے واپس آنے کے بعد وہ میز کرسی پر کھانے لگے۔
دوستوں اور مہمانوں سے اُنکا دسترخوان بہت کم خالی ہوتا تھا۔ جس دن کوئی مہمان نہ ہوتا
وہ کھانا کھاتے وقت بنشاش نہیں معلوم ہوتے تھے اور جس دن زیادہ مہمان ہوتے اُس دن
اُنکے گھر عید ہوتی تھی۔ اگرچہ مہمانوں کی خاطر و مدارت قدیم سے انکی ایک جلی خصلت تھی مگر جسے
علی گڑھ مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز بنا اُس وقت سے اُنکا گھر مانسرا بنگلیا تھا شاید ہی کوئی دن ایسا

متناسب، بدن ٹھوس، وزن ساڑھے تین من، عنفوان شباب میں رسولی نہ تھی اور بدن بھی زیادہ فربہ نہ تھا، بڑھاپے کی وجاہت دلالت کرتی تھی کہ جوانی میں بہت خوبصورت ہونگے۔ اگرچہ سرسید کا چہرہ خاموشی اور فکر کے وقت نہایت عجیب اور ڈراونا معلوم ہوتا تھا مگر بقول کرنل گریم کے گفتگو کے وقت اُس سے مسرت اور زندہ دلی اور گرمجوشی ٹپکتی تھی۔ جس طرح اخلاق میں مطلق تصنع نہ تھا اسی طرح بات چیت میں بالکل بناوٹ نہ تھی۔ زبان دلی کی تھی مگر لب و لہجہ دلی کا سا نہیں معلوم ہوتا تھا؛ محض سید سے سادے طور پر عام فہم بول چال میں وہ ہر قسم کی باتیں کرتے تھے۔ زبان قینچی کی طرح جلدی نہیں چلتی تھی اور نہ زیادہ محاورے بالغت زبان پر آتے تھے۔

جب کسی نئے آدمی سے پہلی ملاقات ہوتی تھی تو وہ اور لوگوں کی طرح بات چیت کرنے کی تقریبیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نہیں نکالتے تھے؛ اگر دوسرا کوئی بات پوچھتا تو جواب دیدیتے اور نہ خاموش بیٹھے رہتے۔ بعض اوقات اس برتاؤ سے ناواقف آدمی اُنکو مغرور سمجھتے تھے مگر وہ کسی کی بدگمانی کے خیال سے اپنا نیچر نہیں بدلتے تھے۔

ولایت جانے سے پہلے اُنکا لباس ہندوستانی وضع کا رہا مگر جب ولایت کا ارادہ کیا تو مسٹر ہٹن نے۔ جو اُنکے دوست تھے۔ انگلستان سے اُنکو لکھا کہ یہاں آؤ تو ترکی لباس پہن کر آنا، اگر یہاں ہندوستانی لباس میں آئے تو یہاں کے لوگ تماشہ بنا لینگے۔ بظاہر انھوں نے اسی وجہ سے ترکی لباس اختیار کیا تھا مگر حقیقت۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ یہ تبدیل لباس کا ایک بہانہ تھا؛ وہ پہلے ہی ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک قومی لباس کی بنیاد ڈالنے کا

نہایت

اگرچہ آخر عمر میں سرسید بقا ضاے سن بیمار رہنے لگے تھے لیکن اس پہلے انکی صحت ہمیشہ نہایت عمدہ رہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں صحیح المزاج ہونے کے سبب انکو دو اٹھنڈائی پینے کا بہت ہی کم اتفاق ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ اگر دو ذرا بد مزہ ہوتی تو وہ اس پیرانہ سالی میں بھی بچوں کی طرح ناک موٹہ چڑھائے بغیر نہیں پیتے تھے۔ عفت و پرہیزگاری اور محنت اور کھانے پینے میں مناسب احتیاط ان سب باتوں نے انکے مزاج کو اور بھی زیادہ اعتدال پر رکھا۔ بینائی اخیر تک عمدہ رہی، اگرچہ عینک لگانے کی عادت ہو گئی تھی مگر دن ہو یا رات لکھنے پڑھنے کا کام بے تکلف مثل جوان آدمیوں کے کرتے تھے۔ البتہ نسیان بڑھ گیا تھا، دانت بھی جھو جھرے ہو گئے تھے، چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا نہایت دشواری سے ہوتا تھا، کسی جلسہ میں کھڑے ہو کر اب دو چار منٹ سے زیادہ تقریر نہیں کر سکتے تھے، باوجود اسکے تصنیف اور تحریر کا کام۔ جو بمنزلہ شہ ضرورت کے ہو گیا تھا۔ اخیر دم تک برابر جاری رہا۔

نہایت تاشون

اگرچہ بچپن اور عنفوان شباب میں انکو میلے تاشون کا بہت شوق تھا مگر جب بھائی کا انتقال ہوا تھا یہ شوق گویا بالکل جاتا رہا تھا، صرف علمی تاشون میں مثل سرسید تھیں وغیرہ کے کبھی کبھی شریک ہو جاتے تھے؛ با اینہم تھیں کو ہندوستان کے حق میں نہایت مضرب خیال کہتے تھے۔ ظرافت اور خوش طبعی انکی جبلت میں داخل تھی مگر صریح انکی اور باتوں میں بناوٹ نہ تھی اس صریح ظرافت و خوش طبعی میں مطلق تصنع نہ تھا۔ تحریر میں، تقریر میں، بات چیت میں جو لطیفہ یا شوخی انکو سوجھ جاتی تھی۔ اگرچہ کیسی ہی شرم و حجاب کی بات ہو۔ ان سے ضبط نہ ہو سکتی تھی مگر ہر ایک امر کے بیان کرنے کا خدانے ایسا سلیقہ دیا تھا کہ کوئی بات تہذیب کی حد

ظرافت

ہوتا ہو گا کہ اُنکے ہاں کوئی مہمان نہ ہو۔ رات کے کھانے پر اُنکے ہاں اکثر پر لطف صحبت ہوتی تھی؛ مذہبی، علمی، تاریخی اور سوشل ہر قسم کے مسائل پر گفتگو ہوتی تھی اور اسی کے ساتھ ہنسی اور چہل کی باتیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ کھانوں میں زیادہ تعدد اور تلون نہیں ہوتا تھا مگر کھانا عموماً عمدہ ہوتا تھا۔ اگر کسی موقع پر کھانا عمدہ نہیں ملتا تھا تو جیسا ملتا تھا خوشی سے بغیر ناک موٹہ چڑھائے سیر ہو کر کھا لیتے تھے۔ فصل کی ترکاریاں اور فواکہ خصوصاً آم اور خربوزے نہایت مرغوب تھے۔ سناہے کہ پہلے خوراک زیادہ تھی مگر بڑھاپے میں بہت گھٹ گئی تھی البتہ بعد کھانا کھانے کے کوئی پاؤ پاؤ سیر و دھو دو وقت بلانا عہ پی لیتے تھے اور اسکے بعد پیسا دو پیسا بھر چنے یا دال سیو کھا کر مونہ صاف کرتے تھے، ولایت جانے سے پہلے پان زردہ کھانے اور حقہ پینے کی بہت عادت تھی مگر ولایت جاتے وقت پان کھانا یک قلم ترک کر دیا تھا اور بجائے حقہ کے سگریٹ پینے لگے تھے۔

کسی قسم کی مسکرات کا تمام عمر میں اُنھوں نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ مرنے سے نو دس برس پہلے ایک دفعہ وہ سخت بیمار پڑے تھے، ڈاکٹر نے کوئی ہلکی سی شراب اُنکے لئے تجویز کی، اُنکے ایک دوست نے اُنسے ڈاکٹر کی تجویز کا ذکر کیا، اُنھوں نے شراب پینے سے انکار کیا اور مرنے کا یہ شعر پڑھا

عمر ساری تو کٹی عشق بتان میں مومن آخری وقت میں کیا خاک مسلمان ہونگے

کرنل گریم لکھتے ہیں کہ ”جب وہ (یعنی سرسید) لندن میں تھے ایک دفعہ ڈیوک آف آرگائل کے ہاں ڈنر پر بلائے گئے، جب شراب سامنے آئی تو اُنھوں نے کہا ”میں نوح کی شراب نہیں پیتا صرف آدم کی شراب

(یعنی پانی) پیتا ہوں“

مسکرات
سکریٹ

جو پادری تھے۔ میچ کھیلنے کے لئے اپنے طلبہ کو ساتھ لیکر علیگڑھ آئے تھے۔ سرسید نے انکو ڈنریہ بلایا۔ جبکہ سٹریک بھی اُنکے ساتھ تھے۔ کھانے کے بعد پادری صاحب سرسید سے مخاطب ہو کر بولے کہ ”بہت اچھی بات ہو کہ آپ کے کالج میں مذہبی تعلیم بھی ہوتی ہے، کیونکہ سچا مذہب ہی ایسی چیز ہے جو انسان میں نیکی پیدا کرتا ہو“ پادری صاحب اسلام کو تو جسکی تعلیم علیگڑھ کالج میں ہوتی ہو۔ سچا مذہب کہہ ہی نہیں سکتے تھے، لامحالہ اُنکی مراد عیسائی مذہب سے تھی اور عیسائی مذہب کی بدولت جسقدر دنیا میں خونریزی ہوئی ہے اُسکی مثال کسی مذہب میں نہیں مل سکتی۔ سرسید نے پادری صاحب کی تقریر سنکر کہا کہ ”دنیا میں مذہب سے زیادہ کوئی بدتر چیز اور تمام برائیوں اور جرائم کا مخزن نہیں ہے، تاریخ شاہد ہے کہ جسقدر ظلم اور بے رحمان اور قتل و خونریزیان دنیا میں صرف مذہب کے سبب ہوئی ہیں وہ ایک طرف اور جو جرائم شیطان نے کرائے ہیں وہ ایک طرف رکھے جائیں تو بھی مذہبی جرائم اور برائیوں کو غلبہ رہیگا۔ پادری صاحب یہ سنکر چپ ہو گئے اور سٹریک سے مکان پر آکر کہا کہ میں تو اس شخص کو بڑا اچھا لو جین سنا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ یہ بالکل غلط تھا۔

بعض اوقات سرسید کسی مسئلہ کی نسبت اپنے عقیدہ کا اظہار ظرافت کے پیرایہ میں ایسے طور پر کر جاتے تھے کہ بظاہر ایک ہنسی کی بات معلوم ہوتی تھی مگر درحقیقت وہ اُنکی اصلی رائے اُس مسئلہ کی نسبت ہوتی تھی۔ جس زمانہ میں وہ بنارس میں تھے اُنکا ایک رُکُل تہذیب الاخلاق میں اس مضمون پر شائع ہوا تھا کہ اجماع۔ جیسا کہ اہل سنت سمجھتے ہیں۔ حجت شرعی نہیں ہے۔ شیعوں میں سے ایک سید صاحب۔ جو بنارس میں ملازم تھے۔ اس رُکُل کو پڑھ کر خوشی خوشی اُنسے ملنے کو آئے۔ پہلے کبھی اُنسے ملاقات نہیں ہوئی تھی، سرسید سے

متجاوز نہ ہونے پاتی تھی۔ زیادہ تر انکو ظرافت اور شوخی اُن لوگوں کے مقابلہ میں ہوجھتی تھی جو اُنکی تکفیر یا تضلیل کرتے تھے؛ وہ انکو کافر یا مرتد کہہ کر اپنا دل ٹھنڈا کرتے تھے اور یہ اس طرح پر اپنے دل کا بُخار نکالتے تھے۔ پادریوں سے بھی اُنکا دل بہت دکھا ہوا تھا اسلئے کبھی کبھی بالمشافہہ اُنسے بھی نوک جھوک ہو جاتی تھی۔

ایک دفعہ وہ ریل میں سوار تھے، کسی اسٹیشن پر دو انگریز اُنکی گاڑی میں بیٹھے، ایک انہیں سے پادری تھا، اُسکو کسی طرح سے معلوم ہو گیا کہ سید احمد خان یہی شخص ہے، سرسیدؒ کہا ”مدت سے آپ کی ملاقات کا اشتیاق تھا، میں آپ سے خدا کی باتیں کرنی چاہتا تھا“ سرسیدؒ کہا ”میں نہیں سمجھا آپ کس کی باتیں کرنی چاہتے ہیں؟ اُسے کہا خدا کی“ سرسیدؒ نے کمال سنجیدگی سے کہا ”میری تو کبھی اُنسے ملاقات نہیں ہوئی، اسلئے میں اُنکو نہیں جانتا“ پادری نے تعجب ہو کر کہا ”ہن! آپ خدا کو نہیں جانتے؟ انھوں نے کہا ”مجھی پر کیا موقوف ہے، جس سے ملاقات نہ ہو اُسکو کوئی بھی نہیں جانتا“ پھر کسی شخص کا نام لیکر پوچھا کہ ”آپ اُسکو جانتے ہیں؟ پادری نے کہا ”نہیں میں اُس سے کبھی نہیں ملا“ سرسیدؒ نے کہا ”پھر جس سے میں کبھی نہ ملا ہوں، نہ میں نے کبھی اُسکو اپنے ہاں کھانی پر بلایا ہو نہ مجھکو اُسکے ہاں کھانے پر جانے کا اتفاق ہوا ہو، اُسکو میں کیونکر جان سکتا ہوں“ پادری یہ سن کر خاموش ہو رہا اور دوسرے انگریز نے انگریزی میں کہا کہ یہ تو سخت کافر ہے۔ پھر سرسیدؒ سے اُس نے کوئی بات نہیں کی، اگر تقریر کا سلسلہ آگے چلتا تو اُسکو معلوم ہو جاتا کہ خود اُسکے عقیدہ کے موافق خدا ایسا ہی ہونا چاہیے جسکے ساتھ ملنا جلنا کھانا پینا لین دین انسان کو مانند ہو سکے۔ ایک دفعہ دلی کے مشنری کلج اور علیگڑھ کا لچ کا بیچ تھا اور دلی سے کالج کو دوپہر تیس بجے

اپنا نام اس طرح لکھا تھا ”جانی فرید“ (یعنی گنگار فرید) سرسید نے جو اس کا جواب لکھا اس کے عنوان پر وہی الفاظ۔ جو مولوی صاحب نے اپنی نسبت لکھے تھے۔ لکھ دیے یعنی ”جانی فرید“

اس قسم کے ہزاروں چٹکے سرسید کی پہلا ورپرائٹ ٹھہریں مین ملتے ہیں جن کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل سالہ لطائف و نوادر کا مرتب ہو سکتا ہے؛ مگر اس شخص کی زندگی۔ ایسے متم باشا واقعات سے بھری ہوئی ہے کہ انھیں کا سمیٹنا بیوگرافی کی طاقت سے باہر ہے چہ جائیکہ اس کے لطائف و نوادر کو جمع کرنا اور اس شعر کا مصداق بننا

”بخون آلودہ دست قتیغ غازی ماندہ بجہ حسین تو خواہی۔ زیب اسپ زینت برگستان بینی“

سرسید کی شوخی طبع جیسی جوانی اور کمولت کے زمانہ میں تھی ویسی ہی بڑھاپے میں خیر عمر تک ہی۔ مرنے سے چار برس پہلے۔ جبکہ انھوں نے تیسری بار تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ سکے اشتہار کے ساتھ۔ جو انھوں نے ایک چھوٹا سا آرٹیکل بطور تہید کے لکھا تھا اُس کے آخر میں

لکھتے ہیں ”گو ہمارا دل کیسا ہی ٹوٹا ہوا ہو مگر امید ہے کہ اب کا تہذیب الاخلاق اگر پہلے سے اچھا ہوگا تو برابر ہی

نہ ہوگا۔ اور اگر وہ مکاتبات و کچپ بھی تہذیب الاخلاق میں چھپنے لگے۔ جو ہم میں اور نواب حسن الملک مولوی

حمادی علی میں بعض مسائل کی نسبت ہونے والے ہیں اور جسے قصہ آدم یاد آ جاویگا اور کبھی میداح کو حکم ملیگا

کہ حمادی علی کو سجدہ کرو اور کبھی حمادی علی کو حکم ہوگا کہ سیداحمد کو سجدہ کرو۔ تب تو تہذیب الاخلاق نہایت ہی

دکچپ ہو جاویگا۔ اور خدا نکرے کہ ان دونوں میں سے کوئی یہ کہے کہ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ“

مطالعہ کی عادت ابتدا سے انکی رفیق رہی۔ جس زمانہ میں وہ فچیور سیکری میں منصف تھے

اُس وقت مولانا نور الحسن مرحوم اگر وہ میں منصف تھے، سرسید کی اُسے نہایت گہری دوستی تھی،

اُس آرٹکل کا ذکر کر کے کہنے لگے ”کیون جناب ! جب آپ کے نزدیک جماع حجت نہیں تو خلیفہ اول کی خلافت کیونکر ثابت ہوگی ! سرسید نے کہا ”حضرت ! نہ ہوگی تو انکی نہ ہوگی“ میرا کیا بگڑ گیا“ وہ یہ سنکر اور بھی زیادہ خوش ہوئے اور سمجھے کہ کچھ پانی مٹتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے ”کیون جناب ! اُس خلافت کے وقت۔ جب کہ کچھ لوگ خلیفہ اول کا ہونا چاہتے تھے اور کچھ جناب امیر کا۔ اگر آپ اُس وقت ہوتے تو کس کے لئے کوشش کرتے ؟ سرسید نے کہا ”حضرت ! مجھے کیا غرض تھی کہ کسی کے لئے کوشش کرتا ؟ مجھے تو جانتا تھا کہ ہو سکتا اپنی ہی خلافت کا ڈول ڈالتا اور سولہ سوے کا میاب ہوتا“ یہ سنکر انکا جی جھوٹ گیا اور جتیاں بہن گھر کا رستہ لیا۔

بہ ظاہر یہ ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت اس پیرایہ میں انھوں نے اپنی اصلی رے مسئلہ خلافت کے متعلق ظاہر کی ہے۔ اُنکے نزدیک۔ جیسا کہ انھوں نے اپنی تحریرات میں جا بجا ظاہر کیا ہے۔ کوئی شخص خاتم النبیین ص کے بعد من حیث النبوۃ انکا جانشین نہیں ہو سکتا تھا اور اسلئے وہ کسی کی خلافت کے ماننے یا نہ ماننے کو ضروریات دین میں سے نہیں سمجھتے تھے بلکہ خلافت کو محض دنیوی سلطنت کی ایک صورت جانتے تھے اور اسی بنا پر جو کچھ خلفائے اپنے اپنے عہد میں کیا اُسکا ذمہ دار اسلام کو نہیں ٹھہراتے تھے، بلکہ خود انھیں کو اُسکا جوابدار ذمہ دار سمجھتے تھے۔

سرسید کے لطیفے خاص کر اُن آرٹکلوں میں پائے جاتے ہیں جن میں معترضین و مخالفین کا ذکر خیر یا انکی طرف خطاب ہے اور سب زیادہ اُنکے پرايوٹ خطوں اور رقعوں میں نظر آتے ہیں جو وہ اپنے خالص اور بے تکلف دوستوں کو وقتاً فوقتاً لکھتے تھے۔

ایک دفعہ۔ جب کہ ناظم بھی علی گڑھ میں سرسید کے مکان پر ٹھہرا ہوا تھا۔ خان بہادر مولوی سید فرید الدین احمد سب آرڈنٹ جج کا رقعہ دعوت سرسید کے نام آیا؛ رقعہ کے خاتمہ پر انھوں نے

لطیف بات مضمون کتاب کے خلاف یا اسکی مؤید یا اس کے متعلق ذہن میں آجاتی اُسی وقت اسپر
کچھ لکھا اور اخبار میں چھپنے کو بھیج دیا ۔

غدر کے بعد سے پریس ہمیشہ اُنکے ہاتھ تلے رہا اسلئے یہ عادت اُنکی طبیعت ثانی بن گئی تھی
کہ مضمون لکھنے کے بعد جب تک کہ وہ شایع نہ ہو جاتا۔ اُنکو چین نہ پڑتا تھا ۔ یہی حال کتاب کی
تصنیف کا تھا ، ادھر ایک پوائنٹ ختم ہوا اور ادھر چھپنے کے لئے بھیجا گیا ؛ مسودہ برابر نظر دینا
اور زیادہ کاٹ چھانٹ کر نیا انکا دستور نہ تھا ، البتہ مسودہ صاف کرنے کے لئے وہ کاتب دیتے تھے ،
اور جب صاف ہو جاتا تو کتابت کی تصحیح کے ارادہ سے اُسکو ایک نظر دیکھ لیتے تھے ۔

تصنیف
حالت

تصنیف کی حالت میں جب کوئی مشکل مقام پیش آ جاتا اور زیادہ غور کی ضرورت ہوتی
تو وہ تنہا ہوتے یا مجمع میں ۔ بالکل اُسین مستغرق ہو جاتے تھے ، چہرہ عبوس ہو جاتا تھا ، ہنسی
یا تبسم پاس نہ آتا تھا ، لوگ آپس میں باتیں کرتے مگر اُنکو کچھ خبر نہ ہوتی تھی ۔ کبھی ایسے موقع پر
اُنکھیں بند کر کے لیٹ جاتے تھے اور جب تک طبیعت راہ نہ دیتی برابر اُسی خیال میں مہمک رہتے ،
جب عقدہ حل ہو جاتا فوراً چہرہ پر نشاں آ جاتی ۔ اگر اُسوقت کوئی مخاطب صحیح پاس ہوتا تو بعض
اوقات اپنا سانحہ اُس کے روبرو بیان کرتے ، اگر اور لوگ بھی اُسکو پسند کرتے تو خوش ہوتے ، اگر کوئی
اعتراض کرتا تو اسپر بحث کرتے یا خاموش ہو جاتے مگر فوراً تسلیم کبھی نہ کرتے تھے ۔

خطون کا جواب دینے میں وہ نہایت فیاض تھے ۔ جو خط کہ پانی پت سے علی گڑھ بھیجا جاتا ہو
اگر وہاں پہنچتے ہی اُسکا جواب لکھا جائے تو دوسرے دن وہاں سے جواب آ جاتا ہے ، مجھے یاد نہیں پڑتا
کہ میرے خط کا جواب کبھی چوتھے دن آیا ہو یا بالکل نہ آیا ہو ، جبکہ اُنکا برتاؤ ہم لوگوں کے ساتھ یہ تھا

خطون کا
جواب دینا

مطالعہ کے وقت کتاب کے مشکل مقامات جو سمجھ میں نہ آتے تھے۔ اُنکے سمجھنے کے لئے ہر توار کو وہ گھوڑا پر سوار ہو کر فچور سے آگرہ میں مولانا کے پاس آتے تھے۔ کئی برس تک بلا ناغہ اُنکا یہی دستور رہا۔ وہ کہتے تھے کہ میرا گھوڑا رستے سے ایسا آشنا ہو گیا تھا کہ ایک بار آگرہ سے چھوٹ کر فچور اپنے تھان پر پہنچ گیا تھا۔

سرسید کا مطالعہ نہ صرف دل بہلانے یا عبارت کا لطف اُٹھانے کے لئے ہوتا تھا اور نہ کتاب دانی کی عرض سے۔ جیسا کہ مدرس اور طلبہ کتاب کے ایک ایک لفظ اور جملہ اور ترکیب پر غائر نظر کرتے ہیں، بلکہ اُنکا مطلب صرف مصنف کے خیالات سے اطلاع حاصل کرنا ہوتا تھا۔ جو بات کتاب میں اُنکے کام کی ہوتی تھی اُس پر پُرسل سے نشان کر دیتے تھے، اور اگر کوئی مضمون کسی اخبار میں کام ہوتا تھا اُس ورق کو الگ کر کے اپنے اخبار کے فائل میں۔ جو ہر وقت سامنے رکھا رہتا تھا۔ چسپان کر دیتے تھے۔ جو مہتمم بالشان سوالات ملک میں دائر و سائر ہوتے تھے اُنکے متعلق کوئی عمدہ مضمون کسی اخبار نظر پڑ جاتا تھا اُس کو زیادہ غور سے دیکھتے تھے اور ہر ایک سوال کے متعلق اپنی ایک مستقل رائے قائم کر لیتے تھے۔ اگر کبھی ضرورت سمجھتے تھے تو اُس پر چھوٹا یا بڑا آرٹیکل لکھ کر چھپنے کو بھیج دیتے تھے۔ جو مضمون اُنکے خلاف اخباروں میں چھپتے تھے اُنکو بہت شوق اور توجہ سے دیکھتے تھے اور اکثر حاضرین کو بھی سناتے تھے۔ انگریزی اخباروں کی بعض خبریں، یا نوٹس یا کوئی ضروری آرٹیکل کسی انگریزی دان سے پڑھوا کر سن لیتے تھے اور جوابات سمجھ میں نہ آتی اُس کا ترجمہ کر لیتے تھے۔

کتاب میں اکثر اُنکے مطالعہ میں مذہبی دیکھی گئی ہیں، تصنیف کی حالت میں صرف بقدر ضرورت یا تو کتاب خود دیکھ لیتے تھے اور یا کوئی دوسرا شخص مقام مطلوب نکال کر اُنکو دکھا دیتا تھا۔ اگر کوئی

مکالمہ یہ کہ آپ مرحمت سے دھولینگے، خنزیر خود ناپاک ہے مگر جس پاک چیز کو وہ مس کرے دھونے سے پھر پاک ہو سکتی ہے۔“

”افسوس میں نے غلطی کی جو اپنے تئیں خنزیر سے تشبیہ دی، وہ تو مجھے بہت اعلیٰ ہے، خدا نے

اسکو یاد کیا جو، مجھے تو سولے ہمدی علی کے اور کوئی یاد بھی نہیں کرتا۔“

اسکے بعد مولوی ہمدی علی کی تحریرات جو اخبار میں کچھ سرسید کے موافق اور کچھ مخالف

چھپی ہیں انکا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”جو جو مقام جھکوا سیں کھٹکتے ہیں (یعنی جو میرے خلاف ہیں)

اُس سے میرا دل عجیب طرز پر خوش ہوتا ہے جیسے کوئی سوداگر یہ دیکھے کہ ایک نہایت بیش بہا و بے نظیر مانتھی

اُنکی اوگی میں آن پھنسے اور وہ یقین کرے کہ اب وہ نکلنے والا نہیں۔“ یہ ایک معمولی مثال ہے اُن

محبت آمیز باتوں کی جو سرسید کی دوستانہ تحریروں میں عموماً دیکھی جاتی ہیں؛ اور اس بات

کے تصدیق سید ہمدی علی خان سلمہ اللہ خود کریں گے کہ وہ فی الواقع سید کی اوگی میں پھنسے تھے

یا نہیں اور پھنسا کر اُسین سے نکلنے کا اُنکو موقع ملا یا نہیں؟

محنت اور جفاکشی کی قابلیت بھی سرسید کے خصل و صاف میں سے تھی۔ قطع نظر اسکے

کہ ابتدا سے اُنکو کام کرنے کی عادت رہی اُنکے قوے میں فطرۃ مشکلات کے برداشت کرنے اور

کسی کام سے ہمت نہ ہارنے کی لیاقت اور استعداد رکھی گئی تھی اور ظاہراً اُنکی غیر معمولی ذہانت

بھی اُنکی دائمی غور و فکر اور دماغی محنت کا نتیجہ تھا کیونکہ بچپن میں۔ جیسا کہ خود سرسید بیان

معلوم ہوا ہے۔ وہ باعتبار ذہانت و جودت کے اپنے ہمپیشمون میں کچھ امتیاز نہ رکھتے تھے، مگر

چونکہ انھوں نے اپنے تمام قوے سے۔ جو خدا تعالیٰ نے اُنکے نفس میں ودیعت کئے تھے۔ پورے پورے

تو دیکھنا چاہئے کہ اپنے خاص دوستوں اور ہمسرین اور ہم رتبہ لوگوں کے ساتھ کیسا ہوگا؟ دوستوں کو معذوری کی حالت کے سوا وہ ہمیشہ پراٹھ خطوط اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، البتہ مدرسہ وغیرہ کے متعلق جو خط لکھتے ہوتے تھے وہ اکثر پیشداشت لکھتا تھا اور وہ خود بتاتے جاتے تھے۔ لیکن جو فضول ترین لوگ اُنکے پاس بھیجتے تھے اُنکا کچھ جواب نہ دیتے تھے۔ جس خط کا جواب لکھ چکے اُسکو فوراً چاک کر ڈالتے تھے۔ کبھی انھوں نے کسی کی تحریر کو اس خیال سے کہ اُسکو الزام دینے یا شرمندہ کرنے کا موقع رہے۔ اپنے پاس ستاویز بنا کر نہیں لکھا۔ جب کسی خالص و مخلص دوست کی زیادہ بیماری کی خبر آتی تو جب تک صحت نہ ہوتی وہ برابر تار پتار یا خط پر خط بھیجتے رہتے۔ جو خط کہ وہ اپنی تکلف اور خالص و مخلص دوستوں کو لکھتے تھے اُنکا انداز تحریر فی الواقع ایسا دلکش و دلنشین ہوتا تھا کہ اگر اُسکو یاد دیا افسوس یا حُب کا عمل کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ افسوس ہے کہ اب تک کسی نے اُنکے خطوط جمع کرنے کی طرف توجہ نہیں کی، اگرچہ امید نہیں ہے کہ اُنکا دسواں حصہ بھی اب فراہم ہو۔ لیکن جب قدر دستیاب ہوں اُنکا جمع کرنا نہایت ضرور ہے۔ وہ ایک ایسا مجموعہ ہوگا جو غیروں کو اپنا بنانا اور خوشیوں کو رام کرنا سکھائیگا، وہ سچی دوستی اور سچی محبت کا نمونہ ہوگا، وہ آئندہ نسلوں کو یاد دلائیگا کہ ہمارے اسلاف کیسے بے ریا اور کیسے محبت والے ہوتے تھے؟ کس طرح دوستوں کا دل اپنی مٹھی میں رکھتے تھے؟ اور کیونکر اُنکے دلوں کو شکار کرتے تھے۔

جب وہ ولایت سے ہندوستان آنے کو ہیں اُنھوں نے مولوی محمد علی خان کو اپنے آنے کی اطلاع دی ہے اُس میں لکھتے ہیں کہ ”جو تھی پانچون کو الہ آباد پہنچ کر آپ کے دیدار فرحت آثار سے مشرف ہوگا اور آپ کے قدموں کو مثل نعلین بوسہ دوں گا۔ اگرچہ آپ کے قدم میرے ناپاک ہونے ناپاک ہو جاویں گے

ایسی محنت شاقہ کی جس سے آخر کار اُنکے پانویں ایک مرض پیدا ہو گیا جو اخیر دم تک اُنہیں ہوا، اُنکے پانو اور پنڈلیاں سوج جاتی تھیں اور تلوون میں درد ہو جاتا تھا جیسے جیسے دودھ جیسے برابر یہ تکلیف رہتی تھی، چند روز کو افاقہ ہو جاتا تھا پھر وہی شکایت پیدا ہو جاتی تھی۔ باوجود ان مشکلات کے اُنھوں نے خطبات احمدیہ کو ولایت ہی میں پورا کیا اور وہیں چھپوایا۔

جس زمانہ میں وہ سائنٹفک سوسائٹی کا مکان بنوا رہے تھے سخت گرمی کا موسم تھا، شام تک کو چلتی تھی، وہ کچری سے آکر گھر کی ٹٹی اور پنکھا چھوڑ کر سیدھے سوسائٹی پہنچتے تھے اور ظہر و عصر اور مغرب کی نمازین وہیں پڑھتے تھے۔ اُنکے دوست محمد سعید خان بیان کرتے تھے کہ اکثر مجھے بھی وہ ساتھ لیجاتے تھے، سیر گرمی اور نو کے مارے بُرا حال ہوتا تھا مگر وہ بے تکلف سارا دھوپ اور لو اور گرمی کا وقت وہیں راج مزدورون میں بسر کرتے تھے۔

اخیر زمانہ میں جو کہ شیخوخت کا زمانہ تھا۔ اُنکی محنت جوانی اور کھولت کے زمانہ سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھی، وہ اُس پیادہ سیاح کی طرح جو سرد سیر ملک میں سیاحت کے لئے داخل ہو۔ جون جن آگے بڑھتے جاتے تھے اُس قدر اُنکی چال زیادہ تیز ہوتی جاتی تھی۔ اُنکا اس عارفانہ مقبولے پر پورا پورا عمل تھا کہ ”ضَاعِفٌ فِی الْکِبَرِ هَمَّتْکَ فَاَنْ وَقْتُکَ قَدْ دَنٰی وَعَمَّا قَلِیْلٍ تَدْعٰی“ (یعنی بڑھاپے میں اپنی ہمت دو چند کر کیونکہ تیرا وقت قریب آ پہنچا ہے اور عنقریب تیری بلاؤ ہونے والی ہے)

وہ تقریباً ہمیشہ صبح کے چار بجے سے شام کے آٹھ بجے تک برابر جاگتے اور مختلف کاموں میں مصروف رہتے تھے، دوپہر کو سخت بیماری کے سوا کبھی بلینگ پر جا کر نہ لیٹتے تھے، اگر کبھی رات کو نیند نہ آتی اور دن کو نیند کا غلبہ زیادہ ہوتا تو بھی وہ اپنی نشست گاہ سے نہیں اُٹھتے تھے،

کام لیا تھا اسلئے اُنکے ذہن اور حافظہ اور عقل سب جلا ہو گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ نیوٹن اسکول میں کچھ ذہین لڑکا نہیں معلوم ہوتا تھا، جب اُس سے بڑے بڑے کار نمایان ظاہر ہوئے اور اُس سے لوگوں نے پوچھا کہ تم نے اتنی نئی باتیں کیونکر نکالیں تو اُس نے یہی جواب دیا کہ ”میں استقلال کے ساتھ برابر غور کرتا رہا“ محنت سے ایسے بڑے بڑے کام ظہور میں آئے ہیں کہ بعض حکما کو شبہ ہو گیا ہے کہ آیا ذہانت بغیر محنت کے فی نفسہ کوئی چیز ہے یا نہیں؟

بہر حال سرسید کے تمام قوائے عقلیہ کی جلا کرنے والی اور اُنکو ترقی کے اعلیٰ درجہ پر پہنچانے والی اُنکی دائمی محنت اور متصل غور و فکر اور استقلال تھا۔ سید میر محمد مرحوم امام طبع مسجد دہلی بیان کرتے تھے کہ ”جس زمانہ میں سید صاحب دلی سے رشتہ بدل کر گئے ہیں میں بھی اُنکے ساتھ گیا تھا۔ وہ صبح سے دس بجے تک مولوی نوازش علی صاحب جٹکو دلی سے ہمراہ لے گئے تھے۔ سبق پڑھتے تھے، بیس بیس بائیس بائیس صفحہ شرح جامی اور قطبی کے وہ ہر روز پڑھ لیتے تھے، میں بھی اُنکے ساتھ پڑھنے کے لئے گیا تھا۔ مگر اس رفتار سے اُنکے ساتھ نہ چل سکا اور واپس دلی چلا آیا۔ سبق کے بعد وہ کھانا کھا کر تھوڑی دیر بیٹولہ کرتے تھے، پھر کچہری جاتے اور شام تک کچہری کرتے، وہاں سے آکر شام کے کھانے اور نمازون سے فارغ ہو کر سو رہتے، کوئی تین ساڑھے تین گھنٹے سوتے تھے، اسکے بعد ہمیشہ بلاناغہ اُٹھ بیٹھتے اور صبح تک برابر مطالعہ کرتے تھے۔ جب تک میں رشتہ میں رہا برابر اُنکا یہی قاعدہ دیکھا“

یہ تو اُس زمانہ کا حال ہے جب سرسید کی عمر ۳۶ برس کی تھی، اُس سے آٹھ نو برس بعد مراد آباد اور غازی پور میں بھی۔ جبکہ وہ تبسین الکلام لکھتے تھے۔ اُنکی محنت کا حال۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اسی کے قریب قریب تھا۔ ولایت میں خطبات احمدیہ کے لکھنے میں اُنھوں نے ڈیڑھ برس برابر

اور مصالح اپنی رے اور تجویز سے منگوانا، ہر ایک عمارت کے لئے مناسب کتبہ یا تاریخ تجویز کرنی، اور اُسکو اپنے اہتمام میں کندہ کرانا، تیار شدہ عمارتوں کی تابمقدور خبر رکھنی اور اُنکے نقصانات کا تدارک کرنا، کالج اور تعمیر کے اخراجات کے لئے چندہ جمع کرنے کی نئی تدبیریں سوچنی اور اُن تدبیروں کے موافق عمل درآمد کرنا اور اخبار اور خطوط کے ذریعہ سے چندہ کی تحریک کرنا، اگر روپیہ بھرم نہ پہنچے تو قرض سے مدرسہ کا کام چلانا، کالج یا بورڈنگ ہوس کے انتظام کے متعلق جب کوئی شکایت گذرے تابمقدور اُسکے تدارک کی فکر کرنا اور جب کوئی مناسب ضروری تجویز منظور ہو جائے اُسکے پورا کرنے کے لئے ہر قسم کی تدبیر عمل میں لانا، اُردو اخبارات جو اطراف و جوانب سے آتے تھے اُن سب پر ایک نظر ڈالنا اور بعض انگریزی اخباروں کو کسی اپنے پیشیت سے پڑھوا کر سننا، ہمیشہ قوم کے اہم معاملات سے۔ جو اخباروں میں درج ہوتے تھے۔ نوٹس لینا اور اپنے اخبار میں اُنپر بحث کرنا اور بعض ضروری مضامین کا ترجمہ انگریزی میں کرنا اگر کبھی اپنے اخبار میں اور کبھی کسی معتبر انگریزی اخبار میں شائع کرانا، ہفتہ میں دو بار اخبار کے پروفون کا خود صحیح کرنا، اپنی یاد دستوں کی کتابیں۔ جو فروخت کی غرض سے مدرسہ کے فائدہ کے لئے ہمیشہ چھپتی رہتی تھیں یا کانفرنس کی رپورٹیں اور لکچر یا کالج کا بجٹ یا رپورٹ سالانہ یا ٹرسٹیوں کے اجلاس کی رودادیں۔ غرض کہ جو کچھ اُنکے اہتمام میں چھپتا تھا سب کی کاپیوں یا پروفون کا اصل سے خود مقابلہ کرنا اور آپ اُنکی تصحیح کرنا اور اپنے سامنے اُنکے پیکٹ بنوا کر مطبع میں بھیجنا، مدرسہ کی تجارتی کتابوں کے خود اشتہار چھپوا کر اُنکو آپ فروخت کرنا اور اُنکا حساب کتاب رکھنا، کالج کے متعلق تمام حساب کتاب کے رجسٹرون، بجٹون، رپورٹون

جو ایسا ہی نیند کا خمار ہوا تو وہین کرسی یا تکیہ کے سہارے سے ذرا کمر سیدھی کر لیتے تھے ، اگر اس میں کبھی آنکھ لگ گئی تو ذرا سی آہٹ سے فوراً اٹھل جاتی تھی اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے تھے ۔ چونکہ بڑھاپے اور زیادہ فریبی کے سبب وہ اپنے میں پھرتی اور چالاک کی قابلیت نہیں دیکھتے تھے اسلئے جن کاموں میں پھرتی کی ضرورت ہوتی تھی اُنکے لئے بہت پہلے سے تیار ہو جاتے تھے ۔ ریل پر وقت سے دو دو گھنٹے پہلے جا بیٹھتے تھے ، کسی ڈنریا دعوت یا جلسہ یا دربار میں جانا ہوتا تو وقت معین سے بہت پہلے تیار ہو بیٹھتے تھے ، کسی حاکم اعلیٰ کو ایڈریس دینی ہوتی تھی تو دس دس بارہ بارہ روز پہلے سب کام لیس کر رکھتے تھے ؛ غرض کہ ہر ایک کام کی تیاری وہ اُس وقت سے شروع کرتے تھے جب کسی کو اُس کا سان گمان بھی نہ ہوتا تھا ۔

تصنیف و تالیف کے علاوہ جو اُن کا ایک لازمی مشغلہ تھا۔ مدرسہ کے متعلق تمام اہم اور ضروری کام یا تو وہ خود اپنی ذات سے کرتے تھے یا اپنی نگرانی میں اپنے پیشہ ستون لیتے تھے مثلاً مدرسہ کی سالانہ آمدنی اور خرچ کا بجٹ بنانا اور اُس کا خلاصہ گورنمنٹ میں بھیجنے کے لئے مرتب کرنا ، سالانہ کی رپورٹ لکھنی ، ہر دوسرے تیسرے مہینے اجنڈا تیار کرنا اور اُس کے تمام کاغذات چھپوا کر ٹرسٹیوں کے پاس بھیجنے اور اُنکو ووٹ بھیجنے کے لئے اکثر کئی کئی دفعہ تقاضے کے خط لکھنے ، پھر ہر ایک جلسہ کی روزنامہ لکھ کر اور چھپوا کر ٹرسٹیوں کی پاس بھیجی ، گورنمنٹ سے ، سررشتہ تعلیم سے ، طالب علموں کے مربیوں سے ، بینک سے ، اور ٹرسٹیوں سے وقتاً فوقتاً کتابت کرنا ، روزانہ آمدنی اور خرچ کو روزنامہ میں درج کرنا ، عمارتوں کی نقشہ تجویز کرنے اور اُنکے موافق ہر ایک عمارت کو اپنی نگرانی میں تیار کرانا ، اُنکے لئے ہر قسم کا سامان

لانے کے لئے مختلف اوقات میں ریلوے سٹیشن پر سواری بھیجتے تھے اور جب تک ان کا قیام رہتا تھا ہر وقت ان کا خیال رکھتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ جو مستعدی اور بہت اور ہر ایک بات کی خبر داری اور ہر ایک فرض کی نگہداشت اس شخص میں بڑھاپے میں دیکھی گئی ہو وہ کسی توانا اور تندرست نوجوان میں بھی نہیں پائی جاتی اور یہ کہنا کچھ مبالغہ میں داخل نہیں ہے کہ ایک محض ناواقف شخص بھی صرف اُس کے روزمرہ کے کام دیکھ کر اس قدر ضرور سمجھ سکتا تھا کہ اس شخص کی خلقت معمولی آدمیوں کی خلقت سے جداگانہ تھی۔ متنبی نے کیا خوب کہا ہے

وَإِذَا كَانَتْ النَّفُوسُ كِبَارًا تَعِيبَتْ فِي مُرَادِهَا الْأَجْسَادَ

(یعنی جب نفوس انسانی اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں تو اعضائے انسانی اُن کے ارادے پورے کرنے کے لئے تھک جاتے ہیں)

باوجود اس قدر مصروفیت اور کاموں کی کثرت کے اُن کی زندہ دلی نہایت تعجب خیز تھی۔ وہ سنان تک ممکن ہوتا تھا رنج اور افسردگی کو کبھی پاس نہ آنے دیتے تھے اور خانگی بکھیروں اور خرشتوں سے تا بمقدور الگ تھلگ رہتے تھے۔ جس طرح اُن کے باپ گھر کے تعلقات سے آزاد تھے اسی طرح سرسید اپنے پرایوٹ معاملات سے بہت ہی کم سروکار رکھتے تھے اور یہی اثر اُن کی اولاد میں پایا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قومی کاموں کے متعلق کوئی کیسا ہی معقول عذر کہے اور مکر وہ بات خانگی کے سبب کیسی ہی مجبوری بیان کرے وہ ہرگز نہ سنتے تھے اور جب تک سب کام چھوڑ کر اُن کی فرمائش پوری نہ کی جاتی تھی وہ کسی عذر کو قابلِ سماعت نہ سمجھتے تھے۔ وہ ہمیشہ جب کام سے خالی ہوتے تھے ہنسی دل لگی اور دوستوں کی صحبت سے اپنے دل کو خوش کرتے تھے۔ بچوں، بوڑھوں، جوانوں سے، دوستوں سے، ملازموں سے، انگریزوں سے اور ہندوستانیوں سے بشرطیکہ

اور روئدادوں وغیرہ کی اور کالج لائبریری کے متعلق اور نیٹیل زبانوں کی کتابوں کی خریدیں
 بندھوا کر الماریوں میں اپنے سامنے احتیاط سے رکھواتا، یورپین حاکم اور افسر ارکان سلطنت
 جو اکثر کالج کے ملاحظہ کو آتے رہتے تھے انکی مدارات اور استقبال و مشایعت کا خود انتظام کرنا،
 انکے دربار کے لئے ہال کو خاص اپنے اہتمام میں آراستہ کرانا، انکے واسطے ایڈریس تیار کرنا اور
 اُسکو انگریزی میں ترجمہ کرنا اور چھپوانا، اور پھر ایڈریس اور اُسکا جواب اور تمام جلسہ کی کارروائی
 کو اخبار کے ذریعہ سے شائع کرنا، محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر خواہ اُسکا اجلاس
 علیگڑھ میں ہو اور خواہ کسی دوسرے شہر میں۔ سب کام چھوڑ کر آٹھ دس روز تک باہر اُسکی
 کارروائی اور انتظام میں ہر وقت مصروف رہنا، یہ اور اسی قسم کے بے شمار چھوٹے بڑے کام
 یہ شخص اس ضعیفی کے زمانہ میں سرانجام کرتا تھا۔ اگر ان تمام کاموں سے قطع نظر کیجائے اور
 صرف چندہ جمع کرنے اور اُسکی تدبیریں سوچنے ہی کے کام پر غور کیجائے تو یہی ایک ایسا کام تھا
 کہ اگر دوسرا شخص اسی کام کو اپنے ذمے لے لیتا تو پھر وہ اور کسی کام کا نہیں رہ سکتا تھا۔ تعلیمات
 کا کام بھی کوئی آسان کام نہ تھا جسکے لئے کم سے کم ایک لائق اور سیر رکھنے کی ضرورت تھی، مگر
 سرید نے یہ بوجھ بھی اپنے سر دھریا تھا یہاں تک کہ سات آٹھ لاکھ کی عمارت صرف اپنی تجویز
 اور اپنے اہتمام سے بنوا ڈالی۔

باوجود ان تمام بکھیروں کے وہ اپنی خاص طرز کی تصنیف کا نہایت کٹھن اور دشوار گزار
 مرحلہ بھی انھیں مشغلوں کے ضمن میں طے کرتے تھے۔ دوستوں کے بے شمار خطوں کی جواب
 اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، مہانوں کی حالت کے موافق انکی آسائش کا انتظام کرتے تھے، انکے

سید صاحب نے کہا میرے گلے کی رسولی نے میری وجاہت کو بگاڑ دیا ہے اس واسطے میں بھی یہ صورت ہو گیا ہوں، پس میرا خط کیونکر اچھا ہو سکتا ہے۔“

”ایک ن سید صاحب نے حافظ جی سے کہا بھلا صاحب! اگر تم بادشاہ ہو جاؤ تو مجھے کیا عہدہ دو؟ حافظ جی نے وہ تمام سلوک جو سید صاحب اُنکے ساتھ کرتے تھے بیان کئے کہ میں آپ کی بڑی خاطر کروں، دو نو وقت آپ کو اپنے ساتھ کھانا کھلاؤں، رات کو آپ کا پلنگ اپنے پلنگ کے برابر بچھاؤں، اور چپان کروں اور چین کروں، سید صاحب نے کہا ان باتوں کو جانے دو، یہ بتاؤ کہ مجھے عہدہ کیا دو؟ حافظ جی نے درار و کھی صورت بنا کر کہا حضرت! میں مجبور ہوں، چونکہ آپ کا خط اچھا نہیں اسلئے کوئی عہدہ نہ دے سکتا گا۔ سید صاحب اور ہم سب گریہ کر مقررہ سنکر پھڑک گئے اور بہت دیر تک ہنستے رہے۔“ غرض کہ سر سید نے تا بمقدور کبھی غم اور رنج کو پاس نہیں آنے دیا، شہر میں، بیرونجات میں، آبادی میں، جنگل میں، جہان کین ہوئے انھوں نے اپنی خوشی اور دل لگی کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور مہیا کر لیا۔

وہ اپنی باتوں سے نہ صرف بڑوں کو بلکہ بچوں کو بھی تسخیر کر لیتے تھے، یہاں تک کہ جو حشمت بچوں کو بڑے بوڑھوں کی صحبت سے ہوتی تھی وہ انہیں باقی نہ رہتی تھی۔ انھوں نے اپنے بھتیجے کو، اپنے بیٹوں کو اور اخیر عمر میں پوتے کو اپنے سے ایسا مانوس رکھا کہ مائیں بھی بچوں کو اپنے ساتھ ایسا مانوس نہیں رکھ سکتیں، انکا بڑاؤ ان سب کے ساتھ بالکل ایسا رہا جیسا یار دوستوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے۔ مراد آباد میں اُنکے بھتیجے کو کنکڑے لڑانے کا شوق حد زیادہ بڑھ گیا سر سید چاہتے تھے کہ یہ دھت جاتی رہی مگر اسپر جبر کرنا گوارا نہ تھا، آخر لاچار ہو کر ایک دن کہا کہ ابھی آج تمہاری پتنگ بازی کی ہم بھی سیر دیکھینگے، شام کو جب کہ بیچ پڑ رہا تھا اور دو نو طرف سے

دل ملا ہوا ہو اور کسی طرح کی مغایرت نہ ہو۔ ہنسی اور چل کے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ یہی زندہ دلی تھی جو انہی ایسی سخت محنت کراتی تھی اور تھکان اور ماندگی اور طالع کلال کو کبھی پاس نہ آؤ دیتی تھی اگرچہ جس زمانہ میں ہم نے انکو دیکھا ہے اُنکی ہنسی اور چل صرف باتوں میں رہی تھی مگر۔ جیسا کہ سنا گیا ہے۔ ابتدا میں اُنکی شوخیان صرف بات چیت ہی میں محدود نہ تھیں۔ کرنل گریہم جو اُنکے قدیم دوست تھے لکھتے ہیں کہ ”وہ اس قدر خوش طبعی اور مسخر کرتا ہے جب قدر کہ کوئی آدمی کر سکتا ہے“ کبھی رات کے وقت ایک سی سے سانپ سانپ لہکر حاضرین کو ڈرا دینا، کبھی نہایت بھیانک اور ڈراؤنی آواز سے اُونگھتون کو چونکا دینا، کبھی کسی سوتے ہوئے کی چھاتی پر چڑھ کر اُس پر اپنا سارا بوجھ ڈال دینا اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں جنہیں سے بعضی بیان نہیں کیا جاسکتیں اُنکے دوستوں سے سنی گئی ہیں۔

بعض اوقات اُنکے ماتحت یا ملازم جن سے بے تکلفی تھی اُنکو ایسا جواب دیتے تھے جس سے انہیں شرمندہ ہونا چاہیے تھا مگر وہ کبھی برا نہ مانتے تھے بلکہ خوب تھقے لگاتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ منشی غلام نبی خان مرحوم نے اس امر کے متعلق ایک دلچسپ نقل بیان کی، وہ کہتے تھے کہ ”حافظ عبدالرحمن جو ۴۵ برس سید صاحب کے رفیق رہے وہ نہایت کمین بھی اُنکے ساتھ تھے، اگرچہ وہ سرکاری نوکر تھے مگر سید صاحب قلتِ تنخواہ کے سبب اُنکو اپنے پاس رکھتے تھے، اُن سے اکثر ہنسی چمک کی باتیں ہوتی رہتی تھیں، حافظ جی اپنی ترقی کے لئے اکثر کما کرتے مگر چونکہ ترقی کی گنجائش نہ تھی سید صاحب ہنسی سے یہ کھکڑال دیتے کہ تمہارا خطا چھانہیں اور نہ کبھی اچھا ہو سکتا ہے کیونکہ تم بد صورت ہو اور بد صورت کبھی خوشنویس نہیں ہو سکتا۔ ایک دن حافظ جی نے کہا آپ تو ماشاء اللہ بہت وجیہ ہیں، آپ کا خط کیوں چھانہیں؟

زمانہ کی ضرورتوں نے اول مذہبی تقلید سے نجات دی جس سے اُنکو مذہبی مشکلات میں اپنی طبیعت پر زور ڈالنے اور اپنی رے اور سمجھ پر تکیہ کرنے کی ضرورت اور عادت ہوئی، پھر رفتہ رفتہ یہ عادت اُنکی طبیعت ثانی ہو گئی اور ہر قسم کے سوالات پر غور کرنا اور سوچنا اور اپنی مستقل رائے قائم کرنا اُنکا وتیرہ ہو گیا اور اس طرح اُنکے قواسم عقلیہ بتدریج جلا پاتے رہے۔

سرید کی غیر معمولی ذہانت اور بے نظیر جنینس کا سب سے بڑا ثبوت اُنکی مذہبی تحقیقات یا وہ تدبیریں ہیں جو اُنہوں نے مدرستہ العلوم کے قائم کرنے اور اُسکو ترقی دینے میں ظاہر ہوئیں اور جنکا ذکر اس کتاب میں بقدر ضرورت اپنے اپنے موقع پر ہو چکا ہے، اور اگر کسی کو اُنکی عالی دماغی کی مجسم تصویر دیکھنی ہو تو سید محمود کو دیکھ لینا کافی ہے جنکی نسبت مسٹر اسٹولی سٹوکس لیگل ممبر ایجس لیٹف کونسل ویسٹ انڈیز کے کونسل میں یہ الفاظ کہے تھے ”نہایت نامور باپ کا نامور بیٹا“ ہم بیان صرف اُنکے بعض لطیف خیالات کا ذکر کرتے ہیں جنسے اُنکی طبیعت میں ایک خاص مناسبت فنون لطیفہ کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

۱۔ یہ وہ مشہور اور نامور لیگل ممبر کونسل قانونی ویسٹ انڈیز کے کونسل ہند ہے جو ۲۰ برس کونسل ہند میں اول سکرٹری اور پھر قانونی ممبر رہا۔ ایکٹھارٹھین کوڈ آف ۱۸۶۰ میں اُنکا یہ حقہ درج ہے کہ ”محکو امتعانت کے زیادہ ذریعے ہائی کورٹ کے ججوں کے فیصلے ہوئے ہیں جو آئین لارڈ پورٹ میں ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۷ء تک چھے ہیں“ یہ ایسے فیصلے ہیں جو اہل ہند کے رسوم و خیالات ہی پر روشنی نہیں ڈالتے بلکہ عموماً (اگر میرا یہ کہنا گستاخی نہ ہو) اپنے لاجل استدلال اور طبیعت کے کٹاوتے قابل تعریف ہیں۔ اور انہیں سے کسی فیصلہ کے پڑھنے سے بہ نسبت اُن فیصلوں کے زیادہ لطف اور زیادہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا جو موتو سامی ایبار ہندو، اور سید محمود مسلمان کے ہیں۔ جن قوموں میں ایسے مقنن پیدا ہوئے ہوں اُنکے لئے کوئی قانونی اصول ایسا ہار یک اور دقیق نہیں ہو سکتا جو اُنکو دشوار معلوم ہو اور کوئی طریقہ عمل در آمد قانونی ایسا پیچیدہ نہیں ہو سکتا کہ اُنکے فہم سے باہر ہو ۱۲

ڈھیل دی جا رہی تھی۔ آپ بھی وہاں پہنچے اور ہاتھ بڑھا کر چلتی دُور کو تھام لیا اور جب پیچ کٹ گیا تو پچار پچار کے کئی دفعہ کہا ”ہم ہمارے ہم ہمارے“ یہ دیکھ کر فریق ثانی کا جوش کم ہو گیا، دوسرے دن کوئی اُدھر سے پتنگ لڑاؤ کو نہ اٹھا اور پتنگ بازی کا خاتمہ ہوا۔

سرید کی ذہانت بھی جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ اُنکی لگاتار محنت اور متصل دماغی ریاضت کا ایک نتیجہ تھا۔ ایک یورپین مصنف نے لکھا ہے کہ ”میں ایسے بہت سے لوگوں سے واقف ہوں جو بڑے ذہین مشہور تھے لیکن آخر کو یہ معلوم ہوا کہ وہ اہل میں بڑے محنتی تھے“ سرید کی ذہانت کی نسبت ایک انگریز نے سرید محمود صاحب لکھا کہ ”تمہارے باپ کا دماغ کیا ہے گویا ٹاپ کے حرفوں کی الماری ہے، جس طرح اُس الماری میں جس حرف کی ضرورت ہوتی ہے وہ فوراً مل جاتا ہے اسی طرح ہر سوال کا جواب اُسکے دماغ میں ہر وقت موجود رہتا ہے“ فی الواقع سرید کے انتقالِ فہنی کا یہی حال تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو وہ ہر ایک ضروری سوال پر جو ملک میں دائروں میں ہوتے تھے۔ بجائے خود غور کر کے اُسکی نسبت ایک پختہ رائے قائم کر لیتے تھے۔ اسلئے جب وہ سوال معرض بحث میں آتا تو اُنکو اُسکا جواب دینے میں زیادہ تامل کرنا نہیں پڑتا تھا اور یا یہ کہ دماغی ریاضت اور برابر غور فکر کرنے کی عادت نے انہیں یہ ملکہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اکثر سوالات کی نسبت ادنیٰ تامل سے ایک سنجیدہ اور معقول اُسے ظاہر کر سکتے تھے۔

بہر حال یہ تعلم نتیجے دائمی غور و فکر اور نور فطرت کے روشن رکھنے اور آپ اپنی تعلیم کرنے کے تھے۔ تقلید کی عادت۔ خواہ امور مذہبی میں ہو، خواہ مسائل علمی میں اور خواہ معاملات دنیوی میں۔ انسان کو کبھی اپنے اوپر بھروسا اور اعتماد کرنے نہیں دیتی۔ وہ ہمیشہ تجویز کی طرح۔ جو چلتے ہیں اُوروں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ ہر معاملہ میں دوسروں کا مونہ تکتا رہتا ہے۔ سرید کو

بنوایا تھا۔ اس بکس پر ان جانوروں کی تصویریں کھجوائی گئی تھیں جن کے نام پر ذمہ جالبیت میں عرب کے نام رکھے جاتے تھے اور اسلئے عرب کے بہت سے قبیلے انھیں ناموں سے شہوتھی جیسے قریش یا قریش (ویل مچلی) ثعلب (لومڑی) کلب (کتا) حمل (اونٹ) اسد (شیر) ذئب (بھڑیا) وغیرہ وغیرہ۔ پھر ان سب تصویروں کے مونہ سے بجائے سانس کے ایک ایک تار نکالا گیا تھا اور یہ سب تار ایک مقام پر جا کر منتہی ہوئے تھے جہاں انگریزی الفاظ میں یہ مطلب ادا کیا گیا تھا کہ ”ہم سب قبیلے متفق اللفظ سر جان اسٹریچی کا شکریہ تہ دل سے ادا کرتے ہیں“ اور اس سے گویا تمام مسلمانوں کی شکر گزاری کا اظہار مقصود تھا۔

اسی قبیل سے کھجور اور اونٹ کی تصویر ہے جو سب سے پہلے سرسید نے انگریزی خطبات احمدیہ میں ہر ایک خطبہ کے سرے پر ولایت میں چھپوائی تھی اور جو عرب کی خصوصیات میں شمار ہونے لے سبب ایک علامت دین اسلام کی قرار دی گئی تھی۔ اس میں سے کھجور کی علامت ہم نے پچھلے دنوں میں ایک چینی کی تشتری پر بنی ہوئی دیکھی تھی جس سے خیال ہوتا تھا کہ شاید اسی کتاب کو دیکھ کر ولایت کے کسی کارخانہ دار نے یہ مارک ان ظروف کے لئے اختیار کیا ہے جو مالک عرب میں بھیجے جاتے ہیں۔ اور اسی قبیل کا وہ نشان ہے جس میں ہلال اور صلیب کو جو تاج قیصری میں بنی ہوئی ہے ایک جگہ جمع کر کے مدرستہ العلوم کے کتبوں اور اسکے کتب خانہ کی کتابوں پر ثبت کیا گیا ہے اور جس سے اسلام اور کریمینی کی مصالحت اور تاج قیصری کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری کا اظہار مقصود ہے۔

ایک اور مثال سرسید کے انتقال فرمائی کی سنہ نبوی کا بجائے سنہ ہجری کے قرار دینا

ہم پہلے کہ چکے ہیں کہ بھلا اُن بے شمار تدبیروں کے۔ جو چہ وصول کرنے کے لئے اُنھوں نے
 وقتاً فوقتاً اختیار کیں۔ ایک تدبیر نواب مختار الملک مرحوم کی خدمت میں اُس تصویر کا بھیجنا تھا جس میں
 مسلمانوں کی حالت کو ایک تباہ شدہ جہاز کی صورت میں ظاہر کیا گیا تھا اور مدرسۃ العلوم کو ایک
 کشتی کی شکل میں دکھایا تھا جو جہاز والوں کو اُس تباہی سے نکالنے کے لئے جہاز کی طرف آرہی تھی۔
 اس تصویر کی مفصل کیفیت پہلے حصہ میں بیان ہو چکی ہے، بیان صرف یہ جتنا ہے کہ سرسید کا ذہن
 کیونکر اس خیال کی طرف منتقل ہوا؟ اُنھیں دنوں میں مدرسۃ العلوم پر ایک نظم لکھی گئی تھی
 جس میں ایک یہ شعر بھی تھا

دور سے امید نے جھلکی سی اک دکھلائی ہے ایک کشتی ڈوبتے بڑے کو لینے آئی ہے

ظاہر اس سرسید کو اس تصویر کے بنوانے کا خیال اسی شعر کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا کیونکہ یہ نظم اُس تصویر
 کے بھیجنے سے پہلے شائع ہو چکی تھی مگر شاعر کا خیال ایک عقیم اور غیر منتج خیال تھا جس میں اس سے
 زیادہ کوئی کرشمہ نہ تھا کہ ایک معقول شے (یعنی تعلیم) کو ایک محسوس چیز (یعنی سفینہ نجات)
 کے ساتھ تشبیہ دی گئی تھی۔ لیکن جو مضمون سرسید نے اُس سے استنباط کیا اُس کا یہ نتیجہ ہوا کہ۔
 جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے۔ نواب مختار الملک کے دل میں۔ جنکو اُس وقت تک قومی معاملات
 چندان دلچسپی نہ تھی۔ کالج کی محبت کا بیج بویا گیا جو رفتہ رفتہ ایک گھنا اور سرسبز اور
 سایہ دار درخت بن گیا۔

اسی قسم کی دوسری مثال وہ بکس تھا جس میں سر جان اسٹریچی کو ہندوستان سے
 رخصت ہوتے وقت کالج کمیٹی کی طرف سے ایڈریس دیا گیا تھا اور جسکو سرسید نے خاص اپنی تجویز سے

مگر سنہ ۱۹۶۰ء اور سنہ ۱۹۶۱ء میں جو سرکار گورنمنٹ نے اُس غلطی کے تدارک کے لئے جاری کئے اُن سے خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اُسی تحقیقات کا نتیجہ تھا جو سرسید نے تاریخ بجنور میں درج کی تھی۔

اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے اُنکے ذہن کی جوت اور بلند پروازی پائی جاتی ہے مگر بیان بطور نمونہ کے اسی بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اخلاق اور خصائل

سب سے زیادہ گراں وزن اور جامع الفاظ۔ جو کسی کی تعریف میں بولے جاسکتے ہیں اسکے سوا خیال میں نہیں آئے کہ فلاں شخص اعلیٰ درجہ کا دل و دماغ رکھتا ہے لیکن اکثر ان الفاظ کا استعمال اپنے محل پر نہیں ہوتا کیونکہ لیاقت جو دماغ سے علاقہ رکھتی ہے۔ اور نیکی جو دل سے علاقہ رکھتی ہے۔ یہ دونوں اکثر ایک جگہ جمع نہیں ہوتیں۔ مگر سرسید میں جب طرح بعض دیگر متضاد لیاقتیں جمع تھیں اسی طرح اُس کو خدا تعالیٰ نے دل اور دماغ دونوں اعلیٰ درجہ کے عنایت کیے تھے؛ یہاں تک کہ اُسکی نسبت یہ کہنا مشکل تھا کہ اس میں نیکی زیادہ ہے یا عقل۔ لیکن جہاں تک غور کیا جاتا ہے اُسکی رایوں میں تو شاید خطا کی گنجائش ہو مگر اُسکے اخلاق و رذائل سے بالکل پاک معلوم ہوتے تھے۔ اسی لئے مسٹر بک نے اُسکے مرنے کے بعد اپنی اسپیش میں کہا تھا کہ ”گو اُسکی لیاقتیں بہت بڑی تھیں مگر اُسکے اخلاق اُن سے بھی بڑے تھے۔“

ایک حکیم کا قول ہے کہ ”جو شخص بدکاری سے پاک ہو، معاملات میں منصف ہو، بات کا پکا ہو، ماتحتوں پر مہربان ہو، معنی ہو، صاحب استقلال ہو، اور بڑے بڑے کاموں پر دلیری کے ساتھ مستعد ہو وہ شریف ہے۔“

اس تعریف میں اگر فیاضی کی صفت اور بڑھادی جائے تو کچھ شک نہیں کہ وہ سرسید کے حق میں جامع و مانع ہوگی۔ جو اختیار کہ یہ شخص محض اپنی اخلاقی طاقت سے ہزاروں غیر شخصوں کے دلوں پر رکھتا تھا وہ کسی کو اپنے گھر کے آدمیوں پر بھی حاصل نہیں ہوتا۔ جس قدر اُسکے دوست اور ملنے والے تھے

اور تہذیب الاخلاق کا سال۔ ماہ شوال سے شروع کرنا ہے۔ ظاہر اسرید سے پہلے سنہ نبوی کا خیال کسی کے ذہن میں نہیں گذرا۔ جس زمانہ میں کہ سرید آئین اکبری کی تصحیح کرتے تھے اُس میں ایک جگہ سنہ ہجری کی نسبت ابو الفضل کا یہ قول اُنکی نظر سے گذرا تھا کہ ”ازین سنہ بوئے ناکامی سے آید“ یعنی یہ سنہ آنحضرت صلعم اور تمام مہاجرین کی اُن مصائب کو یاد دلاتا ہے جنکے سبب اُنکو وطن مالوف چھوڑنا اور مکہ سے مدینہ کو ہجرت کرنا پڑا۔ اُس زمانہ میں سرید نے ابو الفضل کے اُن الفاظ سے بہت برا مانا تھا اور اُسکے حاشیہ پر قائل کی نسبت لعنت یا اُسکا کوئی مرادف لفظ لکھا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار ابو الفضل کے اُسی بے ادب جملہ سے اُنکے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ تہذیب الاخلاق کا سال تاریخ بعثت سے شروع کیا جائے کیونکہ درحقیقت اسلام میں کوئی واقعہ آنحضرت صلعم کی بعثت سرِ اِپارکت کے برابر عظیم الشان نہیں ہو سکا۔ اگرچہ یہ بعثت نہیں ہے کہ جو سنہ تیرہ سو برس تک مسلمانوں میں متداول رہا ہو اُسکی جگہ کوئی دوسرا سنہ قائم ہو سکے مگر اس نظر سے کہ سنہ نبوی تاریخ بعثت ختم المرسلین کو یاد دلاتا ہو اگر مسلمان کم سے کم سیر اور اسماء الرجال کی کتابوں اور قومی میگزینوں وغیرہ میں سنہ ہجری کے ساتھ سنہ نبوی بھی لکھا کریں تو بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح سب سے پہلے سرید ہی نے اُس غلطی کو محسوس کیا تھا جو سنہ فضلی اور سنہ عملی میں فرق نہ کرنے سے سرکاری دفاتروں میں ہمیشہ سے چلی آتی تھی اور جیسا کہ ہم پہلے حصہ باب ۲ میں بیان کر چکے ہیں۔ تاریخ بخور میں اُنھوں نے اُن مشکلات کو گورنمنٹ پرنٹر ظاہر کیا تھا جو اس غلطی سے لازم آتی تھیں۔ اگرچہ وہ تاریخ ۱۳۵۷ھ کے ہنگامہ میں تلف ہوئی تھی

تمتوں کے سوا اُسکا دامن اخیر دم تک ہر ایک داغ اور دھبے سے پاک رہا۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد اور نواب محسن الملک نے ٹھیک لکھا تھا کہ ”علم بالانساب اگرچہ علم مظنون ہے مگر اس شخص کے بارے میں قوم اُسکے افعال اُسکے نسب کی تصدیق کرتے ہیں“

اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ سرسید میں جہان بہت سی خوبیاں تھیں انھیں کچھ ساتھ کچھ کچھ کمزوریاں بھی پائی جاتی تھیں مگر جانتا تھا کہ ہمکو معلوم ہے وہ اُن عیوب سے جو انسان کی خاست اور ذرات پر دلالت کرتے ہیں یقیناً پاک تھا۔ اُسکے اخلاق کا اُسکے ہمنشینوں اور حلیوں پر اثر پڑتا تھا، اُسکو دیکھ کر قومی خدمات کا جوش دلون میں پیدا ہوتا تھا، اُسکی جفاکشی اور مستعدی اورون کو جفاکش اور مستعد بناتی تھی، اُسکی سچائی اور ہمت اور استقلال عمدہ ترین ناصح تھے جو اُسکی پیروی کرنے کی ترغیب دیتے تھے اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو وہ اپنے ہائی گیر کمر سے قوم میں عمدہ اخلاق کا بیج بو گیا ہے۔

اگرچہ سرسید کی زندگی کے واقعات سے جو اس کتاب میں بیان کئے گئے ہیں۔ ۱۔ نئے اخلاق کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے مگر بیان ہم اُن خاص خصلتوں کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کرنا چاہتے ہیں جنکو اُنکی کامیابی میں بہت بڑا دخل معلوم ہوتا ہے اور جو اُنکے تمام افعال و حرکات و سکنات میں ایسی نمایاں تھیں کہ اُن سے شاید ہی اُنکا کوئی دوست اور ملنے والا انکار کر سکے۔

اولاً رستبازی اور وہ تمام اوصاف جو ایک رستباز آدمی میں ہونے ضرور ہیں۔

جیسے صدق مروت، حمت، دلیری اور آزادی وغیرہ۔ اس شخص کی خصوصیات میں سے تھے۔

کسی حکیم کا قول ہے کہ ”اگر سچائی کسی مجسم شکل میں ظاہر ہوتی تو ضرور شیر کی صورت میں ظاہر ہوتی“ اس قول

سب اُسکے مذاح اور تناخوان تھے، سب اُس سے محبت رکھتے تھے، سب کو اُس پر اعتبار تھا اور سب کو اُس کا دنیا سے اٹھ جانا ایسا ہی شاق گذرتا تھا جیسے کسی خاندان کے ممبرن کو اپنے مرنے اور سر پرست کا مرجان شاق گذرتا ہو۔ اس سے زیادہ کسی شخص کے حسن اخلاق کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ سب سے بڑی دلیل اُسکی اخلاقی عظمت کی وہ غیر معمولی کامیابی تھی جو اُس کو اپنے مقاصد میں ہوئی، کیونکہ یاقین کیسی ہی اعلیٰ درجہ کی ہون جب تک اُنکے ساتھ اعلیٰ درجہ اخلاق نہ ہوں کچھ کام نہیں آسکتیں۔ اُسے تقریباً ساٹھ برس اپنی عمر کے۔ پہلک لائف میں بسر کئے جنہیں سے اخیر کے تیس برس ایسی حالت میں گذرے کہ ایک زمانہ اُسکی عیب جوئی کی گھات میں رہا، اور دوست اور دشمن سب اُسکے ادا کرنے اور دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا، مخالفین کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ کوئی ایسی بات باتھ آئے جس سے سرسید کا اعتبار لوگوں کے دلوں سے جاتا رہے اور مدرسہ کی اعانت منقطع ہو جائے باوجود اُسکے کسی کو ایسا موقع نہیں ملا کہ اُسکے کیر کڑ پر کوئی معقول گرفت کرتا یا اُسکے چال چلن میں کوئی فیہ نکالتا۔ سوا اُسکے کہ اُس کو کافر و ملحد و نیچری و کریشان کہہ کر دل ٹھنڈا کیا گیا اور اُس پر وہ الزام لگائے گئے جو کا علم خدا کے سوا کسی کو نہ تھا۔ کسی سے کچھ بن نہ آیا۔ جیسا کہ کہا گیا ہے رباعی

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب دگناہ کافر کہا داعظ نے اُنہیں اور گمراہ

جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

اگرچہ انسان کے اخلاق کی تھاہ دریافت کرنی نہایت مشکل ہے مگر معاملات کی کسوٹی اور مخالفوں کی چھان بین ایسے دو معیار ہیں کہ سچ کو جھوٹ سے اور گھرے کو کھوٹے سے جدا کئے بغیر نہیں ہستے۔ اگر سرسید کی سچائی میں رائی برابر بھی فرق پایا جاتا تو مخالف اُس کو پرہت بنا دیتے مگر چند صریح

مقدم سچائی ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے آپ کو سچا جانیں۔ اور یہ سچائی جیسی کہ قول سے متعلق ہو ویسی ہی فعل سے بھی متعلق ہے، ایسی ہی پراٹھ حطوط سے اور ایسی ہی اخبار سے “

اُنکے ایک نہایت عزیز اور خالص دوست کو ایک زمانہ میں ایسے افسر سے سابقہ پڑا تھا جو نماز پڑھنے پر تعرض کرتا تھا اور اس امر کی اطلاع اُنھوں نے سرسید کو بھی کی تھی۔ اُنکو اسی باب میں سید صاحب لکھتے ہیں ”و بھائی..... کل میں سارے دن متروک رہا، کیونکہ تمہارا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ آج خط آیا اور حال معلوم ہوا۔ گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا، اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا“ دو دو اکٹھی بھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں، ریل میں جتنا سفر ہو مجھ سے ادا نہیں ہو سکتی؛ یہ سب باتیں مجھ میں ہیں، اور نالایقی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے، مگر تنہا اس معاملہ میں جو پیش کیا۔ نہایت لچر بنا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے اسکو ہم اپنی شامت اعمال سے جس خرابی سے ہو۔ ادا کریں یا قضا کریں، لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو اسکا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا، یہ بات سنی بھی نہیں جاسکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جسکے بچنے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائیگا۔ مگر تو پہلے ہی خود اپنی شامت اعمال سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی اور جیسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر لچلچاتا، اور گر گڑا، اور حضور رحمت ہی دین، تنخواہ کاٹ لین، کہنا دہیات تھا تڑاق سانی استعفا دے دینا تھا، صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری نہ میسر ہوتی، فائدے مر جاتے نہایت اچھا ہوتا والسلام“

کی تصدیق جیسی سرسید کو دیکھ کر ہوتی تھی شاید ہی کسی دوسری صورت سے ہوتی ہو۔ اُسے محض اپنی راستبازی کی بدولت ایک عالم کو اپنا مخالف بنایا مگر جس بات کو سچ جانا اُسکے کہنے میں کبھی تامل نہیں کیا۔ جس بات پر دل سے یقین کر لیا اُسی کے موافق کہا اور ویسا ہی کیا۔ جس بات میں ملک یا قوم کی بھلائی سمجھی اُسکے کہنے اور کرنے میں کسی کو مخالفت کی کچھ پروا نہیں کی۔ یہ ممکن ہو کہ سرسید کسی بات کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو مگر جہاں تک کہ اُنکی طبیعت اور جبلت کا اندازہ ہو سکتا تھا یہ بات نہایت مستبعد معلوم ہوتی تھی کہ انھوں نے اپنے کائنات کے خلاف کوئی کام کیا ہو۔ وہ جب کوئی بات کسی اپنے دوست سے سچائی کے خلاف سرزد ہوتی دیکھتے تھے تو اُنکو نہایت رنج ہوتا تھا اور اکثر وہ اُسکو متنبہ کئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ اُنکا ایک دوست جو اخبار کا اڈیٹر تھا اُسکے اخبار میں چند خط ایک عورت کے نام سے چھپے تھے، جب وہ پرچہ سرسید کی نظر سے گزرا تو انھوں نے اُسکو لکھا کہ ”کیا آپ کو یقین دلی ہے کہ وہ خط درحقیقت کسی عورت کے لکھے ہوئے ہیں؟ اگر ایسا یقین نہیں ہے تو کیا یہ کائنات کے برخلاف نہیں ہے کہ جس بات کو تم صحیح نہیں سمجھتے اُسکو بطور سچ کے ظاہر کر دے؟ میری نصیحت یہ ہے کہ ہر ایک کام میں تم اپنے دل کو ٹٹولو کہ جو کچھ تم کہتے ہو یا کرتے ہو آپ کا دل اسکو سچ جانتا ہو یا نہیں؟ اگر نہیں جانتا اور اُسکو سچ کے طور پر بیان کیا تو خلاف کائنات بلکہ خلاف ایمان داری کے کام کیا۔ آپ مجھکو معاف کیجیے گا، بہ سبب اسکے کہ آپ سے محبت ہے یہ کڑی نصیحت کی ہے۔“

جب اُنکے اڈیٹر دوست نے اس نصیحت کا شکریہ لکھا تو اسکا جواب انھوں نے اس طرح لکھا ہے ”میں اس خیال سے کہ آپ میری کسی تحریک یا برائے مانینگے۔ جو میرے دل میں آتا ہے لکھ بھیجتا ہوں، خصوصاً اپنے خاص دوستوں کی نسبت میری خواہش ہے کہ ہر اخلاق میں وہ اعلیٰ درجہ پر ہوں، اور ہر اخلاق سے

بیان کئے ہیں اسپر انکو خود یقین نہیں ہے بلکہ صرف یہ مقصود ہے کہ قرآن پر سائنس کی روش کوئی اعتراض وارد نہ ہو۔ یہ حال سرسید کو بھی معلوم ہوا، انھوں نے نہایت جوش میں آکر کہا کہ ”اگر دین اسلام کے حق ہونے میں مجھے ذرہ برابر بھی شک ہوتا تو میں فوراً اسلام کو ترک کر دیتا“ وہ سید محمد علی خان کو ایک خط میں لکھتے ہیں ”میں سچ اپنے دل کا حال لکھتا ہوں، اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقات حقیقت اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا“

اُس نے اپنی راستی اور صاف گوئی سے صرف اُن مسلمانوں ہی کو مخالف نہیں بنایا جو پُرانے خیالات رکھتے تھے اور جسے کسی طرح موافقت کی امید نہ تھی بلکہ جو بات اُس کو حق معلوم ہوئی اُس کے کہنے میں کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ دنیا میں کوئی دوسرا شخص بھی اس بات میں سیر ساتھ اتفاق کر نہیو لایا ہے یا نہیں۔ نیشنل کانگریس کے خلاف لکچر دینے سے پہلے تمام تعلیم یافتہ ہندو بنگالہ سے کشمیر تک سرسید کو ملک کا سچا خیر خواہ جانتے تھے، اُنکی نہایت تعریف کرتے تھے، مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ اُنکی قدر کرتے تھے، اخباروں میں اُنکی نسبت مدحیہ آرٹیکل چھاپتے تھے، اپنی قومی مجلسوں کی طرف سے اُنکے سامنے ایڈریس پیش کرتے تھے، پبلک ایسیچون میں اُنکا ذکر خیر کرتے تھے، سرسید کو معلوم تھا کہ اگر کانگریس کے خلاف ایک حرف بھی کہا تو کم سے کم تعلیم یافتہ ہندو قاطبہ مخالف ہو جائیں گے۔ مگر جب اُنکو پختہ یقین ہو گیا کہ کانگریس کی اکثر خواہشیں ناممکن الوقوع اور خاص کر مسلمانوں کے حق میں مضر ہیں اور مسلمانوں کا اُس میں شریک ہونا بالکل خطرات کا باعث ہوگا، انھوں نے نہایت زور شور سے مسلمانوں کو اُسکی شرکت سے روکا اور کانگریس میں گروہ کی ناراضی کا کچھ خیال نہ کیا۔ بنگالیوں نے اُنکو خود غرض اور انگریزوں کا

سرسید نے ایک موقع پر دہلی کے ایک نہایت مقدس عالم سے - جو اپنے شاگردوں اور معتقدوں کو رفع یدین کی تاکید کرتے تھے مگر خود کبھی ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے - کہا کہ ”حضرت نہایت تعجب کی بات ہے کہ آپ باوجود مقتداۓ دین ہونے کے صرف طعن و ملامت کے خون سے جس بات کو دل سے حق جانتے ہیں اُسکے موافق کبھی عمل نہیں کرتے ۔ ہم ہزاروں گناہ کرتے ہیں اور دنیا کے مکروہات میں پھنسے ہوئے ہیں ، مگر جو بات حق معلوم ہوتی ہے اُسکے کرنے میں ایک لمحہ توقف نہیں کرتے اور لوگوں کے طعن و ملامت سے نہیں ڈرتے “ سرسید کے کہنے کا اُنکو ایسا اثر ہوا کہ اُنھوں نے اُسی روز جامع مسجد میں جا کر علی الاعلان رفع یدین کیا ، لیکن معلوم نہیں کہ وہ ہمیشہ اُسپر قائم رہے یا نہیں ۔

اس شخص نے اگر سچ پوچھیے تو اپنی آئندہ تخریروں سے اُردو لٹریچر میں سچائی اور آزادی کی بنیاد ڈال دی ۔ اُسے لوگوں کو مجبور کیا کہ سچ بات کے کہنے میں کسی کے طعن و ملامت سے نہ ڈریں ۔ تہذیب الاخلاق کے جاری ہونے سے پہلے جو لوگ عام رائے کے خلاف کوئی بات کسی اخبار میں لکھنی چاہتے تھے اُس میں کبھی اپنا نام ظاہر نہ کرتے تھے ۔ اُسے تہذیب الاخلاق میں مضمون لکھنے کی یہ شرط قرار دی کہ جو لوگ ٹیٹی کے او جھل شکار کھیلنا اور اپنا نام پبلک پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے اُن کا کوئی مضمون اُس میں درج نہ ہوگا ۔ چنانچہ رفتہ رفتہ لوگوں کی جھجک شکنی شروع ہوئی ؛ یہاں تک کہ ہر شخص اپنے نام سے کھلم کھلا اپنے خیالات ظاہر کرنے لگا ۔ اور بڑے بڑے لائق اور ذی علم اور دیندار لوگ صد ہا مضمون عام رائے کے برخلاف اپنے نام سے شایع کرنے لگے ۔

بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ سرسید نے جو قرآن کی تفسیر میں اکثر آیات کے معنی جہلو کے خلاف

اور جب ہندوستان میں واپس آئے تو والد آباد میں ہزارنہ سے ملکر نہیں گئے سیدھے بنارس چلے گئے۔ ہزارنہ کے پرايوٹ سکریٹری کی چٹھی سرسید کے نام ہندس میں پہنچی جس میں لکھا تھا کہ ”نوبل لفٹنٹ گورنر آپ کے مع انخیر ہندوستان میں پہنچنے سے خوش ہوئے ہیں اور آپ کی خیریت اور سید محمود کی تعلیم کا حال معلوم کرنے کے خواہش مند ہیں اور اب تک انتظار کر رہے ہیں“

سرسید نے اسکے جواب میں نہایت صفائی سے تمام وجہ اپنے خطانہ بھیجنے اور ملکر نہ آنے کی اور سید محمود کی تعلیم کی کیفیت مفصل لکھ بھیجی۔ یہ چٹھی ۷ نومبر کی تھی، سر ولیم نے نوین نومبر کو اس کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھا جس کا ترجمہ یہ ہے

”مائی ڈیر سید احمد! آپ کی ساتویں نومبر کی چٹھی نے مجھ کو اس قدر حیران اور بخیدہ کیا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس بات کے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں نے خواب میں بھی آپ پر کسی خلافت واقعات کہنے کا الزام لگانے کا خیال لیا ہوگا۔ میں اُن نتائج سے جو آپ نے نکالے ہیں اب بھی اختلاف رکھتا ہوں مگر اس سے آپ پر کوئی الزام لگانا ظاہر نہیں ہوتا“

”مجھ کو نہایت افسوس ہے کہ آپ نے فوراً مجھ کو براہ راست کیوں نہ لکھا، آپ کے ایسا نہ کرنے سے مجھ کو اور بھی رنج ہوتا ہے، گویا آپ نے اس قدر اعتبار اور بھروسہ سمجھ کر نہ کیا جس کی میں آپ سے امید کرتا تھا اور شاید امید کرتے کا حق بھی رکھتا تھا“

”مسٹر بریلی نے اردو الفاظ کا مطلب مجھ پر ظاہر کیا تھا اور میں نے ایک نوٹ لکھا تھا جس میں ظاہر کر دیا تھا کہ میں نے

سے سرسید نے اپنے پمفلٹ میں ایک دیہاتی مدرسہ کے معاینہ سے۔ جہاں گاہے بندھی ہوئی اور مدرس اور طلبہ غیر حاضر تھے۔ یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ہندوستان کے عام دیہاتی مدارس کی یہ حالت ہے مگر سر ولیم میور اس نتیجہ کو صحیح نہیں سمجھتے تھے نہ یہ کہ جس گانہ کے مدرسہ انھوں نے پمفلٹ میں حوالہ دیا تھا انکا وہ بیان غلط تھا ۱۲

خوشامدی اور ٹائم سرور سب کچھ کہا، صد ہا آرٹکل بنگالی اخباروں میں اُنکے برخلاف چھپ گئے،
 کے۔ سی۔ اس۔ آئی کا خطاب جو حضور ملکہ معظمہ قیصر ہند نے اُنکو عنایت فرمایا اُسکو بنگالیوں
 نے کانگریس کی مخالفت کرنے کا صلہ قرار دیا، مسٹر ہیوم جو سرسید کے دوست تھے وہ اُنسے سخت
 بدگمان ہو گئے، بعضے ایجوکیٹڈ مسلمان بھی اُنکی طرف سے کھٹک گئے، مگر سرسید نے کسی بات
 کی کچھ پروا نہیں کی اور جہانتک ممکن تھا مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے نہیں دیا۔
 سرسید کو کوئی بات اس سے زیادہ شاق نہیں گذرتی تھی کہ اُنپر استبازی کے خلاف
 کوئی الزام لگایا جائے کیونکہ یہ شخص فی الواقع استبازی کو اپنا دین و ایمان سمجھتا تھا، جس
 زمانہ میں وہ ولایت میں تھے اُنھوں نے ہندوستان کے طریقہ تعلیم پر جو اسوقت یہاں جاری
 تھا۔ ایک پیفلٹ لکھ کر شائع کیا تھا جس میں ہندوستان کے طریقہ تعلیم پر بہت کچھ نکتہ چینی
 کی تھی؛ ازاںجلہ ایک دیہاتی مدرسہ کی نسبت۔ جسکا اُنھوں نے ہندوستان میں خود جاننے کیا تھا
 یہ لکھا تھا کہ مکان مدرسہ میں گائے بندھی ہوئی تھی اور مدرس اور لڑکے سب غیر حاضر تھے، وہ
 پیفلٹ جب ہندوستان میں پہنچا تو سرولیم میور۔ جو اسوقت شمالی مغربی ضلع میں یقیناً گورنر
 تھے۔ اُنکی نظر سے بھی گذرا۔ چند روز بعد اُنھوں نے ایک پبلک اسپیچ میں کہا کہ ”میں نے ضلع میں
 دورہ کرتے ہوئے کافی طمانیت حاصل کی ہے کہ تعلیم کی حالت عمدہ ہے اور اُس محنت اور کوشش کے نشان ظاہر ہیں
 جو سید احمد خان کے نتائج کے مخالف ہے“

یہ اسپیچ مع اردو ترجمہ کے اخبار میں چھپ کر ولایت پہنچی اور سرسید کی بھی نظر سے گذری۔
 ترجمہ کے الفاظ سے وہ یہ سمجھے کہ سرولیم میور نے مجھ پر غلوئی کا الزام لگایا ہے۔ اُنکو نہایت رنج ہوا

اسی طرح کا ایک معاملہ ولیم صاحب کیشنر میرٹھ کے ساتھ گذرا۔ جب سائٹفک سوسائٹی علیگڑھ کا مکان بن کر تیار ہوا تو صاحب مدوح کو اُس کے افتتاح کی رسم ادا کرنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ اُنکے دل میں عنایت اللہ خان مرحوم رئیس بھیکن پور ضلع علیگڑھ کی طرف سے ایام عد کے متعلق کچھ شبہات تھے، اسلئے وہ افتتاح کی رسم میں انکا شریک ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اُنھوں نے سرسیدؒ کو کہا کہ ”اس جلسہ میں اگر عنایت اللہ خان شریک ہونگے تو ہم نہیں آنے کے“ سرسیدؒ نے کہا ”یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے نہایت فیاضی سے سوسائٹی کی امداد کی ہے اور جو اُسکا پریسڈنٹ بھی ہو اُسکو شریک نہ کیا جائے“ اُنھوں نے ہرگز اس بات کو گوارا نہ کیا کہ عنایت اللہ خان مرحوم کی عدم موجودگی میں افتتاح کی رسم ادا کی جائے۔ آخر مسٹر بری کلی نے جو علیگڑھ میں سشن جج تھے اور سوسائٹی کے بڑے معاون اور سرسیدؒ کے دوست تھے۔ بڑی مشکل سے صاحب کیشنر کو راضی کیا اور اُنکو عنایت اللہ خان کی موجودگی میں یہ رسم ادا کرنی پڑی۔ سرسیدؒ کا اس باب میں اصرار کرنا زیادہ تر اس وجہ سے تھا کہ اُنکے نزدیک صاحب کیشنر کی شبہات محض بے اصل تھے اور وہ خود عنایت اللہ خان کو ہر ایک لازم سے پاک صاف جانتے تھے۔ جن یورپین افسروں نے ابتدا میں مدرستہ العلوم کی مخالفت کی تھی یا اُسکے لئے سرکاری زمین ملنے میں مزاحم ہوئے تھے سرسیدؒ نے اُنسے پراوٹ طور پر ملنا جلنا ترک کر دیا تھا اور کبھی اُنکے ساتھ ظاہر داری کا برتاؤ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ہم نے سنا ہے کہ جب حضور سر جان اسٹریچی ہندوستان سے ولایت کو جانے لگے اور کلچرل کمیٹی علیگڑھ کی طرف سے اُنکو ایڈریس دینا قرار پایا تو جو سو وہ ایڈریس کا انعقاد جلسہ پہلے سرسیدؒ نے لکھ کر جناب مدوح کے ملاحظہ کے لئے بھیجا تھا اسی میں جہان کلچر کے محسنوں کا شکریہ لکھا تھا اُن افسروں کی شکایت بھی صراحتہ یا کنایتہ لکھی تھی

ایک لمحہ بھی کسی ایسے مطلب کا خیال نہیں کیا تھا اور میں نے اپنی تحریر کو جس طرح پر ضرورت ہو۔ استعمال کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ چونکہ اس معاملہ کا اس سے زیادہ کوئی تذکرہ نہیں ہوا میں نے خیال کیا کہ وہ اظہار کافی تھا اور گزٹ سکاری میں اُسکے شائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔“

”کیپٹن لنگسٹن آپ کو اس مضمون کے متعلق مندرجہ بالا خط کتابت کے حوالہ سے آئندہ لکھینگے۔ اس وقت میں صرف اتنا کہوں گا کہ میں آپ کے بیٹے کے ایسے عمدہ حالات سننے سے نہایت خوش ہوا ہوں، اور آپ کو اسٹرنٹ یا جب کبھی میرا کمپ بنارس میں پہنچے تو وہاں دیکھ کر خوش ہونگا۔“

سرسید نے اس چٹھی کا فوراً شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ ”آپ کے عنایت نامہ سے تمام بوجھ میرے دل پر سے اٹھ گیا ہے۔“

کرنل گریم یہ تمام واقعہ اپنی کتاب میں نقل کر کے لکھتے ہیں کہ ”سروہم نے سید احمد خان کو اجازت دیدی تھی کہ میری چٹھی کو جس طرح چاہیں شائع کر دیں۔ اگر کوئی توڑ دیتی ہے تو فوراً ایسا کرتا ہوں۔“

سید نے اُسکو پڑھ کر ڈال دیا اور مجھ کو بڑے تلاش سے وہ چٹھی ملی۔“

کرنل موصوف کا یہ خیال ہندوستانیوں کے کیرکٹر کی ناواقفیت پر مبنی ہے۔ بے شک ایسی طبیعت اور ایسے رتبے کے ہندوستانی جیسے کہ سرسید تھے بہت کم نکلیں گے کہ ایک مہوم شہوتہ صوبہ کے گورنر سے ناراضی کا اظہار کر بیٹھے اور گورنر کی طرف سے ایسی مہربانی کے ساتھ اُنکی دلجوئی کی گئی مگر ہندوستانی شرفا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو محض اپنی نمود کے لئے حکام کی ایسی تحریروں کا شائع کرنا۔ جیسی کہ سروہم کی تحریر سرسید کے نام تھی۔ نہایت سبک اور حقیر بلکہ ایک کمینہ حرکت سمجھتے ہیں۔

حالت میں تھا اور امداد کی نہایت اشد ضرورت تھی۔ نواب صاحب کے دربار کا قرینہ یہ تھا کہ وہ خود
پلنگری پر بیٹھے رہتے تھے اور جو شخص ملنے جاتا تھا اُسکو فرش پر دوڑا نو بیٹھنا پڑتا تھا، پہنے سنہا،
کہ سرسید نے جب تک کرسی پر بیٹھنے اور جو تپہ پہنے رہنے کی اجازت حاصل نہیں کر لی وہاں
جائے کا ارادہ نہیں کیا۔

سرسید جیسے خود راست باز تھے اسی طرح راست بازوں کی دل سے قدر کرتے تھے۔ جس
زمانہ میں وہ مسٹر کرک کی جگہ صدر امین مقرر ہو کر رہتے تھے اس وقت خان بہادر منشی
غلام نبی خان مرحوم رئیس میرٹھ وہاں نوکری کے امیدوار تھے پھر چند روز بعد و نائب سرمنشی
کلکتہ مقرر ہو گئے تھے۔ اس وقت حسن اتفاق سے رہتائے میں چند لائق اور ذی علم ہلکار سرکاری
دفتروں اور عدالتوں میں موجود تھے جنکی سرسید کے ہاں آمد و رفت تھی۔ خان بہادر نے اُن سے
یہ خواہش کی کہ مجھے سید صاحب ملو اور اُنھوں نے کہا بہت اچھا مگر وہ لا مذہب ہیں۔ یہ فقہاء
کی اصطلاح سے ناواقف تھے اُنھوں نے یہ سمجھا کہ سید صاحب قید اسلام سے آزاد ہیں ایک دن
سید صاحب اور دیگر ہلکار ایک جگہ جمع تھے نماز کا وقت آگیا، سب نے سید صاحب کو امام بنایا، منشی
غلام نبی خان چونکہ نہایت کھرے اور سچے آدمی تھے اُنکو تعجب ہوا کہ ان لوگوں نے ایک لا مذہب
(یعنی غیر مسلم) کو کس طرح امامت پر کھڑا کر دیا۔ جو ہیں سرسید نے نیت باندھی اُنھوں نے
الگ چادر بچھا کر نماز پڑھنے کا ارادہ کیا۔ سرسید نے نماز ہی میں یہ معلوم کر کے نیت توڑ دی اور

لے مذہب کا لفظ جو آج کل دین کے معنوں میں بولا جاتا ہے فقہاء کی اصطلاح میں اسکے یہ معنی نہیں ہیں بلکہ وہ ائمہ اربعہ
میں سے ہر ایک امام کے طریقہ کو مذہب کہتے ہیں اور اسی لئے وہ لا مذہب اُسکو کہتے ہیں جو کسی خاص امام
کے طریقہ کا پابند نہ ہو ۱۲

جو آئین خلل انداز ہوئے تھے۔ اگرچہ جناب مدوح کے ایام سے آخر کار وہ شکایت آمیز الفاظ سرسید کو مسودہ میں سے نکالنے پڑے مگر سرسید نے ہزاروں سے صاف صاف کہہ دیا کہ جس طرح ہم اپنے محسنوں کا احسان نہیں بھول سکتے اسی طرح نامہ ربان افسون کی شکایت ہمارے دل سے فراموش نہیں ہو سکتی۔ سرسید نے یورپین ڈریس جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ محض انگریزوں کی تقلید سے اختیار نہیں کیا تھا، بلکہ زیادہ تر اس کا منشا یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا قومی لباس ان کے ہم وطن قوموں سے مختلف ہونا چاہئے؛ اور چونکہ مصر و قسطنطنیہ ایران اور اکثر ممالک اسلامیہ میں مسلمان ٹرکس ڈریس یا اس کے قریب قریب پہنتے ہیں اس لئے انھوں نے خود ترکی لباس اختیار کر کے اپنی قوم کے لئے ایک مثال قائم کی تھی۔ باوجود اسکے کہ ان کو اس فیشن کے سبب اکثر مواقع پر سخت مشکلات پیش آئیں مگر انھوں نے جو وضع مسلمانوں کے لئے مناسب سمجھا اختیار کی تھی اس سے کبھی سرمو تجاوز نہیں کیا۔ دلی میں دربار قیصری کے موقع پر جب کہ حضور نظام کو کالج کمیٹی کی طرف سے سپاس نامہ دیا گیا۔ سرسید اس کو خود صرف اس وجہ سے پیش نہ کر سکے کہ وہ ان جو تار کار جانا ضرور تھا۔ چنانچہ کمیٹی کے اور ممبروں نے سپاس نامہ پیش کیا اور سرسید ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئے۔ بنارس کے کشن مسٹر نے کارمیکل سے وہ جو تار پہنکر آنے کی شرط پر ملے، حالانکہ کشن مسٹر جو تار تو ان کے بغیر کسی ہندوستانی کو اپنے بنگلے میں نہ آنے دیتے تھے۔ مسٹر واٹسن جب تک علی گڑھ میں کلکٹر رہے یعنی سنہ ۱۸۵۷ء کے سرسید بھی اُن سے نہیں ملے، کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ سید احمد خان جو تار کار ان کے کمرے میں جا میں، مگر انھوں نے اس کو منظور نہیں کیا۔ نواب کلب علی خان مرحوم رئیس رام پور کے ہاں صرف چندے کی غرض سے وہ اس وقت گئے تھے جبکہ مدرسہ نہایت بوسہ سامانی کی

سید صاحب نے ڈاکٹر کو پھر بلایا اور رات کے دو بجے اُسے آکر جواب دیا، 'یہاں تک کہ صبح کی نماز کے وقت جا کر مجھے اجابت ہوئی اور میری تکلیف بالکل رفع ہو گئی۔ سید صاحب تمام رات میرے غریب خانہ پر جاگتے رہے اور جب مجھے افادہ ہو لیا تو صبح کی نماز پڑھ کر اپنے مکان پر تشریف لے گئے۔ جس شفقت اور بزرگانہ عنایت کے ساتھ انھوں نے میری تیمارداری میں وہ رات بسر کی اُسکو میں تمام عمر فراموش نہ کروں گا۔“

منشی صاحب کہتے تھے کہ ”دلی میں مولوی امام بخش صہبائی نے سید صاحب کو چچا کہ تم نے غلام نبی میں کیا بات دیکھی جو آپس پر اس قدر مہربان ہو، سید صاحب نے کہا ”کچھ نہیں صرف اتنی بات ہے کہ جیسا میں سیرتِ ہون ایسا ہی وہ سڑا ہے۔“

جس زمانہ میں کہ سرسید انگلستان میں تھے اور انکی آزادانہ تحریریں جو ہندوستان میں آکر بذریعہ سوسائٹی اخبار کے شائع ہوتی تھیں انپر چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھاڑ پڑتی تھی ان دنوں میں مولوی سید مہدی علی خان انکو برابر ممانعت کے خط بھیجتے تھے کہ ایسی تحریریں یہاں نہ بھیجینی چاہئیں۔ ایک دفعہ انھوں نے گردن مڑوڑی مرغی کا ذکر نہایت صفائی اور آزادی سے لکھ بھیجا جسپر یہاں بہت لے دے ہوئی اور مولوی صاحب مدوح نے اپنے خط میں اُس تحریر پر بہت افسوس ظاہر کیا۔ اسکے جواب میں سرسید نے اُنکو ایک لطیف تحریر بھیجی ہے جسکے چند فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں ”جن لفظوں میں میں نے غیر فرج کی ہوئی مرغی کھانے کا ذکر لکھا اور جسے آپ کو افسوس ہوا اُسکا عذر کرتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں، ہاتھ جوڑ کر ہندوستانی طور پر نہ شرعی طور پر توبہ کرتا ہوں۔ افسوس کہ مجھے ایسے لفظ لکھنے نہ آئے جسے آپ کو افسوس نہ ہوتا۔ براے خدا معاف کیجئے، جب میں

لے چونکہ سچا آدمی مصلحت اندیش نہیں ہوتا اور اپنے کھرے پن کو گون کو اپنا مخالف بنا لیتا ہوں اسلئے انھوں نے آپ کو اور منشی صاحب کو برا یعنی دیوانہ قرار دیا ہوا

منشی صاحب سے کہا کہ آپ نماز پڑھائیے۔ انھوں نے کہا میں امامت کی لیاقت نہیں رکھتا؛ لیکن آپ اپنا مذہب مجھے بتلائیں، اسوقت اگر میرا دل ٹھکیگا تو میں خود آپ کا مقتدی بنونگا ورنہ مجھے معاف فرمائیے گا سید صاحب نے کہا میں شافعی مذہب رکھتا ہوں۔ منشی صاحب نے کہا تو بسم اللہ میں آپ کے پیچھے بڑی خوشی سے نماز پڑھونگا۔ آخر سر سید ہی نے نماز پڑھائی۔

یہ واقعہ منشی صاحب نے مجھ سے خود بیان کیا تھا اور کہتے تھے کہ ”اس موقع پر میری یہ صفائی دیکھ کر سید صاحب مجھ پر حد سے زیادہ مہربان ہو گئے تھے۔ باوجودیکہ میں اسوقت انکے ایک ادنے ماتحت اہلکار کی

حیثیت رکھتا تھا۔ جس روز میں انکی خدمت میں حاضر ہوتا وہ بلا تکلف میرے مکان پر تشریف لے آتے تھے

حالانکہ انکی عادت کسی کی سفارش کرنے کی نہ تھی باوجود اسکے انھوں نے گتری صاحب جنٹل مجسٹریٹ رہنمائی سے ایک نہایت نازک موقع پر میری سفارش کی۔ دوسری دفعہ جو وہ ایک جینے کے لئے رہنمائی کر

گئے تو مکان علیحدہ کرایہ کو نہیں لیا بلکہ صرف اس نظر سے کہ وہاں کے لوگوں کی نگاہ میں میری وقعت زیادہ

میرے ہی غریب خانہ پر آگرا ترے، اور جیسے بھرتک وہیں قیام کیا، پہلی دفعہ جب علیحدہ مکان میں رہتے تھے

ایک روز میں سخت بیمار ہو گیا تھا جس پر پیشاب اور پاخانہ بند ہو گیا، مجھے نوکر ہوئے چند روز گزری تھے

اور میری تنخواہ صرف تیس روپیہ ماہوار تھی اور ایک آدمی کے سوا کوئی نوکر نہ تھا غرض کہ عجیب سیکیسی کی حالت

تھی، صدر امینی کے ناظر نے جو میرے مکان کے قریب رہتا تھا۔ میرے حال کی اطلاع پا کر سید صاحب کے رات کو نو بجے

جا خبر کی۔ تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ سید صاحب یونانی حکیم کو ساتھ لئے چلے آتے ہیں اور ہسپتال سسٹنٹ کو

جیلخانہ سے لانے کے لئے آدمی بھیجا کرتے ہیں تھوڑی دیر میں ڈاکٹر بھی آگیا مگر حکیم کو دیکھ کر ڈاکٹر نے کہا کہ اگر انکے

علاج سے فائدہ نہ ہو تو مجھے پھر اطلاع دی جائے اور یہ کہ حکیم صاحب کے علاج سے کچھ نفع نہوا

کہ اُسے عجب لطف چھکودیا ہے۔ پہلے مجھے بتاؤ کہ کبھی دولتِ عشق مجازی بھی تم کو نصیب ہوئی ہے یا نہیں؟
کیونکہ بغیر اس کے آدمی مین اور مٹی مین کچھ فرق نہیں ہے۔

انسان کی محبت سب سے پہلے اپنے کنبے کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے جو کہ ایک نچرل تعلق ہے۔ کسی کا قول ہے کہ ”جس کے دل میں اپنے کنبے کی محبت نہیں اُس کو کسی سے بھی محبت نہیں“ سرسید کو ہمیشہ اپنے کنبے کے ساتھ سے زیادہ لگاؤ رہا ہے۔ بھائی کی موت کا صدمہ اُنکو بیس برس تک نہیں بھولا۔ سنا ہے کہ اُنکے عزیزان کے سامنے بھائی کا ذکر اسلئے نہیں کرتے تھے کہ اُنکا داغ تازہ ہو جائیگا۔ بہت مدت کے بعد اُنکی بھتیجی کو مونہہ پر باپ کا کچھ ذکر نکل گیا تھا، سرسید کی حالت ایسی متغیر ہو گئی کہ گویا آج ہی بھائی کا انتقال ہوا ہے۔

بھائی کے مرنے کے بعد اُنھوں نے ضعیف سن بھتیجے کو سطح پرورش کیا جیسے مائیں اپنے بچوں کو پرورش کرتی ہیں۔ باوجودیکہ بھائی زندہ تھیں بھتیجے کو کبھی اپنے سے جدا نہیں کیا، سفر و حضر میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا، مدتوں اپنے ساتھ ایک پلنگ پر سلا یا، اور ہر طرح سے اُسکی ولایت اور دجوتی کی غدر میں جب سارا کنبہ ادنیٰ میں تھا اور آپ بختور میں تھے اُسوقت بھی بھتیجا اُنکی جان کے ساتھ تھا۔

جب سرسید کی بی بی کا انتقال ہوا اُسوقت اُنکی عمر کچھ اوپر چالیس برس کی تھی اور تین ضعیف سن بچے۔ جنکی پرورش اور رکھ رکھاؤ اکیلے باپ سے ہونا سخت دشوار تھا۔ موجود تھے، ہر چند دوستوں نے سہرا اما کہ دوسری شادی کر لو، تاکہ اپنی زندگی بھی آسائش سے گزرے اور بچوں کی پرورش میں بھی آسانی ہو، مگر محبت اور وفاداری نے ہرگز اجازت نہ دی۔ اُن کے ایک دوست کا بیان ہے کہ ”میں اُنکو ہمیشہ دوسرے نکاح کی ترغیب دیا کرتا تھا، وہ سکر ہنسی میں ٹال دیتے تھے، ایک دن وہ برآمدہ میں ٹہل رہے تھے، میں نے پھر وہی ذکر چھیڑا، اُنھوں نے دریاں لہو میں

وہ لفظ لکھ رہا تھا تم میرے دل میں اور میری آنکھوں کے سامنے تھے، میں جانتا تھا کہ تم ناپسند کرو گے، بھائی! کیا تم یہ بات پسند کرتے ہو کہ میں برا کروں اور اُسکو اسلئے چھپاؤں کہ لوگ برا نہ کہیں؟ ہکو اپنے خدا سے معاملہ ہے جسکے ہاتھوں سے ایسے تنگ آئے ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا، جو کام کرتے ہیں وہ دیکھتا ہے، جو بات کہتے ہیں سن لیتا ہے، جو دل میں لاتے ہیں جان لیتا ہے، ایسا نیچے چٹا ہے کہ نہ جاز میں چھوڑے، نہ زمین پر چھوٹے، نہ رات کو الگ ہو، نہ دن کو الگ ہو، نہ غیر مرغی کھاتے وقت بیچھا چھوڑے، پس جب میں نہایت سچے دل اور درست اعتقاد سے ایسے دوست اور سچے رفیق خدا سے شرم نہ کی تو پھر بھائی، ہمدی علی سے کیا ڈر کرتا؟ میں اُسکو قرآن مجید سے جائز سمجھتا ہوں، نہ روایت شاذہ سے، والی مصر کے ساتھ بعض علماء مصر بھی تھے، سب انگریزوں کے ساتھ غیر مرغی کئے ہوئے جانور چٹ کرتے تھے، بہر حال میں اس میں گفتگو نہیں کرتا، شاید میں غلطی پر ہوں، ضرر سحافی چاہتا ہوں۔“

دوسرے محبت اور الفت کا مادہ سرسید میں معمولی آدمیوں کی بہت زیادہ تھا اور اسی لئے اُنکے تمام تعلقات میں محبت کا ظہور بہ درجہ غایت پایا جاتا ہے، وہ اپنے ایک دوست کو ایک دوسرے دوست کی نسبت جس سے کچھ شکریہ نہی ہو گئی ہے۔ لکھتے ہیں ”وہ دوستی محبت کے معاملہ و برتاؤ سے محض نادانف ہیں، کسی پر وہ عاشق نہیں ہو، کسی سے اُنھوں نے دل نہیں لگایا، اُنکو مزاد دوستی محبت کا مطلق معلوم نہیں، سچ یہ ہے کہ جس شخص نے ایک گھڑی بھی عشق نہیں برتا وہ نہ خدا کی دوستی کا مزاجانتا ہے نہ انسان کی دوستی کا اور نہ محبت کے لائق ہے۔“

ایک اور خط میں جو سید ہمدی علی کا مضمون گردن مڑوڑی مرغی کے برخلاف اخبار میں دیکھ کر اُنکو لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ”آپ نے جو کچھ میرے مُردار مرغی کھانے کی نسبت اخبار میں لکھا آپ یقین کیجئے

محبت
دوستی

انکومان کے ذکر پر وہ تادیکھ کر لوگ متعجب ہو گئے۔ بھائی کے نواسوں کی نہایت شفقت کے ساتھ انھوں نے سرپرستی کی اور انکو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلوائی، اپنے خالہ زاد بھائی کے نواسوں کو انھوں نے بالکل اپنی اولاد کی طرح اپنے پاس رکھا اور جب تک وہ انگلستان نہیں گئے انکی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔

وہیں عجیب

اپنے وطن کے ساتھ ہر شخص کو عموماً الفت اور موانست ہوتی ہے خصوصاً ایسے وطن کے ساتھ جیسے کہ دلی ہے جہاں پر ایسی بھی آکر زمین پکڑ لیتے ہیں، مگر سرسید کی محبت اپنے وطن کے ساتھ عجیب طرح کی تھی؛ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ انکو دلی کی منصفی سے دوسری جگہ ترقی پر بھیجتے تھے اور وہ وہاں سے ہرگز نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ تو وہ زمانہ تھا کہ دلی میں چند خاندان نام و نمود کے باقی تھے اور ہر قسم کے اہل کمال اور اہل ہنر زمانہ کی بساط کے موافق وہاں موجود تھے، ملے کا چراغ اگرچہ ٹمٹا رہا تھا مگر گل نہوا تھا، سرسید کو جو زندہ دل سوسائٹی وہاں میسر تھی دوسری جگہ اسکے ملنے کی امید نہ تھی۔ مگر غدر کے بعد جب وہاں کے مسلمان بالکل مٹ گئے اور دلی ایک قالب بے روح رہ گئی اب اُسی حُب وطن کا یہ تقاضا ہوا کہ جن انکھوں سے اُسکی بہار دیکھی تھی انھیں انکھوں سے اُسکی خزان کیونکر دیکھی جائے۔ گو بظاہر سرسید نے دلی ہمیشہ کے لئے چھوڑ دی تھی مگر آدم کو بہشت چھوڑنے کا بھی اتنا ہی افسوس ہوا ہوگا جتنا کہ سرسید کو دلی چھوڑنے کا افسوس تھا۔ اُنکے آرٹیکل میں یا ایسی چون اور لکچرون میں یا پراٹوٹ خطوں میں جان کین دلی کا ذکر آگیا ہے انکا دل اُٹے بغیر نہیں رہا۔

وہ اپنی کتاب راہ سنت پر یارک کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں: یہ باتیں تو ان مہبتوں کی یادگار ہیں

کہا کہ ”محمود کی ماں کما فیس آو گئی“ پھر میں نے یہ ذکر کرنا چھوڑ دیا۔“

جب وہ انگلستان گئے تو وطن سے بیٹی کی سخت بیماری کا آثار پہنچا، انھوں نے فوراً وہاں سے تار دیا کہ اگر ہمارے پہنچنے تک اُسکے بچنے کی امید ہو تو ہم واپس ہندوستان آنے کو تیار ہیں مگر دوسرا تار اُسکے مرنے کا پہنچا جس سے اُنکو ایسا سخت صدمہ ہوا کہ جب تک ولایت میں رہے غمگین اور افسردہ خاطر رہے اور جب ولایت سے واپس آئے تو دلی جانے کو ہرگز جی نہ چاہتا تھا، باوجودیکہ اُن دنوں میں دیوانی کی بڑی تعطیل تھی۔ صرف ایک دور دروز دلی میں ٹھہرے اور ساری تعطیل علیگڑھ، مرزا پور اور بنارس میں بسر کی۔

اپنی والدہ کے ساتھ جیسی اُنکو دلہن تھی ایسی بہت ہی کم سنی گئی ہے اور جیسی کم وہ جوانی میں مان کی اطاعت کرتے تھے اور اُنکے غصہ و خفگی کی برداشت کرتے تھے اس طرح بچے بھی اپنے مان یاپ کا کہنا نہیں مانتے۔ وہ کہتے تھے کہ مجھ کو مان کے مرنے کا اتنا رنج نہیں ہوا جتنا کہ بھائی کے مرنے کا ہوا تھا، کیونکہ غدر کے مصائب کا زمانہ تھا اور ہر وقت یہ خیال ہوتا تھا کہ ایسا نہ تو میں پہلے مر جاؤں اور میرے بعد والدہ کی زندگی تلخی اور سختی میں گزرے، انھوں نے مرنے سے چند سال پہلے میرٹھ میں۔ جہان انکی والدہ مدفون ہیں۔ ایک پبلک ایسیج میں اپنی مان کا ذکر کیا، معاً اُنکا دل بھرا یا اور اسٹج ہاؤس میں

لے سرسید کی بی بی۔ جیسا کہ معتزریعون سے سنا گیا ہے۔ فی الواقع ایسی نیک سرشت اور لائق بیوی تھی جسکے بعد سرسید دوسرا نکاح کرنا بہت تکاح نہ کرنے کے زیادہ تعجب انگیز ہوتا۔ وہ بھی اُسی نام کی نواسی تھی جسکے سرسید نواسے تھے اور اسلئے نیک دلی اور عالی حوصلگی دونوں میان بیوی میں یکساں پائی جاتی تھی۔ سرسید کے بعض احباب کا بیان ہے کہ اگر کبھی سرسید کی غیبت میں اُنکے مکان پر جانا ہو گیا ہے تو ہماری ویسی ہی مدارات ہوئی ہے جیسی اُنکی موجودگی میں ہوتی تھی، ہکوباکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا سید صاحب خود مکان پر موجود ہیں۔“

اور پندرہ بیس روز تک اُنکی حالت نہایت نازک رہی، مگر جسوقت بیٹے کا دم نکلا اور گھوٹن کھرام چپا وہ شمس العلماء مولوی نوکار اللہ کے مکان پر چلے گئے اور جب تک لوگ اُنکو دفن کر کے نہ آئے وہیں چپ چاپ بیٹھے رہے اور پھر جو اُس روز سے علیگڑھ گئے ایک آدھ بار سے زیادہ پھر کبھی جا کر گھر کی صورت نہیں دیکھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُنھوں نے دلی کا غم بھلانے کے لئے دلی کی بود باش ہی ہمیشہ کے لئے ترک کر دی تھی۔ اُنکے بعض ہم وطن کہتے ہیں کہ اگر دلی سے کچھ انس ہوتا تو وہ دلی کو چھوڑ کر علیگڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم نہ کرتے؛ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ اگر بنی امیہ کو بغداد سے انس ہوتا تو وہ اندلس میں جا کر اپنی سلطنت قائم نہ کرتے۔ دلی جو سیکڑوں برس مسلمانوں کا دار الحکومت رہا اور اسلئے پرانے عیالات اور قومی و مذہبی تعصبات کا مرکز تھا وہاں سرسید کے منصوبوں کا پورا ہونا بلا تشبیہ سا ہی مشکل تھا جیسا مکہ میں اسلام کا نشوونما پاتا۔

اگر غور کر کے دیکھا جائے تو سرسید کے دل میں قوم کی بھلائی کا خیال اور قومی ہمدردی کا جوش زیادہ تر دلی ہی کی تباہی اور بربادی نے پیدا کیا؛ فتح دہلی کے بعد جسوقت وہ میرٹھ سے اپنی ان اور خالہ کی خبر لینے کو دلی میں پہنچے اُنھوں نے تمام شہر کو بالکل ویران پایا، یہاں تک کہ جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے۔ پیاسوں کے لئے پانی کی ضرورت ہوئی تو ایک صراحی پانی کے لئے اُنکو خود قلعہ جانا پڑا، جس دوست یا عزیز کا حال دریافت کیا اُسکو مقتول سنایا یا مفقود، جس قلعہ میں سلاطین کے عیش و عشرت کے سامان دیکھے تھے اُسکے در و دیوار سے اُنکے خون کی بو آتی دیکھی۔ اگرچہ اُسوقت ہزاروں ایسے بھی تھے جو مرگ انبوہ کو جشن سمجھتے تھے مگر سرسید جیسے ذکی کھن آدمی کے لئے یہ انقلاب ایک تازیانہ تھا، دلی کا وہ سناٹا دیکھ کر ایک ایسی چوٹ اُنکے دل پر لگی جو زفرہ رفتہ

جسکی یاد سے آنسو بھرتے ہیں : کجاوہ صحبتیں ، کجاوہ مجلسیں ، کمان وہ آزرده ، کمان وہ شیفۃ اور کمان صہبائی
کمان وہ علاؤ صلیحا : صرف یاد ہی یاد ہے ۔“

ایک اور آرٹیکل مین - جہان اُردو اخباروں کا ذکر کیا ہے - وہ یوں لکھتے ہیں ” اُس
اُبڑے شہر کے اخباروں کا بھی جسکا نام لیتے دل بھرتا ہے - ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں ہمارے وطن کے اخبار
ہم سے اسلئے ناراض ہیں کہ مدرستہ العلوم دہلی مین کیون نہ مقرر ہوا ؟ بھائی ! کمان ہے وہ دلی ور کمان ہیں
وہ دلی والے ؟ جو نقش کہٹ گیا اُسکا اب کیا نام بیٹا ہے ، مرثیہ پڑھا کرو اور دلی والوں کو رو یا کرو ۔“

جس زمانہ مین ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دلی مین تجویز ہو رہا تھا انھوں نے اپنے
ایک دوست کو یہ لکھا تھا کہ ” آپ کی سب کوششیں اور تدبیریں اور خیالات بے سود ثابت ہونگے ،
نہ دہلی مین کوئی انتظام کرنے والا ہے اور نہ دہلی اس لائق رہی ہے ، وہاں کے مسلمانوں پر مسلمانوں کے
گھروں پر ، مسلمانوں کے محلوں پر اب تک محنت بستی ہے ، انکی طبیعت ، انکا اخلاق ، راہ و رسم ، سوشل حالت
ایسی تبدیل ہو گئی ہے کہ جب کبھی دلی جاتا ہوں اور کسی سے ملاقات ہوتی ہے تو اُسکی باتیں سن کر تعجب ہوتا ہوں
کہ یہ لوگ کس ملک اور کس دیس کے رہنے والے ہیں ؟ خدا نے دلی سے سب کچھ چھین لیا ، ذلک تقدیر العزیز العظیم
سر سید کی طبیعت مین ایک خاص صفت تھی جو بڑے بڑے کاموں کا بوجھ

اٹھانے والوں مین ہونی نہایت ضرور ہے ۔ وہ دل بچانے والی اور بہت توڑنیوالی تقریروں
سے ہمیشہ دور دور اور الگ تھلک ہنا چاہتے تھے ۔ اگر ایسا نہ کرتے تو جس قدر قومی اور ملکی
اور مذہبی خدمات انھوں نے انجام دی ہیں اُسکا عشر عشر بھی اسے سر انجام نہ ہو سکتا ۔ سید حامد
مرحوم کے انتقال کا صدمہ اُنپر نہایت سخت ہوا تھا ، دو وقت انھوں نے بالکل کمانا نہیں کھایا

وَتَقَرَّبَكَ مِنْهُ وَتَرْفَعُ سَجُوفَ الْحِشْمَةِ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ“ کرنل گریم لکھتے ہیں کہ ”میں

اُنکو (یعنی سرسید کو) ایک چوتھائی صدی سے جانتا ہوں، میرا اُنکا تعلق بمنزلہ ایک رشتہ دار کے ہو نہ کہ بطور ایک دوست کے، جتنی زیادہ اُنکی میری واقفیت بڑھتی گئی اُسے قدر اُنکی قدر و منزلت میں زیادہ ہوتی گئی۔“

سرسید اپنا دشمن تو شاید ہی کسی کو سمجھتے ہوں مگر جبکہ وہ اپنا دوست جانتے تھے وہ بھی تعداد میں کچھ کم نہ تھے۔ قوم کی عام خیر خواہی نے ہزاروں بلکہ لاکھوں کے دل میں اُنکی جگہ کر دی تھی۔ انھیں میں بہت سے ایسے بھی تھے جنکی دوستی یا رانہ کے درجہ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اپنی اور اُنکی چیز میں کچھ فرق نہ سمجھتے تھے۔ سرسید کا گھر اُنکا ہوٹل یا سرائے تھا اور اُنکا دل سرسید کی مٹھی میں تھا۔ وہ جب اور جس قدر چاہتے اُنکے نام بغیر نوچھے چندہ لکھ دیتے تھے اور اُنکو طوعاً یا کرہاً قبول کرنا پڑتا تھا۔

دوستی کے متعلق ایک کتاب میں یہ حکایت لکھی ہے کہ ”ایک روز امام محمد باقرؑ نے اصحاب سے کہا کہ تم میں کوئی ایسا شخص ہے؟ کہ دوست کی جیب میں ہاتھ ڈال کر جس قدر نقدی کی ضرورت ہو اُس میں سے نکال لے۔ سب نے عرض کیا ”کَلَّا اللہ یا ابن رسول اللہ“ آپ نے فرمایا ”بس تو تم میں کوئی دوستی کے لائق نہیں ہے۔“ مگر سرسید کا حال اپنے دوستوں کے ساتھ اور اُنکے دوستوں کا حال سرسید کے ساتھ بالکل ایسا ہی تھا کہ ایک دوسرے کی جیب سے جو چاہتے نکال سکتے تھے۔

سرسید کے دوستوں میں اُنکے ایک نہایت عزیز دوست خرچ کرنے میں کبھی اعتدال و درمیانہ روی سے تجاوز نہیں کرتے مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سرسید نے اُن سے چندہ مانگا ہو اور انھوں نے انکار کیا ہو۔ وہ اپنی جبلی عادت کے موافق بطور ظرافت کے کہا کرتے ہیں کہ قومی ہمدردی تو ہم کو

زخم اور آخر کار ناسور بن گئی۔ مسلمانوں کی تعلیم کا خیال بھی اگر سچ پوچھیے تو دلی ہی کی حالت دیکھ کر اُنکے دل میں پیدا ہوا۔ غدر سے پہلے جیسے دلی کے لوگ دنیا کے حالات سے بے خبر تھے ایسے شاید ہی کسی دوسری جگہ کے لوگ ہوں۔ سرسید کہتے تھے کہ ”ایک دفعہ جو مین رہتک سے کسی تعطیل میں دلی آیا تو وہاں کے ایک معزز آدمی نے مجھے پوچھا کہ آپ کمان گئے تھے؟ اور جب میں نے رہتک کا نام لیا تو اُنھوں نے تعجب سے کہا کہ کیا رہتک بھی انگریزوں کی عملداری میں ہے؟ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ”دلی کے اکثر پڑھے لکھے آدمی ہر ایک مجسٹریٹ کو شکاف کہتے تھے کیونکہ پہلے مجسٹریٹ کا نام مشکاف تھا“

جو بڑا دوسرے کا اپنے دوستوں کے ساتھ تھا وہ اس زمانہ کے دوستوں سے بالکل الگ تھا۔ جہاں تک اُنکا حال دیکھا گیا اُنکی خوشی بلکہ اُنکی زندگی کا مدار صرف دو چیزوں پر معلوم ہوتا تھا: کام اور دوستوں کی ملاقات۔ اُنکو شاید ہی کبھی ایسی خوشی ہوتی ہو جیسی اپنے خالص و مخلص دوستوں سے ملکر ہوتی تھی۔ وہ فی الواقع دوستوں کو زندگانی کا ایک عنصر سمجھتے تھے۔ اُنکا اس مقولہ پر پورا پورا عمل تھا کہ ”اگر ساری دنیا قبضہ میں ہو اور کوئی دوست نہ تو وہ بیچ ہے اور اگر ساری دنیا کے برے میں ایک دوست ہاتھ لگ جائے تو اُردن ہے“ باوجودیکہ دن بھر میں اُنکا کوئی گھنٹہ بلکہ کوئی منٹ کام سے خالی نہ ہوتا تھا۔ اور ایسے شخص کو تنہائی زیادہ پسند ہونی چاہئے۔ با اینہم دوستوں کے کبھی اُنکا جی نہ اُٹتا تھا۔ ابتدائی ملاقاتوں میں وہ بہت روکھے پھیکے معلوم ہوتے تھے، ناواقف آدمی اُنکو پہلی ہی بار دیکھ کر نہایت عبوس اور خشک مزاج سمجھتا تھا مگر جب قدر اُنسے زیادہ ربط بڑھتا جاتا تھا اُس قدر اس مقولہ کی تصدیق ہوتی جاتی تھی کہ ”الْوَحْبَةُ إِلَى الْكَرِيمِ مُخِلَّةٌ طَلَقَ

دوستوں کا نام نہ لانا

لے یعنی کریم النفس آدمی کی طرف جس قدر مجھکے اُس سے زیادہ میل جول ہوگا اور مخالفت دور ہوتی جائیگی!۱

جب کسی دوست کی طرف سے کوئی ایسی بات ظہور میں آتی تھی جس سے مغائرت کا خیال پیدا ہوتا ہو تو اُنکو یہ امر نہایت شاق گذرتا تھا۔ منشی غلام نبی خان مرحوم کا بیان ہے کہ ”میں رُبتک میرٹھ جاتا تھا جب دلی پہنچا تو ایک دوست کے مکان پر ٹھہرا ہوا، وہاں میں نے سنا کہ سید صاحب بجنور سے آئے ہوئے ہیں، میں اُنکی خدمت میں پہنچا، اُنھوں نے فوراً میرا اسباب فرود گاہ سے منگوایا اور مندرمایا کہ پانچ چار روز تک وہاں ٹھہرنا پڑیگا، پھر ہم تم بیان سے ساتھ چلیں گے، میں ٹھہر گیا، اُنھوں نے شہر کے مشاہیر سے مجھ کو ملوایا، اتفاق سے محمد بخش خان صدر الصدور میرٹھ بھی وہاں آئے ہوئے تھے، اُنھوں نے سید صاحب کو لکھا کہ میرٹھ تک مجھے بھی اپنی گاڑی میں شریک کر لینا، سید صاحب نے اُنکو لکھ بھیجا کہ میری گاڑی میں منشی غلام نبی شریک ہیں اسلئے آپ کی گنجائش نہیں، مجھے شرکت کے لفظ سے یہ خیال گذرا کہ نصف کرایہ گاڑی کا مجھے دینا پڑیگا۔ غرض کہ میں سید صاحب کے ساتھ دلی سے میرٹھ کو روانہ ہوا، راہ میں اپنی نالائقی سے میں نے نصف کرایہ سید صاحب کے سامنے پیش کیا، اُنھوں نے نہایت غضب آلود نگاہ سے میری طرف دیکھا اور بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ مجھے اپنی اس کینہ حرکت سے ایسا انفعال ہوا کہ بیان نہیں ہو سکتا آخر مجھ کو معافی مانگنی پڑی اور پھر کرایہ کے باب میں اُنکے سامنے دم نہیں مارا، اسی طرح اُنھوں نے ایک دست کو کسی قدر روپیہ کا چک بھیجا مگر اسے واپس کر دیا اور لکھا کہ میں یہ روپیہ نہ لوں گا اسکے لئے مجھے بہتر مصرف موجود ہیں۔ سرسید نے اسکا یہ جواب لکھا کہ ”آپ کا عنایت نامہ پہنچا جس میں چک مرسلہ کا ذکر تھا اُسکو پڑھ کر میں تم پر نہایت خفا ہوا، جو محبت و یکجہتی مجھ کو تھے ہے وہ اس لائق نہ تھی کہ تم ایسے کلمات لکھتے جو ایک غیر شخص کو لکھنے زیبا ہیں۔ خود اس قسم کے خیالات ہمارے ساتھ ہرگز مت کرو۔ اگر تم رقعہ مرسلہ کو کام میں نہ لاؤ گے تو نہایت آزر دگی ہوگی اور یقین ہوگا کہ تم یکجہتی نہیں سمجھتے، اب دوبارہ اس باب میں نہ لکھنا“

معلوم نہیں کس چیز کو کہتے ہیں ہاں مگر سید احمد خان کی زبان میں ضرور جادو تھا کہ جہاں روپیہ دور روپیہ دینا مشکل معلوم ہوتا تھا وہاں اُنکے ایک اشارے پر آنکھ بند کر کے سیکڑوں پوچھائی تھیں۔

سرسید ایک آرٹکل میں لکھتے ہیں کہ ”اگرچہ اسطرح پر متوازن امداد کی درخواست کرنے سے شرم آتی ہے مگر ہمارے دوستوں کی فیاضی ہم کو شرمندہ نہیں ہونے دیتی۔ ہم نے بھی اس مقولہ پر عمل کرنا اختیار کر لیا ہے کہ ”خانہ دوستان بروب و در دشمنان ملوب“ جس امر کی ضرورت ہوتی ہے دوستوں ہی سے سوال کرتے ہیں اور کچھ شرم نہیں کرتے۔ اور حق یہ ہے کہ اگر دوستوں ہی سے نہ مانگیں تو کس سے مانگیں؟ لیکن اُنکا شکریہ ہم پر واجب ہے ایک دوست پر کلچر کے کسی فنڈ کا چندہ کسی قدر باقی تھا، ہم نے اُنسے کہا کہ تھوڑا سا روپیہ رہ گیا ہے اسکو بیباق کر دو۔ اُنھوں نے کہا بیباقی کا تو آپ نام نہ لیجئے، جب تک زندگی ہے بیباقی تو نہ ہوگی، آج اس چندہ کی باقی ہے کل دوسرے چندہ کی، اسی طرح باقیدار مر جاؤں گا، پس بیباقی تو نہ ہوئی ہے نہ ہوگی، مگر جب قدر روپیہ چاہو لے لو“

اسکے بعد آپ لکھتے ہیں کہ ”حقیقت یہی حال ہے، کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوتا کہ ہم اپنے دوستوں کے کلچر کے کسی نہ کسی فنڈ کے لئے چندہ نہ مانگتے ہوں۔ مگر ہمارے دوست بھی ہمارے اس شعر کو کبھی کبھی ٹپکھ لیا کریں“

”گر مکر ز لبت بوسہ گرفتیم مرغ سُرخی لعل لبت میں کہ چہ ز سب ابودست“

انھیں دوستوں میں سے بعض کے ساتھ نہایت بے تکلفی تھی، وہ جو کچھ چاہتے تھے سرسید کو کہ بیٹھتے تھے، اُنپر زور و رُوع تراش کرتے تھے، اُنکے مذہبی خیالات اور رایوں پر نکتہ چینی کرتے تھے، اُنسے ہر قسم کی ہنسی اور چُپل کی باتیں ہوتی تھیں، وہ ہمیشہ سرسید کی جھڑکیاں کھاتے تھے اور خفگیان سے تھے مگر نہ کبھی سرسید کو اُنسے لال ہوتا تھا اور نہ اُنکی خفگی یا جھڑکی کا برا مانتے تھے۔ اُنکے حسبِ حال ہنستا تھا

”تغزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محاسب! بڑھتا ہے آؤر ذوقِ گنہ یان سزا کے بعد“

البتہ کتابوں میں بہت کچھ لکھا دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ بھائی سے مسند محبت ہو سکتی ہے اور نہ باپ سے جیسی کہ اس شخص کی محبت خدا نے ڈال دی ہے۔“

اسی محبت کی کشش تھی کہ محسن الملک نے حیدر آباد سے آکر وطن مالوٹ کی طرف رخ نہیں کیا بلکہ علیگڑھ کو اپنا ہنڈ کوار ٹر بنایا اور کبھی ایک دو دن سے زیادہ اٹاوہ میں جا کر قیام نہیں کیا، اور اگر حفظِ صحت کا خیال نہ نکو مجبور نہ کرتا تو غالباً وہ سرسید کی زندگی میں علیگڑھ کو چھوڑ کر کبھی بمبئی نہ جاتے۔ نظیری نے کیا خوب کہا ہے

”درسِ ادب اگر بود ز مزمعہ مجتہد جمعہ بہ مکتب اور دفضل گریز پائے را“

سرسید کی خفگی اور غصہ میں جوشش تھی وہ کسی کی مہربانی اور عنایت میں بھی نہیں دیکھی گئی۔ سید محمدی علی کو ہمیشہ اُنکے عتاب آمیز خط جاتے تھے چنانچہ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ”مدی علی کو سوائے غصہ اور خفگی کے کبھی کچھ نہیں ملا“ باوجود اسکے سید محمدی علی کا معاملہ اُنکے ساتھ شمع و پروانہ کا ساتھ تھا۔ الہ آباد کے جلسہ کانفرنس میں جس ذوق و شوق اور وجد کی حالت میں اُنھوں نے اپنا لکچر دیتے وقت تمام حاضرین کے سامنے سرسید سے خطاب کیا تھا وہ اکثر لوگوں کو یاد ہوگا خصوصاً اس وقت کا سامان کبھی دل سے فراموش نہ ہوگا جب کہ اُنھوں نے سرسید سے مخاطب کر یہ اشعار پڑھے تھے

دلبرانِ ماہِ پیکرِ دیدہ ام درجالتِ چہرہ دیگرِ دیدہ ام

این چہ نورست اینکہ تابان از تو هست ہفت کوکب نورافشان از تو هست

تو کمال از کمال کیستی مظہرِ نورِ جمال کیستی

سرسید نے ایک آرٹیکل میں جو غالباً محبت پر لکھا ہے مسٹر پٹلی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

جس دوست کے ساتھ سرسید کی زیادہ خصوصیت ہوتی تھی وہی اکثر مورد عتاب رہتا تھا مگر اُس عتاب کی قدر وہی خوب جانتے تھے جو اُس کے مورد ہوتے تھے۔ خان بہادر مولوی سید زین العابدین خان جن پر سب زیادہ خفگی اور ناراضی رہتی تھی وہی آج سب زیادہ سرسید کو یاد کرتے ہیں اور روتے ہیں اور دنیا میں کسی دوست یا عزیز کو ویسا غمخوار اور غمگسار نہیں پاتے۔ سرسید کا ایک خط ہاتھ لگا ہے جو انھوں نے علالت کی حالت میں اپنے پیشدرست لکھو اگر خان بہادر کو رام پور بھیجا تھا: نہ اُس میں غری شوق و آرزو کا اظہار ہے نہ جدائی کی معمولی شکایت ہے مگر اُس کے ہر ہر لفظ سے محبت ٹپکی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں ”میری زینو! ابھی تمہارا خط پہنچا، کچھ شبہ نہیں کہ تمکو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا، مگر تم تو اُس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے، مگر مجھ کو تمہارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جاسکتا۔ زبان کھجلاتی ہے اور کوئی بیان نہیں ہے کہ اُسکو برا کہوں، دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی بیان نہیں ہے جس پر غصہ نکالوں، ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی بیان نہیں ہے جسکو ماروں۔ حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہو گیا۔ صبح کو اٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو۔ اے کہ ہرگز فراشت نکمہ کا نقشہ ہو گیا ہے“

نواب محسن الملک نے ایک موقع پر سرسید کا ذکر خیر کرتے وقت کہا کہ ”میں نے کسی شخص کی ذات میں اس قدر خوبیاں جمع نہیں دیکھیں، میری اُن سے پہلی ملاقات ۱۸۶۳ء میں ہوئی تھی؛ اُس وقت سے آج تک ایک بات بھی اُن میں ایسی نہیں دیکھی جسکو بُرا کہ سکوں۔ اس شخص کیسی سچی محبت اور وفاداری دنیا میں کہیں نہیں دیکھی“

سے خان بہادر ہمیشہ بلاناغہ جمع کے چار بجے سرسید کی کوٹھی پر آتے تھے اور گھنٹا آدھ گھنٹا وہاں ٹھہر کر پھر ہوا خوری کو جاتے تھے یہ اُس صبح کی ملاقات کی طرف اشارہ ہے ۱۱

کہ ہمارے دوستوں سے محبت اور برادرانہ محبت نہیں ہے۔ ہماری قوم خراب حالت میں ہے اسلئے اسیکیت گلیا جاتا
 ورنہ ہم اور قوموں سے بھی ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی اپنے عزیزوں سے۔ اس وقت اسکے علانیہ دوستوں
 موجود ہیں۔ ایک یہ کہ سید محمد محمود اور مسٹر اس سے نہایت دوستی اور برادرانہ اور عزیزانہ محبت ہے، جب
 سید مسعود پیدا ہوا تو مسٹر اس اور انکی میم صاحبہ نے موافق انگریزی رسم کے۔ جو نہایت محبت پر طالت کرتی تھی
 اپنا نام اُس مولود مسعود کو دیا اور پہنے نہایت خوشی سے اُنکا نام اُسکے نام کے ساتھ شامل کیا اور اسی سبب
 اُسکا نام سید اس مسعود قرار پایا۔

”دوسرا نمونہ (راجہ جبکیشن داس بہادر سی۔ اس۔ آئی کی طرف نہایت جوش محبت
 کے ساتھ اشارہ کر کے کہا) ہمارا یہ ڈرہی منڈا دوست یہاں موجود ہے اور سید اس مسعود کو اپنی بغل میں
 بٹھائے ہوئے ہے۔ انکو میں اپنا معزز اور محسن بھائی سمجھتا ہوں اور سید محمود انکو چچا کہتے ہیں اور سید اس مسعود
 دادا راجہ۔ پس ہم اپنے دوستوں سے محبت رکھنے میں کچھ بھی فرق نہیں کرتے۔“

سرسید جبکو دوست سمجھ لیتے تھے اُسکی طرف سے فی الواقع اُنکا دل ایسا صاف ہو جاتا تھا
 کہ اُسکی نسبت بُرائی کا کبھی تصور بھی نہ آتا تھا۔ کسی کی شکایت یا سعایت یا دراندازی اُنکو دوست سے
 جب تک کہ علانیہ اور متواتر اُس سے دوستی کے خلاف باتیں سرزد نہ ہوں۔ بدگمان نہ کر سکتی تھی۔
 لیکن اسی کے ساتھ جب کسی کی نسبت اُنکو یقین ہو جاتا تھا کہ وہ دوست نہیں پھر اُس سے مطلق
 تعلق باقی نہ رہتا تھا۔ ظاہری کامنانی حقیقتہً اس شخص کو نہ آتا تھا۔ اُنکے حال پر عینہً یہ شرط منطبق ہوتا تھا
 مرخان دلم را کہ این مرغ وحشی زبائے کہ برخاست مشکل نشیند

وہ سید محمد علی خان کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ”میں تو اُس شخص کو کافی بے ایمان سمجھتا ہوں

”انسان کو دشمن کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ رکھنا چاہئے کہ اُسکو دوست بنا لینے کا موقع رہے اور دوست سے اس طرح برتاؤ کرنا چاہئے کہ اگر کبھی وہ دشمن ہو جائے تو اُسکے ضرر سے بچنے کی جگہ باقی رہے“ اس قول کو نقل کر کے وہ خود لکھتے ہیں کہ ”اسکا پہلا حصہ جو دشمن کے ساتھ برتاؤ کرنے کا ہے وہ تو نہایت عمدہ ہے، مگر پھلی بات جو دوست کے ساتھ برتاؤ برتنے کی ہے اُس میں سمجھ کی کچھ بھی بات نہیں بلکہ بڑی مکاری ہے۔ ایسے برتاؤ سے انسان زندگی کی بہت بڑی خوشی سے محروم رہتا ہے، اپنے دلی دوستوں سے بھی دل کی بات نہیں کہہ سکتا، یہ سچ ہے کہ بعض دوست دشمن ہو جاتے ہیں اور دوست کے بھید کو کھول دیتے ہیں مگر دنیا انھیں کو دغا باز اور بُرا کہتی ہے، دوست پر بھروسہ کرنے والے کو نا سمجھ نہیں کہتے۔ ہاں البتہ دوستوں کے منتخب کرنے میں بڑی سمجھ چاہیے“

سر سید نے جو کچھ لکھا ہے یہ خاص اُنکے دلی خیالات تھے اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے اُنکا ہمیشہ اسی کے موافق عمل درآمد ہوا۔ وہ بے شک زود آمیز اور زود پیوند نہ تھے بلکہ اس شعر کے حقیقی مصداق تھے

”نہ عیبِ ثبوت کہ بیگانہ دارے گلاری کہ ہر کہ زود گیسل نیت دیر پیوندست“

مگر جب کسی سے دل مل جاتا تھا۔ پھر خواہ وہ شخص ہندو ہو یا عیسائی یا یہودی یا مسلمان۔ اُس سے کسی طرح کی معاشرت اور بیگانگی باقی نہ رہتی تھی۔ اُنھوں نے اپنے پوتے سید مسعود کی بسم اللہ کی تقریب میں بمقام علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں کے بعد تمام ممبروں اور وزیٹروں کے سامنے ایک تقریر کی تھی جس کے آخر کے چند فقرے بیان نقل کرنے مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

اُنھوں نے کہا ”اے حضرات! گو میں نے اس وقت قوم ہی کا گیت گایا ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے

رکھتے تھے جیسے اگلے زمانہ کے وضع دار اور باوقادو ستون کے حالات سننے میں آئے ہیں۔ قطع نظر
پرائیوٹ باتوں کے پبلک معاملات میں بھی۔ جو زیادہ مہتمم بالشان ہوں۔ انکی یہ خواہش معلوم
ہوتی تھی کہ دوست انکی رائے کے مؤید ہوں اور اگر کوئی دوست انکی رائے سے اختلاف کرتا تھا تو انکو
حد سے زیادہ ملال ہوتا تھا۔

جب سے انکو مسلمانوں کی تعلیم کا خیال ہوا وہ اپنے ہر ایک دوست سے اس بات کے متوقع تھے
کہ انکے کام میں دل سے مدد دیں۔ جن قدیم دوستوں نے توقع کے موافق تعلیمی معاملات میں انکو مدد
نہیں دی انکے ساتھ وہ ربط و ضبط جو قدیم سے چلا آتا تھا قائم نہ رہا اور نئے دوست جو ان معاملات میں
انکے مددگار تھے انکو وہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھی زیادہ عزیز اور پیارا سمجھتے تھے۔ خان بہادر
برکت علی خان کی نسبت انکی اخیر دم تک یہ تمنا رہی کہ کالج میں ایک ممتاز مکان انکی یادگار میں
تیار کرایا میں۔ سوار محمد حیات خان کو اپنا قوت بازو سمجھتے تھے۔ قاضی رضا حسین رئیس پٹنہ
خلیفہ سید محمود حسن خان وزیر پٹیاہ مولوی چراغ علی اور میر ظہور حسین کے مرنے کا انکو ایسا رنج ہوا تھا
کہ اپنے کسی عزیز کے مرنے کا بھی کسی کو اس سے زیادہ صدمہ نہیں ہو سکتا۔ نواب انصار جنگ سے اگرچہ
وہ ٹرسٹی بل کے اختلاف کی وجہ سے کسی قدر آزرہ ہو گئے تھے مگر چونکہ مدرسہ کی امداد انکے برابر ایک آدھ
کے سوا کسی نے نہیں کی اسلئے وہ ملال چند روز بعد بالکل جاتا رہا تھا اور انکی ویسی ہی جگہ دل میں
ہو گئی تھی جیسی قدیم سے چلی آتی تھی۔ نواب عماد الملک کو انکی نیکی اور راستبازی اور علم و فضل اور
مدرسہ العلوم کی حقیقی خیر خواہی اور خیر اندیشی کی وجہ سے وہ ایسا ہی عزیز رکھتے تھے جیسے سید محمود کو
اور انکی نسبت یہ کہتے تھے کہ وہ اسان نہیں بلکہ ایک نور مجسم ہے۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد کی نسبت

جو دوست کی نسبت خیال کرے کہ اُسے خلاف دوستی و محبت کے کوئی بات کی یا کہی ہوگی۔ مین تو دوست کے گالی دینے اور بُرا کہنے کو بھی دوستی پر عمل کرتا ہوں، اور درحقیقت دوستی ہی کے سبب وہ بات ہوتی ہے۔ مگر جب حقیقت مین خلاف محبت اور دوستی کے کوئی بات ہو تو پھر شیشہ محبت۔ جو نہایت نازک ہے۔ کسی طرح ثابت نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ دوستی اور محبت ایسی سخت چیز ہے کہ ہتھوڑوں اور ہزاروں صدیوں سے نہیں ٹوٹتی، مگر وہ نازک بھی ایسی ہے کہ باریک سے باریک شیشے اور جاب کو بھی اُس سے نسبت نہیں۔ ایک اونے سی خلاف محبت بات کرنے سے ٹوٹ جاتی ہے اور جس قدر محبت زیادہ بڑھتی جاتی ہے اُسکی نزاکت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ سرسید کو کسی دوست نے لکھا کہ فلاں دوست سے بھی آپ چندہ طلب کریں۔ اُسکے جواب میں آپ لکھتے ہیں کہ ”جو ملاں اُنکی طرف سے میرے دل میں ہوا ہے وہ اب تک کم نہیں ہوا۔ پھوٹ جاوے وہ آنکھ جو کسی کو دیکھے اُس نگاہ سے جو اُسکے دل میں نہیں ہے، گل جاوے وہ زبان جو وہ کہے جو اُسکے دل میں نہیں ہے، ٹوٹ جاوے وہ ہاتھ جو وہ لکھے جو اُسکے دل میں نہیں ہے۔“

اُنکا قول تھا کہ دوستی کے آگے رشتہ و قرابت کی کچھ حقیقت نہیں۔ وہ ولایت سید محمد علی خان کے نام کے خط میں مولوی زین العابدین خان کی نسبت لکھتے ہیں ”جس قدر آپ نے مولوی زین العابدین کی محبت کا میری نسبت ذکر لکھا ہے درحقیقت وہ بہت کم ہے، اُس کا فرغارت کن ایمان کو۔ جیسا کہ وہ ہے۔ مین ہی خوب جانتا ہوں۔ اب آپ کو میری طبیعت کا حال بخوبی معلوم ہو گیا، مین رشتے و ناتے کی سچی محبت اور دوستی کے آگے کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتا۔“

اگرچہ سرسید ہر ایک معاملہ میں نہایت آزادانہ خیالات رکھتے تھے مگر دوستی کے معاملات میں بڑے کنسر و ڈو معلوم ہوتے تھے۔ وہ اپنے خالص و مخلص دوستوں سے اُسی قسم کی توقعات

حافظ عبدالرحمن مرحوم۔ جو سید محمود کے بچپن کے استاد تھے۔ ۲۵ برس سرسید کے ساتھ رہے اور وہیں اُنکا خاتمہ ہوا۔ مرتے وقت اُنھوں نے سید محمود اور سرسید کو بلایا جب دونوں کو دیکھ لیا تو رازِ روح پرواز کر گئی۔ سرسید کو اُنکے مرنے کا ایسا قلق ہوا کہ ایک وقت کھانا نہیں کھایا اور کئی دن تک اُنکے مرنے کا رنج و الم رہا۔ منشی ذوالفقار جو اُنکے بیٹے کا حساب کتاب لکھتا تھا اُسکے مرنے کا بھی اُنکو کچھ کم صدمہ نہیں ہوا۔ اسی طرح کی اور بہت سی حکایتیں ہیں جنسے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کا خمیر مہر و محبت سے ہوا تھا۔

نتیجہ

سیرِ چشمی اور فراخِ چشملگی بھی سرسید کے خاص اوصافِ مین سے تھی۔ اُنھوں نے اپنی کمائی سی نہ کبھی مال جمع کرنے کا امداد کیا اور نہ اولاد کے لئے کوئی جائیداد خریدی بلکہ جو کچھ کمایا اُسکو یا اپنی ضروری آسائش اور سچی عزت اور نیکنامی کے ذرائع میں صرف کیا، یا کفن کی خبر گیری، مستحقین کی امداد، اولاد کی تعلیم، ملک اور قوم کی بھلائی اور مذہب کی حمایت میں اُٹھایا۔ وہ ۳۷ برس سرکاری ملازمت میں رہے اور اس عرصہ میں سو روپیہ سے لیکر آٹھ سو روپیہ ماہوار تک تنخواہ پاتے رہے جب تک سید محمود ہائی کورٹ کے جج رہے ایک ہزار ماہوار باپ کو دیتے رہے۔ نوکری کے بعد اخیر دم تک چھ سو روپیہ ماہوار پنشن کی آمدنی رہی مگر کبھی اُنکی آمدنی خرچ کو کتنی نہیں ہوتی۔ اُنکے ایک معزز رشتہ دار کا بیان ہے کہ ”جب دلی کی منصفی سے اُنکو ترقی کے ساتھ باہر بھیجے گئے تو اُنکی والدہ نے۔ جو اُنکی طبیعت اور خصلت سے خوب واقف تھیں صرف اس خیال سے جانے نہیں دیا کہ جس قدر زیادہ آمدنی ہوگی اُس قدر خرچ بڑھ جائیگا، پھر اپنا گھر چھوڑ کر باہر جانے سے کیا فائدہ“

ابتداء سے اُنکا یہ حال رہا کہ جس کام کی لہر اُنکے دل میں اُٹھی اُس پر روپیہ صرف کرنے میں اُنھوں نے

ایک ناواقف آدمی نے اُنکے سامنے بطور شکایت کے کہا کہ باوجود اس قدر مقدور ہونے کے اُنھوں نے قومی تعلیم میں کچھ مدد نہیں دی۔ سرسید نے بد مزہ ہو کر اُنکے چندون کی تفصیل بیان کی جو وہ ابتدا سے مدرسہ میں دیتے رہے ہیں اور جو مقبولیت اور رونق اُنکے لکچرون سے ایجوکیشنل کانفرنس کو ہوئی اُسکا ذکر کر کے کہا کہ یہ شخص ہماری قوم کے لئے باعث فخر ہے اُسکی نسبت پھر ایسا اہتزاز بان سے نہ نکالنا۔ شمس العلماء مولوی ذکا ماثدہ جنھوں نے کلچر کے چندون کے سوا سوسائٹی کے مقاصد میں اپنے ترجموں سے بے نظیر امداد دی تھی۔ اور۔ سید زین العابدین، میر تراب علی، سید صدیقی علی، مولوی مشتاق حسین، راجہ جیکشن، اس، حاجی اسماعیل خان اور مرزا عابد علی بیگ کو وہ مثل اپنے اعضا و جوارح کے سمجھتے تھے۔

الغرض یہ شخص دوستی و محبت کے باب میں اس عربی شعر کا حقیقی مصداق تھا

وَإِذَا رَأَيْتَ صَدِيقَهُ وَشَقِيقَهُ
لَمْ تَذَرِ أَيُّهُمَا ذُوًّا وَلَا دَحَامَ

(یعنی تو اس کے دوست اور اس کے بھائی کو دیکھ کر یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ بھائی کونسا ہے اور دوست کونسا)

اسی جہتی مہر و محبت کا مقتضاتھا کہ وہ اپنے رفیقوں اور نوکروں اور لگے بندھنوں کو تابعدار عمر بھر اپنے ساتھ نباہنا چاہتے تھے۔ جس شخص کے قدم اُنکے ہاں جم گئے پھر نہ وہ اُسکو اپنے پاس سے جدا کرنا چاہتے تھے اور نہ وہ اُن سے جدا ہونا چاہتا تھا۔ اول تو وہ کسی کی شکایت سنتے نہ تھے اور اگر کوئی کسی ملازم کی شکایت کرتا تھا تو اُسکا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ اُنکے ایک قدیم ملازم کی لوگوں نے اُن سے بارہا شکایت کی مگر وہ کسی طرح اُنکے دل سے نہ اُترا، ہمیشہ اُنکا مہم علیہ اور سفر و حضر میں اُنکے ہمراہ رہا اور آخر انھیں کی رفاقت میں مر گیا۔ اُسکے بعد چھوٹی بھائی کو اور وہنگی ملی جسکی آوارگی اور بد چلنی حد گذر گئی تھی مگر وہ بھی اخیر دم تک اُن سے نہ چھوٹ سکا۔

نوکروں کا
سلف و تلمیذ

مولو نصاحب نے کہا کہ تمہاری تنخواہ کاروپہ مسجد میں نہیں لگایا جاسکتا، سرسید نے جسٹری کی آمدنی میں سے وہاں کئی سو روپیہ بھیجا، مگر جب وہ خیالات بدل گئے تو جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں سہارنپور کی جامع مسجد کے لئے جب اُنہیں چندہ طلب کیا گیا تو اُنہوں نے یہ جواب دیا کہ ”میں خدا کے زندہ گھروں کی تعمیر کی فکر میں ہوں اور آپ لوگوں کو اینٹ مٹی کے گھر کی تعمیر کا خیال ہے“

مستحقوں کی امداد اور دستگیری کرنے کی بھی اُنکی نسبت بے شمار مثالیں سننے میں آئی ہیں، خصوصاً غدر کے بعد جب کہ مسلمان شرفا کے صد ہا خاندان تباہ و برباد ہو گئے تھے، اُن کے دوست محمد سعید خان کہتے تھے کہ ”مراد آباد میں جو شکستہ حال شرافت صورت مسلمان اُنکے مکان کے برابر سے گزرتا اُسکو خود بلا لیتے تھے اور عمدہ لیجا کر اُسکا حال دریافت کرتے تھے اور ایسے طور پر اُسکے ساتھ سلوک کرتے تھے کہ کسی کو خبر نہ ہو“ اُنکے ایک معزز اور ثقہ دوست کی روایت یہ کہ ”مات تک غدر کے بعد اُنکا یہ حال رہا کہ اپنی تنخواہ میں سے

صرف بقدر اخراجات ضروری لیکر باقی کل روپیہ دلی میں تقسیم کر دینے لگے، بھجور دیتے تھے، بعض اشخاص غدر کے آفت رسیدہ لوگوں کے ساتھ سرسید کا برتاؤ دیکھ کر یہ تصنع اپنے تئیں مفلوک و مصیبت زدہ ظاہر کرتے تھے اور سرسید اُنکے اصل حال سے واقف ہونیکے بعد بھی اُنکے ساتھ اُسی طرح سلوک کرتے تھے“ محمد سعید خان صاحب کا بیان ہے کہ ”مراد آباد میں جب کہ نواب قسطنٹ گورنر کا دربار ہونے والا تھا اور لوگ اطراف و جوانب سے دربار

میں شامل ہونے کو آئے ہوئے تھے، ایک شخص بظاہر معقول اور سفید پوش سید صاحب کے مکان پر آئے اور اُنکو الگ لیجا کر کہا کہ میں دربار میں شریک ہونے کے لئے آیا تھا، مگر میرا آدمی اسباب لیکر بھاگ گیا اور میں بالکل بے وسوسہ مان رہ گیا ہوں۔ سرسید نے اُنکو معقول خرچ دیا اور کھانا اپنے ساتھ کھلایا۔ جب وہ چلے گئے تو معلوم ہوا کہ یہ شخص اسی نواح کا رہنے والا ہے اور اسی طرح لوگوں کو بھل دیکر مانگ کھاتا ہے۔ تین چار روز بعد وہ پھر تشریف لائے اور کچھ اور طلب کیا

کبھی پیش و پس نہیں کیا۔ وہ اپنے کھانے پہننے کے اخراجات میں تنگی کر سکتے تھے اور کرتے تھے مگر اپنے شوق کے کاموں میں انھوں نے کبھی مضائقہ نہیں کیا۔ جس کتاب کی انکو تلاش ہوئی اگر وہ پس گئی قیمت پر بھی ملی تو اُسکو ملے بغیر نہیں چھوڑا۔ ریاضی کے متعلق آلات جمع کرنے کا انکو شوق ہوا صد ہا روپیہ اُس میں صرف کر ڈالا۔ کسی تصنیف کے لئے میٹرل جمع کرنے میں، کسی کتاب کے چھپوانے کے اہتمام میں، کسی سوسائٹی یا انجمن یا مدرسہ قائم کرنے میں وہ ہمیشہ اپنی بساط سے بہت زیادہ فائدہ خرچ کرتے رہے، ساری عمر تصنیف و تالیف میں گزری مگر کبھی حق تصنیف سے کچھ فائدہ نہیں اٹھایا اور کبھی کسی کتاب کی رجسٹری نہیں کرائی۔ اُنکی کتابیں اور مضامین جسکا جی چاہتا تھا چھاپ لیتا تھا انھوں نے کبھی کسی سے تعرض نہیں کیا۔

جب تک مذہبی خیالات میں انقلاب پیدا نہیں ہوا وہ ثواب کے معمولی کاموں میں بہت شوق سے شریک ہوتے تھے۔ محمد سعید خان صاحب کا بیان ہے کہ ”بجنور میں غدر سے پہلے میں مسجدوں کے بننے میں انھوں نے کافی مدد دی، موضع بنیسوہ جو بجنور اور دلی کے رستے میں پڑتا تھا وہاں ایک سرے تھی جس میں سرسید آتے جاتے کھانا کھانے کے لئے ٹھہر کرتے تھے اُس سرے میں بھٹیاریوں نے ایک مسجد بنانی شروع کی تھی، اُس مسجد کی ابھی بنیادیں ہی بھری گئی تھیں کہ دو بھٹیاریوں کو وہاں کے برہمنوں نے مار ڈالا اور اسلئے مسجد کی تعمیر بند ہو گئی۔ سرسید نے اُسکی تعمیر ناماد دیکھ کر کچھ روپیہ اپنے پاس سے دیا اور کچھ دلی سے اپنے رشتہ داروں مردوں اور عورتوں سے وصول کر کے اُسکو پورا کر دیا۔ پھر خاص بجنور میں بکر قصابوں نے ایک مسجد کی بنیاد ڈالی تھی، اُسکے بنوانے میں بھی انھوں نے بہت مدد دی، مگر وہ ابھی پوری نہ ہوئی تھی کہ غدر ہو گیا، غدر کے بعد سرسید نے فوراً اسکی تعمیر جاری کر لی اور اُسکو مکمل کر دیا۔ اسطرح کا نہ صلہ میں ایک مسجد مولوی مظفر حسین مرحوم و مغفور بنواتے تھے، سرسید روپیہ بھیجا چاہا“

شر سے بچایا جو محض مذہبی تعصب کے سبب انکو پھانسیاں دلوانے پر کمر بستہ تھے، بعض مسلمان جو سرکاری فوج کے ہاتھ سے دلی پر حملہ ہونے کے وقت بے قصور مارے گئے تھے اُن کے دراندہ وارثوں کی پنشنیں مقرر کرائیں۔ مولانا عالم علی مرحوم مراد آبادی کی صفائی کرنے میں جو کوشش سرسید نے کی وہ ہم پہلے کسی موقع پر بیان کر چکے ہیں۔ غرض کہ اس شخص نے مسلمانوں کو کیا من حیث القوم اور کیا من حیث الافراد فائدہ پہنچانے میں کبھی کمی نہیں کی۔

غریب پیشہ ورون اور مزد ورون کے ساتھ جو فیاضانہ برتاؤ اس شخص کا تھا اُسکا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جب سے وہ مستقل طور پر علیگزہر میں مقیم ہوئے مزد ورون کی مزدوری اور گاریوں کا کرایہ پہلے کی نسبت عموماً زیادہ ہو گیا۔ وہ ہمیشہ ان لوگوں کو انکی توقع اور حوصلہ سے بہت زیادہ دیتے تھے اور جہاں کہیں انکار ہوتا ہو ایہ لوگ اُنکے نہایت شکر گزار اور شاخوآن رہے۔ اُنکے ایک دوست کا بیان ہے کہ ”میں بنارس میں اُنسے ملنے گیا تھا، دریا پر پہنچا تو شام ہو گئی تھی اور کشتی کی آمد و رفت بند ہو گئی تھی، ہر چند ملاحوں سے کہا کہ کشتی لگا دو، مگر انھوں نے نہ مانا۔ لیکن جب اُنکو معلوم ہوا کہ یہ جج صاحب کے ہاں جانے والے ہیں فوراً کشتی لگا دی اور مجھے پار اُتار دیا۔ کشتی سے اُتر کر میں نے ملاحوں کو کچھ دینا چاہا مگر انھوں نے کچھ نہ لیا اور یہ کہا کہ سرکار (یعنی سرسید) ہلکے بہت کچھ دیتے ہیں ہم اُنکے ہاں سے ہرگز کچھ نہ لینگے“ ایسا ہی ایک واقعہ ریل کے مزد ورون کا ساہی جو سرسید کے نام پر بلا مزدوری کام کرتے تھے۔

سالم نام ایک یہودی صنعتی مین کا رہنے والا غازی پور میں سرسید کے پاس آیا اور کہا

اے مولانا صہبائی کے نواسے محمد حمید الدین کا ایک خط ہمارے سامنے تھا میں نے سرسید کے نام آیا تھا جس میں لکھا تھا کہ مولانا، نام بخش صہبائی مرحوم جو اس خط کے نانا تھے ایام غدر میں اُنکے بے گناہ قتل ہونے پر علیحدت نے جناب نانی صاحبہ و دیگر راندگان کا وظیفہ سرکار انگریزی مقرر کر دیا تھا، جب تک نانی صاحبہ زندہ رہیں جو تصور وظیفہ ملتا رہا۔ بنفہ والدین سنا تھا کہ جو سات اہل انجیل کے اس خاندان کو ساتھ ہوئے ہیں وہ میان سے باہر ہیں۔“

سید صاحب نے پھر کچھ خرچ دیا اور کھانا بھی ساتھ کھلایا۔ غرض کہ تین دفعہ دربار ہونے سے پہلے وہ اُنکے پاس آیا اور ہر دفعہ اُسکو کچھ دیا اور کھانا اسی طرح ساتھ کھلایا۔

اُس زمانہ میں سرسید کو یہ خیال تھا کہ سیکڑوں شریعت اور خاندانی افلاس میں مبتلا ہیں اور جس جیلے سے روئی ملتی ہے حاصل کرتے ہیں۔ مگر جب سے انھوں نے مدرستہ العلوم قائم کیا اُن کا حال بالکل اُسکے برخلاف تھا، وہ سائل کو کبھی اپنے دروازے پر پھٹکنے نہ دیتے تھے اور بجائے اس کے کہ شخصی امداد کو کوئی کار خیر سمجھتے ہوں۔ اُسکو ایک قسم کی مصیبت جانتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ ایسے لوگوں کی امداد کرنا اُنکو ہمیشہ کے لئے دریوزہ گردناتا ہو۔ اسی لئے اُنکی تمام فیاضی اور داد و دہش قوم کی تعلیم میں منحصر ہو گئی تھی۔ جس درستی اور سختی کے ساتھ وہ سائل کو جھڑکتے اور اُسپر زور و دیک کرتے تھے اُسکو دیکھ کر ناواقف آدمی اُنکو سخت بد اخلاق اور بد مزاج تصور کرتا تھا مگر وہ اُنکا غصہ اور زور و دیک کرنا سراسر مصنوعی ہوتا تھا، اُنکا یہ قول تھا کہ لوگوں کے اخلاق درست کر کے لئے بد اخلاق بننا نہایت ضرور ہے۔

سرسید کی جو افریدی اور فیاضی صرف داد و دہش ہی میں محدود نہ تھی بلکہ اُنکی مثال ایک پھلدار درخت کی سی تھی جو اپنے پھل سے اپنے سایہ سے اور اپنی لکڑی سے غرض کہ ہر طرح سے مخلوق کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ عذر کے بعد انھوں نے اکثر بے گناہ مسلمانوں کی جنکی نسبت حکام کو اشتباہ ہو گیا تھا۔ صفائی کرائی، بعض اشخاص جو فتح دہلی کے بعد گورنمنٹ کے خوف سے باغیوں کی فوج میں شامل ہو گئے تھے، مگر درحقیقت بے گناہ تھے۔ اُنکو بطور خود وہاں سے بلا کر اُنکی تحقیقات کرائی اور اُنکی بریت پر خود گواہی دیکر اُنکو بری کرایا۔ مراد آباد کے مسلمانوں کو بعض ناخدا ترس ہندوستانیوں کے

سرسید کی اس قسم کی فراخ چٹائی کی مثالیں بے شمار ہیں جنکی تفصیل کی اس کتاب میں گنجائش نہیں۔ اگرچہ یہ خصلت عام مسلمانوں کے حق میں انکی موجودہ حالت کے لحاظ سے نہایت خطرناک ہے، کیونکہ اب مسلمان بغیر کفایت شعاری کے صفحہ ہستی پر قائم نہیں رہ سکتے، مگر سرسید کی حالت عام مسلمانوں سے بالکل مستثنیٰ تھی۔

در حق او مدح و در حق تو ذمہ در حق او شہد و در حق تو سہم
سرسید اگر گھر کے انتظام اور نوں تیل لکڑی کے حساب کتاب کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ تمام ملکی اور قومی اور مذہبی خدمات جو انھوں نے گزشتہ چالیس برس میں سرانجام کیں وہ کون کرتا؟ انھوں نے ایسے کاموں کے لئے جو ہندوستان میں اور خاص کر مسلمانوں میں بالکل نئے تھے اور جن کے خرچ کرنے کی انکو بالکل عادت نہ تھی۔ دس بارہ لاکھ سے کم روپیہ وصول نہ کیا ہوگا، اگر وہ کفایت شعاری کو کام فرماتے اور اپنی پاکٹ بالکل نہ جھاڑ دیتے تو اوروں کے کیسوں میں کیونکر ہاتھ ڈال سکتے تھے، اگر وہ اپنے گھر کو مہمانسرا نہ بناتے تو علی گڑھ کا ایک ویران قطعہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز کیونکر بن سکتا تھا، اگر وہ ہزار ہا روپیہ اپنے پاس سے صرف کر کے اطراف ہندوستان میں چندہ کے لئے سفر نہ کرتے بلکہ اپنا سفر خرچ کمیٹی کے ذمے ڈالتے تو مسلمانوں میں جو ہر وقت اعتراض کرنے کا موقع ڈھونڈھتے تھے۔ کیونکر اپنا دوتا قائم رکھ سکتے تھے، اگر وہ یورپ میں طریقہ پر مانی لائف نہ رکھتے تو ہندوستان کے ارکان سلطنت کو اپنے کاموں کی طرف کیونکر متوجہ کر سکتے تھے۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد نے سچ کہا تھا کہ سید احمد خان کے ظاہر حال خود ہوا ہو سکتا ہے کہ اونچے درجے کے انگریزوں کی طرح ماندو بود کرتے ہیں، گورنروں کو مہمان رکھتے ہیں، ان کے ہونا مہین

کہ تمام ہندوستان میں معاش کی تلاش کے لئے پھراہوں، کہیں کوئی صورت نہیں نکلی سرسید نے پوچھا کہ کیا تنخواہ لوگ؟ اُس نے دس یا پندرہ روپیہ کے 'سرسید' نے کہا میں تلوے پچیس روپے مینا دوں گا، مجھے عبرانی سکھاؤ۔ سرسید کے ایک دوست کہتے تھے کہ اُس نے خوشی کے مارے بڑھکر سرسید کی داڑھی چوم لی اور یہ کہا کہ آج تک مجھے ایسا کوئی شخص نہیں ملا جس نے درخواست سے زیادہ دیا ہو۔ سرسید اُسکو نوکر رکھ لیا، مگر چونکہ وہ سرف اور آوارہ فراج تھا اسلئے اُسکو بقدر ضرورت دیتے رہے اور اُسکی باقی تنخواہ جمع کرتے رہے۔ جب وہ وطن کو جانے لگا تو کئی سو روپیہ جو اُسکا چڑھا ہوا تھا حساب کر کے اُسکے حوالے کر دیا۔

جس زمانہ میں سرسید مولوی نواز ش علی مرحوم سے دلی میں پڑھتے تھے میر محمد مرحوم امام جامع مسجد دہلی بھی اُنکے ساتھ پڑھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب سید صاحب چند روز کے لئے قائم مقام صدر امین مقرر ہو کر رہتک جانے لگے تو انھوں نے مولوی صاحب سے کہا کہ آپ بھی رہتک چلیے۔ مولوی صاحب ہنسنے لگے اور کہا کہ میں بھلا کیونکر جا سکتا ہوں؟ ایک جماعت کثیر طلبہ کی مجھے پڑھتی ہے، انکو کس پر چھوڑ کر جاؤں؟ انھوں نے کہا سب طلبہ کو بھی ساتھ لے چلیے۔ مولوی صاحب کو اور زیادہ تعجب ہوا کہ اتنے طالب علم کھائینگے کہاں سے؟ سید صاحب نے کہا آپ انکے کھانے پینے کا تو فکر کیجیے نہیں، خدا رازق ہے، لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ اگر آپ نہ چلیں گے تو میں رہتک جانے سے انکار کر دوں گا اور اس سے میری آئندہ ترقی رُک جائیگی۔ آخر مولوی صاحب کو اس کے سوا کچھ بن نہ آیا کہ وہ مع طالب علموں کی جماعت کے اُنکے ساتھ ہوئے اور جب تک رہتا ہوا سب کا خرچ سید صاحب کے ذمے رہا۔

مگر خدا کی رحمت ہے جو اسے ہمو مقروض رکھ کر کفر سے بچایا ہے، پس میرے دل کی تسلی کو تو یہ خیال کافی ہے۔ معلوم نہیں کہ سرسید کو اس حدیث کے یقین نے مال جمع کرنے سے باز رکھا تھا یا جب ان جمع نہ ہو سکا تب اس حدیث پر یقین ہوا؟ درحقیقت یہ انکا حسن بیان تھا جس سے مخاطب کو تسلی دینا مقصود تھا ورنہ وہ بیسویسے کی محبت سرے سے انکی سرشت ہی میں نہیں پیدا کی گئی تھی اور وہی اثر انکی اولاد میں موجود تھا کہ باوجود معقول آمدنی کے ہمیشہ مقروض اور تہیست رہے۔

سرسید کے ایک دوست ایک زمانہ میں انکے خانگی اخراجات کا حساب لکھا کرتے تھے، انکے بیان کے کہ جب مہینا ختم ہوا میں تمام اخراجات کا مختصر گوشوارہ بنا کر انکے دکھانے کو لے گیا، سرسید نے کہا ”بس مجھے دکھانے کی کچھ ضرورت نہیں، یونہی چنے دو، میں دیکھوں گا تو ناحق میرے دل کو صدمہ ہوگا“ حتیٰ یہ کہ جو شخص اس دن آدروں کی صلاح و فلاح کی فکر میں رہیگا وہ اپنے خانگی انتظام کی طرف کیونکر متوجہ ہو سکتا ہے؟ ولیم پٹ۔ جو ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے انگلستان کو انگلستان بنایا، انکی نسبت لارڈ مکالے نے لکھا ہے کہ ”نہ اس کے بیوی تھی نہ بچے، نہ محتاج رشتہ دار تھے، اور نہ اسراف کی عادت تھی، باوجود اسکے جب وہ مرا تو ہوس اوف کا منس کو اسکا قرضہ ادا کرنے کے لئے چار لاکھ روپیہ منظور کرنا پڑا، اگر وہ ہفتہ میں پندرہ منٹ بھی انتظام خانگی کے لئے صرف کرتا تو ان تمام اخراجات کا معقول انتظام ہو جاتا، اس کے نوکروں کی لوٹ نہایت حیرت انگیز تھی، ایک ہفتہ میں صرف گوشت کا بل ساڑھے بارہ من کا تھا اور اسی کے قریب مرغ، مچھلی اور چائے کا“

اگرچہ سرسید بمقابلہ وزیر اعظم انگلستان کے ایک نہایت غریب اور کم حیثیت آدمی تھے مگر خانگی انتظام کے متعلق انکی بے اعتنائی نسبتہ ولیم پٹ سے کچھ کم نہ تھی، صرف اتنا فرق تھا کہ ولیم پٹ کو

جسکے دل میں ایسا واہمہ گزرے اُسکو اس بات پر بھی نظر کرنی چاہئے کہ سید کو چار و ناچار قبیلانوں کے ساتھ دوستی رکھنی پڑتی ہے اور وہ بڑے پھانک بغیر نبھ نہیں سکتی۔ اگر انگریزوں کی طرح ہائی لائف نہ رکھیں تو کوئی اعلیٰ درجہ کا انگریز یا اعلیٰ درجہ کا عیسائی انکی طرف رخ نہ کرے اور ایسی موٹی اسامیان دام میں نہ آئیں تو چستہ کی بھاری بھاری رقمیں کن سے ہاتھ لگیں۔“

بہر حال اس باب میں سرسید کی ایک خاص حالت تھی، اگر کوئی دوسرا شخص بھی گھر بار لٹا کر قوم کو ایسے طرح فائدہ پہنچا سکے تو وہ بلاشبہ قوم کا ستراج ہے اور بے شک روپیہ صرف کرنے کا طریقہ اُس سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ مسٹر سمولر اپنی کتاب سلف ہلپ میں لکھتے ہیں کہ ”جو شخص اپنے روپے سے لوگوں کو نفع نہیں پہنچاتا وہ بہت ہی ذلیل آدمی ہے۔ جوانوں کو خیال رکھنا چاہئے کہ جوانی کی کفایت شعاری کہیں بڑھاپے میں جا کر خست نہ بن جائے اور جو کام (یعنی کفایت شعاری) پہلے فرض عظیم تھا وہی گناہ عظیم نہ بن جائے۔ اگرچہ سرسید کی زندگی برابر آسودگی کے ساتھ گزری اور انکی حیثیت ایک متوسط احوال شریف ہندوستانی کی حیثیت سے بہت زیادہ رہی مگر خدا تعالیٰ نے اُنکا حوصلہ بمقابلہ انکی حیثیت کے زیادہ فراخ اور وسیع و بلند پیدا کیا تھا، اسلئے انکی آمدنی کبھی اُنکے اخراجات کو ملتی نہیں ہوتی تھی اور ہمیشہ مقروض رہنا ایک لازمی سی بات ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ایک دوست کو جو مقروض ہو گئے تھے اس طرح لکھتے ہیں ”قرض کی پریشانی بلاشبہ بہت بوجہ ہے جسکے مزے میں خوب واقف ہوں، بہت کم مسلمان ہونگے جو اس بوج میں مبتلا نہ ہوں، مگر میں تو اپنے دل کو اس طرح تسلی دے لیتا ہوں کہ مقروض ہونا بھی خدا کی رحمت ہے، میں اس حدیث پر پورا یقین رکھتا ہوں کہ ”صَاحِبُ الْمَالِ كَافِرٌ“ جس پر حضرت ابوذر غفاریؓ کا یقین اور عمل تھا۔ کافر کے لفظ سے کیا مراد ہے اس بحث کو چھوڑ دو، جو اسکی مراد ہو وہ ہو، لیکن ہم ابوذرؓ کو یقین نہیں

کہ انکی بُرائیاں اُسکو محسوس بھی ہوتی تھیں یا نہیں ؟

حکایات لقمان میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ”ایک مچھر بیل کے سینگ پر بیٹھا اور یہ جھک کر بیل پر میرا بوجھ پڑا ہوگا اُس سے کہا کہ اگر میرا بوجھ تجھے شاق گذرا ہو تو کہہ دے تاکہ میں اُرجاؤں۔ بیل نے کہا اے نادان مجھے تو یہ بھی خبر نہیں کہ تو مجھے بیٹھا بھی ہے یا نہیں چہ جائیکہ تیرے بیٹھنے سے مجھکو کچھ تکلیف ہوئی ہو“ بعینہ یہی حال لوگوں کی بُرائی کے مقابلہ میں اس شخص کے تحمل اور حوصلہ کا تھا۔

اُنکے ایک دوست راوی ہیں کہ ”مراد آباد میں جبکہ سرسید وہاں صدر الصدور تھے۔ محکمہ صاحب جج کے ایک ہندو کلرک سرسید سے کچھ رنجش تھی وہ اکثر گناہم عرضیاں انکی شکایت کی اعلیٰ افسروں کو لکھتا رہتا تھا۔ ایک بار جبکہ پولیس کا نیا انتظام ہوا تھا۔ اُسے ڈسٹرک سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ایک عرضی لکھ بھیجی کہ صدر اعلیٰ کے بھتیجے نے ایک عورت کو مار ڈالا ہے اور اُنکے گھر میں اُسکی لاش موجود ہے، فوراً تلاشی لیجائے۔ اُسی وقت پولیس کا اعلیٰ اُنکے مکان پر چڑھ آیا۔ سرسید نے مکان میں پردہ کرا دیا اور تلاشی لی گئی۔ مگر چونکہ وہ محض اتہام تھا کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی۔ سرسید کو اسکا نہایت بُخ ہوگا؛ مراد آباد کا کو تو ال اس جرم میں کہ بغیر موجودگی مدعی کے تلاشی لی گئی۔ برخاست کیا گیا۔ سرسید اور اُنکے اکثر دوستوں کو خوب معلوم ہو گیا تھا کہ فلان کلرک نے یہ عرضی لکھی تھی مگر سرسید نے اسکی کچھ پروا نہیں کی۔ جب وہ غازی پور بدل گئے اور کسی وجہ سے وہ کلرک نوکری سے علیحدہ ہو گیا تو ایک موقع پر جبکہ سرسید کے ایک معزز یوروپین دوست کسی اعلیٰ عہدہ پر ترقی پا کر غالباً سنٹرل ہڈیا کو جاتے تھے اور جاتے ہوئے غازی پور میں ٹھہرے تھے۔ اُنکو ایک لائق انگریزی دان کی ضرورت ہوئی۔ چونکہ سرسید اُس کلرک کی انگریزی لیاقت سے واقف تھے اُنھوں نے اُسی کی سفارش کی اور اُسکے گھر سے بلوایا۔ چنانچہ وہ صاحب اُسکو دوسور وپیہ ماہوار کا نوکر رکھوئے گئے“ جو صاحب اس حکایت کی ناقل ہیں یہ کہتی تھے

یقین تھا کہ جس سلطنت کی بہتری کے لئے وہ ماخیر دم تک کوشش کرتا رہا وہ اُس کا قرضہ ادا کرنے کی تکفل ہوگی مگر غریب سید کو چار لاکھ چھوڑ چار سو کا بھی ادا کرنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا، اور اسی لئے جو اتنا کہ ہم کو معلوم ہے۔ جس طرح کہ اُس نے وارثوں کے لئے کوئی جائیداد نہیں چھوڑی اس طرح قرضہ کا بوجھ بھی کسی پر نہیں ڈالا۔ اگر بالفرض کچھ قدر قلیل کسی کا دینا باقی رہ گیا ہوگا تو سید کی پورٹکل پنشن۔ جو اُن کے بعد ایک نسل تک جاری رہنے والی ہے۔ اُس قرضہ کو لئے کافی ہو بہت زیادہ ہے ایک دوست نے سرسید کے ایک شتہ دار کا یہ مقولہ بیان کیا کہ سید احمد خان نے اگرچہ جائزہ طور پر کبھی ایک خر مہرہ نہیں لیا مگر اُن کی تنخواہ اور جبرستی اور پورٹکل پنشن کی اس قدر آمدنی تھی کہ اگر وہ میانہ روی اختیار کرتے اور فضول خرچ میں روپیہ برباد نہ کرتے تو آج اُن کی اولاد کے برابر دلی میں بہت ہی کم صاحب جائیداد نظر آتے۔ میں یہ سن کر چپ ہو رہا اور سعدی شیرازی کا یہ شعر دل ہی دل میں پڑھتا رہا

اے کہ آگاہ نہ حالت درویشان را تو چہ دانی کہ چہ سودا و سرت ایشان را

مخالفوں اور دشمنوں کی بُرائیوں کا تحمل کرنا اور کبھی اُن سے انتقام لینے کا ارادہ نہ کرنا یہ بھی سرسید کے اُن اوصاف میں سے تھا جو اُن کی ذات کے ساتھ مخصوص تھے۔ اس شخص کے صرف اقوال ہی سے نہیں بلکہ زیادہ تر اُس کے افعال سے ثابت ہوتا ہے کہ بُرائی کا بدلہ لینا تو درکنار اُس کو کسی کی بُرائی یاد بھی نہیں رہتی تھی۔ بلاشبہ محمدن کا لُج کی بدخواہی یا جن اصول پر سرسید نے اُس کو قائم کیا تھا اُنہیں رخنہ ڈالنا اُس کو حد سے زیادہ ناگوار گذرتا تھا مگر جن لوگوں کی بُرائیاں اُس کی ذات تک محدود تھیں اور کا لُج تک اُن کا علانیہ طور پر کچھ اثر نہ پہنچتا تھا اُن کی نسبت قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا

انتقام کا خیال نہ ہونا

برائی سے ہلکے کیا کام ہے؟ ہلکے اپنا دل، اپنا کام، اپنی زبان بجلی کہنی چاہئے، برائی کرنے والوں پر افسوس کرنا چاہئے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنا خود اپنے آپ کو بھی ویسا ہی کرنا ہے۔ جو لوگ بُرا کہنے والے ہیں اُسکی نسبت ہلکے صبر و تحمل چاہئے۔ اگر وہ بُرائی ہم میں ہے اُسکے دور کرنے میں کوشش لازم ہے، اگر نہیں ہے تو خدا کا شکر کرنا چاہئے کہ وہ بُرائی ہم میں نہیں ہے۔ بُرا کہنے والے کی نسبت خیال ہی نہیں چاہئے کہ کون ہے؟ دنیا میں ہے بھی یا نہیں؟ پس یہی آرام و آسائش کا طریقہ ہے۔ اگر تم بھی چاہتے ہو کہ دنیا میں آرام سے رہو یہی طریقہ اختیار کرو۔ میں یقین کرتا ہوں مگر افسوس کے ساتھ کہ..... صاحب کی طبیعت خدا نے ایسی بنائی ہے کہ اُسے بھلائی یا سچائی کی توقع نہیں، کچھ ہی کرو آزار ہی پہنچے گا۔ پس گلہ کیا ہے؟ کیا تم دنیا کے پتھروں سے گلہ کرتے ہو؟ اور کیا وہ کسی کی دشمنی سے ڈنک مارتے چلتے ہیں؟ پس اُنکے حال سے بحث مت کرو، لوگوں کا جیسا دل چاہے ویسا اُنکے ساتھ برتاؤ کریں، اگر ہمے معافی چاہتے ہیں ہمارا اُس نے کیا گناہ کیا؟ کیا میری ڈاڑھی منڈ گئی؟ آپ اگر دیکھ لیں بدستور ہے، بلکہ جو دو جو بڑھ ہی گئی ہوگی۔ مجھے تمام عمر افسوس رہیگا کہ میں نے وہ خط کیوں برکت علی خان صاحب کو پاس بھیج دیا؟ اگر خاں صاحب مدوح کی نسبت اُس میں متوجش بات نہ لکھی ہوتی تو میں ہرگز نہ بھیجتا۔ خیر! جو ہو گیا اُس پر افسوس سے کیا فائدہ ہے؟

”میرے نزدیک منشی..... کی کسی بات کے درپے ہونا نہیں چاہئے، خدا کی۔ دنیا میں بہت مختلف اقسام کی خلقت ہے، ہر ایک اپنا کام کرتا ہے، تم اپنا کام کرو، مگر جان لو کہ تمہارا کیا کام ہے؟ نیکی، بھلائی اور اپنے کام سے مطلب، دوسرے کے کام سے کچھ غرض نہیں۔ جس سے دل رکا ہوا ہو اس سے مت ملو، کیونکہ اُس سے ملکر خوشی نہ ہوگی، یا منافقانہ طریقہ پر ظاہر واری کرنی پڑیگی۔ نہ ملنے میں بہ نسبت ملنے کے آرام ہے، اسی طرح انکی باتوں کی پرواہ نہ کرنے میں بالکل آرام ہے“

کہ ”موت کے بعد وہ کلرک مجھ سے ملا تو اُسے صاف صاف بیان کیا کہ میں نے سید احمد خان کے ساتھ بُرائی کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا، مگر اُسے میرے ساتھ یہ سلوک کیا کہ مجھے دوسو کانوکر رکھوا کر بھیج دیا۔ اُس نے کہا کہ حقیقت میں سید احمد خان ایسا شخص ہے کہ جس کے سر پر اُسکی جوتیوں کی خاک پڑ جائے اُسکی نجات ہو جائے“

جب رفیق ہنرمین سرسید کے خلاف نہایت سخت سخت آرٹیکل شائع ہونے لگے اور شی سراج الدین ڈیئر سر مورگنزٹ نے اُسکا جواب لکھنے پر قلم اٹھایا تو سرسید اُنکو لکھتے ہیں ”میں نے آپ کا اخبار مورخہ ۸ جنوری پڑھا، بلاشبہ میں آپ کی محبت کا جواب کو مجھ ناچیز سے ہے۔ ممنون اور احسان مند ہوں اور آپ کو اُس تحریر کی نسبت جو اُس پرچہ میں ہے۔ بوجہ جوش محبت معذور سمجھتا ہوں؛ مگر جانے دو، جو جکاول چاہے کہ، ہمارا کیا بگڑنا ہو؟ اگر ہمارے بُرا کہنے سے اُنکاول خوش ہوتا ہے خوش کر لینے دو، تم بھی اُس بُرا کہنے سے خوش ہو، کیونکہ وہ ہمارے دھوبی ہیں، ہمارے گناہوں سے پاک کرتے ہیں۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ میں نے وہ خط جناب خان بہادر برکت علی خان صاحب کے پاس بھیج دیا، اگر اُنکا ذکر نہ ہوتا تو میں ہرگز نہ بھیجتا۔۔۔۔۔ تم میرے ساتھ محبت رکھتے ہو اور اسکا بھی نہ کو یقین ہے کہ جو لوگ میری نسبت عیب لگاتے ہیں وہ مجھ میں نہیں ہیں، تو تمھارے خوش رہنے کے لئے، مجھکو خدا کا شکر کرنے کے لئے، کہ وہ عیب اُس شخص میں جسکو تم دوست رکھتے ہو۔ نہیں ہے۔ کافی ہے۔ اس سے زیادہ کیا خوشی کی بات ہے۔ پس بُرا کہنے والوں کی بُری بات کا یہی نیک پہلو نکالو اور خوش رہو۔ خدا کو ہمیشہ خوش رکھے“

جب شی سراج الدین نے اسکا جواب لکھا تو پھر سرسید نے اُنکو اسی مضمون کے متعلق دوسرا خط لکھا ہے۔ اُس میں لکھتے ہیں ”ہمکو خدا نے دنیا میں اسلئے پیدا کیا ہے کہ سب کی بھلائی چاہیں۔ بُرا کرنے والے کی

۱۔ یہ اُس گناہ خط کی طرف اشارہ ہے جو لاہور کے جلسہ کا تقریر واقع ۱۸۸۷ء میں جانے سے ایک دن پہلے سرسید کے نام علی گڑھ میں آیا تھا اور جس میں یہ سخت الفاظ لکھے تھے کہ ”اگر تم لاہور میں آئے تو تمھاری ڈاڑھی جوتے سے مونڈی جائیگی اور جو حال کل سب بازار تمھارے دوست (یعنی خان بہادر) کا کیا گیا ہے اُس بدتر تمھارا حال کیا جائیگا“ ۲

چنانچہ ایک بار۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ ایک نوکر پر زیادتی کرنے کے جرم میں اُنکو گھر سے نکال دیا گیا۔ اور کئی دن کے بعد جب کہ اُنھوں نے نوکر سے قصور معاف کرا لیا۔ تب گھر میں آنے کی اجازت ملی۔ اگرچہ۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتا ہے مگر جبلت نہیں بدل سکتی۔ لیکن عمدہ تربیت حسبِ طبع گھوڑے کی تو سنی اور سرکشی کو چالاک کی سے بدل دیتی ہے اسی طرح انسان کو غیظ و غضب کو اولوالعزمی اور دلیری کے سانچے میں ڈھال دیتی ہے اور وہی چیز جو پہلے درندہ دُن کی خصلت معلوم ہوتی تھی اب بڑے بڑے عظیم الشان ارادوں کی شکل میں ظہور کرتی ہے۔ سرسید میں یہ انقلاب نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔ اُنکا جبلی غیظ و غضب فی الواقع، مجنسون کی حمایت اور جوش بہم رسانی کے ساتھ بدل گیا تھا۔ اُنکو پرائیوٹ معاملات میں۔ سوا اسکے کہ کبھی کبھی نوکروں پر دودھ کا سا اُبال آجاتا تھا۔ بہت ہی کم غصے ہوتے دیکھا ہے، جو کچھ اُنکا غصہ یا افسوس تھا وہ قوم کی غفلت یا نالائقی پر تھا، یا اُنکی تباہی و بربادی پر، یا قومی کاموں کی مخالفت اور مزاحمت پر یا قوم کے بیجا تعصبات اور اُنکی پوٹھل بے وقعتی پر۔

مکن ہے کہ مقتضای بشریت کسی کی طرف سے اُنکے دل میں کچھ رنج ہو مگر اُنکے ظاہر حال اور قول و فعل سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا میں کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے تھے۔ کبھی اس شخص کو کسی کا ذکر بُرائی کے ساتھ کرتے نہیں دیکھا۔ جو لوگ اُسکو لوگوں کے سامنے علانیہ گالیان دیتے تھے اُنکا نام بھی وہ ہمیشہ ادب کے ساتھ لیتا تھا۔ اُسکے دل کی صفائی کا سب سے بڑا گواہ اُسکا اخبار تھا جو پچیس برس جاری رہا مگر کبھی کسی کی مذمت یا بُرائی اُس میں نہیں لکھی گئی۔ وہ حسبِ طبع اپنے اخبار کو چھپڑ چھاڑ اور ہزل و حرف گیری و کج بحثی سے پاک رکھتا تھا اسی طرح اپنے اخبار نویس دوستوں کو انجیائی

اگرچہ سرسید فطرۃ نہایت عالی ظرف اور عالی حوصلہ پیدا ہوئے تھے اور عفو و اغماض انکی سرشت میں داخل تھا مگر انکی والدہ کی ابتدائی روک ٹوک اور حسن تربیت سے یہ تمام ملکات انکی طبیعت میں آفریدی زیادہ راسخ ہو گئے تھے۔ اُسی نیک اور عاقل مان نے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ بیٹے کے دل میں یہ بات ڈالی تھی کہ سب سے بہتر تو یہ ہے کہ برون کی بُرائی سے بالکل درگزر کی جائے اور اگر بدلا ہی لینے کا خیال ہو تو اُس بڑے اور زبردست انتقام لینے والے کے انصاف پر چھوڑ دینا چاہئے، اُسی نے لوگوں میں یہ سبق پڑھایا تھا کہ بُرائی کرنے والوں کے ساتھ بُرائی کرنا خود آپ کو ویسا ہی بنانا ہے۔ اُسی تعلیم و تلقین کا یہ نتیجہ تھا کہ جن لوگوں نے اُسکے واجب قتل ہونے کے فتوے حرمین میں جا کر لکھوائے جنھوں نے اُسکو کافر و محدورِ شرطان اور دجال ٹھہرایا جنھوں نے گناہِ خطون میں اُسکو گالیان لکھ کر بھیجیں اور قتل کی دھمکیاں دیں۔ انکی نسبت اُس نے علی رؤس الاشهاد یہ کہا کہ ”میں اپنے کسی بھائی سے کسی بھجنس سے نہ دنیا میں بد لالینا چاہتا ہوں نہ قیامت میں“ میں نہایت ناچیز ہوں مگر اُس سول کی ذریت میں ہوں جو رحمۃ للعالمین ہے، میں اپنے دادا کی راہ پر چلوں گا اور تمام لوگوں کو جنھوں نے مجھکو برا کہا جنھوں نے مجھپر تمام کیا یا آئندہ کہیں اور کریں سب کو معاف کروں گا۔“

فی الحقیقہ اچھی مان ادا لاد کے حق میں خدا کی رحمت ہے جو اُس میں عمدہ اخلاق کی بنیاد ڈالتی ہے اور برائیوں کا نسخہ نیکی کی طرف بھیر دیتی ہے۔ سرسید کے بچپن اور جوانی کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ انکی طبیعت غیظ و غضب پر مجبور ہوئی تھی مگر ان کے حسن تربیت نے گویا انکی ماہیت بالکل بدل دی تھی انکے رشتہ داروں کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ مان نے بیٹے کو کبھی کسی مامان یا نوکر پر بھی سختی یا بد زبانی نہیں کرنے دی اور اگر کبھی کوئی ایسی حرکت اُسے صادر ہو گئی تو انکو ایسی سزا دی گئی جو عمر بھر فراموش ہو۔

یہ خواہش تھی کہ ہندوستان کے چھر کر و مسلمان یکدل و یک جان ہو کر اپنی تمام ہمت، طاقت اور استطاعت اُس کام کے پورا کرنے میں صرف کر دیں اور جب تک اُسکو منہا ترقی تک پہنچالیں دوسرے کام کی طرف اُنکے اٹھا کر نہ دیکھیں۔ یہاں ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ اُنکی یہ خواہش ممکن الوقوع تھی یا نہیں؟ اور آیا فی الواقع جیسا کہ وہ سمجھتے تھے مسلمانوں کی بھلائی کا صرف یہی ایک رستہ تھا کہ سب ملکر اُنکے کام میں مدد کریں؟ مگر اس میں شک نہیں کہ وہ ایسا ہی سمجھتے تھے۔ اگر اسی کا نام خود غرضی ہے تو ہم کو اپنی قوم کی بہبودی کے لئے ایسے بہت سے خود غرضوں کی ضرورت ہے، اور ہم امید کرتے ہیں کہ اگر مسلمانوں میں ایسے دس بیس بلکہ دو چار خود غرض بھی اُور پیدا ہو جائیں تو ساری قوم کا بیڑا پار ہو جائے۔ دنیا میں ایسے نیک آدمیوں کی کچھ کمی نہیں ہے جو ہر ایک کے کام میں مدد دینے اور ہر ایک گاڑی میں کنڈھا لگانے کو موجود ہیں، لیکن ایسے افراد صدیوں اور قرونوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں جو تمام دنیا کو اپنا معاون و مددگار بنانے کا ارادہ رکھتے ہوں اُنکو اپنے کام کی بڑائی کا ایسا یقین ہوتا ہے کہ اُسکو تمام دنیا کے کاموں سے مقدم جانتے ہیں اور چونکہ اُنکو لوگ بھی۔ جون جون اُنکے کام کی حقیقت کھلتی جاتی ہے۔ اُسکو ویسا ہی یقین کرتے جاتی ہیں اسلئے اُنکے دل میں اپنے کام کی عظمت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

کتاب کا نام

بعض اصحاب یہ بھی فرماتے ہیں کہ سید احمد خان نے جو کچھ قوم کی خیر خواہی کے پردہ میں کیا اُس سے محض اپنی ناموری اور شہرت اور گورنمنٹ میں اعزاز حاصل کرنا مقصود تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس حسرت میں مرے جاتے ہیں کہ ہم کو بھی ویسی ہی ناموری اور اعزاز حاصل ہو جائے مگر چونکہ اُسکا استحقاق نہیں رکھتے اسلئے کبھی اپنی مراد کو نہیں پہنچتے۔ وہ نہیں جانتے کہ عزت چاہنے سے

پہننے کی نصیحت کرتا تھا۔ وہ ایک اخبار کے ایڈیٹر کو لکھتا ہے جس میں بطور پنج اخباروں کے کسی کا ہزل آمیز خط چھپ گیا تھا ”کیا آپ کا اخبار بھی مثل دیگر نالائق اخباروں کے نامزد ہونے کو ہر؟ نہایت افسوس اور کمال درجہ افسوس ہے کہ مضمون مذاق نوشتہ.... آپ کے اخبار ۳۰۔ اپریل میں چھپا ہے۔ آپ کا اخبار روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا، لوگوں کا خیال اس طرف رجوع تھا کیا اسکا ارادہ ہے کہ اپنی تمام عزت و قدر کھودے؟ اسی ایڈیٹر کو دوسرے خط میں لکھتے ہیں ”میں دوستانہ صلاح دیتا ہوں کہ آپ اپنے اخبار کو مہذب بنائیں، بدگو کے ساتھ اگر بدگوئی کی تو دونو برابر ہو جاتے ہیں۔ میری نسبت لوگ کیا کیا کچھ نہیں لکھتے ہیں؟ کیا مجھے لکھنا نہیں آتا؟ ہندوستانی ریاستیں ہندوستان میں غنیمت ہیں، ہمیشہ ان کے ساتھ دوستانہ برتاؤ چاہئے۔ ایک دفعہ منشی سراج الدین احمد ایڈیٹر سر مور گزٹ نے اپنے اخبار میں ریاست بھاول پور کی شکایت لکھ دی کہ وہاں سے علیگڑھ کالج کے لئے کچھ چندہ نہیں پہنچا، سرسید نے فوراً انکو متنبہ کیا اور لکھا کہ ”سرکار بھاول پور نے دو دفعہ ہزار ہزار روپیہ کالج کے لئے“ اور چند روز ہوئے کہ ایک ہزار روپیہ واسطے تعمیر مسجد کے محنت کیا ہے، جو کہ اسکی اطلاع آپ کو ضرور تھی اسلئے فی الغدیہ مختصر نیاز نامہ روانہ کرتا ہوں“ الغرض اُسکے تمام جذبات اور تمام پیشین ایک قومی ہمدردی کے جوش میں بالکل جذب ہو گئے تھے؛ اُسکا غصہ تھا تو قوم کے لئے، شکایت تھی تو قوم کے لئے، حرص و طمع تھی تو قوم کے لئے اور خود غرضی تھی تو قوم کے لئے؛ اپنے لئے کھانے پینے اور سونے کے سوا کچھ باقی نہ رہا تھا۔

سرسید پر اکثر خود غرضی کا الزام لگایا گیا ہے، بے شک خود غرضی کو اگر زیادہ وسیع معنوں میں لیا جائے تو ایک کا نام ہے انکو خود غرض کہا جاسکتا ہے، جو عظیم الشان کام انھوں نے قوم کی ترقی کے لئے اختیار کیا تھا اور جسکے بغیر وہ قوم کی حالت کا درست ہونا غیر ممکن سمجھتے تھے۔ بلاشبہ انکی

خود غرضی کا الزام

بڑے بڑے کام اُن سے بن آئے اُنہیں سے ایک بھی ظہور میں نہ آتا۔ اُنہوں نے قوم کی بھلائی کے لئے
 جتنے کام اٹھائے وہ سب قوم کے خیالات سے بالاتر اور اُنکی سمجھ سے باہر تھے؛ یہاں تک کہ ولایت
 میں۔ جیسا کہ اُنکے بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے منصوبوں سے سید محمد علی خان کے
 سوا اپنے اور دوستوں کو بہت کم مطلع کرتے تھے؛ کیونکہ کسی سے یہ امید نہ تھی کہ اُنکی رائے سے اتفاق
 کریگا اور اُنکی ہمت بندھوائیگا۔ پھر جب ہندوستان میں اگر اُنہوں نے اپنے منصوبے طے الاعلان
 پورے کرنے کا ارادہ کیا تو۔ جیسا اُنکو خیال تھا۔ ہزاروں مخالف کھڑے ہو گئے اور جہان تک ہوسکا
 اُنکے کاموں میں کھنڈت ڈالی۔ باوجود اسکے ہر ایک کام میں اُنکو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔
 مخالفین روز بروز کم ہوتی گئیں اور آخر کار اُنکے کام نہایت عظمت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔
 اگر اُنکی رائے میں متزلزل ہوتیں اور اُنکو اپنی تجویزوں اور منصوبوں پر کامل وثوق نہ ہوتا تو کیونکر
 ایسے کاموں پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت ہو سکتی تھی جنکا سارا زمانہ مخالف ہو، اور کیونکر اُنکی کوششیں
 اس درجہ تک کامیاب ہو سکتی تھیں۔ پھر جس قدر اُنکی تجویزیں اور منصوبے پورے ہوتے گئے اور
 جس قدر لوگوں کی مخالفت سبھا اور ناواجب ثابت ہوتی گئی اُس قدر اُنکو اپنی رایوں پر زیادہ
 وثوق ہوتا گیا اور اپنی ہر ایک رائے پر اُنکا اصرار روز بروز بڑھتا گیا۔ اپ چاہو اس خصلت
 کو اُنکی خود رائی اور پیلے پن کے ساتھ تعبیر کرو اور چاہو یہ سمجھو کہ دنیا میں جتنے بڑے آدمی ہو ہیں
 اور جن سے مخلوق کو عظیم الشان فائدے پہنچے ہیں وہ سب ایسے ہی قوی اور مضبوط دل والے
 تھے کہ جو ارادہ کرتے تھے اُس پر ثابت قدم رہتے تھے اور جو منصوبہ باندھتے تھے اُس کو پورا کر کے چھوڑتے تھے۔
 اُنکی رائے میں مستقل اور غیر متزلزل ہوتی تھیں، وہ اپنی غلط رایوں پر بھی ویسا ہی اصرار

عزت حاصل نہیں ہوتی بلکہ عزت کے لائق کام کرنے سے عزت حاصل ہوتی ہے۔ جو لوگ قوم کی خیر خواہی کی اڑ میں اپنی شہرت اور اعزاز چاہتے ہیں نہ اُسے قوم کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے اور نہ خود اُنکو شہرت اور عزت نصیب ہوتی ہے۔ لیکن جو شخص سچے دل سے قوم کی بھلائی کے کام کرتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ اپنی شہرت و عزت کا خواہاں ہو یا نہ ہو۔ وہ قوم کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے اور خود بھی شہرت و عزت حاصل کرتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ”قَوْضُ مَدْحًاكَ وَذَمُّكَ إِلَىٰ أَعْمَالِكَ فَإِنَّهَا تَدْحُكَ بِصِدْقٍ إِنْ أَحْسَنْتَ وَتَذُمُّكَ بِحَقِّ إِنْ أَسَأْتَ“

جو لوگ سرسید کی نسبت ایسے نپت خیال رکھتے ہیں اُنکے جواب میں اُس سے زیادہ کتنا فضول ہے جو نواب عماد الملک نے سرسید کی دعوت کے جلسہ میں۔ جو نظام کلب حیدر آباد میں ۱۸۹۱ء میں منعقد ہوا تھا کہا تھا کہ ”کاش مسلمانوں میں سید احمد خان کے سوا کوئی دوسرا شخص ایسا ہی پیدا ہو جائے جو اپنی ناموری اور شہرت کے خیال سے قوم کے لئے ایسے مفید کام کر کے دکھاوے جیسے کہ اس شخص کے ہاتھ سے سرانجام ہوئے ہیں“

منجملہ اُور بڑے بڑے اوصاف کے ایک وصف جسکو سرسید کے تمام کارہائے نمایاں کی بنیاد سمجھنا چاہئے۔ اُنہیں یہ تھا کہ اُنکو اپنی ہر ایک رے پر خواہ مذہبی مسائل سے متعلق ہو اور خواہ کسی اور معاملہ سے۔ ہمیشہ ایسا وثوق معلوم ہوتا تھا کہ کسی دلیل یا برہان یا مخالف پارٹی کی مجاہدتی سے اُس میں تزلزل آنے والا نہیں۔ اسی لئے اُنکو عموماً خود رے اور ہٹیلہ کہا جاتا تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اُنکی ہر ایک رے جس پر اُنکو اصرار ہوتا تھا۔ ہمیشہ صائب اور غلطی سے پاک نہیں ہو سکتی تھی؛ مگر اس میں شک نہیں کہ اگر اُنکو اپنی رایوں پر ایسا وثوق۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ نہ ہوتا۔ تو جو

لے جی اپنی تعریف اور مذمت اپنے کاموں کو سوچ دو کیونکہ وہی تمہاری بھلائی کے سچے مداح اور تمہاری بُرائی کے سچے مذمت کرنے والے ہیں

بقیہ پارہ دہائی

سرسید کی مذہبی خدمات و اصلاحات اور مذہبی تحقیقات کے متعلق۔ جو کچھ ان کی تصنیفات سے ثابت ہوا۔ بعد ضرورت بیان ہو چکا ہے بیان ہم اُنکے وہ مذہبی خیالات دکھانے چاہتے ہیں جو انھوں نے اپنے پرائوٹ خطوں میں یا کسی پبلک تقریر میں ظاہر کئے ہیں اور جسے اُنکے دل کی اصلی کیفیت اور اصلی واردات منکشف ہوتے ہیں؛ کیونکہ تصنیفات میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ بعد غور و خوض کے تمام پہلو اور جوانب دیکھ کر لکھا جاتا ہے؛ اور جہاں تک مصنف کے امکان میں ہوتا ہے وہ اپنی تصنیف کو کم سے کم اُن لوگوں کی نکتہ چینی سے بچانے میں ضرور کوشش کرتا ہے جنکو وہ اپنے نزدیک مخاطب صحیح جانتا ہے۔ برخلاف اسکے پرائوٹ خطوط جو وہ اپنے محرم اور ہمارے دوستوں کو لکھتا ہے اور پبلک تقریریں جنہیں سوچنے اور غور کرنے کا بہت کم موقع ملتا ہے اُن سے اسکے دل کی ننگی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور اسکے دلی خیالات روز روشن کی طرح سب پر ظاہر ہوتے ہیں پس مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے مذہبی خیالات جو کھلے ڈلے طور پر انھوں نے اپنے رازدار دوستوں کو لکھے ہیں یا کسی پبلک جلسہ میں بے ساختہ اور بے ہمتہ ظاہر کئے ہیں یا جو ایسے ہی کسی اور طریق سے ہم تک پہنچے ہیں اس عنوان میں کسی قدر ترتیب کے ساتھ بیان کئے جائیں۔

جہاں تک کہ سرسید کے اقوال و افعال اور خیالات سے استدلال ہو سکتا ہے اُنکو دین اسلام کی حقیقت پر ایسا یقین معلوم ہوتا ہے کہ اُس سے زیادہ تصویر میں نہیں آ سکتا۔ اگرچہ اُنکے مذہبی خیالات اور مذہبی عقائد مسلمانوں کے کسی خاص فرقہ کے خیالات اور عقائد کے تابع نہ تھے، مگر انکا ایک عقیدہ بھی شاید ایسا نہ نکلے گا جو اصولاً کسی نہ کسی اسلامی فرقہ کے عقیدہ سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اُنکو اہل سنت کی قدیم اصطلاح کے موافق زیادہ سے زیادہ متدع کہا جاسکتا ہے جیسا کہ اکثر اکابر اسلام کو کہا گیا ہے لیکن انکی نسبت کافر

کرتے تھے جیسا صحیح رایون پر؛ کیونکہ وہ انھیں رایون کو اپنے نزدیک صحیح سمجھتے تھے۔

با اینہم اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آخر عمر میں سرسید کی خود رائی یا جو وثوق کہ انکو

اپنی رایون پر تھا وہ حد اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔ بعض آیات قرآنی کے وہ ایسے معنی

بیان کرتے تھے جنکو سنکر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزور اور بودی تاویلیوں کو صحیح

سمجھتا ہے؟ ہر چند کہ اُنکے دوست اُن تاویلیوں پر ہنستے تھے مگر وہ کسی طرح اپنی رے سے رجوع نہ کرتے تھے۔

کالج کے متعلق بھی اخیر زمانہ میں اُنسے بعض امور ایسے سرزد ہوئے جنکو لوگ تعجب دیکھتے تھے؛ مگر حقیقت

انہیں سے کوئی بات بھی تعجب کے قابل نہ تھی۔ جو حیرت انگیز کامیابی باوجود سخت مخالفتوں اور مزاحمتوں

کے سرسید کو اپنے مقاصد میں پہنچی اُسکا لازمی نتیجہ تھا کہ آخر عمر میں۔ جو کہ قوائے کے انحطاط اور فتور کا

زمانہ تھا۔ اُنکو اپنی اصابت رے پر جتنا کہ چاہئے تھا اُس سے زیادہ اعتماد ہو جائے اور وہ اپنی عقل

اور سمجھ کو خطا اور غلطی سے پاک سمجھنے لگیں؛ اسکے سوا اخیر عمر کے صدقات نے بھی اُنکے دل و دماغ پر کچھ کم اثر

نہیں کیا تھا۔ قطع نظر اسکے انسان کا منتہا کمال یہ ہے کہ اُس میں عیب کم اور خوبیاں زیادہ ہوں

نہ یہ کہ وہ عیبوں سے بالکل پاک ہو۔ پس سرسید میں باوجود بے شمار خوبیوں اور حیرت انگیز اوصاف

کے اس قسم کی کمزوریوں کا پایا جانا۔ بجائے اسکے کہ اُنکے اخلاقی نقص کی دلیل ہو۔ اُنکے اعلیٰ درجہ

کی اخلاقی فضیلت اور کاملیت پر دلالت کرتا ہے۔ گویا شاعر نے سرسید ہی کی شان میں یہ شعر کہا تھا

”شَخْصٌ لَا نَامُ إِلَى كَمَالِكَ فَاسْتَعِذْ مِنْ شَرِّ أَعْيُنِهِمْ عَجِيبٌ وَاحِدٌ“

(یعنی تیرے کمالات دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی ہیں سو اُن کی نظر بد سے بچنے کو لئے

کسی عیب کی پناہ لے)

منہد ہیں۔ اور اُسی کے استحقاق عبادت پر۔ جو اُسکو لازم ہے۔ پورا پورا یقین ہو۔ اُسکی ذات کا یقین تو اُسکے وجود بلاشبہ
 ازلی وابدی وحدہ لاشریک لمہونے پر یقین ہوتا ہے۔ اُسکی صفات کا یقین اُسکے مانند صفات کا کسی دوسرے میں
 نہونے پر یقین کرنا ہے۔ تمام صفتیں جو خدا سے منسوب کی جاتی ہیں۔ عالم، رحیم، مہی، اور مثل ان کے اور جو اُنکا
 مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے اور جن میں اُوروں کا اشتراک بھی (جو جبراً تصور ہوتا ہے اُس مفہوم سے اور اُس
 اشتراک سے بھی خدا کی صفات کو مُتَبَرِّک اور مُتَنَزَّہ ماننا اُسکی صفات پر یقین ہوتا ہے۔ اُسکے استحقاق عبادت پر یقین
 یہ ہے کہ کوئی شے سوا خدا کے مستحق عبادت نہیں۔ جو شخص کہ اسطرح سے خدا پر یقین رکھتا ہے وہ مسلمان ہے.....
 ہاں ایسے شخص کی نسبت جو صرف خداے واحد کو مانتا ہو میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ محمدی نہیں..... محمدی ہونے
 کے لئے ضرور ہے کہ ہم اُس شخص پر بھی۔ جسے ہم کو توحید کی نعمت دی..... جس کی وجہ سے ہم نے خدا کو جانا اور
 اُسکی صفات کو پہچانا۔ یقین کریں۔ خود عقل ہی ہم کو ہدایت کرتی ہے کہ جس سے ہم کو ہدایت ہوئی کس طرح
 ہو سکتا ہے کہ ہم اُسکے ہادی ہونے پر یقین نہ کریں اسلام جسکو میں نے ایسے استحکام سے سچا بتایا اُسکی ہدایت
 محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ پس اُس کی تصدیق بالضرور دوسرا رکن اسلام کا ہے
 جو پہلے رکن سے منفک نہیں ہو سکتا۔“

”اس تمام تقریر کا نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص خدا کو مانتا ہے اور وحدہ لاشریک جانتا ہو اور اُسپر یقین رکھتا ہے اور کسی
 نبی کی تصدیق نہیں کرتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تصدیق نہیں کرتا اُس کی نسبت یہ کہنا کہ محمدی
 نہیں یا مراد مفہوم لیکر یہ کہنا کہ وہ مسلمان نہیں۔ بالکل صحیح ہے مگر اُسکو کافر بمعنی مشرک کہنا یا موحّد کہنا اسلام
 کے اصول کی رو سے درست نہیں..... موحّدین محض کے مخلصی النار ہونے یا نہونے پر قدیم سے علمائین بحث چلی آئی ہے
 کوئی کہتا ہے کہ مخلصی النار ہونگے، کوئی کہتا ہے کہ بعد عذاب کے نجات پاویں گے۔ اس بحث کو انھیں علون کرنا

یا متحد یا نیچری یعنی نیچرلسٹ کتنا اسی قسم کا بتان ہے جیسا کہ ہر زمانہ اور ہر ملک اور ہر مذہب میں محققوں اور مصلحوں پر کیا گیا ہے ۔

انھوں نے جو لکچر ۱۸۸۴ء میں بمقام لاہور اسلام پر دیا تھا اُس میں اپنے عقائد صاف صاف بیان کئے تھے ۔ اسلئے اول ہم اُس لکچر کے چند مقامات اس مقام پر نقل کرتے ہیں ۔ لیکن ہر ایک عقیدہ کے ساتھ جو کچھ انھوں نے بطور دلیل کے بیان کیا ہے اُسکو اُنکے لکچر میں دیکھنا چاہئے ۔

اول انھوں نے کہا کہ ”میں ایک جاہل آدمی ہوں نہ مولوی ہوں نہ مفتی نہ قاضی اور نہ داعظہ نہ میری یہ خواہش ہے کہ کوئی شخص ۔ گو وہ میرا کیسا ہی دوست ہو ۔ وہ میرے خیالات کے پیروی کرے ؛ میں رسولوں کے سوا کسی شخص کا ایسا منصب نہیں سمجھتا کہ اُن باتوں میں جو خدا اور بندوں کے درمیان دلی اور روحانی امور سے متعلق ہیں اور جنکو مذہب کہتے ہیں ۔ وہ یہ خواہش کرے کہ لوگ اُسکی پیروی کریں ۔ یہ منصب رسولوں کا تھا اور آخر کو جنابِ سو خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر جنکا ازلی مذہب خدا ابد الابد تک قائم رکھے اور ضرور قائم رکھیں گا کیونکہ جیسا وہ ازلی ہی ابدی بھی ہے ۔ ختم ہو گیا “

پھر کہا کہ ”وہ چیز چسپرو یقین کرنے سے کوئی شخص مسلم یا مسلمان کہا جاسکتا ہے وہ خدا کی توحید ہے ۔ جو شخص خدا کو بحق جانتا ہے اور اُس کی توحید پر یقین رکھتا ہے وہ مسلمان ہے ۔ یہی رکن اول اور رکنِ اعظم اسلام کا ہے اور باقی ارکان اُسکے تحت میں اور اُسکے ساتھ طرح لے ہوئے ہیں جیسے کسی خاص دوا کی معجون ہو اور اُسی کے ساتھ اُسکے اجزاء بھی لے ہوئے ہوں ۔ خدا کو واحد مطلق اور خالق تمام چیزوں کا جاننا اور سمجھنا ۔ نہ صرف جاننا اور سمجھنا بلکہ یقین کرنا ۔ اسلام ہے اور جو اُس پر یقین کرے وہ مسلم ہے “

پھر کہا کہ ”خدا پر اور خدا کی وحدانیت پر اُس وقت یقین ہو سکتا ہے جب اُسکی ذات اور صفات پر جو حقیقتیں

تقریباً

اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ انھوں نے اپنی غلطی سے نہ کراؤنگی تقلید سے۔ انکو دیکھا کہ من دون اللہ تک پہنچا دیا ہے جو لوگ کہ اس مسئلہ تقلید کے برخلاف ہیں اور عدم تقلید کے مسئلہ کی پیروی کرتے ہیں اور اُس کے اجرا میں کوشش کرنی چاہتے ہیں اُنکی بھی عین عزت کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دونوں کا مقصود ایک ہے اور دونوں خدا اور رسول کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان دونوں فرقوں کے سبب باہم رنج و عداوت پیدا ہوئی ہے یہ شیطان کے وسوسے ہیں جو گروہ اسلام کو متفرق کرنے اور قوت کو ضعیف کرنے کی فکر میں ہے۔ حقیقت میں اسلام لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا اور اُس پر دل سے یقین رکھنا اور سب کلمہ گو یوں کو بھائی سمجھنا ہی۔ یہی اختلاف کی وجہ سے اسلام کے مجمع کو متفرق کرنا اصول اسلام کے برخلاف ہے اور اُس برکت کی ناشکری ہے جو خدا نے دی ہے اور جسکو خَالَعَتْ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔

تقریباً

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر مندرجہ ذیل تفسیر کی ”ایک ایسے شخص نے جو قبیلہ کنکریلہ ملک میں پیدا ہوا جو چھوٹی عمر میں یتیم ہو گیا جس نے کسی دارالعلم میں تعلیم پائی نہ سقراط اور بقراط اور افلاطون کے مسائل کو سنا نہ کسی استاد کے سامنے تعلیم کو بیٹھا نہ حکما اور فلاسفوں اور پولنگل و مارٹل سافس کے عالموں کی صحبت اٹھائی بلکہ چالیس برس اپنی زندگی کے تائزیت یافتہ اور باخلاق اونٹ چرانے والوں میں بسر کیے چالیس برس تک بھڑا سی قوم کے جو بت پرستی اور باہمی جنگ و جدال میں مبتلا تھی اور چوری اور زنا کاری پر عورت مرد کو فخر تھا۔ اور کسی کو نہیں دیکھا وہ دفعۃً اپنی تمام قوم کے برخلاف اٹھا چاروں طرف سے وہ بت پرستی میں گھرا ہوا تھا مگر اُسے کہا تو یہ کہا کہ ”لا الہ الا اللہ“ اُسے نصرت یہ کہا ہی نہیں بلکہ تمام قوم سے بھی جو سیکڑوں برس سے لات و منات و عزت کو پوجتی آتی تھی۔ یہی کہو دیا اُن تمام باخلاقوں اور ام مومل عادتوں کو تمام قوم سے مٹوا دیا بتوں کو زمین پر گر دیا انکو توڑ دیا اور خدا کے نام اور خدا کی پرستش کو تمام عرب کے جزیرہ نما میں بلبست کر دیا۔

چھوڑ دو اور ہلکوا اپنے حبیب کے اس قول پر رہنے دو کہ ”علیٰ رغبنا فی ابی ذر“

پھر کہا کہ ”وحدانیت اور رسالت کی تصدیق کے بعد اور حیرین بھی اسلام کے ساتھ ہیں جسکو خدا تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے؛ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ وغیرہ۔ ان فرائض کے ادا نہ کرنے والے کو ہم کفار اور ان کے منکر کی نسبت وہی کہیں گے جو رسالت کے منکر کی نسبت کہا کہ وہ محمدی نہیں یا بمعنی مرادف مسلمان نہیں۔ اُس کے مخالف فی النار ہونے یا نہ ہونے کی وہی بحث پیش آجاتی ہے جو ابھی موحہ محض کی نسبت میں نے بیان کی“

پھر کہا کہ ”شُرک کی بحث۔ جو کہ اسلام کا پورا دشمن ہے اور جس کے ساتھ اسلام جمع ہی نہیں ہو سکتا۔ بہت بڑی ہے؛ مگر میں اس وقت ایک شمع اُس کا بیان کروں گا۔ جس طرح خدا کو اپنی ذات و صفات میں وحدت ہے اسی طرح رسول کو تبلیغ احکام یا احکام شریعت کے قرار دینے میں وحدت ہے اور کسی کو اُس میں شرکت نہیں پس جو شخص رسول کے سوا کسی اور شخص کے احکام کو دین کی باتوں میں اس طرح پر واجب العمل سمجھتا ہے۔ کہ اُن کے برخلاف کرنا گناہ ہے اور اُسی کی تابعداری کو باعث نجات یا ثواب سمجھتا ہے۔ وہ بھی ایک قسم کا شرک کرتا ہے جسکو میں شرک فی اللہ سے تعبیر کرتا ہوں۔ خدا نے یہود و نصاریٰ دونوں کو اسی بات پر ملزم ٹھہرا کر فرمایا ”اتخذوا احبارہم و رهبانہم ادبایا من دون اللہ“ پس اس طرح کی بیروی اربابا من دون اللہ تائب نہ بن سکتی ہو۔ میری اس تقریر سے آپ یہ تصور نہ کریں کہ میں ائمہ مجتہدین کے برخلاف رہا کرتا ہوں۔ نہیں، میں انگوامت کا سرتاج اور اُن کے اجتہادوں اور اختلافوں کو باعث رحمت سمجھتا ہوں۔ یہ بھی آپ خیال نہ کریں کہ میں اُن کے پیرو مقلدین کو برا کہتا ہوں یا تقلید کو برا جانتا ہوں مگر اس قدر ضرور سمجھتا ہوں کہ مقلدین کے بعض افعال

فرائض منصوصہ

شرک فی اللہ

ائمہ مجتہدین

مقلدین

یہ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جسکو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے ابوذر غفاری سے، اور جبکہ مضمون یہ ہے کہ آنحضرت نے ابوذر سے فرمایا ”ما من عبد قال لا الہ الا اللہ ثم مات علی خلاف الاصل دخل الجنة“ انھوں نے یہ سن کر تین بار ازراہ تعجب یہ الفاظ عرض کئے کہ وائے خدائی وائے سق؟ اور آپ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ وائے سق اور میری دفعہ اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ علی رغبنا فی ابی ذر

اور ہدایت اُسکے مثل بے شک نہیں ہو سکتی۔ میں اسکو بھی معجزہ بلکہ اصلی معجزہ قرآن مجید کا سمجھتا ہوں۔

”قرآن مجید اُس زمانہ میں نازل ہوا جو جاہلون اور نادانوں اور ناتربیت یافتہ لوگوں کا زمانہ تھا، وہ اُس زمانہ کے جاہل لوگوں کی ہدایت کے لئے بھی تھا اور اُن اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کی ہدایت کے لئے بھی تھا جو اُس وقت کی دنیا میں تھے اور جو آئندہ دنیا میں ہونے والے تھے، ضرور تھا کہ اُسکی ہدایتیں اس طرح پر بیان کی جائیں کہ اُس سے ایک صحرائی اونٹ چرنے والا بدو اور ایک اعلیٰ درجہ کا حکیم سقراط اور بقراط دونوں برابر فائدہ اٹھائیں۔ قرآن مجید ہی صرف ایسا کلام ہے جس میں یہ صفت موجود ہے اور جس سے مختلف درجوں بلکہ متضاد حیثیتوں کے لوگوں کو یکساں ہدایت ہوتی ہے۔ ایک جاہل بدو، ایک مقدس مولوی اُسکے لفظی معنوں سے جیسی ہدایت پاتا ہے ایسا ہی ایک فلاسفر انہیں الفاظ کے مقصود سے ویسی ہی ہدایت پاتا ہے اور کسی لفظ کو نیچر یا فلسفہ سے خلاف نہیں پاتا۔ کسی زبان میں۔ فرنج، لیٹن، عربی، فارسی، سنسکرت وغیرہ میں کوئی ایسی کتاب لکھو یا اگلے زمانہ کی لکھی ہوئی تبادو جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین فلسفہ اور حکمت کے بھرے ہوئے ہوں اور پھر نہایت دلکش اور سہل الفاظ میں اور پھر اُس سے جاہل اور عالم عامی اور فلسفی سب کو یکساں فائدہ حاصل ہو اور سب کے دل پر یکساں اثر ڈالے، نہایت نامکن ہے۔ مگر قرآن مجید ہی ہے جس میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں اور یہی اُسکا اصلی اور سچا اور واقعی معجزہ ہے۔ اُسکے مسائل جیسے اُس زمانہ میں سمجھے جاتے تھے جبکہ زمین ساکن مانی جاتی تھی ویسے ہی اب بھی سچے اور قابل تسکین ہیں جبکہ سورج ساکن اور زمین کھومتی مانی جاتی ہے۔ اور اگر یہ حکمت و فلسفہ جو اس زمانہ میں سچی مانی جاتی ہے اگر آئندہ غلط ثابت ہو جیسے یونانی حکمت اب غلط ثابت ہوئی ہے۔ اور حکمت و فلسفہ کے بالکل نئے اصول سچے ثابت ہوں تو بھی میں دعویٰ کرتا ہوں کہ قرآن مجید ویسا ہی سچا ثابت ہوگا جیسا کہ اب سچا ہے اور غور کرنے کے بعد ثابت ہوگا کہ جو کچھ غلطی تھی وہ ہمارے علم کا نقصان تھا“

وہ جزیرہ جو ابراہیم اور اسمعیل کے بعد سے ہزاروں ناپاکیوں سے ناپاک ہو گیا تھا پھر اُسکو اُسکی اصلی پاکی اور دین ابراہیم کی بزرگی تک پہنچا دیا۔ چالیس برس بعد کس نے یہ نور اُسکے دل میں ڈالا؟ جس نے نہ صرف جزیرہ عرب کو بلکہ تمام دنیا کو روشن کر دیا۔

”اے لاکھ لاکھ اللہ کی تعلیم کے بعد جو احکام دین کے اور اخلاق کے لوگوں کو بتائے کیا کوئی فلاسفر اس سے زیادہ بتا سکتا تھا جو اُس اُمتی نے بتائے؟ صرف بتائے ہی نہیں بلکہ اپنے پاگل اپنی پاک زبان کے اثر سے لوگوں کے دلوں میں بٹھلا دئے۔ یہ کام وہ تھا جو نہ کسی فلاسفر سے ہو سکتا تھا نہ کسی سلطان مقتدر سے۔

پھر کیا چیز اُس پھر میں تھی جس نے نہ جزیرہ عرب کو بلکہ تمام دنیا کو خدائی کا کرشمہ کھلا دیا؟ کوئی سخت سے سخت ہریت اور لامذہب بھی اگر ایسے شخص کو معاذ اللہ نبی نہ مانے گا تو اُسکو یہ ماننا تو ضرور پڑے گا کہ اگر بعد خدا کے کوئی دوسرا شخص رنگ ہے تو یہی ہے۔ روحی فداک یا رسول اللہ۔ پس جو شخص نبوت کی حقیقت کو سمجھ لے گا تو امکان سے خارج ہے کہ محمد رسول اللہ کی تصدیق نہ کرے۔“

پھر قرآن کے معجز ہونے پر مندرجہ ذیل تقریر کی ”قرآن مجید جو تیرہ سو برس سے معجز یقین کیا جاتا ہے میں بھی اُسکو معجز ماننا ہوں مگر ہمارے قدامت صرف ایک اوپری دلیل اُسکے معجز ہونے کی قرار دی تھی؛ یعنی فصاحت اور کلام کی عمدگی اور وہ بھی اس وجہ سے کہ آج تک کسی بشر سے نہ کسی فصیح اور بلیغ سے اُسکی ایک یا دس آیتوں کو برابر بھی ویسا فصیح کلام نہیں کہا گیا۔ باوجودیکہ اُسے بطور مقابلہ کے کہا گیا کہ اگر کہہ سکتے ہو تو کہ لاؤ۔ بلاشبہ میں بھی قرآن مجید کو ایسا ہی فصیح و بلیغ تسلیم کرتا ہوں۔۔۔۔۔ لیکن یہ دلیل۔۔۔۔۔ ایسی نہیں ہے جو غیر متعقد لوگوں کے مقابلہ میں پیش کی جاسکتی ہو اور اُنکے دل کو تسلی دے سکتی ہو۔ میں ایک اور دلیل رکھتا ہوں جسکو میں اس دلیل سے زیادہ مضبوط سمجھتا ہوں۔ وہ دلیل کیا ہے؟ وہ ہدایتیں انسان کے لئے ہیں جو قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں۔ کوئی

اعجاز قرآن

میں اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا۔ جو شخص جس مذہب میں پیدا ہوا ہے خاموشی سے اُٹھیں چلے جانا دوسری بات ہو، اور اُسکی تائید پر مستعد ہونا دوسری بات ہے، پچھلی بات اُس شخص کو زیبا نہیں ہے جس نے پورا یقین اُسپر خود نہ کر لیا ہو۔ میں نے علی الذہن ہو کر اسلام پر بہت کچھ غور کی ہے اور نہایت غور و فکر کے بعد میرے دل میں اس بات کا یقین ہوا، کہ دنیا میں کوئی مذہب سچا ہے تو وہ اسلام ہی ہے، اور میں اس دلی یقین پر اُسکی تائید کرتا ہوں۔ نہ اس وجہ سے کہ میں مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہوں اور مسلمان ہوں۔“

یہاں تک سرسید کی اُس تقریر کا خلاصہ تھا جس میں انھوں نے بمقام لاہور اسلام کی نسبت اپنی خیالات ظاہر کئے تھے۔ اب ہم اُنکے بعض پراٹھ خطوط سے چند مقالات انقاط کرتے ہیں جو انھوں نے مذہبی خیالات کے متعلق اپنے دوستوں کو لکھے ہیں۔ ان خطوں میں کچھ تو وہ ہیں جو ہم کو منشی سراج الدین احمد کے مسودات میں دستیاب ہوئے ہیں اور کچھ ہم نے اور ذریعوں سے ہم پہنچائے ہیں۔

منشی سراج الدین احمد

اگرچہ سرسید عام لوگوں کے کافرو ملحد کہنے سے کچھ ناراض نہ ہوتے تھے مگر جو لوگ اُنکے حالات سے بخوبی واقف تھے اگر وہ اُنکی نسبت ایسا خیال بھی کرتے تھے تو اُنکو سخت ناگوار گزرتا تھا۔ جب وہ ہندوستان سے ولایت جانے کو تھے ایک خط حکیم غلام نجف خان مرحوم نے جنکے ساتھ اُنکی اور اُنکے بڑے بھائی کی دوستی اخوت کے درجہ تک پہنچ گئی تھی۔ اُنکے پاس بھیجا تھا جس میں غالباً اس قسم کی کوئی بات ہوگی کہ ولایت جا کر مذہب کو نہ چھوڑ دینا یا عیسائی نہ بنانا۔ انھوں نے ولایت پہنچ کر اسکا یہ جواب بھیجا ”معاذ نے آپ کا عنایت نامہ مجھے دیا تھا۔ میں نے خیال کیا تھا کہ جب میں ولایت سے پھر آؤں گا اور آپ سے انشاء اللہ تعالیٰ ملوں گا اُسی وقت جواب دوں گا۔ حقیقت میں وہ عنایت نامہ محبت امیر ہنسی کی بات تھی نہ جواب

فرائض منصوصہ

پھر نماز اور روزہ وغیرہ کی نسبت اس طرح بیان کیا ”غیر مشتبہ منصوص مسائل جیسے نماز روزہ حج اور زکوٰۃ
 ہیں اور جو خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرض بتائے ہیں انکو میں بھی اس طرح فرض سمجھتا ہوں جیسے ایک جاہل مسلمان
 یقین کرتا ہے۔ لیکن جب انہی مخالف کا حلقہ ہوتا ہے تو انکی لیت اور صلیت بتانی ضرور پڑتی ہے اگر یہ بحث پیش ہو
 کہ ہاتھ مونہ دھونے کو (یعنی وضو کو) عبادت سے جسکا تعلق دل سے ہے۔ کیا تعلق ہے؟ حدیث کے بعد محل
 مونہ میں کلی کرنے سے کیا تعلق ہے؟ نماز کو جو ایک روحانی فعل ہے اٹھنے بیٹھنے سونچا اور سرن اوپنے کرنے سے
 کیا علاقہ ہے؟ تو مجبوری ہمکو اسکی صلیت اور نماز کے ارکان کی لیت پر بحث کرنی ہوگی اور سمجھانا پڑے گا کہ وضو کیوں
 فرض کیا گیا ہے؟ اور نماز کے ارکان کیوں قرار پائے ہیں“

دین اسلام

پھر دین اسلام کی نسبت اس طرح بیان کیا ”میرا عقیدہ ہے کہ مذہب اسلام ایک مکمل اور آخری مذہب
 ہے۔ مخلص خدا کے اس قول پر یقین کامل ہے کہ ”الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتہ
 ورضیت لکم الاسلام دیناً“ مگر جب مفسرین (خدا انہر رحمت کرے) اس تکمیل کے یہ معنی بتائیں کہ خدا
 ظان جانور کو حلال اور ظان جانور کو حرام بتا کر دین کو کامل کر دیا ہے۔ تو میں اُنسے مخالفت کرتا ہوں گو کہ وہ
 فخر الدین رازی ہوں، یا ملا علی شمشاد پوری، یا اُنسے برعکس اور کوئی۔ اور اُن بزرگوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں
 کہ جناب اگر یہی معنی تکمیل دین کے ہیں تو سلام! میں کہتا ہوں کہ یہ تفسیر غلط ہے، دین اسلام خدا کی توحید کے
 کامل طور پر بتانے سے، اُس کے ہر ایک فروع و اصول کو روشن کر دینے سے مکمل ہوا ہے یہی تکمیل دین کی ہو اور
 اسی تکمیل کے سبب وہ آخری دین ہے اور اسی تکمیل کے سبب قیامت تک بلکہ قیامت کے بعد بھی بغیر تبدیل کو قائم رہے گا
 پھر لکچر کے اختتام پر یہ الفاظ کہے کہ ”جو تائید اسلام کی میں نے اپنی دہشت میں اختیار کی ہے وہ
 اسوجہ سے نہیں کی کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہوں اور خواہ خواہ مجھکو اسلام کی تائید کرنی چاہیے“

جانب اسلام کی وجہ

نہ چھوڑینگے اور خاص اُس روشنی کو جو قرآن و حدیث سے حاصل ہوتی ہے نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کریں گے تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائیگا۔ اسی خیر خواہی نے مجھ کو برا لکھتے کیا ہے جو میں ہر قسم کی تحقیقات کرتا ہوں اور تقلید کی پروا نہیں کرتا؛ ورنہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ میرے نزدیک مسلمان رہنے کے لئے اور بہشت میں داخل ہونے کے لئے اللہ کا ہر تودرکنار مولوی جٹو کی بھی تقلید کافی ہے۔ لا الہ الا اللہ و محمد رسول اللہ کہ لینا ہی ایک ایسی طہارت ہے کہ کوئی نجاست باقی نہیں رہتی۔ پس میں چاہتا ہوں کہ بدلائل و مباحثہ مجھ کو قابلِ کردار بنائے کہ میری یہ رے صحیح ہے یا غلط؟ اور میں دشمن اسلام ہوں یا مثل ابوبکر اور عمر کے دوست اسلام ہوں؟ آیا میں جو اسلام کو ابو حنیفہ اور شافعی سے زیادہ دوست رکھتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ ابو حنیفہ اور شافعی تو درکنار ابوبکر اور عمر بھی بالفرض اگر کچھ غلطی کریں تو بھی اسلام میں کچھ نقص نہیں ہو سکتا، اور میرا یہ اعتقاد کہ اگر تمام عالم کا فرس ہو جائے یا تمام عالم فرشتہ ہو جائے تو خدا کی خدائی میں کچھ زیادتی یا نقصان نہیں ہوتا، اسی طرح اسلام کے مسائل کا حال ہے کہ اگر تمام مجتہدین صواب پر ہوں یا خطا پر اصل اسلام کی جو روشنی ہے اُس میں کچھ نقص نہیں ہے پس یہ اعتقاد میرا صحیح ہے یا غلط؟

پھر اسی خط میں لکھتے ہیں ”لوگوں نے جو اخباروں میں مجھ کو برا بھلا لکھا اس سے آپ کو غصہ آگیا معلوم نہیں کہ آپ نے اسے اڑھل میں کیا لکھا ہوگا؟ مگر مجھ کو کمان تک بچاؤ گے؟ میں تو ہر قسم کی تیاری طاعت ہو گیا ہوں اور روزِ بڑا ہوتا جاؤنگا۔ شاید بعد میرے کوئی زمانہ آوے جب لوگ میری دلسوزی کی قدر کریں۔“

ایک اور خط میں لکھتے ہیں ”میں سچ کہتا ہوں کہ جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچا یا ہو آنا کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ شخص اسلام کے حق میں تقلید نہ لکھتا ہے بھی زیادہ زہر قاتل ہے۔ بلاشبہ ہر نئے علما کو مثل یہود و نصاریٰ کے آریابا من دون اللہ سمجھ لیا ہے خدا اس گناہ سے سب مسلمانوں کو بچائے۔ آمین! اور میرے دوستوں کو اور

لکھنے کے لائق۔ اگرچہ میں یقینی سمجھتا تھا کہ آپ کے خیالات وہی قدیم پُرانے دینیانوسی ہندوستانیوں کے ہیں حال کے زمانہ کی جو باتیں ہیں نہ وہ ذہن میں آتی ہیں اور نہ پسند ہوتی ہیں، مگر خاص جس امر کی نسبت آپ نے مجھے لکھا اُس کا نہایت تعجب ہے: اس لئے کہ میری نسبت اس قسم کے خیالات کی البتہ جاہل ناواقف آدمی کو گنجائش ہو سکتی ہے، یا دشمن و حاسد جو کچھ چاہیں خیال کر سکتے ہیں، مگر آپ کو اس قسم کا خیال کیوں ہوا؟ شاید نقصاً محبت ایسا خیال ہوا ہو اس لئے کہ دوست کو ہمیشہ بُرے بُرے خیالات گذرتے ہیں۔ جیسا کہ میں خود اپنی تحقیق سے نہ تقلید سے۔ دین اسلام کو حق سمجھتا ہوں اُس قدر یقین آپ کے شہر کے بُرے بڑے لمبی ڈار بھی والوں کو اور ہزار ہزار دانہ کی تسبیح والوں کو اور جو مکہ و مدینہ سے پیر و خلیفہ و مرشدی کا جُتہ و دستار لیکر آتے ہیں انکو بھی نہیں ہے والسلام“

ایک خط میں سید محمد علی خان کو لکھتے ہیں ”میں سچ اپنے دل کا حال لکھتا ہوں کہ اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقات حقیقت اسلام پر توجہ نہ دیتا تو یقینی مذہب چھوڑ دیتا۔ فرض کرو کہ تقلید چھوڑنے میں میں کسی مسئلہ یا عقیدہ میں غلطی میں پڑوں، چندان نقصان نہیں، مسلمان تو ہونگا... جناب مذہب اسلام تو آفتاب بھی زیادہ روشن اور سب کی آنکھوں کے سامنے ہے وہ کوئی معما اور بدرجہا چمکا شر نہیں جس کے حل کرنے کو مولوی امام بخش صہبائی اور میر حسین معامی درکار ہوں۔ خدا فرماتا ہے ”ہو الذی بعث فی الاممیین رسولاً منہم“ ذرا عربانی سے قرآن کھول کر ملاحظہ فرمائے اُس میں یہی لفظ ہیں یا کجاؤ انکے یہ الفاظ ہیں ”ہو الذی بعث فی الفلسفیین رسولاً“

ایک خط میں لکھتے ہیں ”بھائی جان بنو! اب یہ وقت نہیں ہا کہ میں اپنی مکتوبات ضمیمہ کو نقلی سکھوں۔ میں کہتا ہوں اگر کوئی تقلید

لے بیان تقلید سے مراد ہمارے مین سلف کی پیروی کرنا ہے نہ تقلید مصطلح فقہاء

تقلید کا مخالفت

تقلید کا مخالفت

”مگر ایک اور عمدہ بات میں نے یہ ثابت کی ہے کہ نام آنحضرت کا سچا توریث میں موجود ہے، چنانچہ عمری توریث میں وہ لفظ اور نشان شامل آنحضرت کے بجنسہ نکالے ہیں مگر افسوس ہے کہ اس پر بھی میں کافر ہوں اور یارانِ بافروش و عطاگو مسلمان !! کیا انھوں نے خدا کو بھی اپنا ہی سانا بیٹا یقین کیا ہو؟ میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر لوگ جھکوا کر کہتے ہیں اگر خدا مجھے اُس صبرِ کامل عطا کرے تو میرے لئے ایک نہایت عمدہ زاویہ اور دوسری دنیا کے لئے ہے جہاں ہمیشہ رہنا ہے ایسا کس کا نصیب جسکو نہایت عمدہ زاویہ اور راہ وہاں کے لئے ہاتھ آوے“

ایک اور خط میں درباب طیور منخفہ اہل کتاب کے لکھتے ہیں

”جو کچھ فتنہ آپ کو مجھ پر درباب گردن مروڑی ہوئی مرغی کے ہو وہ میری گردن پر مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ عالمی ترکستان (یعنی ترکی) کی بلا کسی تامل کے اسکو جائز کیا ہے، تمام ترک جنگی خاک پا ہونے کی بھی ہکولیاقت نہیں ہے۔ سب بے تامل کھاتے ہیں۔ ایک بہت بڑے دیندار عالم نے جو ترکستان (یعنی ترکی) سے آیا تھا اور ایسا سخت مذہب میں تھا کہ باوجود میرے اصرار کے فوٹو گرافت کی تصویر کھچوانے سے انکار کیا۔ درباب گردن مروڑی مرغی کے مجھے کہا کہ ”هذا قصور الله“ لا جاس لسانی اكله قد اكل الله لنا طع اهل الكتاب“ علاوہ اسکے جو شخص حقیقاً اسکا رنگ نہ نہایت عمدہ بات ہے، مگر اسکو مسئلہ شرعی ٹھیکرانا اور اسکے ترکین کو اکل حرام قرار دینا نہایت مضار اور اسلام کے پانوپرست غلط تفسیرِ زور ہے۔ اس فقرہ کے معنی آپ کی سمجھ میں نہیں آئیے؛ انشاء اللہ عنقریب مت عالی میں حاضر ہو کر اسکی تفسیر عرض کروں گا۔ ایک شخص نے اُسے دریافت کیا کہ جو شخص منکر خدا ہو وہ بھی جیسے کہ بعض لوگ کہتے ہیں۔ مذہب ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اسکے جواب میں سرسید لکھتے ہیں ”سوائے توحید ذات باری تعالیٰ کو ماننے کے تہذیب نفس انسانی اور شایستگی حاصل نہیں ہو سکتی“

مولوی محمد علی میرے پیارے دوست کو سب سے پہلے آئین ثم آئین ثم آئین

ایک اور خط میں لکھتے ہیں ”تصب خود بخلاف شریعت ہے، ہندوستان کے مسلمان آئین گرفتار ہیں خدا کی نامہ ربانی اُنکی طرف رجوع ہے.... پھر اسکا علاج کیا ہے؟ خدا کے ساتھ لڑائی غیر ممکن ہے۔ دنیا میں جو کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں اور ہر روز چھپتی ہیں اور کبھی ہیں اُن میں جو حالات مسلمانوں کے لکھے جاتے ہیں اُنکو دیکھ کر مرجانے کو دل چاہتا ہے۔ بہت سی باتیں اُن میں بلاشبہ سچ ہیں اور حقیقت ہم نے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے اسلام کو بدنامی ہے۔۔۔۔۔ میری صرف ایک لفظ لکھنے سے کہ ”جوان ہیں“ نالائقوں کو اس قدر طیش کھانے کا بہانہ ہاتھ لگ گیا ہے اور انگریزی اخباروں اور تاریخوں میں جو اوصاف چھپ رہے ہیں اُن سے کسی کم بخت کو غیرت نہیں آتی۔

ایک اور خط میں خطبات احمدیہ کے بعض مضامین کے متعلق لکھتے ہیں ”افسوس صد افسوس ہمارے ہاں کے مولویوں نے ایسے صاف اور روشن مذہب کو ایسی لٹو اور چل کہا نیوں میں ڈال دیا ہے، اور جب کوئی چاہتا ہے کہ اُسکی تحقیقات اور اُسپر غور کیا جائے تو اُسکو کافر، لامذہب، مرتد، عیسائی، حرام خور، مری مرغی کھانے والا بتاتے ہیں“

”آیہ یاتی من بعدی اسمہ احمد کا نہایت عمدہ بیان مسٹر سگنر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے اور بخوبی مجھے اس آیت کا موجود ہونا انجیل یوحنا میں ثابت کیا ہے اور وہ وہی مشہور لفظ فارقلیط کا ہے، مگر جس طرح کہ اُسکو مسٹر سگنر نے ثابت کیا ہے اُسکو پھر حکمران مسلمان متعصب مولویوں کو غیرت کرنی چاہئے کہ جو کام اُنکے کرنے کا تھا اُسکو ایک غیر مذہب کے منصف شخص نے کیا ہے۔ میں نے آئین کچھ اضافہ نہیں کیا، بعینہ مسٹر سگنر کی تحریر نقل کر دی ہے“

تصبر

اسلام
کا حلیہ

نہیں لانا چاہئے پہلے امورِ عظیم اور اصول کو رائج کرنا چاہئے، تصاویر و تائیل کے جائز و ناجائز ہونے کے دلائل موجود نہیں، اسکی نسبت فیصلہ کرنا اور ناجوازی و جوازی کی وجہ بتانا نہایت دقیق اصول پر مبنی ہے۔ تصاویر کا رواج خود بخود ہوتا جاتا ہے، پس جو بیل کر چلے، بابے اُسکو آرائے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔“

کسی نے سرسید کو بذریعہ تحریر کے اطلاع دی کہ ایک مولوی صاحب نے آپ کی مصنفہ کتابوں کو اپنے ایک شاگرد سے جو رئیس اعظم ہے۔ چھین کر آگ میں جلادیا۔ سرسید اُسکے جواب میں لکھتے ہیں ”اُسکو (یعنی مولوی کو) اس عمل سے کیا فائدہ ہوا؟ اگر وہ ہمارے مطبع سے بہت سی کتابیں خرید کر جلاتا تو مطبع کو بھی فائدہ ہوتا اور اُسکا بھی دل ٹھنڈا ہوتا۔“

مستورات کے پردہ کی نسبت اُنکی رائے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے بالکل برخلاف تھی۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اُنکی عورتیں منہ کھولے بے حجاب بازاروں میں پھریں۔ ایک دفعہ شاید مولوی عبدالحلیم شرر نے اپنے اخبار میں اُنکی نسبت لکھ دیا تھا کہ وہ پردہ کے مخالفت ہیں۔ اسپریشی سراج الدین نے اُنسے اس باب میں اُنکی رائے دریافت کی۔ سرسید اُنسے خط کے جواب میں لکھتے ہیں ”میں پردہ کی رسم کا متعدد وجوہ سے نہایت طرفدار ہوں اور بالخصوص ہندوستان میں۔ امین میر کچھ اجتہاد نہیں ہے نہ میں نے کبھی اسپر غور کیا، مگر فقہائے اسلام کا یہ مسئلہ ہے کہ منہ اور ہاتھ پہنچے تک اور پانوں ٹخنے تک ستر میں داخل نہیں ہیں۔ فقہائے متاخرین نے بسبب فساداتِ زمانہ کے منہ کو بھی پردہ میں داخل کیا ہے۔ مولوی شرر نے میری نسبت غلط لکھ دیا ہے، شاید میں نے کسی کے سامنے کہا ہو گا کہ شرعاً منہ اور ہاتھ پردہ میں داخل نہیں ہیں، اُنکو چاہئے کہ خود فقہ کی کتابیں دیکھیں۔“

ایک دفعہ کسی شخص نے مسئلہ متعہ پر بحث کرتے ہوئے اخبار میں سرسید کی نسبت یہ لکھ دیا

سرسید مذہبی مسائل میں اُس میدان سے۔ جسکو انھوں نے اسلام اور اہل اسلام کی حمایت کے لئے لازم پکڑ لیا تھا۔ سروجاؤ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر کوئی نبوت بلکہ خدائی کا بھی دعوے کرتا تو انکو اُس کا رد لکھنے سے کچھ سروکار نہ تھا، وہ اکثر معتزلیں کے حلون یا اعتراضون کو ہنسی میں ملال دیتے تھے اور اپنے دوستون کو فضول بحثون سے جنسے مسلمانوں میں تفرقہ پڑنے کے سوا کوئی نتیجہ پیدا نہ ہو۔ ہمیشہ روکتے رہتے تھے اور کبھی کسی ایسے سلسلے سے تعرض نہ کرتے تھے جو اُن کے دائرہ کی حدود سے باہر ہو۔

ایک شخص نے مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی نسبت۔ جنکو صاحب الہام اور مثیل مسیح ہونے کا دعوے ہیں۔ ایک طویل خط سرسید کو لکھا۔ اُسکے جواب میں وہ لکھتے ہیں ”مخدومی! شخص ہانگ کہ شہد کی مکھی بھی الہام کا دعوے کر سکتی ہے مگر اُسکا نتیجہ کیا؟ اور کسی کو کسی کے الہام سے کیا فائدہ اور نقصان پہنچ سکتا ہے؟“ انا دین میں وہ جو اُنسے جھگڑا کرتے ہیں والسلام

ایک اور شخص نے مرزا صاحب کے خیالات کی مخالفت میں کچھ لکھنے کا ارادہ سرسید سے ظاہر کیا اُسکے جواب میں وہ لکھتے ہیں ”آپ جو سالہ نسبت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی لکھنا چاہتے ہیں کیا آپ کو بھی کچھ مانجھو لیا ہو گیا ہے؟ اس لغو حرکت سے کچھ فائدہ نہیں اور محکمہ ہرگز اس قدر فرصت نہیں ہے کہ نسبت حضرت مسیح کے دوبارہ آنے کے۔ جو محض غلط روایات پر مبنی ہے۔ کچھ لکھوں“

منشی سرارج الدین نے اُنسے دریافت کیا کہ گھر میں تصویر رکھنی کیسی ہے؟ اُسکے جواب میں لکھتے ہیں ”ان چیزوں کو موجود حالت میں بحث میں لانا مسلمانوں کی ترقی میں ہرج ڈالنا اور انکو متوحش اور زیادہ متفرک کرنا ہے۔ یہ امور نہایت جزئیات ہیں جنکی بحث سے ترقی تعلیم اور ترقی تہذیب میں ہرج پڑے گا۔ پس اُسکو ہرگز بحث میں

”جہان و باہر وہاں داخل ہونا اور وہاں کے مقام سے چلا جانا دونوں کی یکساں حالت ہے۔۔۔ اگر اسباب کی طرف توجہ منحوع ہو تو جہان و باہر وہاں جانے کا امتناع غلط ہو جاتا ہے اُسی دلیل سے جس دلیل سے کہ ایسے مقام سے چلا جانا ممنوع ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب شام کو جا رہے تھے اور معلوم ہوا کہ وہاں وہاں تو صحابہ سے صلاح کی اور آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ مت جاؤ! اُس وقت ابو عبیدہ نے کہا ”اَفِرَاکُمِنْ قَدَرِ اللّٰهِ“ اُنکے جواب میں حضرت عمر نے کہا ”نَعَمْ نَفِیْ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ اِلٰی قَدَرِ اللّٰهِ“ پس اس جواب سے ٹھیک مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور یہی جواب اُس شخص کی جانب سے ہوتا ہے جو اس مقام سے جہان و باہر چلا جائے اور کوئی شخص اُسکو کہے کہ افراد امن قدر اللہ تو اُسکا جواب یہی ہوگا کہ نَعَمْ نَفِیْ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ اِلٰی قَدَرِ اللّٰهِ۔ پس جب ان تمام حدیثوں اور اُنکے الفاظ و مقاصد پر غور کرو تو یہی مطلب حکم پایا جاتا ہے جو میں نے بطور خلاصہ کے اول لکھ دیا ہے۔ یہ بات کہ جو عزیز اقربا۔ جن کی تیمارداری اُسکے ذمہ ہے اور وہ مبتلا ہوں اور وہ شخص اُس کے دُور سے اُنکو چھوڑ جاوے۔ یہ ایک دوسرا گناہ ہے؛ عام بحث سے اسکو تعلق نہیں۔ اُس شخص کی نسبت وہ حدیث ہے جو بخاری ”اَجْر الصّٰبِرِ فِی الطّٰعُوْنَ“ میں مذکور ہے“

اسلام کا ادب

اسلام اور شعائر اسلام کا ادب، قرآن مجید کا ادب، اور خدا اور رسول کے نام کی تعظیم سرسید کے دل میں کسی اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے صوفی خوش اعتقاد سے کچھ کم نہ تھی؛ بلکہ بعض موقعوں پر اس سے بھی کچھ بڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھی یہاں چند شہادتیں بطور نوٹ کے ذکر کی جاتی ہیں۔

مبہنی کے ایک شخص نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اُردو تحریروں میں علامات وقف ہی مقرر کرنے چاہئیں جو قرآن مجید میں لکھے جاتے ہیں۔ سرسید نے اُنکو لکھا ”ہم نہیں پسند کرتے کہ جو علامتیں بت سے قرآن مجید کی تحریر میں مخصوص ہو گئی ہیں وہ اُنہو تحریروں میں مُروج کی جائیں اور آیت و مطلق وغیرہ جو خاص

استعمال کریں جو خاص رب واحد محمود و غیور نے اپنی عبادت میں استعمال کرنے کے لئے بطور شاعر اُردو مقرر کئے ہیں۔ افسوس کہ جس وقت ہمارے دوست ہنگو نصیحت کرتے ہیں اُس وقت اُن کو اُن الفاظ کی عظمت کا اور ہمارے کاموں کی خست کا خیال نہیں رہتا اور چاہتے ہیں کہ ہم اپنے مخیسل و ذلیل کاموں میں خدا کی عظمت اور اُسکے شاعر کی عزت کو بھول جاویں اور انھیں ذلیل دنیاوی کاموں میں شاعر اُردو کو گڈ مڈ کر کے اُسکی عظمت کو لوگوں کے دلوں سے کھودیں۔ کیا ہنگو زیبا ہے؟ کہ اپنے لغو اور ذلیل دنیاوی کاموں میں اُس منبر کی۔ جیسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے (بابی انت و اُمی یا رسول اللہ) کھڑے ہو کر وعظ فرمایا، قرآن مجید لوگوں کو سنایا، خطبات روحانی ارشاد فرمائے، صحابہ اور ائمہ علیہم السلام نے اُس سنت کو اختیار کیا اور اب ہماری مسجدوں کے لئے مخصوص ہے جیسے یہی سنت ادا کی جاتی ہے، نقل بنا کر کھڑے ہوں..... یہی خیالات ہیں جنکے سبب سے لوگ ایسی باتیں کر بیٹھتے ہیں جنسے ہمارا دل تو کانپ جاتا ہے، ایک اخبار نکالا جاتا ہے جس کا نام (توبہ توبہ) منشور محمدی رکھا جاتا ہے، کیون اُس کا دل پھٹ نہ گیا اور کیون اس کا قلم ٹوٹ نہ گیا جو اُس نے ان انمظون کو لکھا، ایک اخبار نکالا جاتا ہے جس کا نام اسلام رکھا جاتا ہے وہ نہیں سمجھتا کہ کس مقدس نام کو کس جگہ استعمال کرتا ہے اور اسلام کی عظمت کو دل سے بھٹاتا ہے؟ ایک اخبار نکلتا ہے اور مخبر صادق (ہمارے افسوس کس دل سے) اُس کا نام رکھا جاتا ہے، کوئی اخبار الصدیق کے نام سے مشہور ہے۔ ایک دفعہ محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں ایک رزلویشن اس مضمون کا پیش ہوا کہ کانفرنس کے چندہ کی آمدنی جمع رکھنے کو (یا اور کسی غرض کے لئے) ایک شخص امین قوم مقرر ہونا چاہیے۔ سرسید نے یہ مضمون سنا اور آبدیدہ ہو کر دردناک آواز سے کہا کہ "امین قوم تو صرف ایک شخص تھا سو گزر گیا اب کوئی امین قوم نہیں ہو سکتا، ہاں اس عہد کا نام امانت دار قوم ہو سکتا ہے" چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابتدا سے عمر سے عرب میں امین کے لقب سے مشہور تھے اسلئے اس لقب کا اطلاق کسی دوسرے شخص پر ہونا

اصطلاحات قرآن مجید کی بین نور تحریریں پر بولی جائیں۔ گوشہ غاد عقلاً اس میں کچھ قباحت نہ ہو الا تعظیماً للقرآن المجید
ایسا کرنا ہم پسند نہیں کرتے۔

خلون پر جو اکثر لوگ بسم اللہ الرحمن الرحیم یا حامداً و مصدقاً لکھ دیا کرتے ہیں اُسکی نسبت
وہ ایک جگہ لکھتے ہیں ”ہم کو نہایت افسوس ہے کہ لوگوں نے اسلام کے مقدس الفاظ و مضامین کو ایک دل لگی کی
بات بنا لیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ یہ نہایت دینداری اور خدا پرستی اور نہایت ہی اتقاء اور ٹھیک سنت پر چلنے کا کام ہے؛
حالانکہ اس سے زیادہ اسلام اور اُسکے مقدس الفاظ و مضامین کی بے ادبی نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کے اس قسم کے
برتاؤ سے اسلام کی برکت و منزلت اُنکے دل میں نہیں رہی۔ بعض اسکے کہ اسلام کی باتوں سے اُنکے دل میں نیکی
خضوع اور خشوع پیدا ہو۔ سختی اور قساوت پیدا ہوتی ہے۔ حدیث نبوی کا بھی۔ جس میں خدا کے نام سے کام شروع
کرنے کا حکم ہے۔ یہی منشا معلوم ہوتا ہے؛ کیونکہ اُسکے الفاظ یہ ہیں کُلُّ امْرِئٍ ذِي بَالٍ اَمْرٌ بِدَايِئِهِ سُبْحَانَ اللَّهِ
فَهَوَّابٌ عَزَّ“ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو امر ذی بال یعنی عظمت اور شان والا نہ وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔“

ایک صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ کانفرنس کے جلسوں میں تحسین
کے موقع پر بجائے تالی بجانے کے سبحان اللہ یا مرحباً یا جزاك اللہ کہا جائے اور اجلاس کے
موقع پر ایک منبر رکھا جائے جہاں پر لوگ اپنیج کیا کریں۔ سرسید نے اس سخت ناراضی
ظاہر کی اور کہا ”ایسے جلسوں میں جیسے کہ ہمارے جلسہ نبوی اغراض کے لئے ہوتے ہیں اُن الفاظ کو استعمال کرنا
جو شعائر اللہ میں سے ہیں اُنکی ہتک حرمت کرنا ہے اور لاکھوا شعائر اللہ میں داخل ہے۔ کیا یہ افسوس کی بات
نہیں ہے کہ ہم ایک عاشقانہ شعر پڑھیں اور مئے ناب کی خوبی کسی شعر میں باندھیں؛ یا ایک محشوق کے ہجو وصل
اور اُسکے خط و خال اور عشوہ و ناز تو بہ شکن کو دلچسپ نظم میں ادا کریں؛ اور سنے والے اسکی تحسین میں اُن کلمات کو

وہ صرف اُن لوگوں کے لئے ہے جو مذکورہ بالا عقائد پر پختہ یقین نہیں رکھتے یا اُن پر مسترض
یا اُن میں متردو ہیں۔

سر سید نے ایک موقع پر اپنی تفسیر کی نسبت کہا کہ ”اگر زمانہ کی ضرورت مجھ کو مجبور نہ کرتی تو میں
کبھی اپنے ان خیالات کو ظاہر نہ کرتا بلکہ لکھ کر اور ایک لوہے کے صندوق میں بند کر کے چھوڑ جاتا اور یہ لکھ جاتا کہ جب تک
ایسا اور ایسا زمانہ نہ آوے اُسکو کوئی کھول کر نہ دیکھے۔ اور اب بھی میں اُسکو بہت کم چھپواتا ہوں اور گراں بیچتا ہوں
تاکہ صرف خاص خاص لوگ اُسکو دیکھ سکیں۔ سر دست عام لوگوں میں اُسکا شائع ہونا اچھا نہیں“

جس محبت

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سر سید کو ایک خاص تعلق اور غایت درجہ کی ارادت اور
سچی محبت معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ جس حدیث کا مضمون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت
شان کے منافی ہو میرے نزدیک وہ یقینی موضوع و مفتر ہے اگرچہ تمام محدثین کا اسکی صحت پر اتفاق
ہو۔ بعض روایتوں پر جسکے ذریعہ سے مخالفوں کو آنحضرت پر طعن کرنے کا موقع ملا ہے۔ وہ بعض
اوقات نہایت غیظ و غضب میں آکر یہ کہ اُٹھتے تھے کہ اگر اسکا راوی میری حکومت میں یہ روایت
کرتا تو میں اُسپر مفتری کی حد جاری کرتا۔

منشی سراج الدین نواب (تصاویف) سے روایت کرتے ہیں کہ ”سید صاحب کے کفر کا فتوہ
جو مولوی امداد العلی نے علما کے پاس مہر و مخط کے لئے بھیجا تھا۔ جب وہ مولوی سراج احمد مرحوم سنبھلی کے پاس
پہنچا تو انھوں نے اُسکو پڑھ کر یہ کہا کہ ”میں ایسے شخص کی نسبت کفر کے فتوے پر کیونکر دستخط کر سکتا ہوں جسکو
میں نے اپنی آنکھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پر چشم پر آب ادا نازدار روتے دیکھا ہے؟“

سر سید نے اپنی تفسیر میں ایک موقع پر اپنے چند فارسی اشعار لکھے ہیں جن میں سے دو شعر

انہوں نے گوارا نہیں کیا۔

ایک شخص نے سرسید سے استفسار کیا تھا کہ اگر نازمین قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ لیا جاوے تو آپ کے نزدیک کچھ قباحت تو نہیں اس کے جواب میں انہوں نے یہ لکھ بھیجا ”مخدومی نازمین قرآن مجید بلفظ نہ پڑھے اور اس کا ترجمہ پڑھ لینے میں بجز اس کے اور کچھ قباحت نہیں کہ نازمین ہوتی“

ایک اور شخص نے اُن سے دریافت کیا تھا کہ قرآن کا ترجمہ جو آپ نے اپنی تفسیر میں کیا ہے۔ اگر قرآن سے ملحدہ چھاپ لیا جاوے تو آپ اس کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں؟ اس کے جواب میں انہوں نے لکھا ”اول تو یہ بتاؤ کہ ایسے فردود ترجمہ کو خریدیگا کون؟ دوسرے یہ کہ جو ترجمہ تفسیر کے ساتھ کیا گیا ہے وہ نہایت سہری طور پر ہوا ہے اگر صرف ترجمہ چھاپا جاوے تو نظر ثانی کا محتاج ہے اس کا اہتمام سطح پر کہ صرف اردو بغیر متن قرآن کے چھاپا ہو ہرگز پسند نہیں ہے نہ میں اس کی اجازت اپنی زندگی میں دوں گا۔ میں اس کو نہایت عظیم گناہ سمجھتا ہوں لیکن اگر مع متن قرآن مجید چھاپا جاوے تو میں نظر ثانی کرنے کی محنت گوارا کروں گا والسلام“

قرآن مجید کی تفسیر لکھنے سے سرسید کا مقصد جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے۔ یہ ہرگز نہ تھا کہ اُس کے مضامین عام طور پر تمام اہل اسلام کی نظر سے گزریں۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک مولوی نہایت معقول اور ذی استعداد اُن کے پاس آئے اور کہا کہ میں آپ کی تفسیر دیکھنے کا مشتاق ہوں اگر آپ مستعار دین تو میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ سرسید نے اُن سے کہا کہ آپ کو خدا کی وحدانیت اور رسول خدا صلعم کی رسالت پر تو ضرور یقین ہوگا؟ انہوں نے کہا ”اھم شد“ پھر کہا کہ آپ حشر و نشر اور عذاب و ثواب اور بہشت و دوزخ پر اور جو کچھ قرآن میں قیامت کی نسبت بیان ہوا ہے سب پر یقین رکھتے ہوئے؟ انہوں نے کہا ”اھم شد“ سرسید نے کہا بس تو میری تفسیر آپ کے لئے نہیں ہے

تفسیر قرآن
کے خلاف

پاک ہیں آلایشن مین - بندشون مین بے لگاؤ رہتے ہیں دنیا مین سب کے درمیان سب سے الگ
 سیکڑون پھندون مین یحان جکڑا ہوا ہے بند بند پر ٹوٹے کوئی دل اُن کا تو وہاں سب سے الگ
 یہ شخص اپنے فرائض کے سوا - جنگو وہ اپنے اوپر لازم سمجھتا تھا - درحقیقت کسی چیز سے تعلق
 نہ رکھتا تھا ۔ باوجود قطعی مایوسی کے - جو اسکو مسلمانوں کی ترقی کی طرف سے تھی اور جسکو وہ اکثر
 پرالوٹ صحبتون مین نہایت افسوس کے ساتھ ظاہر کرتا تھا - اسکی کوششیں اخیر دم تک
 برابر جاری رہیں ۔ حالانکہ اسکو یقین تھا کہ مسلمانوں پر مرنی چھا گئی ہے اور قومی زندگی کی
 رُمق اُن مین مطلق باقی نہیں رہی باوجود اسکے وہ دن رات اُنکی ترقی کی تدبیرون مین مصروف
 تھا اور جن کاموں کو وہ بے سود و لا حاصل سمجھتا تھا اُن مین اسکی سرگرمی و دلچسپی دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا
 کہ گویا ہر ایک کام مین اسکی جان اُلکی ہوئی ہے ۔ یہ اُسی کی ہمت اور اُسی کا حوصلہ تھا جو اسکی ات چرم ہو گیا
 وہ اپنے نہایت عزیز اور خالص دوست اور مددگار نیاز محمد خان رئیس جالندھر کو اُنکے تعزیتی تا
 کے جواب مین لکھتے ہیں ”آپ کا تار ہمدردی کا پہنچا“ جو دلی محبت اور عنایت آپ کی مجھ نا چیز ہے اُسکا مین صرف
 شکر گزار ہی نہیں ہوں بلکہ مین بھی اُسکو نہایت محبت و قدر سے دیکھتا ہوں ۔ اگرچہ سید حامد حرم کے انتقال سے
 سخت صدمہ ہوا ہے لیکن خدا نے صبر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ قومی بھلائی کے کام مین زیادہ مصروف ہو ، کیونکہ
 وقت موت معلوم نہیں ہے اور تو بھی جلد آنے والا اور دنیا اور عزیز قوم کو چھوڑنے والا ہے ، پس قومی بھلائی
 مین زیادہ کوشش کر ۔ والسلام“

وہ اُن لوگوں مین سے نہ تھا جو لوگوں کو دنیا سے نفرت دلاتے ہیں اور خود مال و دولت
 جمع کرتے ہیں بلکہ وہ وہ شخص تھا جو ایک امید موہوم پر - کہ شاید قوم دنیوی ذلت سے نکلے - اپنا

یہاں نقل کئے جاتے ہیں جنسے اُنکے دل کا لگاؤ جو آنحضرت کے ساتھ تھا ظاہر ہوتا ہے

خدا دارم، دل بریان ز عشق مصطفیٰ دارم نثار دہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

ز جبریل امین قرآن بہ پیغامے نئے خواہم ہمہ گفتار معشوق ست قرآنے کہ من دارم

جس زمانہ میں کہ وہ سر ولیم میور کی کتاب لائف اوف محمد کا جواب لکھنے کی تیاری کر رہے تھے

انھوں نے ولایت سے مولوی سید محمد علی خان کو ایک خط میں یہ الفاظ لکھے تھے ”مصرم ارادہ

کر لیا ہے کہ آنحضرت صلم کی سیر میں۔ جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا۔ کتاب لکھی جائے، اگر کام روپیہ خرچ ہو جاوے

اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں یہ تو کم کر پکارا جاؤں گا کہ اُس فقیر مسکین احمد

کو۔ جو اپنے دادا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا۔ حاضر کرو، مارا ہین تفرہ شاہنشاہی بس ست“

سر سید کو اس وجہ سے کہ وہ مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے لئے کوشش کرتے تھے، اُمر سے

ملتے تھے، حاکمان وقت سے میل جول رکھتے تھے اور خود دنیا داروں کیسی زندگی بسر کرتے تھے۔

کہا جاسکتا تھا کہ وہ دنیا دار ہیں لیکن اُنکی حالت پر نظر کرنے سے ہر شکل اُنکو عرفی معنوں میں دنیا دار

کہہ سکتے تھے۔ ایک بزرگ کا حال۔ جو بظاہر تعلقات میں گھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے مگر دل کو

کسی چیز سے تعلق نہ تھا۔ لکھا ہے کہ وہ اپنے صطبیل کے گھوڑے دیکھ رہے تھے، کسی نے طنز کے طور

پر کہا کہ جس دل میں خدا ہو اُس میں گھوڑے نہیں سما سکتے۔ انھوں نے کہا ”ابن سجاد گل زدہ ام

نہ در دل“ سر سید کا حال دیکھ کر اس مقولہ کی بخوبی تصدیق ہوتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ ایسے

لوگ اب بھی دنیا میں موجود ہیں جو باوجود کثرت تعلقات کے ہر ایک تعلق سے آزاد ہیں

اور جن کی نسبت کہا گیا ہے

نسبک دنیوی
عبارت تعلق

کرتے ہوئے ہمیشہ اُنکے چہرہ سے ایک رقت آمیز نداشت ظاہر ہوتی تھی۔ باوجودیکہ مدت سے یہ کوچہ چھٹ گیا تھا وہ مرنے سے چند سال پہلے زیادہ تر اسی ارادہ سے دلی گئے کہ شاہ صاحب کے مزار پر حاضر ہوں۔ اور ہمیشہ حضرت مجدد کے مزار پر جانے کے لئے سر ہند جانے کا قصد رکھتے تھے۔ ایک خط میں سردار محمد حیات خان صاحب کو لکھتے ہیں ”مائی ڈیر حیات! آپ کا عنایت نامہ پہنچا..... بعد برسات ٹیلا جانا ہوگا۔ آپ کی ملازمت کو بھی جی چاہتا ہے اور سر ہند میں حضرت مجدد کے مزار کی زیارت کا ارادہ ہے کیا عجیب کہ ملتان تک آنا ہو جائے۔ ملتان میں کن کن بزرگوں کی زیارت ہے، اُن سے اجازت لے لیجئے اور یہ بھی دریافت فرما لیجئے کہ کیا عنایت ہوگا“

تصور شیخ کے مسئلہ کے متعلق جس پر طریقہ نقشبندیہ میں سالک کی ترقی کا دار و مدار ہے جو خیالات سرسید نے ۱۸۵۱ء میں اپنے رسالہ موسومہ بنیقہ میں ظاہر کئے تھے وہی خیالات وہ اسکی نسبت اخیر دم تک رکھتے تھے۔ مگر جس طرح وہ اور باتوں میں کسی کے مقلد نہ تھے اسی طرح تصوف میں بھی اُنکے خیالات بالکل آزاد تھے۔ وہ کہتے تھے کہ دنیا میں رہ کر دنیا سے بے تعلق رہنا اور جو قوتے خدا تعالیٰ نے انسان میں ودیعت کئے ہیں اُنکو اپنے اپنے موقع پر بغیر افراط و تفریط کے استعمال کرنا تمام تصوف کا خلاصہ ہے یہی اُنکا قول تھا اور اسی کے موافق اُنکا عمل تھا۔

وہ ایک دوست کو اُسکے خطا کے جواب میں لکھتے ہیں ”سب بڑا کام انسان کے لئے دنیا میں یہ ہے کہ دنیا کو برتنے اور دل کو اُس سے تعلق نہ ہو مولانا روم فرماتے ہیں ”چھیت دنیا از خدا غافل بدن“ مگر میرے نزدیک اس میں کسی قدر غلطی ہے خدا سے غافل ہونا انسان کی طاقت سے باہر ہے خود خدا ایسا ہمارے پیچھے پڑا ہے کہ اگر ہم چھوڑنا بھی چاہیں تو نہیں چھوڑتا اسی طرح ہم بھی خدا کے ایسے پیچھے پڑے ہیں کہ اگر خدا خود

دھن تن من سب قوم پر قربان کر گیا۔ اُسے اپنے اُس بڑے فرض کے ادا کرنے کی جلدی میں جسکے لئے ولایت کا سفر اختیار کیا تھا۔ اپنی ہزاروں روپیہ کی جائداد اور اثاث البیت اور ہزاروں روپیہ کی کتابیں نکلے دھڑے کے بھاؤ فروخت کر دیں اور اُسکے دل پر ذرا میل نہ آیا، اُسے غدر کے بعد لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا تعلق لینے سے ایسی بے پروائی کے ساتھ انکار کر دیا کہ کوئی دو چار بیگمہ زمین کے لینے سے بھی اس طرح انکار نہیں کر سکتا، وہ اکثر ایسی تنگی کی حالت میں کہ گھر میں خرچ کرنے کو ایک پیسا نہ ہوتا تھا اپنی ساری تنخواہ خزانہ سے منگوا کر مدرسہ کی ضرورتوں میں اٹھا دیتا تھا اور جب تک مدرسہ کاروپہ وصول نہ ہوتا آپ قرض وام کر کے گزارہ کرتا تھا، جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو بقول مسٹر آرنلڈ کے نہ اُسکے پاس رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو، اور جب وہ مرا تو اُسکی تجہیز و تکفین کے لئے ایک پیسا گھر میں سے نہ نکلا، کیا اس سے زیادہ کوئی زاہد کوئی صوفی کوئی درویش دنیا سے بے تعلق ہو سکتا ہے؟ اور کیا ہکوہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں میں کوئی ایسا کافر مل سکتا ہو؟

وَاللّٰہُ دَرُّہُمْ قَاتِلٌ

دولت بغلط نبود از سعی پشیمان شو کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو

اگرچہ سیرید کی تمام زندگی دنیا داروں کی زمی میں بسر ہوئی مگر اس میں شک نہیں کہ شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ کارنگ جو ابتدائے عمر میں اُنپر چڑھ گیا تھا وہ نفس واپسین تک بدستور چڑھا رہا۔ اُنکے بعض خوابوں سے جو ضمیمہ کتاب میں نقل کئے گئے ہیں اُنکی طبیعت کو ایک خاص تعلق طریقہ نقشبندیہ کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ نیز انھوں نے اپنی اکثر تحریروں میں مشائخ نقشبندیہ کا ذکر ایسے طور پر کیا ہے جس سے اُس تعلق کا کافی ثبوت ملتا ہے؛ خصوصاً شاہ غلام علی صاحب کا ذکر

سرسید کی مذہبی زندگی میں دو ایسی متضاد خاصیتیں پائی جاتی تھیں جو ایک مذہبی آدمی میں بہت ہی کم جمع ہوتی ہیں۔ حالانکہ اسلامی حیثیت انہیں کوٹ کوٹ کر بھری تھی باوجود اسکے مذہبی تعصبات سے وہ بالکل پاک تھے۔ جس بے تعصبی سے انہوں نے فصل خصومات کا کام انجام دیا اور جس طرح کہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے ساتھ اُنکا برتاؤ بحیثیت ایک جج ہونے کے یکساں اور بے طرفدارانہ رہا اُسکو۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ ہر قوم اور ہر فرقہ کے لوگوں نے برابر تسلیم کیا ہے۔ یہی حال اُنکے برتاؤ کا دوستی و ملاقات اور سوشل معاملات میں تھا اور یہی رنگ اُن مذہبی جھگڑوں کے متعلق تھا جو سنی، شیعہ، مقلد، غیر مقلد اور ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ پیش آتے تھے اور پیش آتے ہیں۔ اُنکے نہایت گاڑھے دوست جنکی دوستی اخوت کے درجہ کو پہنچ گئی تھی ہر مذہب اور ہر طریقہ کے لوگوں میں موجود تھے جنکے ساتھ خیر و دم تک اُن کی یکجہتی و یک رنگی کا یکساں حال رہا۔ گائے کی قربانی پر جو ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ تکرار رہتی ہو اسکی نسبت وہ صاف صاف کہتے تھے کہ اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم رہے تو یہ دوستی بے لگائے کی قربانی سے بہت زیادہ بہتر ہے اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت ہے۔ اسی طرح وہ شیعوں کی نسبت اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں ”بہت سے شیعہ ہیں جن سے ہمیں نہایت دوستی ہے، وہ اپنے گھر میں ہمارے بزرگوں پر بڑا کیا کرتے ہیں، کیا کریں، ہمارا کیا نقصان ہے۔“

ایک سال بکرید کے موقع پر کالج کے چند طالب علموں نے شریک ہو کر ایک گائے قربانی کے لئے خرید لی۔ عین بکرید کے دن نماز عید کے بعد سرسید کو خبر ہوئی کہ کالج میں گائے کی قربانی ہونے والی ہے۔ یہ سگڑوہ از خود رفتہ ہو گئے، فوراً سوار ہونے کے لئے گاڑی تیار کرائی اور اپنی

چاہے تو ہکو چھوڑ نہیں سکتا۔ بھلا دیکھیں تو خدا ہکو اپنے بندے اور اپنے مخلوق ہونے سے خارج تو کر دے،
خدا کی قدرت سے خارج ہے

من تو شدم تو من شدمی من تن شدم تو جان شدمی تاکس نگوید بعد ازین من دیگرم تو دیگری
پس از خدا غافل بدن چہ معنی دارد؟ دنیا ہمارے برتنے کے لئے ہے ہم خوب چین سے اُسکو برتین مگر دل کو اُس سے
تعلق نہ ہو۔ بس یہی سب سے بڑا کام ہے اور یہی تعلق کفر ہے جسکی نسبت رسول مقبول نے فرمایا ”صاحب المال کافر“
ایک اور دوست کو۔ جنکی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اُنکے خطا کے جواب میں لکھتے ہیں ”آپ کا
عنایت نامہ درد انگیز پہنچا جو رنج آپ کو ہے وہ بلاشبہ ہمدردی کے لائق ہے۔ لیکن امر لا علاج کا یہ علاج نہیں ہے
کہ انسان اُسی میں غلطان و پچاپن رہے اور اُور سب کاموں کو جنکے لئے خدا نے اُسکو پیدا کیا ہے چھوڑ بیٹھے
رضا بقضا۔ جو اہل اللہ کا مقولہ ہے۔ نہایت عمدہ اور فلسفیانہ ہے ”حقے المقدور انسان کو اُسپر عمل کرنا چاہئے۔
..... میری دہشت میں آپ کو اتباع والدہ صاحبہ جنکا حق جمیع امور پر مقدم ہے لازم ہے۔ آپ اُنکی صلاح کو
مان لین اور شادی کر لیں۔ امید ہے کہ آپ کی حالت موجودہ اور آئندہ درست ہو جائیگی۔ ایک بیوی کی وفات
کے بعد دوسری بیوی کرنی کسی طرح اخلاق کے برخلاف نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت خدیجہ کبریٰ سے
نہایت محبت تھی اُنکے بعد آپ نے نکاح فرمایا، کون شخص ہے جو کانشنس یا اخلاق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
زیادہ اپنے تئیں قرار دے سکتا ہے؟ تمام حالات و مشکلات جو آپ نے لکھی تھیں وہ سب واردات حالیہ ہیں
جو کبھی قائم نہیں رہتیں۔ انسان کو چاہئے کہ اُن واردات حالیہ کو دل سے علیحدہ کر کے سوچے کہ اُس کو کیا
کرنا چاہئے۔ میری سمجھ میں والدہ صاحبہ کی اطاعت اور اُنکو رنج کی حالت میں نہ رکھنا تمام اخلاق و عبادتوں
اور کانشنس کے جذوبوں سے افضل ہے۔ والسلام“

ایک دریا کا پانی پیتے ہیں، مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہوتا ہے، ایک کو دوسرے سے بغیر ملے چارہ نہیں، پس کسی چیز کو جو معاشرت سے علاقمند رکھتی ہے۔ ان دونوں کا علیحدہ علیحدہ رکھنا دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔ پھر آگے چل کر انھوں نے کہا کہ ”قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے، گویا ان میں بعض بعض خصوصیات بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندو مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرنے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے، ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی جو اسی ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔“

ایک اور موقع پر اسی باب میں انھوں نے مندرجہ ذیل تقریر کی ”میرے نزدیک یہ امر چندان لحاظ کے قابل نہیں ہے کہ اُنکا (یعنی ہندو مسلمانوں کا) مذہبی عقیدہ کیا ہے؟ کیونکہ ہم اُس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے، لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں، ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں، ہم سب فائدہ کے عجز ایک ہی ہیں، ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برابر برداشت کرتے ہیں۔ یہی مختلف وجوہات ہیں جنکی بنا پر میں ان دونوں قوموں کو۔ جو ہندوستان میں آباد ہیں۔ ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ ”ہندو“ یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم۔“

ایک اور ایسی چیز میں اُنکے یہ الفاظ تھے ”اب ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے، ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں، مقدس گنگا جمنہ کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں، ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں، مرنے میں جینے میں دونوں کا ساتھ ہے، ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا، دونوں کی رنگتیں ایک سی ہو گئیں، دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئیں، مسلمانوں نے

کوٹھی سے کلچر تک آدمیوں کی ہڈاں لگا دی یہاں تک کہ وہ گائے طالب علموں سے چھین کر اُس کے مالک کو واپس دی گئی اور طالب علموں کو سخت ملامت کی اور آئندہ کے لئے قطعی ممانعت کر دی کہ کلچر کے احاطہ میں کبھی کوئی ایسا نہ کرنے پائے۔

سر سید نے انجمن پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں جو الفاظ کہے تھے اُن سے اس باب میں اُن کے اصلی خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا ”میری تمام آرزو یہ ہے کہ بلا کا ناقوم اور مذہب کے تمام انسان آپس میں ایک دوسرے کی بھلائی پر متفق ہوں۔ مذہب سب کا بے شک علحدہ علحدہ ہے مگر اُس کے لحاظ سے آپس میں کوئی دشمنی کی وجہ نہیں ہے۔ فرض کرو کہ ایک دسترخوان پر مختلف قسم کے کھانے موجود ہیں، انہیں سب کو کوئی کسی کھانے کو پسند کرتا ہے اور کوئی کسی کو، مگر اس اختلاف طبائع کی وجہ سے اُس دسترخوان پر بیٹھنے والوں کو باہم کچھ رنج نہیں ہوتا، اسی طرح اس دنیا میں مختلف مذہبوں کی وجہ سے مختلف مذہب والوں میں کوئی وجہ باہمی رنج کی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہر شخص اپنے ایمان کا مختار بلکہ میری رائے میں اُس پر مجبور ہے۔ اس لئے کہ جس چیز کا یقین اُس کے جی میں ہے اسی کو وہ اختیار کرے گا، وہ یقین دوسروں کے دل میں اثر نہیں اچھا، تو اُس کے لئے اور بُرا ہے تو اُس کے لئے؛ لیکن آپس کی محبت میں۔ جو انسانوں کی راحت میں سب جرم ہے۔ اُس سے کچھ نقصان نہیں آ سکتا“

یہی وجہ تھی کہ سر سید ہمیشہ پبلک جلسوں میں جہاں ہندو مسلمان جمع ہوتے تھے دونوں قوموں کو اتحاد و اتفاق اور ایک دوسرے کی خیر خواہی و خیر اندیشی کی نصیحت کرتے تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے اپنی اتالیج میں کہا ”ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں طلح آباد ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملتا ہے، ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے، ایک آب و ہوا میں دوسرے کی

طرف سے ہوا اُسے فوراً اسکی مداخلت کی نہ اس معاملہ میں اُسکو اپنی صلح کل کی پالیسی کا پاس رکھنا تھا اور نہ اس بات کی کچھ پروا تھی کہ فریق ثانی کس تہہ اور درجہ کا آدمی ہے۔ حالانکہ وہ ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ اتحاد و اتفاق قائم رکھنا چاہتا تھا مگر جب اُسے دیکھا کہ ہندو اردو زبان اور فارسی خط کو صرف اس وجہ سے مٹانا چاہتے ہیں کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد کی یادگار ہے تو اُسے علانیہ اُنکی مخالفت کی اور ولایت جانے سے پہلے دو برس تک برابر اُن تمام بھانوں اور مجلسوں اور کمیٹیوں کے برخلاف آرٹیکل لکھتا رہا جو بنارس اور الہ آباد اور دیگر مقامات میں اردو کی بیخ کنی کے لئے قائم ہوئی تھیں۔ پھر جب ایسے ہی تنگدلی اور تعصب کے خیالات سے الہ آباد یونیورسٹی میں یہ تحریک ہوئی کہ فارسی زبان یونیورسٹی کے کورس سے خارج کر دی جائے تو اُسے محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں بمقام الہ آباد اس تحریک کے برخلاف ایک نہایت پر جوش اور زبردست اسپیچ میں اُن تمام دلائل کی تردید کی جو فارسی زبان کے خارج کرنے کی ضرورت پر پیش کی گئی تھیں۔

باوجودیکہ وہ انگریزوں کا دوست تھا اور اُنہیں اور مسلمانوں میں خلوص اور دوستی پیدا کرنا چاہتا تھا مگر جن انگریزوں نے اسلام کے برخلاف کتابیں لکھیں اُنکا مقابلہ اُس نے نہایت آزادی اور بیباکی کے ساتھ کیا۔ اُسی نے سب سے پہلے گورنمنٹ کو اس بات سے آگاہ کیا کہ ملکی اور فوجی افسر اپنے تابعین کو مشنیریون کا وعظ سنوانے کے لئے اپنا رعب و داب کام میں لاتے ہیں جس سے لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ گورنمنٹ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ صلح مراد آباد میں انتظام قحط کے موقع پر ہندو مسلمانوں کے یتیم لاوارث بچوں کی بابت جو کشمکشیں ہوئیں اور مشنیریون اور کلکٹر مراد آباد کے درمیان رہی وہ پہلے حصہ میں مفصل بیان ہو چکی ہے۔

ہندوؤں کی سیکڑوں رسمن اختیار کر لیں، ہندوؤں نے مسلمانوں کی سیکڑوں عادتیں لے لیں، یہاں تک ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں نے ملکر ایک نئی زبان اُردو پیدا کر لی۔ جو نہ ہماری زبان تھی نہ انکی۔“

”اے میرے دوستو! میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دُھن کی مانند ہے جسکی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دُھن بھینگی ہو جاوے گی، اور اگر ایک دوسرے کو برباد کر دینگے تو وہ کانٹری بن جاوے گی، پس اے ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلمانو! اب تمکو اختیار ہے کہ چاہو اُس دُھن کو بھینکا بناؤ چاہو کاٹو۔“

اس کے علاوہ۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اُنھوں نے جتنے رفاہ عام کے کام کئے انہیں تمام ہندو مسلمانوں کو شریک کیا، سوسائٹی کے اخبار میں۔ جو کہ سینتیس برس اُنکے ہاتھ تلے رہا۔ کبھی بھولکر بھی کوئی آرٹیکل یا نوٹ ایسا نہیں لکھا جس سے کہ مذہبی تعصب کی بو آتی ہو، کبھی گورنمنٹ سے اس بات کی شکایت نہیں کی کہ مسلمانوں کی تعداد بہ نسبت ہندوؤں کے سرکاری ملازمت میں بہت کم ہے، کبھی کسی ہندو غمہ دار کی ترقی پر اعتراض یا ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ برخلاف اسکے ہمیشہ مسلمانوں کو نصیحت کی کہ سرکاری ملازمت کا استحقاق پیدا کر لیں ہمیشہ ہندو لیڈروں اور رفاہیروں کا ذکر ادب اور تعظیم کے ساتھ اپنے اخبار میں اور پبلک سیچون میں کیا، اور ہمیشہ اُنکے مرنے پر حد سے زیادہ رنج اور افسوس ظاہر کیا۔ یہی حال اُنکی بے تعصبی کا اسلامی فرقوں کے ساتھ تھا اور یہی حال عیسائیوں کے ساتھ۔

باوجود اسکے اسلامی حمیت جیسی اس شخص میں پائی جاتی تھی نہ وہ مولویوں اور واعظوں میں دیکھی گئی نہ صوفیوں اور درویشوں میں۔ جب کوئی بیجا حملہ اسلام یا مسلمانوں پر غیر مذہبوں کی

تعریف میں کچھ تقریر کی تو اُس کے جواب میں جو کچھ انھوں نے کہا اُس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک مشن اسکول کے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان کی نسبت کیسے خیالات اور شبہات رکھتے تھے۔ انھوں نے کہا ”تمہارے بیان میں کئی جگہ قوم کا لفظ آیا ہے مگر یاد رکھو کہ قوم کوئی چیز نہیں ہے جب تک کہ وہ قوم نہ ہو ایک ایک شخص جو اسلام کے گروہ میں داخل ہے وہ سب ملکر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتی ہے، جب تک وہ اپنے عزیز مذہب کے پیرو اور پابند ہیں تبھی تک وہ قوم ہیں۔ یاد رکھو کہ اسلام جس پر ٹکوجبنا ہے اور جس پر ٹکومنا ہے اُس کو قائم رکھنے سے ہماری قوم قوم ہے۔ اے عزیز بچے، اگر کوئی آسمان کا تارا ہو جائے مگر مسلمان نہ رہے تو ہلکوا کیا؟ وہ تو ہماری قوم ہی نہ رہا۔ پس سلام کو قائم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبودی ہے۔ امید ہے کہ تم ہمیشہ اُس کو قائم رکھو گے اور اُس کے ساتھ تمام باتوں میں ترقی کرتے جاؤ گے کہ یہی قومی ترقی ہوگی جو تم کو بھی فائدہ دیگی اور قوم کو بھی عزت ہوگی اور آئندہ آنے والی نسلیں بھی اُس سے فائدہ اٹھاویں گی“

اگرچہ اسلامی حمیت ہر مسلمان کے دل میں کم و بیش ضرور ہوتی ہے اور ہونی چاہیے مگر اس باب میں سرسید کے خیالات عام مسلمانوں کے خیالات سے بالکل مختلف تھے جو اعتراض عیسائی لوگ اسلام پر کرتے ہیں یا جو مطاعن رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں بعض مسلمان تو اسی کو کمال دینداری سمجھتے ہیں کہ اُس کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے، بعض غیظ و غضب میں آکر ایسی کتابوں کو آگ میں جلا دیتے ہیں اور بعض گورنمنٹ سے فریاد کرتے ہیں کہ فلاں کتاب میں ہمارے دین یا ہمارے نبی کی توہین کی گئی ہے اُس کو گورنمنٹ تلف کرادے اور آئندہ اس کے چھاپنے کی ممانعت ہو جائے۔ مگر درحقیقت ان باتوں کو مذہبی حمیت کی کچھ علاقہ نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا گویا اس بات کو تسلیم کر لینا ہے کہ مخالفوں کے اعتراضات کا ہمارا پس

ایجوکیشن کمیشن کی شہادت میں صاف صاف کہہ دیا کہ مسلمانوں کی عام فیلنگ مشنیری اسکولوں اور کالجوں کے برخلاف ہے۔ پس اگر ہمیں کسی مشنیری اسکول کی موجودگی کے سبب کوئی گورنمنٹ اسکول توڑ دیا جائیگا تو اس کی وجہ سے لوگوں میں ناراضی پیدا ہوگی۔ اُسے کمیشن میں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ”جہاں مشنیری اسکول ہیں اگر وہاں کے لوگ اپنی اولاد کو اُن اسکولوں میں بھیجتا پسند نہ کریں اور آپ اپنے لئے عمدہ اسکول یا کالج قائم کریں تو گورنمنٹ اُنکو گرنیٹ ان ایڈ عطا فرماوے اور اس بات کی خبر رکھے کہ وہاں کے حکام اس قسم کی لوکل کوششوں میں خلل انداز نہ ہوں اور جیسا کہ بعض ضلعوں میں ہوا ہے اپنی حکومت اور رعب داب کو اُنکے برخلاف عمل میں نہ لاویں“

اُس سے بڑھ کر کوئی شخص اس بات کا مخالف نہ تھا کہ مسلمان اپنی اولاد کو تعلیم کے لئے مشنیری اسکولوں یا کالجوں میں داخل کریں؛ نہ اسلئے کہ اُسکو عیسائی مذہب کے کچھ تعصب تھا بلکہ صرف اس خیال سے کہ مسلمانوں کو غیرت آئے اور وہ اپنی اولاد کی دینی اور دنیوی تعلیم کا خود نظام کریں۔ اُسے جو لکچر سنا تھا کہ میں بمقام لودھیانہ دیا تھا اُس میں وہاں کے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر صاف صاف کہا تھا کہ ”بڑے افسوس کی بات ہے کہ لودھیانہ سے شہر میں جو ایک بڑا شہر ہے اور جہاں بہت سے مسلمان آباد ہیں مشنیری اسکول بہت سے ہیں اور مسلمانوں کو یہ شرم نہیں آتی کہ مشنیری تعلیم لیں وہ اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں اُنکو کچھ جوش پیدا نہیں ہوتا اُنکو کچھ غیرت نہیں آتی کہ وہ اپنے لڑکوں کا خود کچھ بندوبست کریں وہ کتنی طرح اپنے لڑکوں کو خیراتی روٹی پر چلاتے ہیں اور ایسے خیراتی اسکولوں میں اپنی اولاد کو تعلیم کداسلئے بھیجتے ہیں اور کوئی بندوبست اپنے بچوں کی تعلیم کا نہیں کرتے“

اُسی لودھیانہ کے جلسہ میں جب وہاں کے مشن اسکول کے ایک مسلمان طالب علم نے سرسید کی

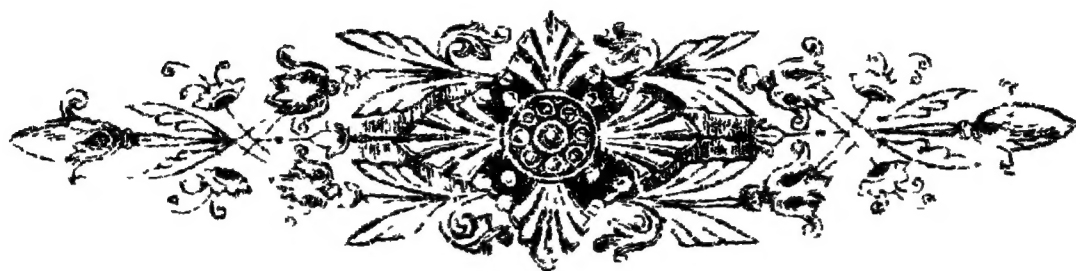
اسکے سوا کچھ علاج نہیں کہ اُن اعتراضوں سے اپنی آنکھیں اور کان بند کر لیں یا گورنمنٹ سے فریاد کر کے ایسی کتابوں کو تلف اور اُن کی اشاعت بند کرادیں۔ برخلاف اسکے سرسید کے خیالات اس باب میں یہ تھے کہ مسلمانوں کے لئے اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ عیسائیوں کے اعتراضوں کو لغو و پوچھ سمجھ کر انکی طرف التفات نہ کیا جائے، یا گورنمنٹ میں استغاثہ کر کے اس بات کا ثبوت دیا جائے کہ مسلمان اُنکا جواب دینے سے عاجز ہیں۔ بلکہ اسلامی حیثیت کا مقتضایہ ہے کہ اُنکے اعتراضوں کو نہایت ٹھنڈے دل سے اور نہایت صبر و تحمل کے ساتھ دیکھیں اور اُن پر غور کریں، پھر جو جواب دینے کے قابل ہوں اُنکا جواب دیں اور جنہیں بدزبانی و بے تہذیبی کے سوا کوئی بات التفات کے قابل نہ ہو اُنکا فیصلہ پہلے کی ریل پر چھوڑ دیں نہ یہ کہ گورنمنٹ کو اُن کا حج قرار دیں اور مذہبی مباحثوں میں جکڑت کی پناہ دے ورنہ زمین تاکہ دنیا پر ظاہر ہو جائی کہ اسلام کی دلیلیں باوجود اُسکے محکوم و مغلوب ہونے کے اب بھی ویسی ہی غالب ہیں جیسی اُسوقت تھیں جبکہ اپستین کے عیسائی مسلمانوں کے زوال کے بعد اُنکو اسلئے جلا وطن کرتے تھے کہ اُن کی دلیلوں کا جواب دینے سے عاجز آگئے تھے۔

الغرض اگر مسلمان سے یہ مراد ہے کہ دین اسلام کے حق ہونے پر اپنی ذاتی تحقیقات سے نہ کہ مان باپ کی تقلید سے۔ یقین و اثق رکھتا ہو، اسلام کو اعلیٰ ترین اخلاق کا تعلیم دینے والا،

سہ سرسید نے خطبات احمدیہ میں ایک آزاد خیال یورپین مصنف کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”اگرچہ بظاہر مہمور دینی اسپین کے مسلمان اس وجہ سے جلا وطن کیے جاتے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہ کرتے تھے مگر محکمہ گمان ہے کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیوں پر استغاثہ کرتے تھے کہ نادان ہنک دراز ہیں یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت کی نذر اور تلوار سے ہو سکتا ہو، اور مجھے کچھ شبہ نہیں کہ جہانک انکی ناقص قوت جواب دینے کے باب میں تھی وہ انکے اُنکایہ خیال صیح تھا،“

غیر مذہب والوں کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ سکھانے والا اور فتنہ و فساد و ظلم و بے رحمی کی بیخ کنی کرنے والا۔
 غرض کہ اسکی تعلیم کو نوع انسانی کے حق میں سراسر رحمت اور برکت سمجھتا ہو، خدا کے سوا کسی کو مستحق عبادت
 اور ہی کے سوا کسی انسان کے قول کو واجب الاتباع نہ جانتا ہو، اسلام کی حمایت کو اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین
 مقصد خیالی کرتا ہو، مسلمانوں کی عزت چاہنے والا اور ان کی ذلت پر افسوس کرنے والا ہو،
 جس بات کو سچ جانے اُس کے ظاہر کرنے میں کسی کی مخالفت سے نہ ڈرتا ہو، معاملات میں
 رہت باز ہو اور بُرائی کے عوض میں بھی بھلائی کے سوا کچھ نہ کرے تو شاید سید احمد خان جیسا
 مسلمان زمانہ میں مشکل سے ملے گا، لیکن اگر مسلمان سے یہ مراد نہیں ہے بلکہ اس لفظ کے حقیقی
 مصداق وہ لوگ ہیں جو تعصب کو دین اسلام کا رکن رکین سمجھتے ہیں، جو ذرا ذرا سا اختلاف
 پر جماعت اسلام کو پرانندہ کرنا اپنا فرض جانتے ہیں، جنکو ائمہ مجتہدین کی تفسیر نے
 قرآن اور حدیث سے مستغنی کر دیا ہے، جو قرآن کو محض تلاوت کرنے کی کتاب اور حدیث
 کو صرف سند لینے کی چیز خیال کرتے ہیں، جو احکام ظاہری پر لمبے لمبے وعظا کہتے ہیں،
 آئین اور رفع یدین کی بحث میں عمرین گزار دیتے ہیں، وضع و لباس میں غیر قوموں
 کے تشبہ کو محارِ یہ خدا و رسول کی حد تک پہنچا دیتے ہیں، مگر قوم کے اخلاق کی درستی
 کا۔ جسکی نسبت نبی نے کہا تھا کہ ”بُعِثْتُ لَأَتِمِّمَ مَعَكُمْ الْاِحْلَاقَ“ کبھی
 بھول کر بھی خیال نہیں کرتے، جن کے وعظ و نصیحت سے۔ سوائے کہ مسلمانوں میں افلاک
 نا اتفاقی، بغض اور کینہ کو ترقی ہو، اہل قبلہ میں ہمیشہ کھٹاپی رہے۔ اسلام مطعون ہو،
 اور قوم کو دنیا میں رہتا مشکل ہو جائے۔ کوئی نتیجہ پیدا ہوتا نظر نہیں آتا تو ہم تسلیم کرتے ہیں

کہ ان معنوں میں سید احمد خان کو مسلمان کہنا صحیح نہ ہوگا مگر یہ ویسی ہی مسلمانی ہوگی
 جسکی نسبت کہا گیا ہے
 اگر حقیقت اسلام درجہ ان این ست ہزار خندہ کفرست بر مسلمانی



AL. IND. AZ. C. L.

942

528

PKI 228/78 PKA

05-32/78 PKI